فتاویٰ حقانیہ

٦

افادات و ارشادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ودیگر مفتیان کرام دارالعلوم حقانیہ

نگرانی و اہتمام

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ

ترتیب

مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰى أُوْلِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ (الآية)

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے نصف صدی سے زائد عرصے کے فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ حقانیہ

جلد ششم

افادات
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق و دیگر مفتیان کرام
جامعہ دارالعلوم حقانیہ

نگرانی واہتمام
مولانا سمیع الحق مہتمم و استاذ حدیث
جامعہ دارالعلوم حقانیہ

ترتیب: مفتی مختار اللہ حقانی

شائع کردہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ، پاکستان

نام کتاب .... فتاوی حقانیہ (جلد ششم)

افادات .... شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ و دیگر مفتیان کرام جامعہ ہذا

نگرانی واہتمام .... شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، مہتمم جامعہ ہذا

ترتیب .... مولانا مفتی مختار اللہ حقانی استاذ شعبہ التخصص فی الفقہ والافتاء

ضخامت .... ۵۶۰ صفحات

تاریخ طبع ہفتم .... ۱۴۳۱ھ / ۲۰۱۰ء

طابع .... مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
Mob:0300-4572899

ناشر .... جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

فہرست مضامین جلد ششم

عنوانات	صفحہ

كتاب البيوع

يا ايها الذين امنوا لا
تاكلوا اموالكم بينكم
بالباطل الا ان تكون
تجارة عن تراضٍ منكم

باب شرائط البیع و ارکانہ

(بیع کے شرائط و ارکان وغیرہ)

خرید و فروخت میں طرفین کی رضامندی کا اعتبار

سوال:- آجکل مروّجہ طریقہ کے مطابق ناپ تول میں متفاوت آلات استعمال ہوتے ہیں، کپڑے کے دوکاندار عموماً میٹر پہ کپڑا خرید کر گز پہ بیچتے ہیں جو میٹر سے کم ہوتا ہے، اسی طرح عام دوکاندار یہ تختہ سیر سے (جو سو تولہ کا ہوتا ہے) چیز خرید کر کلوگرام (جو کہ ۸۵ تولہ ہوتا ہے) سے فروخت کرتے ہیں، بائع اور مشتری دونوں اس طریقہ ناپ تول سے آگاہ ہونے کے باوجود باہمی رضامندی سے معاملہ طے کرلیتے ہیں، کیا ناپ تول کا یہ طریقہ ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مشتری سے ناپ تول کی حقیقت کو مخفی رکھنا دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے جو کہ ناجائز ہے لیکن جہاں کہیں بائع اور مشتری دونوں کی باہمی رضامندی سے معاملہ طے ہو جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۲۹) [1]

مکرہ کی بیع صحیح نہیں ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کی دھمکی دیکر بجبر و اکراہ اس سے ایک ٹریکٹر خرید ا جبکہ بائع اس عقد پر بالکل راضی نہیں، تو کیا شرعاً یہ بیع صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے خرید و فروخت میں بائع اور مشتری کی رضامندی اور

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: اذا وجدت الاجازة من المالك فی الانتهاء وبین وجود الرضا فی التجارة عند العقد او بعده فیجب العمل باطلاقها۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۹ کتاب البیوع، فصل: وأما الذی یرجع الی م) ومثله فی تبیین الحقائق ج۴ ص۳ کتاب البیوع۔

طیب نفس کو ضروری قرار دیا ہے، لہٰذا اگر کسی عقد میں بائع کی رضا مفقود ہو اور جبر و اکراہ سے بائع کو مجبور کر کے بیع کی گئی ہو تو یہ بیع صحیح نہیں ۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: ومنہا الرضا.......... فلا یصح بیع المکرہ اذا باع مکرھا وسلم مکرھا لعدم الرضا۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۷۶ کتاب البیوع، فصل واما شرائط الصحۃ فانواع) لـہ

نابالغ کی خرید و فروخت میں اذنِ عُرفی کا اعتبار

سوال:۔ دیہاتوں میں بعض اوقات چھوٹے بچے اور بچیاں دوکان میں بیٹھ کر کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرتے ہیں، گاہک کو پتہ نہیں چلتا کہ بچوں کا والد یا سرپرست اس پر راضی ہے یا نہیں؟ جبکہ بچوں کا باپ اس خرید و فروخت پر انہیں منع نہیں کرتا، تو کیا اس طرح بچوں سے اشیاء کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو بچے اور بچیاں نفع اور نقصان کی تمیز کر سکتے ہوں تو باپ کے اذن و اجازت سے ان کی بیع و شراء شرعاً نافذ ہوگی اور اذن صراحۃً اور دلالۃً دونوں طرح درست ہے، پس بچوں کے والدین کی خاموشی اور خرید و فروخت سے انہیں منع نہ کرنا بھی اذن اور اجازت میں داخل ہے لہٰذا ان سے خرید و فروخت مرخص ہے ۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ثم الاذن کما یثبت بالصریح یثبت بالدلالۃ کما اذا رأی عبدہ یبیع ویشتری فسکت یصیر ماذوناً عندنا۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۶۱ کتاب الماذون) ؎

لـہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۲۵۵ کتاب البیوع، باب الغصب والعاریۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۴ ص۵۰۶ کتاب البیوع، مطلب فی بیع المکرہ والموقوف ۔

؎ قال فی الھندیۃ: اذا اذن لصبیٍ یعقل البیع والشراء یجوز یرید بہ انہ یعقل معنی البیع والشراء بان عرف ان البیع سالب للملک والشراء جالب عرف الغبن الیسیر من الفاحش لا نفس العبارۃ کذا فی الصغریٰ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۱۱، الباب الثانی عشر فی الصبی والمعتوہ.... الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۸۷ کتاب الماذون ۔

مجنون کی خرید و فروخت

سوال :۔ ایک آدمی کا دماغی توازن درست نہیں (دیوانہ اور مجنون) ہے، آیا از روئے شریعت اس آدمی کا بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ شریعتِ مطہرہ نے بیع وشراء کی صحت اور انعقاد کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ عقل کی درستگی کو بھی ضروری اور اہم شرط قرار دیا ہے، چونکہ دیوانہ اور مجنون شخص اچھے بُرے اور نفع ونقصان کی تمیز پر قادر نہیں ہوتا اس لیے مجنون اور دیوانے کی بیع منعقد نہ ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله : واما شرائطها فمنها ان یکون حرّا فلا تثبت ولایة العبد ومنها ان یکون عاقلاً فلا تثبت ولایة المجنون۔ (بدائع الصنائع ج ۳ ص۱۵۳ کتاب البیوع۔ فصل: واما شرائطها فانواع : ا ہ) [1]

نرخ کے تعین سے قبل مبیعہ میں تصرّف کرنا

سوال :۔ ہمارے علاقے میں زمیندار کپاس کی فصل تیار ہونے پر کارخانے میں بھیج دیتے ہیں، کارخانہ والے مال تول کر اپنے استعمال میں لاتے ہیں اور زمیندار کسی بھی وقت جاکر نرخ طے کر لیتے ہیں، آیا تجارت کا یہ طریقۂ کار درست ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگر کارخانہ والے مال وصول کرکے بطور امانت اپنے پاس رکھیں یا باقاعدہ طور پر نرخ طے کرکے اور رقم کی ادائیگی کی تاریخ طے کرکے اس کو استعمال میں لائیں تو اس میں شرعاً کوئی حرج یا فساد نہیں، لیکن اگر نرخ طے کرنے سے قبل ہی کارخانہ والے اس کپاس کو اپنے استعمال میں لائیں اور استعمال کے بعد نرخ مقرر کیا جائے تو یہ معاملہ (بیع) فاسد ہے، کپاس کے استعمال سے قبل نرخ مقرر کرنا لازمی ہے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: منها ان یکون المبیع معلوماً وثمنه معلوماً علماً یمنع من المنازعة۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۵۶ کتاب البیوع، فصل: واما شرائط الصحة فانواعٌ) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: فشرائط العاقد اثنان العقل والعدد فلا ینعقد بیع مجنون وصبی لا یعقل۔ (ردّ المحتار ج ۴ ص۵۰۴ کتاب البیوع۔ مطلب شرائط البیع انواع اربعة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۳ ص۲ کتاب البیوع، الباب الاوّل فی تعریف البیع ... الخ۔

[2] قال فی الهندیة: ومنها ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاوّل فی تعریف البیع) وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۵۰۵ کتاب البیوع مطلب شرائط البیع انواع اربعة۔

مالِ مسروقہ کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے کچھ مال خریدا سودا کر لینے اور خریدنے کے بعد اُسے معلوم ہُوا کہ یہ مال چوری کا ہے، تو اب اس خریدے ہوئے مال کا کیا حکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں اس بات کی تصریح فرمادی گئی ہے کہ چوری کا مال اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، جس چیز کے متعلق قرائن سے غالب گمان ہو کہ یہ چوری کی ہے تو اس کے خریدنے سے گریز کیا جائے، لیکن اگر غلط فہمی سے خرید لی جائے اور بعد میں حقیقت واضح ہو تو وہ چیز اس کے اصل مالک کو واپس کی جائے، اور مشتری کو بائع سے اپنی رقم کے مطالبے کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : لوظهر غیر حلالٍ ای مسروقاً او مغصوباً یرجع علیه المشتری۔ (ردّ المحتار ج۴ ص۱۰۶ کتاب البیوع۔)[1]

کوئی چیز خریدنے کے لیے پیشگی رقم دینا

سوال: جناب مفتی صاحب! میں ایک کار ڈیلر ہوں اور کاروں کا کاروبار کرتا ہوں پہلے گاہک سے رقم وصول کر لیتا ہوں بعد میں نئی کار کمپنی سے لے کر گاہک کے حوالے کرتا ہوں، اگر گاہک کو پسند آجائے تو خرید لیتا ہے ورنہ اپنی رقم واپس لے لیتا ہے اور بیع ختم ہو جاتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح معاملہ طے کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ متاخرین فقہاء نے صورتِ مذکورہ کے جواز پر تصریح کی ہے کیونکہ بیع کی نیت سے پیشگی رقم دینا بیع نہیں بلکہ بیع کا وعدہ ہے جبکہ حقیقی بیع مبیعہ وصول کرنے کے بعد متحقق ہوتی ہے، لہٰذا بیع تعاطی کی وجہ سے بیع منعقد ہو کر صحیح ہو جاتی ہے اور مشتری کو خیارِ رؤیت کا حق حاصل رہے گا۔ اس لیے کسی چیز کے خریدنے کے لیے پیشگی رقم دینا

---

[1] قال ملك العلماء العلامة الکاسانی رحمه الله : ولو باع السارق المسروق من انسان او ملکه منه بوجهٍ من الوجوه فان کان قائماً فلصاحبه ان یاخذه لانه عین ملکه وللماخوذ منه ان یرجع بالضمان علی السارق۔

(بدائع والصنائع ج۵ ص۸۵ کتاب البیوع)

ومثلهٗ فی البحرالرائق ج۶ ص۶۸ کتاب البیوع، باب خیار العیب۔

جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ولو اعطاه الدراهم وجعل يأخذ منه كل يوم خمسة امناءٍ ولم يقل في الابتداء اشتريت منك يجوز وهذا حلال وان كان نيته وقت الشراء لانه بمجرد النية لا يتعقد وانما ينعقد البيع الآن بالتعاطي والآن المبيع معلوم ينعقد البيع صحيحًا. (رد المحتار ج۴ ص۵۱۶ مطلب البيع بالتعاطي) لہ

مشتری کو مبیعہ وصول کرنے پر مجبور کرنا

سوال:- میں نے ایک شخص کے ہاتھ کاٹنے کی شرط لگا کر کچھ درخت فروخت کئے ہیں لیکن اب وہ مجھے تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو درخت کاٹتا ہے اور نہ ہی سودا واپس کرتا ہے ایسی صورت میں از روئے شریعت مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:- باقاعدہ بیع منعقد ہو کر ثمن (قیمت) دیدینے کے بعد مشتری کو مبیعہ وصول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اسی بناء پر صورت مذکورہ میں بائع کے مطالبہ پر مشتری کو درخت کاٹنے یا دونوں کی رضامندی سے بیع فسخ کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اور اگر مشتری اس کے باوجود کسی بات کو تسلیم نہ کرے تو بائع قاضی یا اہل حل وعقد کے ذریعے اپنا حق وصول کر سکتا ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ويقال للبائع اقلعها وسلم المبيع وكذا اذا كان فيها زرع لان ملك المشتري مشغول بملك البائع فكان عليه تفريغه وتسليمه كما اذا كان فيه متاع. (الهداية ج۳ ص۳۱ كتاب البيوع، فصل، ومن باع دارًا... الخ) ٢ہ

لہ قال العلامة سليم رستم بازؒ: ويصح البيع بالتعاطي ...... وصورته ان يتفق على الثمن ثم يأخذ المشتري المتاع ويذهب برضا صاحبه من غير ان يرفع الثمن او ان يرفع المشتري الثمن للبائع ويذهب بدون قبض المبيع فان البيع لازم على الصحيح۔

(شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز تحت المادة ۱۷۵ ص۹۷)

ومثله في شرح المجلة للعلامة خالد الاتاسي، تحت المادة ۱۷۵ ج۲ ص۳۶۔

٢ہ قال العلامة الحصكفيؒ: ويؤمر البائع بقطعهما وتسليم المبيع عند وجوب تسليمهما فلو لم ينقد الثمن لم يؤمر به خانية ــ وقال العلامة ابن عابدينؒ: تحت قوله: عند وجوب تسليمهما) اي تسليم الارض والشجر وذلك عند نقد المشتري الثمن فلو لم ينقد الثمن لم يؤمر به. (رد المحتار ج۴ ص۵۵۲ مطلب في بيع الثمر والزرع والشجر مقصودًا) ــ ومثله في البحر الرائق ج۵ ص۳۰۰ كتاب البيوع۔

ٹیلیفون کے ذریعے عقدِ بیع کا حکم

سوال :۔ عصر حاضر میں عام طور پر تاجر حضرات دُور دراز کے شہروں اور بیرونِ ممالک سے ٹیلیفون کے ذریعے مال منگواتے ہیں، تو کیا خرید و فروخت کا یہ طریقہ شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ شریعتِ مقدسہ نے خرید و فروخت کے دوران ایجاب و قبول کے لیے اتحادِ مجلس کو ضروری قرار دیا ہے لیکن اتحاد عام ہے خواہ حقیقی ہو یا حکمی، حقیقی تو ظاہر ہے اور حکمی کی صورت یہ ہے کہ ایک مجلس میں ایجاب ہو جائے اور مشتری کو کسی مناسب طریقے سے (بذریعہ خط یا پیغام رساں کی معرفت) اطلاع دی جائے ۔ موجودہ دَور میں فقہاء نے انسانی ضروریات اور حوائج (ٹیلیفون) کے ذریعے کیے گئے بیع وشراء اور طلاق وغیرہ کو بھی اسی زمرہ میں شمار کیا ہے ، لہٰذا ٹیلیفون کے ذریعے اگر کسی چیز کے بارے میں باقاعدہ ایجاب وقبول ہو جائے تو یہ بیع شرعاً نافذ العمل ہوگی ۔

لما قال الشيخ محمد كامل ابن مصطفى الطرابلسيؒ : سئل بعد صلوٰة الجمعة حضر خبر الشام في التلغراف لبعض الثغور بانه ثبت في الشام روية هلال ..... فاجاب ان السلاطين المسلمين وضعوا التلغراف لتبليغ الاخبار من البلاد القريبة والبعيدة في مدة يسيرة جداً او قاموا لاعماله اشخاصاً مسلمين وانفقوا على ذلك اموالاً جسيمة واستغنوا به عن السعاة وارسال المكاتيب غالباً فصار قانوناً في ذلك يخاطب به السلاطين بعضهم لبعضهم في مهمات الامور وتبعهم الناس على ذالك ۔ (فتاوٰى الكاملية ص۲۸۵ مطلب هل يثبت رمضان بالتلغراف) [۱]

بالغ بیٹے کی غیر موجودگی میں اس کی جائیداد فروخت کرنا

سوال :۔ ایک شخص کا بالغ بیٹا ہے اور وہ کسی دور جگہ میں رہتا ہے، اس کی غیر موجودگی میں اور اجازت کے بغیر والد اس کی جائیداد فروخت کردے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے ؟

---

[۱] قال الدكتور الوهبة الزحيلي : البيع بالمراسلة او بواسطة رسول يصح اتفاقاً ويكون مجلس التعاقد هو مجلس بلوغ الرسالة من العاقد الاول الى العاقد الثاني ۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج۴ ص۵۰۳ ثانياً البيوع بسبب الصّيغة)

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے ہر انسان کو اپنی ملکیت میں خود مختار قرار دیا ہے جبکہ کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف اصل مالک کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بالغ بیٹا حاضر نہ ہو تو والد کی طرف سے اس کی فروخت کردہ جائیداد بیع فضولی کے زمرہ میں آکر بیٹے کی اجازت پر موقوف ہوگی۔

لما قال علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ: یبیع الاب عرض ابنہ الکبیر الغائب لا الحاضر اجماعاً لا عقارہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۹۱۳ مطلب فی نفقۃ قرابۃ غیر الولاد من الرحم المحرم) [۱]

جائیداد کی خرید و فروخت پر کمیشن لینے کی شرعی حیثیت

سوال: ایک آدمی نے "جائیداد کی خرید و فروخت کا با اعتماد ادارہ" کے نام سے ایک دفتر کھول رکھا ہے جہاں وہ زمین کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے اور اس پر وہ جانبین (یعنی خریدنے اور فروخت کرنے والے) سے دو فیصد کمیشن لیتا ہے، تو کیا اس طرح پر جانبین سے کمیشن لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے ایک ہی شخص کو بائع اور مشتری دونوں کی جانب سے وکالت کی ذمہ داری اپنانے کی اجازت نہیں دی ہے لیکن جانبین کی طرف سے دلال بن سکتا ہے۔ وکیل اور دلال میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وکیل کو مبیعہ میں جائز تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، جبکہ دلال کی ذمہ داری مال خریدنے کی طرف ترغیب دلانا ہوتی ہے' اور مبیعہ میں کسی قسم کے تصرف کا اس کو حق حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یہ شخص چونکہ دلال کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس لیے اس کو جانبین سے مناسب کمیشن لینا شرعاً ممنوع نہیں ہے، تاہم ایسے ادارے کو پہلے سے مناسب کمیشن کی وضاحت کر دینا ضروری ہے' تاکہ بعد میں جھگڑے اور کبیدہ خاطری کا سبب نہ بنے۔

---

[۱] قال العلامۃ عبد العلی البرجندیؒ: یجوز للاب ان یبیع عروض ولد الغائب ابناً کان او بنتاً و تصرف فی ثمنہ اذا کان من جنس نفقتہ ولا یجوز ان یبیع عقارہ لذلک۔ (البرجندی ج ۲ ص ۸۹ کتاب البیوع۔

ومثلہٗ فی آداب الاوصیا (علی ھامش جامع الفصولین ج ۲ ص ۱۲۳ فصل فی الاباق والکتابۃ والعتاق۔ الخ

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : فتجب الدلالة علی البائع او المشتری علیهما بحسب العرف۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۶ کتاب البیوع) [1]

بیع کے نفاذ کا دار و مدار سرکاری کاغذات میں اندراج پر موقوف نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین خریدی لیکن لاپرواہی سے حکومتی کاغذات میں اندراج (رجسٹری اور انتقال) کیے بغیر بطور زراعت اُسی آدمی کے حوالہ کر دی جس سے خریدی گئی تھی، اب کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ آدمی اس زمین پر قابض ہو گیا ہے کہ یہ زمین سرکاری کاغذات میں میری ملکیت ہے، تو کیا مشتری بغیر سرکاری کاغذات میں اندراج کے اس زمین کا مالک ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت نے بیع کے نفاذ کو سرکاری کاغذات میں اندراج پر موقوف نہیں رکھا ہے بلکہ نفاذِ بیع کے لیے جانبین کی رضامندی اور ایجاب وقبول کو ضروری قرار دیا ہے، لہٰذا سرکاری کاغذات میں اندراج نہ ہونے کے باوجود مذکورہ زمین کے جملہ حقوق مشتری کو حاصل ہوں گے اور اس پر بائع کا قبضہ غصب اور ظلم شمار ہو کر ناجائز اور حرام ہوگا۔

لما قال فی مجلة الاحکام : البیع ینعقد بایجاب وقبول۔

(مجلة الاحکام، المادة ۱۶۷، الفصل الاول فی ما یتعلق برکن البیع) [2]

حقِ مہر میں دی ہوئی زمین کا حقِ فروخت بھی زوجہ ہی کو حاصل ہے

سوال:۔ ایک شخص نے عقدِ نکاح کے وقت اپنی منکوحہ کو حقِ مہر میں کچھ زمین دیدی، اب یہ شخص حقِ مہر میں دی ہوئی زمین کو بلا اجازت زوجہ کے فروخت کرنا چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع خاوند کو

---

[1] قال المفتی محمد شفیع: اگر بائع یعنی مالک کی اجازت سے خود دلال مال کو فروخت کرے تو اس کی اجرت اولاً دلالی بائع کے ذمے ہے اور اگر محض کوشش کرنے والا ہے اور معاملہ کرنے والا ہے فروخت کرنے والا خود بائع ہے تو عرف اور رواج کا اعتبار رہوگا، رواج کے موافق جس کے ذمے دلالی ہوگی اس سے لینا جائز ہوگا۔ (امداد المفتیین الشہیر بفتاوٰی دار العلوم دیوبند ج۲ ص۸۲۵ کتاب الاجارۃ) ۔۔۔ ومثلہٗ فی تالیفات رشیدیہ ص۴۱۸ کتاب الاجارۃ۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : اما القول فالایجاب والقبول وهما رکنه ظاهرة ان الضمیر للایجاب والقبول۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۴ کتاب البیوع)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۵۸ کتاب البیع۔

یہ حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: حق مہر میں دی ہوئی زمین کے تمام تر مالکانہ حقوق بیوی کو حاصل ہو جاتے ہیں، بیوی کی اجازت کے بغیر شوہر کو تصرف کا حق نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ اس زمین میں شوہر کو ملکیت یا ولایت کا حق حاصل نہیں لہٰذا بلا اجازت زوجہ (بیوی) کے بیع نافذ العمل نہ ہوگی۔

وفی الهندیة: واما شرائط النفاذ فنوعان الملك اوالولایة والثانی ان لایکون فی المبیع حق لغیر البائع۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاوّل فی تعریف البیع۔۔۔الخ) [1]

درخت عقدِ بیع میں زمین کے تابع ہیں

سوال: ایک شخص نے کسی سے ایک قطعہ اراضی خریدا لیکن زمین کے کنارے پر واقع درختوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بعد میں دونوں کے درمیان ان درختوں پر اختلاف پیدا ہو گیا، تو کیا یہ درخت از روئے شرع بائع کا حق ہے یا مشتری کا؟

الجواب: زمین کے فروخت کرتے وقت اس میں مذکورہ اشیاء مثلاً درخت یا آبادی وغیرہ خود بخود عقدِ بیع میں شامل ہوں گے پس اس بناء پر صورت مسئولہ میں درخت بھی مشتری کا حق ہیں، البتہ اگر ان مذکورہ اشیاء کو عقدِ بیع کے وقت مستثنیٰ کر کے عقد کیا جائے تو اس وقت یہ اشیاء عقد میں شامل نہیں ہوں گی۔

لما قال العلامہ ابن نجیم رحمہ اللہ: ویدخل البناء والشجر فی بیع الارض بلا ذکر لکونه متصلاً بها للقرار فیدخل تبعًا۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۹۶ کتاب البیع، فصل: یدخل البناء والمفاتیح فی بیع الدار) [2]

---

[1] قال العلامة الکاسانی ؒ: ومنها وهو شرط انعقاد البیع للبایع ان یکون مملوکًا للبائع عند البیع فان لم یکن لاینعقد۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۶ کتاب البیوع، فصل: واما الذی یرجع الی المعقود علیه۔الخ)

ومثله فی فتح القدیر ج۵ ص۲۵۵ کتاب البیوع

[2] قال علی بن ابی بکر المرغینانی ؒ: ومن باع ارضًا دخل ما فیها من النخل والشجر وان لم یسمه لانه متصل بها للقرار فاشبه البناء۔ (الهدایة ج۳ ص۲۰ کتاب البیوع)

ومثله فی فتح القدیر ج۵ ص۴۸۵ کتاب البیوع،

مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا

سوال:- ایک مسجد کی آمدنی اور فنڈ فی الحال مسجد کی ضروریات سے زیادہ ہے، اس سے تجارت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کی آمدنی اور فنڈ دراصل مسجد کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے لیکن اگر فنڈ مسجد کی ضروریات اور استعمال سے زائد ہو تو اس رقم کو کسی قابلِ نفع تجارت میں لگا کر اس سے حاصل ہونے والے منافع کو مسجد کے فنڈ میں جمع کرنا ہوگا، اس طریقہ سے مسجد کی رقم سے تجارت کرنا جائز ہے بشرطیکہ چندہ دہندگان کی طرف سے اس تجارت کی اجازت ہو۔

لما قال فی الهندیة: متولی المسجد اذا اشتری بمال المسجد حانوتاً و داراً ثم باعها جاز اذا کانت له ولایة الشراء۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۱۷ الباب الخامس فی ولایة الوقف و تصرف القیم) [1]

رشوت کی رقم سے مقبرہ (قبرستان) کے لیے جگہ خریدنا

سوال:- رشوت کے ذریعہ حاصل شدہ مال سے مقبرہ کے لیے جگہ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- حصولِ مال کے لیے جائز طریقہ اور مخاطب کی رضا کو شریعتِ مقدسہ نے ضروری قرار دیا ہے، رشوت چونکہ ناجائز ذرائع سے حاصل کی جاتی ہے، لہٰذا اس کو اصل مالک یا ورثاء کو واپس کرنا ضروری ہے، رشوت کا مال چونکہ اصل مالک کی ملک سے نہیں نکلتا، اس بناء پر رشوت کی رقم سے مقبرہ (قبرستان) کے لیے جگہ خریدنا اور اس میں مسلمان میتوں کو دفنانا جائز نہیں، لہٰذا ایسے مال کے ورثاء یا اصل مالکوں کی موجودگی میں بغیر ان کی رضامندی کے اس رقم کو رفاہِ عامہ کے کاموں میں خرچ کرنے سے ذمہ داری فارغ

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: متولی المسجد اذا اشتری بمال المسجد حانوتاً و داراً ثم باعها جاز اذا کانت له ولایة الشراء وفی التجنیس فی الفتاوی قال الامام حسام الدین هذا هو المختار وفی الخانیة هو الصحیح۔

(التاتارخانیة ج۵ ص۸۶۲ کتاب الوقف، مسائل وقف المسجد و قیم المسجد)

وَمِثْلُهُ فی السراجیة علی هامش الخانیة ج۳ ص۱۴۲ کتاب الوقف۔

نہیں ہوگی ۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : لومات رجل وکسبہ من ثمن البازق والظلم واخذ الرشوۃ تعود الورثۃ ولا یأخذون منہ شیئاً وھو الاولیٰ لھم ویردونہ علیٰ اربابہ ان عرفوھم والا یتصدق لان سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذر الرد ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۲۰۱ فصل فی البیع) ؎۱

کرایہ کی دوکان یا مکان پر پیشگی رقم (پگڑی) لینے کی شرعی حیثیت

سوال :۔ بعض علاقوں میں دوکان یا مکان کرایہ پر لیتے وقت پیشگی رقم دینا ضروری ہوتا ہے اور یہ رقم کرایہ کے علاوہ ہوتی ہے جو کہ عرف میں پگڑی کہلاتی ہے، کیا یہ رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بسا اوقات ایک آدمی اپنا مکان یا دوکان ایک طویل مدت کے لیے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ دار سے کرایہ کے علاوہ کچھ رقم یکمشت بھی وصول کرتا ہے جو پگڑی کہلاتی ہے کرایہ دار یکمشت رقم دے کر اس بات کا حق دار ہو جاتا ہے کہ ایک طویل مدت یا تاحیات کرایہ داری کو جاری رکھے، بعض حالات میں وہ اپنا یہ حق کسی دوسرے کرایہ دار کو منتقل کر کے اُس سے یہ رقم لے سکتا ہے، اور اگر اصلی مالک دوکان یا مکان واپس لینا چاہے تو اُسے یہ رقم واپس کرنا ہوگی ۔

اس مروجہ پگڑی کے بارے میں علماء کرام نے عدم جواز کا قول فرمایا ہے کیونکہ یہ نہ تو نزول عن الحق ہے اور نہ اُجرتِ معجلہ ہے بلکہ یہ حقِ مجرد کی فروخت ہے جو کہ ناجائز ہے اور پیشگی کی رقم رشوت ہے جو کہ نصِ قطعی کی رُو سے حرام ہے، لہٰذا مروجہ پگڑی کی رسم شرع کے خلاف ہے ۔

البتہ اس یکمشت رقم کو ایک متعینہ مدت کی پیشگی اُجرت قرار دیا جائے اور متعینہ مدت تک

؎۱ قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : فی البزازیۃ اخذ مورثہ رشوۃً او ظلماً ان علم ذلک بعینہ لا یحل لہ اخذہ والا فلہ اخذہ حکماً اما فی الدیانۃ فیتصدق بہ بنیۃ ارضاء الخصماء ۔ (ردّ المحتار ج ۵ ص۹۹ مطلب فی من ورث مالا حراماً ۔

ومثلہٗ فی غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر ج۳ ص۲۰۴ کتاب الکراھیۃ ۔

کرایہ بھی ختم ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ اجارہ میں شمار ہوگا اور اجارہ کے تمام احکام اس پر جاری ہو کر اس قسم کی رقم کا لینا جائز ہے اور مروجہ رسم پگڑی ناجائز ہے۔

قال الدکتور وھبۃ الزحیلی: الحق المجرد او المحض ھو الذی لا یترك اثراً بالتنازل عنه صلحاً او ابراءً فلا یجوز الاعتیاض عنه کحق الولایۃ علی النفس والمال وحق الشفعۃ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۴ ص۲۱ الحقوق المجردۃ وغیر المجردۃ۔) [1]

دوسرے کے سودے پر سودا کرنا

سوال:۔ ایک آدمی کی کسی سے گھر خریدنے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ اسی دوران ایک تیسرے آدمی نے مداخلت کرکے زیادہ قیمت پر وہ مکان خرید لیا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بائع اور مشتری کی بات چیت کے دوران کسی اور کے لیے درمیان میں آکر قیمت بڑھانا مناسب نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے تاہم باقاعدہ ایجاب وقبول کی صورت میں بیع تام اور صحیح ہے اگرچہ ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال لا یبیع الرجل علی بیع اخیه ولا یخطب علی خطبۃ اخیه الا ان یاذن له وایضاً: عن ابی ھریرۃ ان نبی علیه السلام نھی ان یستام علی سوم اخیه۔ (الصحیح لمسلم ج۲ ص۳ باب: تحریم بیع الرجل علی بیع اخیه وسومه علی سومه) [2]

حرام مال سے خرید وفروخت کرنا

سوال:۔ رشوت، سود، جوا اور دیگر حرام طریقوں سے حاصل کی ہوئی رقم سے خرید وفروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ الحصکفی رحمه اللہ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع)

[2] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن النجش وعن السوم علی سوم غیرہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۶۹ فصل فیما یکرہ)
ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۹۹ فصل فیما یکرہ۔

الجواب:۔ رشوت، سود، جوا اور دیگر حرام ذرائع سے حاصل شدہ رقم کا ذاتی ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اس سے فراغتِ ذمّہ کے لیے ضروری ہے کہ اگر اصل مالک زندہ ہوں تو ان کو واپس کرکے ذمہ فارغ کرے ورنہ فقراء اور محتاجوں پر اصل مالکان کی طرف سے صدقہ کردے۔ اس بناء پر علم کے باوجود ان اشیاء کے عوض خرید وفروخت سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: والحاصل ان علم ارباب الاموال وجب ردہ علیھم والّا فان علم عین الحرام لایحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ وان کان مالاً مختلطاً مجتمعاً من الحرام ولا یعلم اربابہ ولا شئ منہ بعینہ حل لہٗ حکماً والاحسن دیانۃ التنزہ عنہ۔

(رد المحتار ج۵/۹۹ مطلب فی من ورث مالاً حراماً) [1]

حکومت کی طرف سے روزمرہ استعمال کی اشیاء کے نرخ مقرر کرنا

سوال: بسا اوقات کسی چیز کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے جبکہ حکومت ایک حد مقرر کرکے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگادیتی ہے، کیا حکومت کے لیے اس قسم کی پابندی لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت کی رُو سے کسی چیز کی خرید وفروخت بائع اور مشتری کی آپس میں رضامندی پر موقوف ہے خواہ وہ قیمت زیادہ ہو یا کم، بعض اشیاء کی کوالٹی میں تفاوت کی وجہ سے اُن کے نرخوں میں بھی تفاوت آجاتا ہے، اسلئے حکومت کو شرعاً یہ حق نہیں کہ کسی چیز کے نرخ متعین کرکے پابندی لگائے کیونکہ اس قسم کی پابندیوں سے عوام پر تکلیف کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں یہی لوگ اشیاء ضروریہ کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کرکے عوام کو پریشان کرتے ہیں اور لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لو مات رجل وکسبہ من ثمن البازق والظلم او اخذ الرشوۃ تعود الورثۃ ولا یاخذون منہ شیئاً وھو الاولیٰ لھم ویردونہ علیٰ اربابہ ان عرفوھم والّا یتصدق بہ لان سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذّر الرد۔

(البحر الرائق ج۸ ص۲۰۱ فصل فی البیع۔ کتاب الکراھیۃ)

ومِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۴ ص۲۰۵ کتاب الکراھیۃ۔

کم قیمت اشیاء مجبوراً مہنگے داموں خریدنا پڑتی ہیں جس سے ملک کی معیشت متاثر ہوسکتی ہے۔ تو اس صورتِ حال میں حکومت معاشیات اور اقتصادیات کے ماہرین سمجھدار لوگوں اور تاجروں کے مشورے سے اشیاء ضروریہ کی قیمتوں کا تعین کر کے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا سکتی ہے تاکہ عوام الناس پریشان نہ ہوں اور ملک کا سرمایہ دار طبقہ غریب لوگوں کی مجبوریوں ناجائز فائدہ نہ اٹھاسکے۔

قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: ولا يسعر حاكم الا اذا تعدى الارباب عن القيمة تعدياً فاحشاً بمشورة اهل الرأي۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۴۰۰ کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع) [1]

ڈالڈا گھی کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ اگر ڈالڈا گھی میں اس طرح صفائی پیدا کر دی جائے کہ وہ بالکل دیسی گھی کی طرح نظر آتا ہو تو کیا اس کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اصل میں دیسی اور ڈالڈا گھی کی قیمتوں میں کافی فرق ہوتا ہے؟

الجواب:۔ بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی سے ایسے گھی کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر ڈالڈا گھی کو دھوکہ اور فریب سے دیسی گھی ظاہر کر کے فروخت کیا جائے تو یہ تذویر اور تلبیس کے مترادف ہو کر ناجائز رہے گا۔

لما جاء في الحديث: عن ابي هريرة رضي الله تعالى عنه قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر۔
(صحیح مسلم ج۲ ص۲ کتاب البیوع۔ باب بطلان الحصاۃ۔ الخ) [2]

---

[1] قال العلامة عبد الله بن محمود الموصليؒ: ولا ينبغي للسلطان ان يسعر على الناس لما بينا قال الا ان يتعدى ارباب الطعام تعدياً فاحشا في القيمة فلا بأس بذلك بمشورة اهل الخبرة به لأن فيه صيانة حقوق المسلمين عن الضياع۔ (الاختيار لتعليل المختار ج۴ ص۱۶۱ كتاب الكراهية، فصل في الاحتكار)

[2] وفي الهندية: رجل اراد ان يبيع السلعة المعيبة وهو يعلم يجب ان يبينها۔
(الفتاوى الهندية ج۳ ص۲۱۰ الباب العشرون في البياعات المكروهة والارباح الفاسدة)
ومثله في ردّ المحتار ج۵ ص۱۰۲ مطلب احكام نقصان المبيع فاسداً۔

زیادہ منافع کیلئے ذخیرہ اندوزی کرنا

سوال :۔ گاؤں یا شہر کی ضرورت کے باوجود ایک شخص غلہ خرید کر ذخیرہ کر لیتا ہے تاکہ مناسب وقت پر فروخت کرکے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکے، تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ تنگی اور عسرت کے دنوں میں غلہ خرید کر مصنوعی گرانی پیدا کرنے کے لیے ذخیرہ کرنا احتکار ہے جو شرعاً حرام ہے، تاہم اگر عوام الناس کی ضروریات کھلی منڈی میں آسانی سے پوری ہوتی ہوں تو پھر کسی چیز کو زیادہ منافع کی خاطر مؤخر کرنا جائز ہے۔

لماورد فی الحدیث :عن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجالب مرزوق والمحتکر ملعون ۔ (ابن ماجہ ص۱۵۶ باب الحکرۃ)[1]

پنشن کی خرید و فروخت کا شرعی حکم

سوال :۔ آجکل ملازمت کے اختتام (ریٹائرمنٹ) پر سرکاری ملازمین کو حکومت کی طرف سے پنشن کے نام پر کچھ وظیفہ دیا جاتا ہے، اس وظیفے کا کچھ حصہ دوران ملازمت ملازم کی تنخواہ سے کاٹا جاتا ہے اور کچھ گورنمنٹ اپنی طرف سے ملاتی ہے، اس طرح یہ وظیفہ ریٹائر ہونے والے کو حکومت سے رفتہ رفتہ ملتا رہتا ہے، تو اگر اس وظیفہ کو فروخت کرکے یکمشت نقد رقم لے لی جائے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ یہ وظیفہ درحقیقت دوران ملازمت محنت اور خدمت کے صلہ میں بطور اعزاز و اکرام کے ملازمت سے ریٹائر ہونے والے کو حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے جس میں بعض حصہ عطاء سلطانی اور بعض اپنی محنت کا حصہ ہوتا ہے، اس کی فروخت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کرنا ہے اور ایک اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا ہے، تو حکومت کے علاوہ کسی اور پر فروخت کرنا چند خرابیوں کی وجہ سے مشروع نہیں کیونکہ اس میں اس رقم کو فروخت کیا جاتا ہے جو کہ ابھی اس کے قبضے میں آئی ہی نہیں اسلئے

---

[1] قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ : ویکرہ الاحتکار فی اقوات الآدمیین والبھائم اذا کان ذلک فی بلدٍ یضر الاحتکار باھلہ وکذلک التلقی فاما اذا کان لا یضر فلا بأس بہٖ ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۲۲ کتاب الکراھیۃ ، فصل فی البیع)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۹ کتاب الاستحسان ۔

غیر مقدور التسلیم ہونے کی بناء پر جائز نہیں' اسی لیے فقہاء کی عبارات اور احادیث نبوی میں اس قسم کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ثمنین کا آپس میں بیع کی وجہ سے دست بدست اور مثل بمثل ہونا ضروری ہے' جو کہ یہاں مفقود ہے۔ لہٰذا ان نقصانات اور خرابیوں کی وجہ سے اس (پنشن) کی بیع جائز نہیں۔ یہاں تک گورنمنٹ پر فروخت کرنا ہے تو یہ درحقیقت بیع نہیں بلکہ عطاء مؤجل کو معجل بنانا ہے اور وہ اس طرح کہ حکومت نے جو وظیفہ قسط وار حیثیت سے مقرر کیا تھا اب اس زیادہ وظیفہ کو نسبتاً کرکے یکمشت لیا جارہا ہے۔ یعنی پہلی صورت میں تاجیل تھی اور اس میں یکبارگی حاصل کرنا ہے جس میں شرعی طور پر کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبیع الدَّین لایجوز ولو باعہ من المدیون اَوْ وهبه جاز۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۱۴۱۔ القول فی الدَّین) [۱]

بیع میں اجل مجہول سے بیع فاسد ہو جاتی ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کے ساتھ معاملہ طے کیا کہ مجھ سے کچھ رقم لے لے اور اس کے بدلے آئندہ گندم کے موسم میں جو نرخ ہوگا اس کے مطابق مجھے گندم دے دینا، تو کیا یہ معاملہ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی معاملہ میں وقت کا تعین کرنا ضروری ہے' وقت کا تعین کیے بغیر معاملہ طے کرنا مفضی الی النزاع ہوتا ہے اس لیے شرعاً ایسے معاملات فاسد قرار دیئے جاتے ہیں۔ مذکورہ معاملہ بھی اسی قسم کا ہے' خواہ اسے بیع مطلق قرار دیا جائے یا بیع سلم، البتہ اگر یہ معاملہ قرض کا ہو تو پھر شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة ظفر احمد عثمانیؒ: وقد اجمعوا علی فساد السلم الی اجل مجهول ففساد البيع كذلك اولٰی کما مر۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۵ ابواب البیع۔ دلیل فساد البیع الی اجل مجهول) [۲]

---

[۱] قال العلامة الكاسانی رحمہ اللہ: وامابیع هذه الدیون من غیر من علیه والشراء بها من غیر من علیه فینظر ان اضاف البیع والشراء الی الدین لم یجز۔ اھ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۸۲ کتاب البیوع، فصل واما شرائط الصحة فانواع)

[۲] قال العلامة ابن عابدینؒ: رجل باع شیئاً بیعا جائزا اولخرج الثمن الی الحصاد اوالدیاس قال مفید البیع فی قول ابی حنیفة۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۶ کتاب البیوع) وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج۳ ص۱۷ کتاب البیوع۔

بغیر قیمت طے کی ہوئی بیع وشراء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بغیر قیمت طے کئے مکئی کی کچھ گڈریاں کسی پر فروخت کر دیں اور یہ کہا کہ ان کا سائز عام گڈی سے زیادہ ہے، لیکن چار مہینے کے بعد خریدار نے لینے سے انکار کر دیا، شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بیع وشراء کرتے وقت قیمت مقرر کرنا ضروری ہے، قیمت کا تعین کئے بغیر معاملہ فاسد ہو جاتا ہے لہٰذا مذکورہ معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے اس لیے یہ بیع فاسد ہے، دونوں کو چاہیئے کہ اس معاملے کو دوبارہ طے کریں۔

کما فی السنن الکبریٰ مع الجوهر النقی ج ۶ ص۲۴ تحت لا یجوز السلف حتی یکون بثمن معلوم الخ [1]

قبول کا ایجاب کے مطابق ہونا ضروری ہے

سوال:۔ ایک آدمی اپنے جملہ مال کو یکمشت فروخت کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرا آدمی وہ مال ادھار لینے کا خواہشمند ہے اور مشتری بائع سے بات بھی کر جاتا ہے مگر بائع اس پر راضی نہیں، تو کیا اس سے بیع تام ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ مشتری بائع کے ایجاب کے مطابق جواب دے یعنی بائع جتنا مال فروخت کرنا چاہتا ہو اتنے مال کے مطابق جواب دے، اگر مشتری بائع کے ایجاب سے زیادہ یا کم لینا چاہتا ہو تو وہ بائع کی رضامندی پر موقوف ہے، اگر وہ اجازت دے تو ٹھیک ورنہ بیع تام نہیں ہوگی۔

لما فی مجلة الاحکام: اذا اوجب احد العاقدین ببیع شیٔ بشیٔ یلزم لصحة العقد قبول العاقد الآخر علی الوجه المطابق للایجاب ولیس له تبعیض الثمن او الثمن وتفریقهما۔ (شرح المجلة الاحکام لرستم باز ص۸۱ المادة ۱۷۷ الفصل الثانی فی بیان لزوم موافقة القبول والایجاب)

---

[1] قال ابن الهمام رحمه الله: لقوله علیه السلام فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم الخ۔ (فتح القدیر ج ۶ ص۲۶۲ باب السلم۔
ومثله فی الهدایة ج ۳ ص۵۸ کتاب البیوع۔

باب مایجوز بیعه وما لا یجوز

(جائز اور ناجائز بیع کے مسائل و احکام)

شراب کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ اسلام میں شراب کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اسلام میں شراب بنص قطعی ناجائز اور حرام ہے۔ بلکہ اس عمل کو شیطانی عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ قال الله تبارك وتعالیٰ: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۹۰) اس لیے شراب کی خرید و فروخت حرام بلکہ بیع باطل ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

وفی الهندیة: فالباطل مالم یکن محله مالاً متقوماً کما لو اشتری خمرًا او خنزیرًا او صیدًا الحرم... الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص ۱۲۶ کتاب البیوع، الباب الحادی عشر فی احکام البیع لغیر الجائز) [۱]

شراب کی آمدنی کے عوض اشیاء فروخت کرنا

سوال :۔ ایک شخص جو کپڑے کا کاروبار کرتا ہے، اگر اس کو کسی گاہک کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ شراب کی آمدنی کے عوض کپڑا خرید رہا ہے تو اس گاہک پر کپڑا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ مسلمان کے لیے شراب فروشی کو ذریعۂ آمدن بنانا حرام اور ناجائز ہے اور نہ ہی اس آمدنی کے عوض دیگر اشیاء فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ شراب کی فروخت کے عوض آیا ہوا مال، مالِ غیر ہے مسلمان اُس کا مالک نہیں بن سکتا۔

لِمَا جَآءَ فِی الْحَدِیْثِ: ابو حنیفة عن محمد بن قیس الهمدانی عن ابی عامر الثقفی انه

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ: الباطل مالا یجوز بحال وله صور منها بیع الدم والخمر والخنزیر۔ (خلاصة الفتاوی ج ۳ ص ۴۹ کتاب البیوع، الفصل الرابع فی البیع الفاسد واحکامه)
ومِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۵۳ کتاب البیوع باب البیع الفاسد۔

كان يهدى للنبي صلى الله عليه وسلم رواية من خمر۔۔۔۔ فقال رسول عليه السلام يا ابا عامر ان الله تعالىٰ قد حرم الخمر فلا حاجة لنا فى خمرك قال خذها فبعها فاستعن بثمنها على حاجتك فقال يا ابا عامر ان الله تعالىٰ قد حرم شربها وبيعها واكل ثمنها

(المسند للامام الاعظم ص۲۷۳ باب حرمة اكل ثمن خمر)[1]

دارالحرب میں شراب فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ دارالحرب میں کفار کے ہاتھ شراب فروختی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالحرب میں غیر مسلموں کا مال بلا غدر و دھوکہ ان کی خوشی سے جس طرح بھی لیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں، لہٰذا ان کا مال مباح ہو کر عقودِ فاسدہ سے حاصل کرنا اور شراب کے عوض لینا جائز رہے گا، تاہم نصوص کی اطلاق کو دیکھ کر عقودِ فاسدہ اور شراب فروشی سے اجتناب افضل ہے۔

لما قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ:۔ ولا بين الحربي والمسلم ثمة اى لا ربوا بينهما فى دار الحرب عندهما خلافاً لابى يوسف وفى البناية وكذا اذا باع خمراً او خنزيراً او ميتة او قامرهم واخذ المال كل ذلك يحل له۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۳۵ باب الربا)[2]

شراب ملی ہوئی اشیاء کی خرید و فروخت

سوال: شراب ملی ہوئی اشیاء مثلاً ادویات وغیرہ کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں شراب چونکہ حرام اور نجس ہے اس لیے اس سے کسی قسم کا فائدہ لینا جائز نہیں، جس چیز میں شراب شامل ہو جائے وہ چیز حرام اور ناپاک ہو جاتی ہے اگرچہ قلیل مقدار میں کیوں

---

[1] قال المرغينانى رحمہ اللہ:۔ واذا باع المسلم خمراً واخذ ثمنها وعليه دين فانه يكره لصاحب الدين ان ياخذ منه وان كان البائع نصرانياً لا بأس به۔ (الهداية ج۴ ص۴۶۸ كتاب الكراهية)

وَمِثْلُهٗ فى بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۸ كتاب الاستحسان۔

[2] وفى الهندية: دخل مسلم او ذمى دار الحرب بامان او بغيره وعقد مع الحربى عقد الربوا۔۔۔۔ او باع منهم خمراً او خنزيراً او ميتة او دماً بمال فذلك كله جائز عند الطرفين۔

(الفتاوى الهندية ج۳ ص۲۴۸ الفصل السادس فى الصرف فى دار الحرب)

وَمِثْلُهٗ فى الدر المختار على صدر رد المحتار ج۵ ص۱۸۶ باب الربوٰ۔

نہ ہو۔ اس بناء پر جن ادویات اور دیگر اشیاء میں یقیناً یا ظنِ غالب سے معلوم ہو کہ ان میں شراب کی آمیزش ہے اور علاج کسی متبادل دوائی سے ممکن ہو تو ان کی خرید و فروخت اور استعمال سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما ورد فی الحدیث: فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا ابا عامر ان اللہ تعالیٰ قد حرم الخمر فلا حاجۃ لنا فی خمرك قال خذها فبعها فاستعن بثمنها علی حاجتك فقال یا ابا عامر ان اللہ تعالیٰ قد حرم شربها وبیعها واکل ثمنها۔ (المسند للامام الاعظم ص۳۴۳ کتاب البیوع)[1]

الکحل ملی ادویات کی تجارت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ الکحل ملی ہوئی ادویات کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ادویات میں ملایا گیا الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری اشیاء سے کشید کیا گیا ہو تو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک اس دوا کا استعمال ضرورتاً جائز ہے گا بشرطیکہ حدِ سکر تک نہ پہنچا ہو اور علاج کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے شیخینؒ کے مسلک پر عمل کرنا مرخص ہوگا، تاہم اگر الکحل انگور یا کھجور سے حاصل کیا گیا ہو تو ان دواؤں کا استعمال شدید ضرورت اور اضطرار کے علاوہ جائز نہیں۔ البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ الکحل دواؤں میں ملانے کے بعد اس کی حقیقت اور ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں اس کی حقیقت ختم ہو کر ان ادویات کا استعمال بالاتفاق جائز ہوگا، لیکن یہ مسئلہ ماہرینِ فنِ طب کی مدد سے ہی حل ہو سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ المفتی تقی عثمانی:۔ وبهذا یتبین حکم الکحول المسکرۃ التی عمت بها البلوی الیوم فانها تستعمل فی کثیر من الادویۃ والعطور والمرکبات الاخری فانها ان اتخذت من العنب او التمر فلا سبیل الی حلتها او طهارتها وان اتخذت من غیرهما فالامر فیها سهل علی مذهب ابی حنیفۃؒ ولا یحرم استعمالها للتداوی او لاغراض مباحۃ اخری ما لم تبلغ حد الاسکار لانها انما تستعمل مرکبۃ مع المواد الاخری ولا یحکم بنجاستها اخذا بقول ابی حنیفۃؒ۔ وان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویۃ والعطور وغیرها لا تتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیره۔ (تکملۃ فتح الملہم ۳/۶۰۸ کتاب الاشربہ) ۴۴/۶

---

[1] قال محمد بن الحسن الشیبانیؒ: محمد عن یعقوب عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ قال الخمر حرام قلیلها وکثیرها۔ (الجامع الصغیر ص۳۹۸ کتاب الاشربۃ۔

منشیات کی خرید و فروخت

سوال: افیون، چرس، بھنگ اور ہیروئن وغیرہ کی تجارت کا شریعتِ مقدسہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب: افیون، چرس، بھنگ اور ہیروئن نشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام ہیں لہٰذا حرام شے کی قیمت اور گناہ پر اعانت کی وجہ سے ان کی خرید و فروخت سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ ان اشیاء سے انسان کی دینی اور دنیوی بربادی لازم آتی ہے۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: وصح بیع غیر الخمر لما مر ومفادہ صحۃ بیع الحشیشۃ والافیون قلت وقد سئل عن بیع الحشیشۃ ہل یجوز فکتب لا یجوز فیحمل علیٰ انہ مرادہ بعدم الجواز عدم الحل قالہ المصنف۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج۶ ص۴۵۴ کتاب الاشربۃ)[1]

تمباکو کی خرید و فروخت

سوال: جناب مفتی صاحب! تمباکو کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: تمباکو کا استعمال از روئے شرع ممنوع نہیں لہٰذا استعمال کے مرخص ہونے کی بناء پر اس کی خرید و فروخت میں بھی کوئی قباحت نہیں جبکہ آجکل تمباکو فروشی ایک بہت بڑا ذریعہ معاش بن گیا ہے، غربت اور تنگی کے اس دور میں اس کا کاروبار کرنے میں کوئی شرعی جرم نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وبالجملۃ ان تثبت فی ہٰذا الدخان اضرارٌ صرف خالٍ من المنافع فیجوز الافتاء بتحریمہ ان لم یثبت انتفاعہ فالاصل حلہ مع ان فی الافتاء بحلہ دفع الحرج عن المسلمین فان اکثرہم مبتلون بتناولہ مع ان تحلیلہ ایسر من تحریمہ وما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرہما (تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ ج۲ ص۳۶۶ مسائل وفوائد شتی الخ)[2]

---

[1] قال العلامۃ الحداد الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشۃ والافیون وذٰلک کلہ حرام۔ (الجوہرۃ النیرۃ ج۲ ص۲۷۰ کتاب الاشربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۲۰۵ کتاب الاشربہ۔

[2] قال العلامۃ ابوالحسنات عبد الحی لکھنویؒ: فی رسالتہ رفع الالتباس فی حکم تعاطی بشجرۃ التمباکو اما بیعہا وشرائہا فیجوز لامکان الانتفاع بہا۔ (مجموعۃ الفتاوٰی ج۲ ص۱۲۷ کتاب البیع)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۶ ص۴۵۹ کتاب الاشربۃ۔

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی خرید وفروخت

سوال:۔ تلاوتِ قرآن مجید، دینی پروگرام اور خبریں وغیرہ سننے کی غرض سے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کا استعمال جائز امور میں ممکن ہے اس لیے ان کی خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں، تاہم یہ چیزیں کسی ایسے شخص کو دینا جس سے کسی خیر کی توقع نہ ہو بلکہ محض بے دینی کے امور میں استعمال کا یقین ہو تو تعاون علی المعصیت کے شبہ سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: قلت وافاد کلامهم ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریماً والا فتنزیهاً(قوله نهر) وعبارته وعرف بهذا انه لا یکره بیع ما لم تقم المعصیة به کبیع الجاریة المغنیة به والکبش النطوح۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۶۸ باب البغاة ... الخ)[1]

آلاتِ موسیقی کی خرید وفروخت

سوال:۔ باجا، ستار اور دیگر آلاتِ موسیقی کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موسیقی چونکہ اسلام میں ناجائز اور حرام ہے، اس لیے وہ آلات جو محض موسیقی کے لیے استعمال ہوتے ہوں اور بغیر کسی تغیر وتبدیلی کے ان سے موسیقی کا کام لیا جاتا ہو آلاتِ معاصی ہونے کی وجہ سے ان کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی کیونکہ اس میں اعانت علی المعصیت ہونے کی وجہ سے جواز کی گنجائش نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ویکره تحریماً بیع السلاح من اهل الفتنة لانه اعانة علی المعصیة...... قلت وافاد کلامهم ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریماً والا فتنزیهاً نهر ونظیره کراهة بیع المعازف لان المعصیة تقام بها۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۶۸ کتاب السیر)[2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه وما لا فلا ولذا قال انه لا یکره بیع الجاریة المغنیة والکبش النطوح۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۴۳ باب البغاة)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵۳ کتاب الاجارة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: نظیره بیع المزامیر یکره هنا ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه والا فلا۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۴۳ تبغییرٍ یسیر۔ آخر کتاب البغاة)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج۲ ص۱۵۳ کتاب الاجارة۔

گمراہ کن کتابوں کی تجارت کرنا

سوال :۔ آجکل بعض لوگ بے دینی، فحش گوئی، فرضی ناول شرک وبدعات اور دیگر جرائم پیشہ لوگوں کے حالات اور سوانح پر مشتمل کتابوں کی تجارت کرتے ہیں، کیا یہ تجارت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ شریعتِ مقدسہ نے مسلمانوں کو شرک وبدعت، فحش ناول اور لادینیت پھیلانے والی کتابوں کے مطالعہ سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دین سے دوری اور گمراہی کا سبب بنتی ہیں، لہٰذا ایسی کتابوں کے مطالعہ اور تجارت سے اجتناب ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ یہی تاجر لادینیت کا آلۂ کار اور معاون بن جادیں تاہم راسخ العلم علماء کے لیے جواب دہی کی نیت سے ایسی کتابوں کے مطالعہ کی گنجائش ہے تاکہ لوگوں کو ان کے مطالعہ سے منع کریں۔

لما قال العلامة محمود آلوسیؒ : واستدل بعضهم على القول بان لهو الحديث الكتب التي اشتريها النضر بن الحارث على حرمة مطالعة التواريخ الفرس القديمة وسماع ما فيها وقرأته وفيه بحث ولا يخفىٰ ان فيها من الكذب ما فيها فالاشتغال بها لغير غرض ديني خوض في الباطل ۔ (روح المعانی ج۷ ص۶۹ سورۃ المائدۃ) [1]

تعویذات کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال :۔ بعض لوگ تعویذات کی خرید وفروخت کا دھندہ اپنائے ہوئے ہوتے ہیں اور لوگوں سے تعویذات کے پیسے وصول کرتے ہیں، کیا تعویذات کے عوض پیسے لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ تعویذ چونکہ علاج ومعالجہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اس بناء پر جائز معاملات میں مشروع تعویذ کے عوض پیسے لینا اور دینا دونوں جائز ہیں۔ تاہم تعویذ فروشی کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا مناسب نہیں۔

لما اخرج الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ : عن ابی سعید الخدری ان ناساً من اصحاب النبیّ صلی الله علیه وسلم اتوا علی حی من احیاء العرب فلم یقروهم فبینما هم اذ لدغ

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : اذا اصاب المسلمون الغنائم وكان فيها اصابوا مصحف فيه شئ من كتب اليهود والنصارىٰ ..... فانه لا ينبغي للامام ان يقسم ذلك في غنائم المسلمين مخافة ان يقع في سهم رجل من المسلمين ..... وبيعه من المشركين مكروه ۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج ۵ ص۳۱۲ كتاب السير مسائل قسمة الغنائم)

سید اولئک هل معکم دواءٌ اوراق فقالوانعم انکم لا تقررون ولا نفعل حتیٰ تجعلوالنا جعلاً فجعلوالهم قطیعاً من الشاة فجعلوا یقرء بام القرآن و یجمع بزاقه ویتفل فبرأ فاتوا بالشاة فقالوالا ناخذه حتیٰ تسئال النبی علیه السلام فسئالوه فضحك وقال ما ادراك انها رقیة خذوها واضربوا لی بسهم ۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص۸۵۴ باب الرقی بفاتحة الکتاب ویذکر من ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم) ؎

اخبارات کی خرید وفروخت

سوال :۔ اخبارات میں اکثر تصاویر ہوتی ہیں نیز ایسی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا، کیا ایسے اخبارات کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اخبارات کی خرید وفروخت کا بنیادی مقصد ملکی اور غیر ملکی حالات وواقعات سے آگاہی حاصل کرنا ہوتا ہے، باقی رہا تصاویر کا مسئلہ تو اس کا گناہ بنانے والے پر بہرحال میں رہے گا۔ البتہ اگر اخبارات ورسائل وغیرہ شائع کرنے کا مقصد صرف فحاشی اور عریانی کو فروغ دینا ہو اور اس سے معاشرہ کے افراد کی عادات اور اخلاق متاثر ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں ان کی خرید وفروخت سے اجتناب ضروری ہوگا ۔

لما قال علی بن سلطان القاری رحمه الله : قال اصحابنا وغیرهم من العلماء تصویر صورة الحیوان حرام شدید التحریم ....وا ما اتخاذ المصور بحیوان فان کان معلقاً علیٰ حائطٍ سواء کان له ظل ام لا اوثوباً ملبوساً اوحمامة اونحوذلك فهوحرام واما الوسادة ونحوها مما

؎ قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : ولا بأس بالمعاوضات اذا کتب فیها القرآن ....اختلف فی الاستشفاء بالقرآن بان یقراء علی المریض والملدوغ الفاتحة اویکتب فی ورق ویعلق علیه اوطست ویغسل ویسقی وعن النبی علیه السلام انه کان یعوذ نفسه قال رضی الله عنه وعلی الجواز عمل الناس الیوم وبه وردت الآثار ۔

(ردالمحتار ج ۶ ص۳۶۴ فصلٌ فی اللبس)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المسلم للامام النوویؒ ج۲ ص۲۲۴ باب جواز اخذالاجرة علی الرقیة ۔

یمتھن فلیس بحرام۔ (المرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۸ ص۲۶۶ باب التصاویر)[1]

دوسرے ممالک سے مال خرید کر پہنچنے سے پہلے فروخت کرنا

سوال:۔ آجکل بڑے بڑے کاروباری لوگ دوسرے ممالک سے مال منگوا کر پہنچنے سے قبل ہی فروخت کر دیتے ہیں کیونکہ وہ مشتری کے نام پر خریدا ہوا مالِ تجارت مشتری کی ملک تصور کرتے ہیں، لہٰذا قبل القبض ان اشیاء کی فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: باقاعدہ طور پر قبضہ سے قبل مال فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں لیکن آجکل بڑے بڑے کاروباری لوگ دوسرے ممالک سے جو اشیاء منگواتے ہیں تو ان کے پہنچنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے جس میں بازار کی مندی کا اندیشہ ہوتا ہے اور گاہک کم ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے، لہٰذا ایسے مال کو فروخت کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں :۔

(۱) مال منگوانے والا گاہک کے ساتھ بیع کرنے کی بجائے بیع کا وعدہ کر لے کہ مال پہنچتے ہی آپ کے ہاتھوں اتنے داموں کے عوض فروخت کروں گا لہٰذا مال پہنچنے پر بیع درست ہوگی، البتہ اس صورت میں خلاف ورزی اگرچہ وعدہ خلافی ضرور ہے لیکن جانبین میں سے کسی ایک کے انکار کی صورت میں دوسرے کو بیع پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی کو یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا لیا جائے جو مال پہنچانے کا کاروبار کرتی ہو، اور مال پہنچانے کا کرایہ چونکہ خریدار پر ہوتا ہے اس لیے اس خریدار کے اذن اور اجازت سے بایع جس کو بھی حوالہ کر دے وہ مشتری کی ملک اور قبضہ تصور ہوگا، اگرچہ خریدار اور مشتری اس شخص یا مال بردار کمپنی کا تعین بھی نہ کرے، اس بنا پر جب بھی مال اُس شخص یا مال بردار کمپنی کی تحویل میں آجائے تو یہ خریدار اور مشتری کی ملک تصور ہو کر بیع

---

[1] قال العلامة فخر الدین الشھیر بقاضی خان : واذا سأل الرجل غیرہ الاخبار المحدثة فی البلد قال بعضھم یکرہ الاخبار والاستخبار وقال بعضھم لا یکرہ الاستخبار ویکرہ الاخبار والصحیح انہ لا بأس بالاخبار ایضاً لیکون عالماً بالمصالح۔ (خانیہ علی ہامش الہندیہ ج۳ ص۴۲۵)
ومثلہٗ فی الصحیح البخاری ج۱ ص۲۸۳ باب کم یجوز الخیار۔

جائز رہے گی۔

مندرجہ بالا دو صورتوں کے علاوہ قبل القبض مال فروخت کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ: رجل اشتری عبداً ولم یقبضہ فامرہ ان یہبہ من فلان ففعل البائع ذلک ودفعہ الی الموہوب لہ جازت الہبة و صار المشتری قابضاً وکذا لوامر البایع ان یواجرہ فلاناً معیّناً اوغیر معینٍ ففعل جاز وصار المستاجر قابضاً للمشتری اولاً ثم یصیر قابضاً لنفسہ والاجر الذی یاخذہ البایع من المستاجر یحسبہ من الثمن ان کان من جنسہ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۷ باب المرابحة والتولیة) [1]

کتے کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کتے کی خرید وفروخت ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جائز فائدے اور نفع کے لیے کتے کی خرید وفروخت کی اجازت دی ہے مثلاً شکار یا چوکیداری یا فصل وغیرہ کی حفاظت کی خاطر کتا خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً مرخص ہے۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ابو حنیفة عن الہیثم عن عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال رخّص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثمن کلب الصید۔

(المسند للامام الاعظم ص۲۱۹ باب الرخصة فی ثمن کلب الصید) [2]

---

[1] لما قال فی الہندیة: اذا قال المشتری للبایع ابعث الی ابنی واستاجر البایع رجلاً یحملہ الی ابنہ فہذا لیس بقبضٍ والاجر علی البایع الا ان یقول استاجر علیّ من یحملہ فقبض الاجیر یکون قبض المشتری ان صدقہ انہ استاجر ودفع الیہ وان انکر استئجارہ والدفع الیہ فالقول قولہ کذا فی التاتارخانیة۔

(الفتاوی الہندیة ج۳ ص۱۹ الباب الرابع فی حبس المبیع بالثمن)

ومثلہ فی ردّ المحتار ج۴ ص۱۴۹ مطلب فی تصرف البائع فی المبیع قبل القبض۔

[2] قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: یجوز بیع الکلب..... ولانہ ینتفع بہ حراسةً واصطیاداً فکان مالاً فیجوز بیعہ۔ (الہدایة ج۳ ص۱۰۳ مسائل منثورہ، کتاب البیوع)

ومثلہ فی ردّ المحتار ج۵ ص۲۲۷ باب المتفرقات، کتاب البیوع۔

پرندوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ پرندوں کو پکڑ کر فروخت کرتے ہیں، مثلاً چیل، باز، تیتر اور بٹیر وغیرہ پرندوں کو پکڑ کر خوب نفع کماتے ہیں، تو کیا از روئے شریعت یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت مقدسہ نے پرندوں کے شکار اور پکڑنے کو جائز قرار دیا ہے اور ان کی خرید وفروخت کی بھی اجازت دی ہے، اس معاملہ میں فریقین کی رضامندی سے جو بھی قیمت متعین کی جائے شرعاً مرخص ہوگی، تاہم آپس میں لڑانے کے لیے خرید وفروخت سے اجتناب کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وصح بيع الكلب..... وكذا الطيور اى الجوارح والفهد والبازى يقبلان التعليم فيجوز بيعها على كل حالٍ۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۲۲۷ باب المتفرقات، كتاب البيوع) [1]

خنزیر کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا اسلام میں خنزیر کی خرید وفروخت کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے چونکہ خنزیر کو نجس العین اور حرام قرار دیا ہے اور خنزیر سے ہر قسم کے انتفاع اور اس کی خرید وفروخت کو بھی ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، اس لیے کسی مسلمان کیلئے اسلامی نقطۂ نظر سے خنزیر کو ذریعۂ آمدن بنانا قطعاً زیبا نہیں، یہی وجہ ہے کہ شرعاً خنزیر جب عقد میں خواہ بیعہ ہو یا ثمن ہو تو عقد باطل ہے لہٰذا خنزیر کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ تاہم جب اسلامی ملک میں ذمی رہائش پذیر ہوں تو اُن کو آپس میں اس کی خرید وفروخت کی گنجائش موجود ہے۔

لما قال العلامة مرغینانیؒ: اذا كان احد العوضين او كلاهما محرّمًا فالبيع فاسد كالبيع بالميتة والدم والخمر والخنزير۔ (الهداية ج ۳ ص ۵۳ باب البيع الفاسد) [2]

---

[1] قال فى الهندية: وكذا بيع السمور وسباع الوحش والطير جائز عندنا معلمًا كان او لم يكن كذا فى الفتاوى قاضيخان۔ (الفتاوى الهندية ج ۳ ص ۱۱۴ الفصل الرابع فى بيع الحيوانات)

وَمِثْلُهٗ فى البرجندى ج ۳ ص ۱۴ كتاب البيوع۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيدؒ: ولو باع الخمر والخنزير كان باطلاً باعها من مسلم او مسلم۔ (خلاصة الفتاوى ج ۳ ص ۱۱ كتاب البيوع الباب الرابع فى البيع الفاسد واحكامه)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج ۳ ص ۱۲۶ كتاب البيوع الباب الحادى عشر فى احكام البيع الغير الجائز۔

مردار جانور کی کھال رنگنے کے بعد فروخت کرنا

سوال، مرے ہوئے غیر مذبوح جانور کی کھال نکال کر باقاعدہ طور پر رنگنے کے بعد فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے غیر مذبوح جانور سے انتفاع ممنوع قرار دیا ہے لیکن اس کی کھال کو باقاعدہ رنگنے یا خشک کرنے کے بعد فروخت کرنا جائز قرار دیا ہے ۔

لما ورد فی الحدیث: عن عبد اللہ بن عباسؓ اخبرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بشاۃ فقال ھلا استمتعتم باھابھا قالوا انھا میتۃ قال انما حرم اکلھا۔

(رواہ البخاری ج ۱ ص۲۹۶ باب جلود المیتۃ قبل ان تدبغ) ؎۲

مُردار جانور کی ہڈیاں فروخت کرنا

سوال:۔ مردار جانور جس کے کھانے سے شریعت نے منع فرمایا ہے، تو کیا ان کی ہڈیوں کو جمع کر کے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں جبکہ اس جانور کو باقاعدہ طور پر ذبح نہیں کیا گیا ہو؟

الجواب:۔ خنزیر کے علاوہ دیگر مردار جانوروں کی کھال رنگنے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں لیکن ہڈی، بال اور اُون کی خرید و فروخت شرعاً مرخص ہے کیونکہ کسی جانور کی موت کی وجہ سے اس کی یہ اشیاء ناپاک نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اگر جانور باقاعدہ مذبوح نہ بھی ہو تو اس کے ہڈی، بال اور اُون کی فروخت جائز اور مرخص ہے۔

لما قال المرغینانیؒ: ولا بأس ببیع عظام المیتۃ وعصبھا وصوفھا وقرنھا وشعرھا ووبرھا والانتفاع بذلک کلہ لانھا طاھرۃ لا یحلھا الموت لعدم الحیاۃ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۵۸ باب البیع الفاسد) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ الزیلعیؒ: وجلد المیتۃ قبل ان تدبغ یعنی لا یجوز بیعہ وبعدہ یباع وینتفع بہ ۔۔۔۔۔ یعنی بعد الدباغ یجوز بیعہ۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص۵۱ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص۵۵ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد۔

؎۲ قال العلامۃ الزیلعیؒ: وجلد المیتۃ قبل الدباغ وبعدہ یباع وینتفع بہ کعظم المیتۃ وعصبھا وصوفھا وقرنھا ووبرھا یعنی بعد الدباغ یجوز بیعہ کما یجوز بیع عظم المیتۃ۔

(تبیین الحقائق ج ۴ ص۵۱ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۲ ص۱۳۳ کتاب البیع فصل فی البیع الباطل۔

گندگی کھانے والے جانوروں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ بعض جانور مثلاً مرغی اور بکری وغیرہ گندگی اور بدبودار اشیاء کھانے کے عادی ہوتے ہیں. اگر ایسی اشیاء کھانے کی وجہ سے ان سے بدبو محسوس ہوتی ہو تو ایسی حالت میں ان کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ جانور گندگی کھانے کی وجہ سے بدبودار ہوگئے ہوں تو ایسی صورت میں ان کا کھانا اور خرید وفروخت مکروہ ہے تاہم اگر ان کو گندگی کھانے سے روک لیا جائے اور بدبو زائل ہونے تک بند رکھا جائے تو پھر ان کے کھانے اور خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: الجلالة التي تأكل العذرة كره لحمها وتحبس الجلالة حتى يذهب نتن لحمها وفي المنتقى الجلالة المكروهة التي اذا قربت وجدت منها رائحة فلا توكل ولا يشرب لبنها ولا يعمل عليها وتلك حالها ويكره بيعها وهبتها وتلك حالها۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۳۴۰ كتاب الحظر والاباحة)[1]

ریچھ کو ذبح کر کے روغن نکال کر فروخت کرنا

سوال:۔ ریچھ کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنے کے بعد اس کے گوشت سے روغن اور تیل نکالا جاتا ہے تاکہ جانوروں کو کھلا کر اُن کی قوت بڑھائی جاسکے، تو کیا اس طریقہ سے روغن نکال کر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باقاعدہ ذبح شرعی سے حرام جانور کا گوشت اور کھال وغیرہ پاک ہوجاتے ہیں، اس بناء پر اس کے گوشت وغیرہ سے روغن یا تیل نکال کر انسانوں کی خوراک کے علاوہ مویشیوں اور دیگر ضروریات کے لیے استعمال کرنا جائز ہے ایسی خرید وفروخت بھی جائز ہے

لما قال في الهندية: واما حكمها فطهارة المذبوح وحل اكله من الماكول

---

[1] قال ابن نجيمؒ: ولا تؤكل الجلالة ولا يشرب لبنها لانه عليه السلام نهى عن اكلها وشرب لبنها والجلالة التي تعتاد اكل الجيف ولا تخلط فيكون لحمها متناً ولوحبست حتى يزول النتن حلت۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۸۲ فصل في الاكل والشرب)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج۶ ص۳۰۸ الفصل الثاني عشر في الاجارات والمزارعات۔

وطهارة غير الماكول للانتفاع لا لجهة الاكل كذا في محيط السرخسي۔
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۸۲ کتاب المعاملة ۔الباب الثانی فی المتفرقات) لـه

قبل الدباغ مردار جانور کی کھال کی فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں مردار جانوروں کی کھال اتار کر رنگنے سے قبل ہی فروخت کر دی جاتی ہے، کیا ایسی کھال کا استعمال وفروخت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مردار جانور کے اجزاء سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا شرعاً ممنوع ہے، لہٰذا اُس کی کھال آتار کر دباغت (رنگنے) سے قبل فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے، تاہم کھال کو باقاعدہ دباغت کے بعد استعمال کرنے اور فروخت کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا بیع جلود المیتة قبل ان تدبغ لانهٗ غیر منتفع به ولا بأس ببیعها والانتفاع بها بعد الدباغ۔ (الهدایه ج۳ ص۵۸ باب البیع الفاسد) ٢ـه

جاندار اشیاء کے مجسموں کی خرید وفروخت

سوال:۔ اگر کھلونوں کو مرغ، بطخ، کبوتر اور دیگر جانوروں اور پرندوں کی شکل پر بنایا جائے تو کیا ایسے کھلونوں کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بلاضرورت تصویر کشی ازروئے شرع ممنوع عمل ہے اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانوروں اور پرندوں کی اشکال والے کھلونوں کی خرید وفروخت سے اجتناب کرے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک موقع پر اس سے منع کرتے ہوئے یوں فرمایا۔

لما ورد فی الحدیث: فقال ابن عباسؓ لا احدثك الا ما سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لـه قال فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: فجاز بیعه ولحوم السباع وشحومها وجلودها بعد الزکاة کجلود المیتة بعد الدباغ حتی یجوز بیعها والانتفاع بها فی غیر الاکل لطهارته بالزکاة۔

(تبیین الحقائق ج۴ ص۵۰ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۴۲ کتاب الاضحیة ۔

٢ـه قال ابن نجیم رحمه الله: (وجلد المیتة قبل الدبغ) ای لم یجز بیعه لانه غیر منتفع به ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۸۱ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۱۵ کتاب البیوع، الفصل الخامس فی بیع المحرم الصید... الخ

يقول سمعته يقول من صوّر صورة فان الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها ابدًا فربا الرجل ربوة شديدة واصفر وجهه فقال ويحك ان ابيت الا ان تصنع فعليك بهذا الشجر كل شئ ليس فيه روح -

(صحیح بخاری ج ۱ ص۲۹۶ باب بیع التصاویر التی لیس فیها روح وما یکرہ من ذلک) [۱]

مُرغیوں کو وزن کرکے فروخت کرنا

سوال :- زندہ مُرغیوں کو تول کر وزن کرکے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جاندار اشیاء عددی متفاوت ہونے کی وجہ سے وزناً یا پیمانے کے ذریعے فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ سانس لینے کی وجہ سے ان کے وزن میں گھٹنے بڑھنے کا احتمال ہوتا ہے جو کہ مفضی الی المنازعہ ہے، البتہ دورِ حاضر میں لوگ اس معمولی گھٹنے بڑھنے کو کوئی وقعت نہیں دیتے تو نزاع نہ ہونے کی صورت میں ایسی بیع جائز ہونی چاہیئے کیونکہ فی زمانہ عادات اس پر مبنی ہیں جبکہ ایامِ ماضیہ میں عادت کی وجہ سے ایسی بیع کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے -

لما قال المرغینانیؒ :لان الحیوان لا یوزن عادتًا ولا یمکن معرفة ثقله بالوزن لان یخفف نفسه مرة ویثقل اخریٰ - (الهدایة ج ۳ ص۸۴ کتاب البیوع - باب الربوٰ) [۲]

آزاد عورت کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :- بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ بہن یا بیٹی کی شادی کے وقت والد یا سرپرست مہر کے نام سے بہت سی رقم وصول کرکے خود استعمال کرتے ہیں جبکہ اس میں سے تھوڑا بہت جہیز میں بھی لگاتے ہیں، کیا اس طریقہ سے لیے ہوئے مال کا استعمال جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مہر میں مبالغہ بہتر نہیں بلکہ

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ : اذا ثبت کراهية لبسها للتختم ثبت کراهية بیعها وصنعها لما فیه من الاعانة علی ما یجوز وکل ما ادی الی ما لا یجوز لا یجوز - (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۶۰ فصل فی اللبس)

وَمِثْلُهٗ فی عمدة القاری ج ۲ ص۳۸ باب بیع التصاویر الخ

[۲] قال ابن الهمامؒ : وانما قلنا ان الحیوان لیس بموزون لانه لا یوزن عادةً فلیس فیه احد المقدرین الشرعیین الوزن او الکیل - (فتح القدیر ج ۶ ص۱۶۲ باب الربا - کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی العنایة علی هامش فتح القدیر ج ۶ ص۱۶۲ باب الربا -

متوسط درجہ کا ہونا چاہیئے اور مہر جس کے حق میں رکھا جائے تو وہ اسی کا حق ہوگا اُس کی اجازت کے بغیر کسی اور کو اس کے استعمال کا حق نہیں ۔ اور بعض علاقوں کا مذکورہ رواج آزاد عورت کی خرید و فروخت کے مترادف ہے جبکہ ظاہری طور پر اسے مہر کا نام دیا جاتا ہے لہٰذا یہ ناجائز و حرام ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله : وبطل بيع ماليس بمال کا لدم والميتة والحر (تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار ج۵ ص۵۲ باب البيع الفاسد)؎

خون کے جل کر راکھ ہو جانے پر اسکی تجارت کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! آجکل اکثر بڑے شہروں بلکہ بعض دیہاتوں میں بھی جانوروں کے خون کی تجارت عام ہے کہ مذبح خانوں سے خون جمع کر کے جلا لیا جاتا ہے اور اس کی راکھ کو فارمی مرغیوں کی خوراک تیار کرنے والی فیکٹریوں پر فروخت کر دیا جاتا ہے کیا اس طرح جانوروں کے خون کی تجارت کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب :۔ کسی جانور کا خون اگرچہ مال متقوم نہیں کہ اس کو فروخت کیا جائے لیکن بسا اوقات عرف کی وجہ سے ضرورت کے تحت ایک غیر مال بھی مال بن جاتا ہے اور فقہاء اسلام نے اس کی بیع کو جائز قرار دیا ہے مثلاً گوبر وغیرہ۔ تو صورتِ مسئولہ کے مطابق آجکل جانوروں کے خون سے چونکہ فارمی مرغیوں کی خوراک بنتی ہے اور ضرورت کے تحت عموماً اس کا کاروبار ہوتا ہے اسلئے بناء بر عرف اس کو مال سمجھا جائے گا۔ اور مذکورہ صورت میں تو وہ خون خون ہی نہیں رہتا بلکہ جل کر راکھ بن جاتا ہے اس لیے جلے ہوئے خون کی تجارت بلاشک و شبہ جائز ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: یہ بیوپار جائز ہے..... ان اقوال کا مقتضا یہ ہے کہ اگر کسی وقت خون کی قیمت بھی عرفاً ہو جائے تو اسکی بیع و شراء صحیح ہے اور خون کی راکھ تو پاک ہے اس کی بیع صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں۔ (امداد الاحکام جلد۳ ص۳۵۴،۳۵۵ کتاب البیوع)

خون کی خرید و فروخت کے احکام

سوال :۔ خون کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ خون چونکہ مالِ متقوم نہیں اسلئے شرعاً اس کے

؎ قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ : اذا كان احد العوضين او كلاهما محرماً فالبيع فاسد وكذا اذا كان غير مملوك كالحر۔ (الهداية ج۳ ص۵۳ كتاب البيوع، باب البيع الفاسد)

ومثله فی مجلة الاحكام المادة ص۲۱ الفصل الثانی فيما يجوز بيعه وما لا يجوز)

خرید و فروخت جائز نہیں، تاہم اگر کسی مریض کے لیے شدید ضرورت کے وقت بلاقیمت خون نہ ملتا ہو تو قیمت دے کر اس کے لیے خون خریدنا تداوی بالمحرم کی وجہ سے مرخص ہوگا لیکن خون دینے والے کیلئے قیمت لینا جائز نہیں تاکہ خون متاعِ بازار نہ بن جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: بطل بیع ما لیس بمالٍ ای لیس بمال فی سائر الادیان کالدم۔ (ردّ المحتار ج۵ ص۵۱ مطلب لبیع الموقوف من قسم الصحیح) [۱]

انسانی اعضاء کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض حالات میں کسی مریض کو آنکھ، گردہ یا اور کسی انسانی عضو کی ضرورت ہوتی ہے، تو کیا ان اعضاء کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ انسان کو مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ نے مکرم اور مشرف پیدا فرمایا ہے، اسی تکریم اور شرافت کے پیشِ نظر انسانی اعضاء کی خرید و فروخت جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں انسانی اعضاء متاعِ بازار بن کر اُن کی عظمت متاثر ہو کر اہانت لازم آئے گی، تاہم با امر مجبوری مرخص ہوسکتا ہے۔

لما قال العلامة کمال الدین ابن الھمامؒ: والانتفاع به لان الآدمی مکرم غیر مبتذل فلا یجوز ان یکون شیء من اجزائه مهانا ومبتذلا وفی بیعه اهانة له وکذا فی امتهانه بالانتفاع۔ (فتح القدیر ج۶ ص۶۳ باب البیع الفاسد) [۲]

جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرنا

سوال: جنگل سے لکڑیوں کو کاٹ کر فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جنگل اگر کسی قوم، قبیلے یا حکومت کی باقاعدہ مملوک اور ملکیت نہ ہو تو اس سے لکڑیاں وغیرہ جمع کر کے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے لیکن اگر جنگل کسی کی ملکیت ہو تو چونکہ اس میں

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: لم یجز بیع المیتة والدم لانعدام المالیة التی هی رکن البیع۔ (البحر الرائق ج۶ ص۷ باب البیع الفاسد)

ومثله فی تبیین الحقائق ج۴ ص۴۴ باب البیع الفاسد۔

[۲] قال العلامة الکاسانیؒ: والآدمی بجمیع اجزائه محترم مکرم ولیس من الکرامة والاحترام ابتذاله بالبیع والشراء۔ (البدائع والصنائع ج۵ ص۱۴۵ کتاب البیوع، فصل واما الذی یرجع الی المقصود....الخ)

ومثله فی ردّ المحتار ج۶ ص۳۷۲ فصل فی النظر والمس۔ کتاب الحظر والاباحة۔

دیگر شرکار کی حق تلفی کا اندیشہ ہے لہٰذا ان کی رضامندی کے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: والحطب فی ملك رجل لیس لاحد ان یحتطبه بغیر اذنه وان کان غیر ملكٍ فلا باس به ولا یضر نسبة الی قریةٍ اوجماعةٍ اوجماعةٍ مالم یعلم ان ذلك ملك لهم وکذلك الذنبخ والکبریت والثمار فی المروج والاودیة۔

(ر دالمحتار ج ۶ ص۴۴۲ فصل الشرب) [1]

قبرستان کے درخت کاٹنے سے قبل فروخت کرنا

سوال:۔ قبرستان کے درختوں کو کاٹنے سے قبل فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قبرستان کی زمین اگر باضابطہ طور پر وقف کی گئی ہو تو اس زمین کے درخت ذاتی استعمال میں نہیں لائے جا سکتے البتہ ان درختوں میں سے غیر پھلدار درخت قبل القلع فروخت کرنا جائز ہے اور پھلدار درختوں کو قبل القلع فروخت کرنا جائز نہیں، اور ان درختوں کو فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم کو قبرستان کی ضروریات میں خرچ کیا جائے گا، کسی شخص کو یہ رقم خود اپنے ضروریات میں خرچ کرنے کا اختیار نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: وفی الجامع وفی فتاوی ابن الفضل سئل عن اشجار موقوفة مع الارض ایجوز بیعها قال لایجوز قبل القلع کبیع الارض وبعد القلع یجوز۔ وقال ایضًا الاشجار الموقوفة اذا کانت غیر مثمرة یجوز بیعها قبل القلع لانها هی الغلة بعینها والمثمرة لم یجز بیعها الابعد القلع

---

[1] قال العلّامة سلیم رستم باز رحمه الله: الاشجار التی تنبت بلاغرس فی الجبال المباحة غیر المملوکة (ربعد ف یسیر) والقبر والزبیخ والفرزج صها لشجر فمن اخذ من هذه الاشیاء ضمن والحطب فی ملك رجلٍ لیس لاحدٍ ان لحتطبه بغیر اذنه وان کان فی غیر ملكٍ فلا باس به ولا تضر نسبته الی قریة اوجماعة مالم یعلم ان ذلك ملك لهم۔

{شرح المجلة تحت المادة ج۴۲ ص۱۲۴۳ الفصل الاول فی الاشیاء المباحة۔}

ومثله فی الجامع الفصولین ج۲ ص۲۶۶، ۲۶۷، الفصل الثامن والثلاثون فیما یمنع عنه مالا یمنع

کبناء الوقف و الباب لا یجوز بیعہ قبل الدفع ۔ (التاتارخانیۃ ج ۵ ص ۸۷۵ کتاب الوقف ، مسائل وقف الاشجار) [1]

خودرو گھاس کی خرید و فروخت کرنا

سوال :۔ اگر کسی کی مملوکہ زمین میں خودرو گھاس ہو تو اس کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ خودرو گھاس چاہے مملوکہ زمین میں کیوں نہ ہو کاٹنے سے قبل اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ، تاہم اگر خودرو گھاس کے لگانے اور حفاظت کرنے میں مالکِ زمین کی محنت بھی شامل ہو مثلاً اس کے اردگرد خندق یا کانٹے دار تار وغیرہ سے حفاظت کرے اور اس کو پانی وغیرہ دے تو اس محنت کی وجہ سے مالکِ زمین کے لیے اس خودرو گھاس کی خرید و فروخت جائز ہوگی ۔ بشرطیکہ اس گھاس کو کاٹ کر فروخت کی جائے ۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : عن رجلٍ من مہاجرین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال غزوت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثاً اسمعہ یقول المسلمین شرکاء فی ثلاث الماء والکلاء والنار ۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۶) [2]

اپنے مملوکہ درخت سے شہد فروخت کرنا

سوال :۔ اگر کسی شخص کی اپنی مملوکہ زمین میں درخت ہو اور اس میں شہد کی

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ ، وفی البزازیۃ وقال الفضلی و بیع الاشجار الموقوفۃ مع الارض لا یجوز قبل القلع کبیع الارض ۔ وقال ایضاً اذا لم تکن مثمرۃ یجوز بیعہا قبل القلع ۔ ایضاً لانہ غلتہا والثمرۃ لاتباع الا بعد القلع کبیع البناء الوقف بحر ۔

(تنقیح الفتاوٰی حامدیۃ ج ۱ ص ۱۱۱ فی مطلب بیع الاشجار الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۲ ص ۴۱۲ الباب الخامس فی ولایۃ الوقف وتصرف القیم ۔

[2] قال فی الہندیۃ : ولا یجوز بیع الکلاء واجارتہ وان کان فی ارض مملوکۃ غیر ان لصاحب الارض ان یمنع الدخول فی ارضہ ..... ھذا اذا نبت بنفسہ فاما اذا کان سقی الارض واعدھا للانبات فنبت ففی الذخیرۃ والمحیط والنوازل یجوز بیعہ لانہ ملکہ وھو مختار الشہید ۔

(الفتاوٰی الہندیۃ ج ۳ ص ۱۰۹ الفصل الثانی فی بیع الثمار وانزال الکروم والاوراق الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۷۷ باب البیع الفاسد ۔

مکھیاں شہد بنالیں تو اس شہد کی فروخت کا اختیار اس مالکِ زمین کو ہوگا یا ہر شخص اس کو کاٹ کر فروخت کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ اپنی مملوکہ زمین میں شہد کی فروخت اور دیگر مالکانہ تصرفات کا حق صرف زمین کے مالک کو حاصل ہے، کیونکہ شہد درخت کے تابع ہوکر درخت کے حکم میں ہے۔ اس بناء پر چونکہ درخت میں تصرف کا حق صرف مالکِ زمین کو حاصل ہے اس لیے شہد پر اختیار بھی اسی کو حاصل ہوگا لہٰذا کسی دوسرے شخص کو اس کی فروخت وغیرہ کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: بخلاف ما اذا عسل النحل فی ارضہ لانہ عدمن انزالہ فیملکہ تبعًا لارضہ کالشجر النابت فیہ والتراب المجتمع فی ارضہ بجریان الماء۔
(الھدایۃ ج۳ ص۱۰۶ مسائل منثورۃ۔ کتاب البیوع)[1]

خریدکردہ درخت کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا حکم

سوال: ایک شخص نے کسی سے چند درخت خریدے، کاٹتے وقت دونوں میں کچھ تیز گفتگو ہوئی کہ درختوں کو کہاں سے کاٹا جائے، مالکِ زمین اوپر سے کاٹنے پر مصر ہے جبکہ مشتری جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہے، کیا ازروئے شریعت اس میں کوئی حد مقرر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع وشراء کے وقت اگر درختوں کا سودا بلا کسی شرط کے ہوا ہو تو مشتری کیلئے درختوں کا جڑ سے اکھاڑنا جائز ہے، لیکن اگر سودا طے کرتے وقت سطح زمین سے کاٹنے کی شرط لگائی گئی ہو تو سطح زمین سے ہی کاٹنا ہوگا، اور اگر جڑ سے اکھاڑنے کی صورت میں قریبی کنوئیں یا دیوار وغیرہ کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو پھر جڑ سے اکھاڑنے کی بجائے سطح زمین سے کاٹنا ہوگا۔

لما قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وفیما اذا اشتری شجرۃ للقلع فانہ یومر بقلعھا بعروقھا ولیس لہ حفر الارض الی انتھاء العروق بل یقلعھا علی العادۃ الا ان شرط

---

[1] قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: بخلاف معسل النحل فی ارضہ حیث یملکہ وان لم تکن ارضہ معدۃ لذلک من انزال الارض حتی یملکہ تبعًا لھا کالاشجار النابتۃ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۷۸ باب المتفرقات۔ کتاب البیوع)
ومثلہ فی رد المحتار ج۵ ص۲۳۵ کتاب البیوع۔

للبایع القلع علیٰ وجه الارض اویکون فی القلع من الاصل مضرۃ علی البایع کما اذا کانت بقرب حائطٍ او بئرٍ لانه یقطعها علیٰ وجه الارض - (البحر الرائق ج۵ ص۲۹۶ کتاب البیع، فصل یدخل البناء والمفاتیح فی بیع الدار) [1]

باغ کے بعض پھل ظاہر ہوں جبکہ بعض ظاہر نہ ہوں ایسی حالت میں باغ کی فروخت کا حکم

سوال:- بعض لوگ باغ کے صرف بعض پھل ظاہر ہونے پر خریدار پر بیچ دیتے ہیں جبکہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ پھل کی مقدار کیا ہوگی یا مستقبل میں اس کی کیفیت کیا ہوسکتی ہے، اسی حالت میں اگر باغ فروخت کیا جائے تو شرعی نقطۂ نظر سے اس کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ ایسی حالت میں درخت میں ایسے پھل بھی ہوسکتے ہیں جن کا ابھی وجود نہیں ہوتا ہے؟

الجواب:- شرعی نقطۂ نظر سے کسی چیز کی فروخت کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مبیعہ عقد کے وقت موجود ہو تاکہ بائع مشتری کو سپرد کرکے اپنی ذمہ داری فارغ کرے۔ صورتِ مذکورہ میں جو پھل ظاہر ہو خواہ انسان کے کھانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا حیوانات کی، اس کی خرید وفروخت جائز ہے، لیکن اگر باغ فروخت کرتے وقت پھل ظاہر نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ ہے کہ پھل ابھی بالکل ظاہر نہ ہو تو یہ عقدِ بیع معدوم ہوکر ناجائز ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بعض پھل ظاہر ہو لیکن روز بروز باغ میں مزید پھل ظاہر ہوتا رہتا ہو، ایسی حالت میں اگر مالک موجودہ پھل فروخت کرے لیکن جو پھل ابھی ظاہر نہیں ہوئے تو ظاہر المذہب کی رُو سے اس کی بیع فاسد رہے گی۔

لیکن عمومِ بلویٰ اور ضرورت کو دیکھ کر علماء کرام نے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اور جو پھل ابھی پیدا ہو رہے ہوں تو اس کے لیے باغ کے اجارہ کے عوض مشتری کے لیے

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: اشتریٰ شجرۃ للقلع یومر بقلعها بعروقها ولیس له حفر الارض الیٰ انتهاء العروق بل یقلعها علی العادۃ الاان شرط البائع القطع علیٰ وجه الارض اویکون فی القلع من الاصل مضرۃ للبایع لکونها بقرب حائطٍ او بئرٍ فیقطعها علیٰ وجه الارض -

(رد المحتار ج۴ ص۵۵۵ مطلب فی بیع الثمر والزرع والشجر مقصودًا)

ومثلهٗ فی الهندیة ج۳ ص۳۵ کتاب البیوع، الفصل الثانی -

بھاری حصّہ مقرر کرکے بائع کو مثلاً ہزارواں حصّہ دینے کے حیلہ کا سہارا لے کر معاملہ جائز نہ ہے گا۔

لما قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ : والحیلۃ ان یأخذ الشجرۃ معاملۃً علیٰ ان لہٗ جزءً من الف جزءٍ وفی الزرع والحشیش یشتری الموجود ببعض الثمن ویستأجر الارض مُدّۃً معلومۃ یعلم فیھا الادراک بباقی الثمن وفی الاشجار الموجود ویحل لہ البائع مایوجد فان خاف ان یرجع یقول علیٰ انّی متی رجعت فی الاذن تکون ماذوناً فی الترک بمثلی ملخصاً۔ (الدّرالمختار مع ردّالمحتار ج۴ ص۵۵۸ کتاب البیوع) [1]

پکنے تک کی شرط لگاکر کچی فصل خریدنا

سوال :۔ گندم یا جَو کی کچی فصل پکنے تک چھوڑنے کی شرط سے خریدی جائے اور پکنے پر کاٹی جائے تو کیا یہ بیع شرعاً درست ہوگی یا نہیں؟ اور جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ گندم، جَو یا دیگر فصلوں کو اس شرط سے خریدنا کہ پکنے پر کاٹوں گا تو یہ صورت ناجائز ہے، البتہ فقہاء نے جواز کی ایک صورت ذکر کی ہے کہ فصل کو مستقل طور پر قیمتاً خرید کر ایک خاص مدت کے لیے زمین اجارہ پر لی جائے اور معینہ مدت کے اندر فصل کو کاٹ لیا جائے تو اس صورت میں مذکورہ بیع اور پکنے تک فصل کا باقی رکھنا صحیح ہوگا۔

لما قال طاھر بن عبدالرشید البخاری رحمہ اللہ : وان کان البیع بشرط الترک لایجوز۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع۔ الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ ...الخ) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن الھمامؒ : وفی ثمار الاشجار یشتری الموجود ویحل لہ البائع مایوجد فان خاف ان یرجع یفعل فی الاذن فی ترک الثمر علی الشجر وھو ان یأذن المشتری علیٰ انہٗ متی رجع من الاذن کان ماذوناً فی الترک باذنٍ جدیدٍ فیجعلہ علیٰ مثل ھٰذا الشرط۔

(فتح القدیر ج۵ ص۴۹۲ کتاب البیوع)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع الفصل الثالث فیما یجوز بیعہ ..الخ۔

[2] قال طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ : ولو اراد ان یترک فی الارض ویکون لہ الولایۃ الشرعیۃ فالحیلۃ ان یشتری الحشیش واشجار البطیخ ببعض الثمن ویستاجر الارض ببعض الثمن من صاحب الارض ایاماً معلوماً۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ ومالایجوز)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۳ ص۳۳ کتاب البیوع۔ الفصل الثانی فیما یدخل فی بیع الاراضی، الخ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے خرید و فروخت کرنا

سوال:۔ ایک چیز کی قیمت ایک ہزار روپے ہے، بیس آدمیوں نے آپس میں ۵۰/۵۰ روپے جمع کر کے یہ فیصلہ کیا کہ قرعہ اندازی کر کے جس کے نام پر یہ چیز نکل آئے تو یہ اس کو دی جائے گی اور باقیماندہ افراد محروم رہ جائیں گے، کیا یہ طریقہ تجارت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ میں خرید و فروخت کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں اُن کے فقدان کی وجہ سے ایسی بیع جائز نہیں، صورتِ مذکورہ میں ایک ممنوع امر یہ ہے کہ اگر نام نکل آئے تو اس کو مبیعہ دیا جائے گا ورنہ نہیں جو کہ شرط فاسد ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ہر ایک ممبر اپنا نام نکلنے کا متمنی ہوتا ہے لیکن پتہ نہیں کہ نکلے یا نہیں، تو گویا بیع علیٰ خطر الوجود ہونے کی وجہ سے قمار لازم آتا ہے جو کہ بنصِ قرآنی ممنوع ہے اس بناء پر مذکورہ معاملہ شرط فاسد اور قمار کی وجہ سے جائز نہیں۔

لما قال اللہ تعالیٰ: يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰) [1]

تجارتی لائسنس (پرمٹ) کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ایک شخص کے پاس حکومت کی طرف سے جاری کردہ تحریری سرٹیفکیٹ کی صورت میں ایک تجارتی لائسنس (پرمٹ) ہے تاکہ درآمد برآمد کے وقت کوئی اعتراض نہ کرے، اب وہ شخص اس اجازت نامہ کو فروخت کرنا چاہتا ہے، یہ لائسنس چونکہ کاغذ کی شکل میں ہوتا ہے تو کیا اس کی فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عصر حاضر میں اکثر ممالک نے تاجروں پر لائسنس کے بغیر درآمد برآمد کی پابندی لگائی ہوئی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ لائسنس ایک مادی چیز نہیں بلکہ دوسرے ممالک کو مال دینے یا لینے کا دوسرا نام ہے اور اس لائسنس کے حصول کیلئے چونکہ وقت، کوشش اور

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ماکان مبادلۃ مالٍ بمالٍ یفسد بالشرائط الفاسد ویبطل تعلیقہ۔ ایضاً لدخولہ فی التملیکات لانہا اعم۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۲۴۰ مایبطل بالشرط الفاسد ولا یصح تعلیقہ بہ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۱۷۹ باب المتفرقات۔ کتاب البیوع۔

مال صرف کرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر حاملِ لائسنس کو تحریری سرٹیفکیٹ کے ذریعے قانونی پوزیشن حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ مختلف قسم کی سہولیات کا حقدار ہو جاتا ہے اور بغیر لائسنس کے مال درآمد برآمد کرنا قانوناً جرم ہوتا ہے اور اس کے مرتکب شخص کو سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے، اس لیے یہ لائسنس بڑا قیمتی ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے کروڑوں روپے کی تجارت ممکن ہوتی ہے۔ تو اس طرح تجارتی لائسنس کے ساتھ اموال والا معاملہ کیا جا سکتا ہے چونکہ حاملِ لائسنس کو یہ حق اصالتاً ثابت ہے تو اگر وہ عوض لے کر اپنے حق سے دستبردار ہو کر کسی دوسرے کے نام منتقل کر دے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مال کے بدلے اپنے وظائف اور حقوق سے دستبرداری شرعاً مرخص ہے، البتہ اگر لائسنس کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کا ہو جس کی کسی دوسرے فرد یا کمپنی کو انتقال کی بالکل قانوناً اجازت نہ ہو، تو چونکہ ایسے لائسنس کو کسی دوسرے کے نام منتقل کرنے کی صورت میں جھوٹ، دھوکہ اور فریب لازم آتا ہے لہٰذا یہ بیع ناجائز ہوگی۔

قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله : ولا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالاوقاف وفيها في آخر بحث تعارض العرف مع اللغة المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لكن افتى كثير باعتباره وعليه فيفتي بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ - (الدر المختار ج۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع) [۱]

اِنعامی بانڈز کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- آجکل حکومت نے انعامی بانڈز کے نام سے ایک کاروبار شروع کیا ہوا ہے جو کہ مختلف مالیت کے بانڈز کی شکل میں ہے، طریقۂ کار اس کا یہ ہوتا ہے کہ بانڈ حاصل کرنے کے ہر ماہ بعد قرعہ اندازی کی جاتی ہے، قرعہ اندازی میں جو نمبر نکلتے ہیں اُن کے حاملین کو زیادہ رقم دی جاتی

---

[۱] قال العلامة خالد الاتاسيؒ : اقول وعلى ما ذكروه من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغي ان يجوز الاعتياض عن التعلي وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال .... كما جاز النزول عن الوظائف و نحوها لا سيما اذا كان صاحب حق التعلي فقيرًا قد عجز عن اعادة علوه فلو لم يجز ذلك له على الوجه الذي ذكرناه يتضرر فليتامل و ليحرر - (شرح مجلة الاحكام - المادة ۲۱۶ ج۲ ص۱۲۱ الفصل الثاني في بيع ما يجوز و ما لا يجوز) ومثله في فقهي مقالات ج ۱ ص۱۹ بيع حقوق المجردة -

ہے اور باقی تمام ممبران زیادہ رقم سے محروم ہو کر اپنی جمع شدہ رقم چھوڑنے یا واپس لینے کے مجاز ہوتے ہیں، تو کیا اس طرح انعامی بانڈز کی خرید و فروخت اور اس کے ذریعے حاصل شدہ رقم کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مذکورہ کاروبار دو وجوہات کی بناء پر مشروع نہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس میں ربوا پائی جاتی ہے اور اعانت علی الربوا بھی ہے کیونکہ حکومت ان ممبروں سے حاصل ہونے والی رقم کو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک مختلف قسم کے سودی معاملات میں استعمال کرتی ہے جو کہ حکومت کے ساتھ سودی معاملات میں تعاون ہے اور مختلف افراد سے جمع ہونے والی رقم کا فائدہ صرف مخصوص افراد حاصل کرتے اور باقیماندہ ممبران محروم ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ تمام ممبر اپنی اپنی رقم کے عوض میں زیادہ رقم کے متمنی ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کا حصہ علی خطر الوجود ہوتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انعام حاصل ہوتا ہے یا نہیں، لہٰذا یہ قمار کی صورت ہے۔

اس لیے ان وجوہات کی بناء پر مذکورہ کاروبار سود اور قمار کی وجہ سے ناجائز ہے اور چونکہ یہ دونوں نصِ قرآنی کی رُو سے ناجائز اور حرام ہیں، لہٰذا یہ کاروبار اور اس کے ذریعے ملنے والی رقم کسی بھی مسلمان کی شایانِ شان نہیں۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰) [1]

غیر ملکی ویزا کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کو اس کے بھائی نے سعودی عرب کا ویزا بھیجا ہے، بعض وجوہات کی بناء پر وہ خود سعودی عرب نہیں جا سکتا اور ویزہ کسی دوسرے شخص پر پچاس ہزار روپے کے عوض فروخت کرنا چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس شخص کے لیے ویزا فروخت کر کے رقم حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: موجودہ دور میں بیشتر ممالک اپنے ملک میں کسی غیر ملکی کو بغیر ویزا کے داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ایک قانونی جرم قرار دیا ہے، جبکہ ویزا بذاتِ خود کوئی مادی چیز تو ہے نہیں

---

[1] لما ورد فی الحدیث: عن جابرٍ قال لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ و شاہدیہ وقال ھم سواء۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۲۴۴ کتاب الربوا)

بلکہ کسی دوسرے ملک میں داخل ہونے اور وہاں ایک متعین وقت تک رہنے کا تحریری اجازت نامہ ہے جس کی رُو سے حاملِ ویزا کو مناسب سہولیات بھی حاصل ہوتی ہیں جبکہ بغیر ویزہ کے داخلہ ممنوع ہوتا ہے، چونکہ کسی ملک کے ویزا کے حصول کے لیے کافی وقت اور مال لگایا جاتا ہے اور حاملِ ویزہ کو چونکہ وہاں داخلے اور رہنے کا حق اصالتًا حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا اگر وہ اپنے حق اور وظیفہ سے دستبردار ہو کر ویزہ کسی دوسرے کے نام فروخت کرے تو شرعًا اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مناسب عوض لے کر کسی کو اپنا حق اور وظیفہ چھوڑنا فقہاء نے مرخص قرار دیا ہے لہٰذا ویزہ فروخت کر کے رقم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة كحق شفعة وعلیٰ هذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیها فی اٰخر بحث تعارض العرف مع اللغة المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لكن افتی كثیر باعتباره وعلیه فیفتیٰ بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۵۱۹ کتاب البیوع) [1]

انتخابات کے دوران ووٹ کی خرید و فروخت کا مسئلہ

سوال:۔ بعض علاقوں میں انتخابات کے وقت لوگ اُمیدواروں سے بھاری رقم لے کر اپنا ووٹ اس کے حق میں استعمال کرتے ہیں، تو کیا ووٹ کے عوض رقم لینا شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ووٹ جس کے حق میں استعمال کیا جاتا ہے وہ اس کے حق میں ملک و ملت کی خیر خواہی کی شہادت ہے، اور ووٹ ایک قسم کی سفارش ہے کہ امیدوار کے لیے متعلقہ عہدے کی سفارش کر رہا ہے، ووٹ ایک قسم کا مشورہ ہے کہ یہی امیدوار اس عہدے کا مستحق ہے، لہٰذا ووٹ کی مذکورہ بالا حیثیتوں سے یہ بات عیاں ہے کہ ووٹ مالِ متقوم نہیں، اور کسی بھی چیز کی

---

[1] قال العلامة خالد الاتاسیؒ: اقول وعلیٰ ما ذكروه من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال.... كما جاز النزول عن الوظائف و نحوها لا سیما اذا كان صاحب حق العلو فقیراً قد عجز عن اعادة علوه فلو لم یجز ذلك له علیٰ الوجه الذی ذكرناه یتضرر فلیتامل و لیحرر۔ (شرح مجلة الاحكام المادة ۲ ص ۱۲۱/۱۲ الفصل الثانی فی بیع ما یجوز وما لا یجوز) ومثله فی فقهی مقالات ج ۱ ص ۱۹ بیع حقوق المجردة۔

خرید و فروخت کے لیے اسی چیز کا مالِ متقوم ہونا ضروری ہے، لہٰذا ووٹ کے بدلے رقم حاصل کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ۔

لما قال الدکتور وهبة الزحیلی : اتفق الفقهاء علی صحة البیع اذا کان المعقود علیه مالاً متقوماً محرزاً موجوداً مقدوراً علی تسلیمه معلوماً للعاقدین لم یتعلق به حق الغیر۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۴ ص۵۰۲ کتاب البیوع ۔ ثالثاً البیوع المنوعة بسبب المعقود علیه الخ) [1]

ٹریڈ مارک کی خرید و فروخت

سوال :۔ بعض کمپنیوں اور اداروں کی اپنی تجارتی علامت ہوتی ہے جو کہ حکومت کی طرف سے رجسٹرڈ ہوتی ہے اور اُسے گاہک کو رغبت اور تیزی دلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیا اس کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب : کسی کمپنی کی مصنوعات پر تجارتی علامت یا ٹریڈ مارک رغبت یا بے رغبتی کا سبب ہوتی ہے اس لیے تاجروں کی نظر میں اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے چونکہ موجودہ دور میں التباس اور دھوکہ بازی عام ہونے کی وجہ سے حکومتوں کی جانب سے ان ٹریڈ مارکوں کی رجسٹریشن ہونے لگی اور ایک تاجر کے لیے دوسرے تاجر کا ٹریڈ مارک کا استعمال قانونی طور پر جرم قرار دیا گیا ہے اس لیے تاجروں کی نظر میں اس کی قیمت گویا مادی بن گئی ہے اور تاجر اسے مہنگے داموں بیچنے اور خریدنے لگے ہیں اور ٹریڈ مارک کو تحریری سرٹیفکیٹ کی شکل دی گئی ہے۔ یہ تو ایک حق مجرد ہے لیکن اس کے حصول کے لیے چونکہ بے تحاشا مال صرف کیا جاتا ہے گویا کہ وہ تاجر کے لیے ایک ثابت حق بن جاتی ہے جو کہ اس کے لیے اصالتاً ثابت ہے۔ تو فقہاء کی تصریحات کے مطابق عوض لے کر اپنا حق اور وظیفہ چھوڑنا مرخص ہے، لہٰذا ٹریڈ مارک کی فروخت میں کوئی حرج نہیں ، البتہ یہ ضروری ہے کہ ٹریڈ مارک رجسٹرڈ ہو کیونکہ رجسٹریشن کے بغیر یہ علامت قابلِ قبول نہیں ہوتی ۔ اور دوسرا یہ کہ عوام پر دھوکہ اور التباس نہ ہو کہ خود

---

[1] قال العلامة الشیخ عبدالرحمن الجزائریؒ : ومنها ان یکون المبیع مملوکاً للبائع حال البیع ..... وان یکون مقدوراً علی تسلیمه فلا ینعقد بیع المغصوب...... ومنها ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعة فبیع المجهول جهالة تفضی الی المنازعة غیر صحیح ۔ (کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة ج۲ ص۱۶۳ کتاب البیع الرکن الثالث ۔ المعقود علیه) ۔

استعمال کرتا ہے اور اس سے بھی رقم حاصل کرے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: فی الاشباہ لایجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ وعلیٰ ھذا لایجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیھا فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغۃ المذھب عدم الاعتبار بالعرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبارہ وعلیہ فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۸، ۵۱۹ کتاب البیوع) [۱]

بیع بذریعہ نیلام عام

سوال: آجکل بیع وشراء کا یہ طریقہ رائج ہے کہ کسی چیز کو منڈی اور مارکیٹ میں رکھ کر لوگوں میں خریدنے کا اعلان ہوتا ہے، خریدار اپنا اپنا نرخ لگا کر مبیعہ خریدنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں لیکن جو خریدار زیادہ قیمت بتائے تو وہ مبیعہ اس کے حوالے کیا جاتا ہے، کیا خرید وفروخت کا یہ طریقہ اپنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی ایک خریدار سے باقاعدہ معاہدہ ہوئے بغیر یونہی متعدد خریداروں کی رائے معلوم کرکے سب سے زیادہ قیمت دینے والے سے ایجاب وقبول کرنا جائز ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بیع من یزید کہا جاتا ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے لیے چند اشیاء فروخت کرنے میں یہ طریقہ اپنایا تھا۔

لما جاء فی الحدیث: عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باع حلساً وقدحا وقال من یشتری ھذا الحلس والقدح فقال رجل اخذتھما بدرھم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یزید علی درھم فاعطاہ رجلٌ درھمین فباعھما منہ۔
(ترمذی ج۱ ص۲۳۱ باب ما جاء فی بیع من یزید۔ کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ خالد الاتاسیؒ: اقول وعلیٰ ما ذکرہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال.... کما جاز النزول عن الوظائف ونحوھا لا سیما اذا کان صاحب حق العلو فقیراً قد عجز عن اعادۃ علوہ فلو لم یجز ذلک لہ علیٰ الوجہ الذی ذکرناہ یتضرر فلیتامل ولیحرر۔ (شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۲ ص۱۲۱/ ۱۲۰ الفصل الثانی فی بیع ما یجوز وما لا یجوز)

وَمِثْلُہٗ فی فقھی مقالات ج۱ ص۱۹ بیع حقوق المجردۃ۔

[۲] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا بأس ببیع من یزید (..........) لانہ بیع الفقراء والحاجۃ ماسۃ الیہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۴۹ کتاب البیوع۔ فصل فیما یکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۵ ص۱۰۲ مطلب احکام نقصان المبیع فاسداً۔

سرکاری کاغذات میں جعلسازی سے خود کو مالک ظاہر کر کے کسی کی زمین فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین دوسرے شخص کے پاس بطور رہن رکھی تھی لیکن اُس نے سرکاری کاغذات میں دھوکہ اور جعلسازی سے اس زمین کا انتقال اپنے نام پر کرالیا، سرکاری کاغذات میں ردّو بدل کی وجہ سے اب یہ شخص اس زمین کو فروخت کرے تو کیا یہ بیع شرعاً جائز ہوگی؟

الجواب:۔ بشرطِ صدق وثبوت اگر یہ زمین کسی کے لیے تسلیم شدہ یا بذریعہ گواہ ثابت شدہ ہو تو کسی کے غاصبانہ اور ظالمانہ قبضہ سے اس زمین میں شرعاً اُس کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس زمین کے تمام تر حقوق بیع حقِ فروخت اصل مالک کو حاصل ہیں، البتہ اس زمین کی فروخت موقوف علی شرط التسلیم ہوگی یعنی جب تک زمین مشتری کے حوالے نہیں کی گئی ہو تو بیع موقوف ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ:۔ منها ان یکون مقدور التسلیم عند العقد فان کان معجوز التسلیم عندہٗ لا ینعقد۔ (البدائع والصنائع ج ۵ ص۱۴۷ کتاب البیوع۔ فصل واما الذی یرجع الی المعقود علیه) [1]

حکومت کی اجازت کے بغیر غیر ملکی اشیاء کی تجارت کرنا

سوال:۔ وہ غیر ملکی اشیاء جن کی خرید و فروخت پر حکومت کی طرف سے پابندی ہو اُس کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ جو اشیاء بیرونِ ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں اُن پر حکومت تاجروں سے ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی وغیرہ کے نام سے کچھ رقم وصول کرتی ہے، بسا اوقات ان ٹیکسوں میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ کر دیا جاتا ہے، اگر یہ ٹیکس مناسب اور جائز انداز میں لیا جاتا ہو اور قومی خزانہ میں

---

[1] قال طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: واما بیع المغصوب فقد ذکر محمدؒ انهٗ موقوف ان اقر به الغاصب ثم البیع وان جحد و للمغصوب منه بینة فکذٰلك وان لم یکن ولم یسلمه حتی هلك ینقض البیع۔

(خلاصة الفتاوی ج ۳ ص۴۲ الباب الرابع فی بیع الفاسد واحکامه)

وَمِثْلُهٗ فی الجامع الفصولین ج ۲ ص۹ الفصل الثانی والثلاثون فی بیع الغصب۔

جمع ہوکر قومی مفاد میں استعمال کیا جاتا ہو تو پھر سامانِ تجارت چوری چھپے لانا مناسب نہیں کیونکہ حکومتِ وقت درآمد کردہ اشیاء پر ضروری ٹیکس لگانے کی مجاز ہے، البتہ اگر حکومت ان ٹیکسوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ کرکے تاجروں کو تنگ کرتی ہو اور ٹیکس کے نام سے وصول کی گئی رقم قومی خزانہ کی بجائے ذاتی خواہشات اور ضروریات میں صرف کی جاتی ہو تو ایسی صورت میں مال لانے والا ٹیکس سے بچنے کی مناسب تدابیر اختیار کرے تو کوئی مضائقہ نہیں ، البتہ دروغگوئی ، خیانت اور دھوکہ بازی سے بہرحال اجتناب ضروری ہے ۔

قال القاضی ابو یعلیٰ محمد بن الحسین الفرائ : ان کان الیلد ثغرًا یتاخم دار الحرب وکانت اموالہم اذا دخلت دار الاسلام معشورۃ من صلح استقر معہم اثبت فی الدیوان عقد صلحہم وقدر المأخوذ منہم من عشر او خمس او زیادۃ او نقصان منہ وان کان یختلف باختلاف الازمنۃ والاموال فصلت فیہ وکان الدیوان موضوعًا لاخراج رسومہ والاستغناء مایرفع الیہ من مقادیر الامتعۃ المحمولۃ الیہ ۔ (الاحکام السلطانیۃ ص۲۴۶) [1]

حکومت کی اجازت کے بغیر سرکاری درختوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :- سرکاری ملازمین کے ذریعے سرکاری زمین پر اُگے ہوئے درختوں کی خرید وفروخت کا حکم کیا ہے ؟

الجواب :- حکومت کی طرف سے اگر ان ملازمین کو سرکاری درختوں کی فروخت کی اجازت ہو اور رقم حاصل کرکے قومی خزانہ میں پہنچتی ہو تو ملازمین کے لیے درختوں کو فروخت کرنے میں شرعًا کوئی حرج نہیں ، البتہ اگر ملازم خیانت ، بددیانتی اور ماردھاڑ سے فروخت کرتے ہوں تو علم ہونے کے باوجود اُن سے خریدنا ناجائز ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے ، کیونکہ قومی ملکیت ہونے کی وجہ سے ان درختوں میں پوری قوم کا حق ہے ۔

---

[1] قال فخر الدین الزیلعیؒ : والاصل ان متی عرفنا ما یأخذون منا اخذنا منہم مثلہ بذلک امر عمر رضی اللہ عنہ وان لم نعرف اخذنا منہم العشر لقول عمر فان اعیاکم فالعشر وان کان یاخذون الکل ناخذ منہم الجمیع الا قدر ما یوصلہ الی مأمنہ فی الصحیح ۔

(تبیین الحقائق ج۱ ص۲۸۵ باب العاشر)

ومثلہ فی الجامع الصغیر ص۱۰۱ باب فیمن یمر علی العاشر بمال ۔

لما فی مجلة الاحکام: لیس للوکیل ان یبیع بانقص مما عینه الموکل یعنی اذا کان الموکل قد عین ثمنا فلیس للوکیل ان یبیع بانقص من ذلک واذا باع ینعقد البیع موقوفا علی اجازة موکله ۱ھ وقال العلامة خالد الاتاسی: ثم لو خالف الوکیل بالبیع وباع وسلم المبیع للمشتری ثم ھلک فی ید المشتری یکون الوکیل ضامنا لقیمة لانه بالمخالفة صار غاصبا ۱ھ - شرح المجلة لخالد الاتاسی ج۴ ص۴۸۵/۴۸۶ مادة ۱۴۹۵

حکومت کا ضبط کردہ مال خریدنا

سوال: بعض لوگ اندرونِ ملک مخصوص علاقوں سے دیگر علاقوں تک کپڑا، برتن اور دیگر سامان خفیہ طریقے سے لے جاتے ہیں جبکہ بعض اوقات حکومت کے کارندے ان کو پکڑ کر ان کا سامان ضبط کرکے نیلام کر دیتے ہیں، کیا ان ضبط شدہ اشیاء کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ سامان اصل مالک کی ملک سے نہیں نکلتا ہے کیونکہ حکومت کیلئے رعایا کے اموال ضبط کرنا مناسب نہیں، لہٰذا ایسا سامان اصل مالک کی ملک سے خارج نہ ہونے کی وجہ سے واجب الرد ہے، اس بناء پر ضبط شدہ مال کی خرید و فروخت جائز نہیں اور حکومت کی اندرونِ ملک انتقالِ اشیاء پر پابندی لگانا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف - (رد المحتار ج۴ ص۱۸۰ مطلب القول الذی لیدان الارض ملکه وان کانت خراجیة) [1]

---

[1] قال العلامة القاضی ابو یعلی الحنبلی رحمه الله: فاما اعشار الاموال المنتقلة فی دار الاسلام من بلد الی بلد فمحرمة لا یبیحها شرع ولا یسوغها اجتهاد ولا ھی من سیاسات العدل وقلما تکون الا فی البلاد الجائرة ولذلك قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یدخل الجنة صاحب مکس -
(الاحکام السلطانیة ص۲۴۶ فصل فی وضع الیلون - القسم الثانی اعشار الاموال)
ومثله محمد حامد الفقی علی ھامش الاحکام السلطانیة ص۲۴۶

غیرمحفوظ سرکاری کاغذات کے ذریعے جائیداد وغیرہ کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ملکی قانون کے تحت ایک شخص سرکاری کاغذات (رجسٹری و انتقال) کے ذریعے اپنی جائیداد وغیرہ فروخت کرسکتا ہے، ان کاغذات کے اعتبار اور عدم اعتبار کے متعلق شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ از روئے شرع جو سرکاری کاغذات تغیر و تبدل سے محفوظ ہوں تو اُن کو قابلِ اعتبار قرار دے کر ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، موجودہ حالات میں چونکہ رشوت، جھوٹ، دھوکہ اور فریب ہر جگہ غالب ہو چکا ہے اس بناء پر دورِ حاضر میں صرف کاغذات کے ذریعے خرید و فروخت مناسب نہیں۔

لما فی مجلة الاحکام: لا یعمل بالخط والختم واحدهما الا اذا کان سالماً من شبهة التزویر والتصنیع فیعمل به یعنی انه یکون مداراً للحکم ولا یحتاج الی الثبوت بوجه آخر۔ (المجلة المادة ۱۷۳۶ الباب الثانی۔ الفصل الاول فی الحجج الخطیة) [1]

وقف شدہ زمین کو فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین کو مسجد یا قبرستان کے لیے وقف کیا، وقف کے بعد اُس زمین کو وہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا اِس واقف کو موقوفہ زمین کی فروخت کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زمین کو وقف کر دینے کے بعد شرعاً زمین واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے بشرطیکہ وقف کی شرائط کا لحاظ کر کے وقف تام ہو۔ وقف کر دینے کے بعد زمین میں واقف کو کسی قسم کے ذاتی یا مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں رہتا، لہٰذا اس زمین کو

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهراً وعلیه فما یوجد فی دفتر التجار فی زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما علیه فی دفتره الذی یقرب من الیقین انه لا یکتب فیه سبیل التجرید والهزل یعمل به۔
(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۲۱ مطلب فی دفاتر التجار حادثة فی تاجر له دفتر۔)

خرید وفروخت یا ہبہ کا مجاز نہیں ہے اور نہ اس زمین میں وراثت جاری ہوسکتی ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ : واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۱۶ کتاب الوقف)[1]

مسجد کا ضرورت سے زائد سامان فروخت کرنا

سوال:۔ اگر کسی قصبہ کے لوگ اپنے قصبہ سے مکمل طور پر کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہوں اور اس قصبہ میں مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو کیا ایسی حالت میں مسجد کا سامان فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر حقیقتاً قصبہ والے مکمل طور پر اپنے قصبہ سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہوں اور وہاں مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو اس صورت میں چونکہ مسجد کو ایسے ہی چھوڑنے پر اسکے سامان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے لہٰذا ایسی کسی بھی مسجد کی اشیاء فروخت کرنا جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جائے گا، البتہ مسجد کی زمین کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں ہوسکتی۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : قلت لکن الفرق غیر ظاہر فلیتأمل والذی ینبغی متابعۃ المشائخ المذکورین فی جواز النقل بلا فرق بین مسجد او حوض کما افتی بہ الامام ابو شجاعؒ والامام الحلوانیؒ وکفی بہم قدوۃ ولا سیما فی زماننا فان المسجد او غیرہ من رباط او حوض اذا لم ینقل یاخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد وکذلک اوقافہ یأکلھا النظار او غیرھم وفی فتاوی النسفی سئل شیخ عن اھل قریۃ رحلوا وتداعی مسجدھا الی الخراب وبعض المتغلبۃ یستولون علی خشبۃ وینقلونہ الی دورھم ھل لواحد لاھل المحلۃ ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسک

---

[1] قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ : فاذا تم ای الوقف فلا یملک ولا یعار ولا یرھن۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف)

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ کتاب الصدقۃ۔ فصل واما حکم الوقف الجائز ۔۔۔ الخ۔

الثمن يصرفه الى بعض المساجد او الى هٰذا المسجد قال نعم۔

(ردّ المحتار ج ۴ ص۳۶۱ مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ) [1]

غیر موقوف قبرستان کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے ایک قطعہ زمین خریدا جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جگہ قبرستان کی ہے لیکن تقریباً ساٹھ سال سے اس میں کسی بھی میت کو دفن نہیں کیا گیا ہے اور اس قطعۂ زمین کو مالک نے قبرستان کے لیے وقف بھی نہیں کیا تھا، کیا اب مالکِ زمین کو اس کی فروخت کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر موقوف قبرستان میں اگر یہ یقین ہو کہ اموات کی لاشیں ختم ہو کر خاک بن گئی ہیں تو ایسی صورت میں اس کا مالک اس زمین میں ہر قسم کے مالکانہ تصرفات کا مجاز ہوگا، البتہ اگر وقف کا شائبہ بھی موجود ہو تو موقوفہ قبرستان کی خرید و فروخت یا دیگر مالکانہ تصرفات کا حق اس کو حاصل نہیں۔

لما قال الشیخ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی رحمہ اللہ۔ ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه۔ (التبیین الحقائق ج ۱ ص۲۴۶ باب الجنائز) [2]

وصولِ حق کے لیے غاصب کی جائیداد فروخت کرنا جائز ہے

سوال: میرے ایک رشتہ دار نے میری ملکیتی زمین سرکاری کاغذات (رجسٹری و انتقال وغیرہ) میں جعلسازی سے ردّ و بدل کر کے فروخت

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ:۔ حشیش المسجد اذا کانت له قيمة فلاهل المسجد ان يبيعوها وان رفعوا الى الحاكم فهو احب وكذا الحباب والنعش اذا افسدا فلاهل المسجد ان يبيعوها وان رفعوا الى الحاكم فهو احب۔

(الفتاوى التاتارخانية ج ۵ ص۸۵۵ کتاب الوقف مسائل وقف المساجد)

ومِثلُهٗ فی الهندية ج ۲ ص۴۵۸ الباب الحادی عشر فی المسجد وما يتعلق به۔

[2] قال العلامه ابن عابدینؒ ،ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۲۳۳ مطلب فی دفن المیّت)

ومِثلُهٗ فی الهندية ج ۱ ص۱۶۷ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مكان الى مكان اخر۔

کردی ہے، میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اس زمین کو مجھے واپس کردے لیکن وہ کسی طرح بھی زمین واپس کرنے کو تیار نہیں ہے، اب میرے اس رشتہ دار کو چند وجوہات کی بنا پر ملک چھوڑنا پڑ گیا ہے جبکہ اس کا دو کنال رقبہ میرے قبضے میں ہے، تو کیا میرے لیے اس دو کنال رقبہ کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ہے؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال کسی کے غاصبانہ قبضہ کرنے سے آپ کی زمین اُسکی ملکیت نہیں بن سکتی اور نہ ہی ناجائز طور پر سرکاری کاغذات میں تبدیلی کرکے فروخت کر دینے سے شرعاً ملکیت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ زمین میں مالک کو باقاعدہ طور پر ہر قسم کے تصرّفات کا حق حاصل ہے اپنے حق کے حصول کے لیے غاصب کی منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کی فروخت کرکے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: قال ونقل جد والدی لامه الجمال الاشقر فی شرحه للقدوری ان عدم جواز الاخذ من خلاف الجنس کان فی زمانهم لمطاوعتهم فی الحقوق والفتویٰ الیوم علی جواز الاخذ عند القدرة من ای مال کان لا سیما فی دیارنا لمداومتهم للعقوق۔ (رد المحتار ج۴ ص۹۵ مطلب یعذر بالعمل بمذهب الغیر عند الضرورة) ؎

بُت فروشی کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ بُتوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے ہیں، ازروئے شرع یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بُت چونکہ آلۂ معاصی اور شرک پرستی میں معین ہیں، لہٰذا اعانت علی المعصیت کی بناء پر ان کی خرید و فروخت جائز نہیں، علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بُت فروشی سے منع فرمایا ہے۔

؎ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وفیه ان ابن ابی لیلیٰ والشافعی یطلقان اخذ خلاف جنس حقه للمجانسة فی المالیة وقالا هو الاوسع ویجوز الاخذ به وان لم یکن من هینا فان الانسان یعذر فی العمل به عند الضرورة۔

(البحر الرائق ج۵ ص۵۶ کتاب السرقة)

ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۹۵ مطلب یعذر بالعمل بمذهب الغیر عند الضرورة۔

اخرج الامام البخاری رحمہ اللہ: عن جابر بن عبد اللہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عام الفتح وھو بمکۃ ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص۲۹۸ باب البیع المیتۃ والاصنام) [۱]

غصب شدہ املاک کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال: بعض اوقات علاقائی جھگڑوں میں ایک قوم دوسری قوم کو مغلوب کرکے اس کی تمام جائیداد مال مولیشی وغیرہ پر غاصبانہ اور ظالمانہ قبضہ کرکے ضبط کرلیتی ہے، تو کیا اس غاصب قوم سے مغلوب قوم کی غصب شدہ جائیداد خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کے مال وجان پر غاصبانہ قبضہ کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس طرح قبضہ شدہ جائیداد وغیرہ کسی فریق کی ملکیت بن سکتی ہے بلکہ ان غصب شدہ املاک کی واپسی شریعت مقدسہ نے واجب قرار دی ہے، اس بناء پر یہ قبضہ غصب شمار ہوکر اصل مالکوں یا ورثاء کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر اصل مالک یا ورثاء معلوم نہ ہوں تو اُن کی طرف سے فقراء ومساکین پر صدقہ کرکے اپنا ذمہ فارغ کریں، لہٰذا مشتری کو اگر یہ علم ہو کہ جو جائیداد وہ خرید رہا ہے وہ غصب کردہ اور ظلم وجبر سے ہتھیائی گئی ہے تو پھر اس کے لیے وہ جائیداد اور مال مولیشی وغیرہ خریدنا جائز نہیں، اور جو بیع ہوجائے وہ بیع فضولی کے حکم میں ہوکر موقوف رہے گی۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفسہ منہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۲۵۵ کتاب الغصب) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ علی بن سلطان محمد القادریؒ: حرّم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام وان کانت من ذھب اوفضۃ۔ (المرقاۃ ج۶ ص۱۴۹ باب الکسب وطلب الحلال۔ الفصل الاول)

وَمِثْلُہٗ فی عمدۃ القاری ج۱۲ ص۵۴ باب بیع المیتۃ والاصنام۔

[۲] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: الغصب فی الشریعۃ اخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالک علی وجہ یزیل یدہ..... وعلی الغاصب ردّ العین المغصوبۃ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۷۲ کتاب الغصب)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۰۵ کتاب الغصب۔

بیٹے پر زمین فروخت کرنا

سوال:۔ کیا شریعتِ اسلامیہ میں والد اپنی مملوکہ زمین بیٹے پر فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والد اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر قسم کے تصرفات کا حق رکھنے کے علاوہ جس پر بھی چاہے فروخت کرسکتا ہے، لہٰذا بیٹے پر زمین فروخت کرنے میں کوئی قباحت نہیں اور نہ ہی یہ شرعاً ممنوع ہے۔

لما قال حافظ الدین محمد بن البزازؒ:۔ دارٌ لرجل او مشترك بين الاب والرجل وللاب ابن صغير له ام فقالت اشتريت هٰذه الدار لابني بماله والاب حاضر او اشتريت منكما لابني بماله فقال بعنا وقع الملك للابن۔
(البزازية على هامش الهندية ج۴ ص۲۸۷ باب الثاني في بيع الاب والام والوصي) [۱]

باریک کپڑے کی تجارت کرنا

سوال: باریک کپڑے پہننے سے عموماً بدن صاف نظر آتا ہے، کیا ایسے باریک کپڑے کی تجارت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا باریک کپڑا جو دوہرا کرکے زیبِ تن کرنے کے باوجود بدن نظر آتا ہو تو ایسا کپڑا بے حیائی اور عریانی کا پیش خیمہ بننے اور پردہ متاثر ہونے کے باوجود فروخت کرنا درحقیقت اعانت علی المعصیۃ کے مترادف ہے، اس لیے ایسے کپڑوں کی تجارت سے اجتناب کرنا چاہیئے تاہم ایجاب وقبول سے بیع تام ہوگی۔

لما قال العلامة محمد بن محمد ابن البزاز الكردويؒ: وبيع المكعب المفضض للرجال اذا علم انه يشتريه للبسه يكره۔ (البزازية على هامش الهندية ج۴ ص۳۵۲ الثالث في المتفرقات) [۲]

---

[۱] لما قال العلامة فخر الدين الشهير بقاضيخانؒ: امرأة قالت لزوجها وبينهما ولد صغير اشتريت منك دارك هٰذه لابننا بكذا وقال الاب لبعتها جاز لان الاب لما قبل البيع فقد جاز شراؤها للصغير فيجوز۔ (الخانية على هامش الهندية ج۲ ص۲۸۶ باب في بيع غير المالك)
ومِثْلُهٗ في شرح مجلة الاحكام لسليم رستم باز تحت المادة ۱۶۷ ص۷۵۔

[۲] قال العلامة ابن عابدينؒ:۔ ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً والا فتنزيهاً وبيع المكعب المفضض للرجل انه يلبسه يكره لانه اعانة على لبس الحرام (رد المحتار ج۴ ص۳۹۲ كتاب الحظر والاباحة)
ومِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۵ ص۱۴۳ نعيم بتغيير يسير، في آخر باب البغاة۔

کفار کے ملبوسات کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ غیر مسلم اقوام کے بیجانی کے ملبوسات مثلاً پتلون اور ٹائی وغیرہ کی خرید و فروخت کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ وہ اشیاء جو بلا تغیر و تبدیل بے دینی اور معصیت کا آلہ ہوں یا کسی غیر مسلم قوم کا شعار ہوں ایسی اشیاء کی خرید و فروخت سے اجتناب کرنا ضروری ہے کیونکہ استعمال کی ممانعت خرید و فروخت کی ممانعت کی دلیل ہے تاکہ اعانت علی المعصیت کے زمرہ میں داخل نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : ماقامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً والافتنزيهاً وبيع المكعب المفضض للرجل انه يلبسه يكره لانه اعانة على لبس الحرام خياطاً امره ان يخذ له ثوباً على ذى الفساق يكره له ان يفعل لانه سبب التشبه با لمجوس والفسقة۔

(رد المحتار ج ٦ ص ٣٩٢ فصل فی البیع ۔کتاب الکراھیة)[1]

غیر مسلموں کی متروکہ جائیداد فروخت کا حکم

سوال:۔ تقسیم ملک کے نتیجہ میں ہندوؤں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ان کی جائیدادیں وغیرہ رہ گئی ہیں ایک شخص نے کچھ حصہ پر قبضہ کرکے اُسے اپنی ملکیت میں لے لیا ہے، کیا اُس کے لیے اِس جائیداد کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلم اقوام کی متروکہ جائیداد اور دیگر اشیاء چونکہ بیت المال اور قومی خزانہ کا حق بنتا ہے، اِس بناء پر ذاتی مفاد کے لیے اس پر قبضہ کرنا اور اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے ہاں اگر حکومت کی باضابطہ اجازت سے فروخت کی جائے اور رقم قومی خزانہ میں جمع ہو تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: وما اوجف المسلمون عليه من اموال اهل الحرب بغير قتال يصرف فى مصالح المسلمين كما يصرف الخراج قالوا هو مثل الاراضى التى اجلوا اهلها عنها ۔(الهداية ج ٢ ص ٥٦٤ باب المستأمن)[2]

---

[1] قال النبی صلی الله علیه وسلم :عن ابن عمرؓ قال قال عليه الصلوٰة والسلام من تشبه بقوم فهو منهم۔ (ابو داؤد ج ۲ ص ۲۰۳ کتاب اللباس) ۔وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۲۱ کتاب الکراھیة۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ :وما اخذ منهم بلا حرب ولا قهر كالهدية والصلح فهو لا غنيمة ولا فيئ وحكمه حكم الفيئ لا يخمس ويوضع فى بيت المال ۔(رد المحتار ج ٤ ص ١٣٦ مطلب فی بیان معنی الغنیمة والفیئ)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۷۲ کتاب البیوع۔

بلا اجازت کسی کی زمین فروخت کرنا

سوال :۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو ترکہ میں سے ان کے حصہ سے محروم کر دیتے ہیں، تو کیا ان لوگوں سے ایسی اراضی یا دیگر جائیداد خریدنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بہنوں اور بیٹیوں کو جائیداد میں ان کے مقررہ حصے سے محروم کرنا اسلامی تعلیمات کو پامال کرنے کے مترادف ہے اور ان کے حصہ پر اُن کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے فروخت کرنا مغصوبہ زمین کی فروخت کے حکم میں ہے، لہٰذا اُن کی اجازت کے بغیر فروخت کردہ زمین بیع فضولی کے حکم میں شمار ہو کر حصہ داروں (بیٹیوں اور بہنوں) کی اجازت پر موقوف ہوگی، اگر وہ اجازت دیں تو بیع نافذ ہوگی ورنہ نہیں۔

قال العلامة سليم رستم باز : كلٌّ واحد من الشركاء في شركة الملك اجنبي في حصة سائرهم فليس احدهم وكيلاً عن الآخر ولا يجوز له من ثم ان يتصرف في حصة شريكه بدون اذنه - (شرح مجلة الاحكام ، المادة ۱۰۷۵ صـ ۶۰۱ الفصل الثاني في بيان كيفية التصرف في الاعيان المشتركة) لـه

حقِ تعلّی کی فروخت کا حکم

سوال :۔ موجودہ دور میں بعض مقامات میں لوگوں کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے زمین فروخت کرتے وقت یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ آپ کو دس فٹ کے اندر اندر ایک چھت بنانے کی اجازت ہو گی، اگر دس فٹ سے مکان اونچا کرنا ہو تو اس کی بھی قیمت ادا کرنا ہوگی، البتہ اس کی قیمت نیچے والے حصہ سے کم ہوگی ۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زمین فروخت کرتے وقت اس قسم کی شرط عائد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ فضا مال نہیں کیونکہ اس کا احراز ممکن نہیں، اور حقوقِ مجردہ کی فروخت شرعاً ممنوع ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ نیچے والی منزل

لـه قال في الهندية : ولا يجوز لاحدهما ان يتصرف في نصيب الآخر الا بامره وكل واحدٍ منهما كالاجنبي في نصيب صاحبه - (الفتاوى الهندية ج ۲ صـ ۳۰۱ الفصل الاول في بيان انواع الشركة)

ومثلهٗ في البرجندي ج ۳ صـ ۱۴۲ كتاب الشركة -

ایک آدمی کی ہو اور اوپر والی منزل کسی دوسرے کی ہو اور خدانخواستہ دونوں گر جائیں تو اوپر والا اپنا حق نیچے والے پر فروخت کردے تو یہ بیع ناجائز ہوگی کیونکہ یہ حق تعلی ہے اور حق تعلی کی فروخت سے فقہاء نے منع فرمایا ہے۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: سفل وعلو بین رجلین انہدما فباع صاحب العلو علوہ لم یجز لان الہواء لیس بمال۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۵ کتاب البیوع، فصل واما الذی یرجع الی المعقود علیه فانواع) [1]

شرط لگاکر کوئی چیز فروخت کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی پر اپنا گھر فروخت کرتے وقت یہ شرط لگادی کہ میں آٹھ مہینے تک اس گھر میں رہوں گا، کیا اس شرط کے ساتھ یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر گھر کی بیع کو اس شرط پر موقوف رکھا گیا کہ اگر مشتری اس شرط کو قبول نہ کرتا تو بائع اس پر راضی نہ ہوتا تو یہ بیع فاسد ہوگی کیونکہ شریعت مقدسہ نے بیع وشرائع کے دوران ہر اس شرط کو ممنوع قرار دیا ہے جس میں کسی ایک جانب یا مبیعہ کو فائدہ ہو، لہٰذا صورت مذکورہ میں بیع فاسد تصور ہوگی۔ تاہم اگر بیع کو اس شرط پر موقوف نہیں کیا گیا بلکہ مشورے کی حیثیت سے رکھا گیا تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں جس کے نتیجے میں اس کی رعایت ضروری نہیں بلکہ شرط کی رعایت احسان کے مترادف ہوگی۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا بیع بشرط لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدھما او لمبیع۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۸۵ باب البیع الفاسد) [2]

کسی چیز پر قبضہ کرلینے کے بعد زائد قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے ایک گاڑی ایک لاکھ روپے میں

---

[1] قال العلامة المرغینانی: لان حق التعلی لیس بمال لان المال ما یمکن احرازه۔
(الهدایة علی صدر فتح القدیر ج۶ ص۱۱ کتاب البیوع۔)

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: لو کان فی الشرط منفعة لاحد المتعاقدین بان شرط البایع ان یقرض المشتری او علی القلب یفسد العقد۔
(خلاصة الفتاوی ج۳ ص۵ کتاب البیوع، الفصل الخامس فی البیع)
ومثله فی الهندیة ج۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع الخ۔

خریدی اور قبضہ کر کے دوسرے شخص پر دو لاکھ روپے میں فروخت کر دی، دوسرے شخص نے خرید کر تیسرے آدمی پر دو لاکھ دس ہزار روپے میں فروخت کر دی، تو کیا یہ معاملہ سود در سود ہے یا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: شریعت نے قبل القبض کسی چیز میں تصرف کی اجازت نہیں دی ہے لیکن باقاعدہ طور پر کسی چیز کو قبضہ کر کے فروخت کرنے کو مشروع رکھا ہے، لہٰذا بائع اور مشتری کے درمیان جو بھی قیمت مقرر ہو جائے وہی صحیح اور مشروع ہے۔

قال العلامۃ ابن الہمام رحمہ اللہ: ھو مبادلۃ المال بالمال بالتراضی۔

(فتح القدیر ج ۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)[1]

بغیر زمین کے پانی فروخت کرنا

سوال: اگر کسی زمین کا حق شرب بغیر زمین کے فروخت کیا جائے تو کیا یہ بیع شرعاً درست ہو گی یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے ماء محرز (یعنی وہ پانی جو کسی برتن میں محفوظ ہو) کے علاوہ عام پانی کو مباح الاصل قرار دیا ہے اور زمین کا حق شرب زمین کے توابع میں شمار کیا ہے۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر بلا تذکرہ شرب زمین فروخت کی جائے تو زمین کے ساتھ حق شرب خود بخود شامل ہو گا۔ لہٰذا مفتیٰ بہ اور ظاہر الروایۃ قول کے مطابق مستقل طور پر حق شرب کی خرید و فروخت، ہبہ یا تصدق وغیرہ جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولا یباع الشرب ولا یوھب ولا یؤجر ولا یتصدق بہ لانہ لیس بمال متقوم فی ظاھر الروایۃ وعلیہ الفتوٰی۔ (رد المحتار ج ۵ ص۸۰ باب البیع الفاسد)[2]

---

[1] قال العلامۃ جلال الدین رحمہ اللہ: البیع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی۔

(کفایۃ شرح الہدایۃ فی ذیل فتح القدیر ج ۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)

وَمِثْلُہٗ فی العنایۃ علی ہامش فتح القدیر ج ۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامۃ قاضیخانؒ: ولا یجوز بیع مسیل الماء وھبتہ ولا بیع الطریق بدون الارض وکذلک بیع الشرب۔

(فتاوٰی قاضیخان علی ہامش الہندیۃ ج ۲ ص۱۵۴ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی شرح المجلۃ تحت المادۃ ۲۱۶ ص۱۰۵، الفصل الثانی، فیما یجوز بیعہ وما لا یجوز۔

کسی گاڑی کی متوقع آمدنی فروخت کرنا

سوال: دو آدمیوں نے آپس میں مشترکہ طور پر ایک بس خریدی، اب دونوں میں سے ایک نے کہا کہ بس کا تمام تر سالانہ منافع مجھے اتنی رقم پر فروخت کرو، تو کیا یہ عقد شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: خرید و فروخت کے لیے شریعت نے مبیعہ کی موجودگی ضروری قرار دی ہے، صورتِ مذکورہ میں چونکہ سالانہ منافع یا اصل نامعلوم اور معدوم ہے، لہٰذا یہ بیع معدوم کے زمرہ میں شمار ہو کر باطل ہوگی۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: منها ان يكون موجودًا فلا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۳۸ كتاب البيوع فصل واما الذي يرجع الى المعقود الخ)[1]

مقررہ نرخوں سے زیادہ قیمت پر مال فروخت کرنا

سوال: ایک آدمی نے کھاد کی ایجنسی کھول رکھی ہے اور وہ گورنمنٹ کی طرف سے مقررکردہ نرخوں پر کھاد فروخت کرتا ہے، بعض اوقات کھاد شارٹ ہونے کی وجہ سے مارکیٹ میں کم ملتی ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہی ڈیلر کھاد زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں یہ کھاد ڈیلر گورنمنٹ کا وکیل نہیں کیونکہ کاروبار کا تمام تر منافع مالک ہی کو ملتا ہے لیکن اس نے گورنمنٹ سے کھاد مقررہ نرخوں پر فروخت کرنے کا عہد و پیمان کر رکھا ہے اور گورنمنٹ اُسے نرخ بتا کر کھاد دیتی ہے لہٰذا اس سے زائد نرخ پر فروخت کرنے میں بدعہدی لازم آتی ہے اور زائد نرخوں پر فروخت کرنے سے جھوٹ، مخلوقِ خدا پر ظلم و زیادتی، بے رحمی اور بے جا سختی لازم آتی ہے، اس لیے اس سے اجتناب اور پرہیز ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: وبيع ما ليس في ملكه لبطلان بيع المعدوم اذ من شرط المعقود عليه ان يكون موجودًا مالاً متقومًا في نفسه۔
(ردّ المحتار ج ۵ ص ۵۸ كتاب البيوع مطلب الآدمي مكرم شرعًا ولو كافرًا)
ومثله في البحر الرائق ج ۶ ص ۱۱ كتاب البيوع۔

لہ قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۳۴)

بیع میں اجنبی کے فعل کی شرط لگانا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر اس شرط سے زمین فروخت کی کہ فلاں شخص مجھ پر معینہ قطعہ اراضی فروخت کرے گا اور اگر اس نے فروخت نہ کی تو میں بیع واپس کرنے کا مجاز ہوں گا، باقاعدہ بیع کے بعد اُس شخص نے اس پر معینہ قطعۂ اراضی فروخت کرنے سے انکار کر دیا، تو اب بائع کہتا ہے کہ چونکہ میں نے اپنی زمین کی واپسی کی شرط لگائی تھی لہٰذا میں اپنی بیع کو منسوخ کرتا ہوں، تو کیا اس کو اپنی زمین واپس لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع میں وہ شروط پورے کرنے ہوتے ہیں جو کہ بیع کے مقتضیات یا لوازمات عقد میں سے ہوں تو شرط مذکورہ چونکہ ملازمات اور مقتضیات میں سے نہیں اور نہ ہی مفسد للعقد ہے کیونکہ اسے اجنبی کے فعل سے معلق کیا گیا ہے، اس بنا پر یہ عقد صحیح ہو کر شرط فاسد شمار ہوگی، پس بائع کو زمین واپس لینے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وفی المنتقی قال محمد کل شئ یشترطه المشتری علی البائع یفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو باطل رای فالشرط باطل (منحۃ الخالق) کما اذا اشتری دابۃ علی ان یهبه فلان الاجنبی کذا فهو باطل۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۸۶ باب البیع الفاسد) ٢ہ

ایجاب وقبول کے وقت مبیعہ کو مشتری کے حوالہ کرنے کے لیے چند دن کی مہلت کی شرط لگانا

سوال:۔ عقد بیع کے دوران یہ شرط لگانا کہ مبیعہ ابھی نہیں بلکہ چند دن حوالہ کروں گا، تو کیا بائع کے لیے یہ شرط لگانا شرعاً

لہ قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولا یسعر حاکم الا اذا تعدی الارباب عن القیمۃ تعدیا فاحشا فیسعر بمشورۃ اهل الرای۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۰۰ کتاب الکراهیۃ۔ فصل فی البیع)

٢ہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: المراد بالنفع ما شرط من احد العاقدین علی الآخر فلو علی اجنبی لایفسد ویبطل الشرط لما فی الفتح عن الولوالجیۃ بعتك الدار بالف علی ان یقرضنی فلان الاجنبی عشرۃ دراهم فقبل المشتری لایفسد البیع لانه لایلزم الاجنبی ولا خیار للبائع۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۸۵ مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر بعد العقد او قبله)

ومثلہ فی شرح المجلۃ لسلیم رستم باز تحت المادۃ ۱۸۹ ص ۸۹

جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرط مذکورہ نہ تو بیع کے مقتضیات میں سے ہے اور نہ ملازمات میں سے ہے بلکہ بائع کے فائدہ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بیع کیا گیا ہے اور مبیعہ حوالہ کرنے میں مہلت کی شرط لگانا فقہاء نے شرطِ فاسد قرار دیا ہے، اسی بناء پر مذکورہ شرط بھی ناجائز ہے، البتہ اگر رقم سے کر بطورِ وعدہ چند دن بعد مبیعہ حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو بیع استجرار کی رُو سے یہ پیشگی رقم وعدہ بیع شمار ہو کر مبیعہ حوالہ کرتے وقت بیع منعقد ہو جائے گی۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ومن باع عیناً علی ان لا یسلمه الی رأس الشهر فالبیع فاسد لان الاجل فی المبیع العین باطل فیکون شرطاً فاسداً وهذا لان الاجل شرع ترفیهاً فیلیق بالدیون دون الاعیان۔ (الهدایة ج۳ ص۶۳ باب البیع الفاسد) لہ

نفع کی خاطر گاہک کو دوسری دوکان سے سودا لینے کیلئے قرض پر رقم دینا

سوال: ایک شخص کسی دوکاندار سے کوئی چیز قرض پر خریدنا چاہتا ہے لیکن وہ چیز دوکاندار کے پاس نہیں ہے اور دوکاندار اس شرط پر گاہک کو قرض رقم دیتا ہے کہ مجھے اتنا منافع دو گے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ دوکاندار گاہک کو قرض رقم دے کر منافع کا مطالبہ کرتا ہے قرض دینے کی صورت میں کسی قسم کا منافع حاصل کرنا شرعاً ممنوع ہے اسلئے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ شرط لگا کر قرض دینے سے شرط پر عمل لازم نہیں ہے، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں قرض لینے کے بعد نہ تو گاہک کو منافع دینا ضروری ہے اور نہ دوکاندار کو لینا جائز ہے۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کل قرض جرّ نفعاً فهو ربوا۔ (نصب الرایة ج۴ ص۶۰ کتاب الحوالة) ۲ہ

لہ قال فی الهندیة: اذا شرط الاجل فی المبیع العین فسد العقد وان شرط الاجل فی الثمن والثمن دین فان کان الاجل معلوماً جاز البیع وان کان مجهولاً فسد البیع۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۳۲ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد البیع الخ)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۸۵ باب البیع الفاسد۔

۲ہ قال الحصکفیؒ: القرض بالشرط حرام والشرط لغو۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۵ ص۱۶۶ فصل فی القرض)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۸۷ کتاب البیوع، باب المتفرقات۔

عیب دار اشیاء کی خرید و فروخت کرنا

سوال :- ایک دوکاندار کے پاس مختلف اقسام کی گندم ہے جسے وہ مختلف نرخوں میں فروخت کرتا ہے، اگر دوکاندار ان مختلف اقسام کی گندم کو ملاکر ایک علیحدہ قسم نکالے جس میں ادنیٰ اور اعلیٰ ہر قسم کی گندم شامل ہو تو کیا یہ طریقۂ تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگر دوکاندار گندم کی حقیقت چھپاکر خریدار پر اعلیٰ قیمت پر فروخت کرے تو یہ ناجائز ہے، لیکن اگر گاہک کو بتاکر فروخت کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ بائع کی نشاندہی کے بعد عیب دار چیز کی فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، کسی چیز کے عیب کو چھپاکر فروخت کرنا گناہ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : لایحل کتمان العیب فی مبیع اوثمن لان الغش حرام۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۴۷ کتاب البیوع، باب خیار العیب) [۱]

نقد رقم قرض دینے کی بجائے کوئی چیز مہنگی دینا

سوال :- ایک آدمی نے کسی سے تین ہزار روپے قرض لینا چاہا، بجائے قرض رقم کے اس نے ایک کپڑا ساڑھے تین ہزار روپے میں اس کے ہاتھ فروخت کیا جبکہ بازار میں اس کپڑے کی قیمت تین ہزار روپے ہے، ضرورت مند نے کپڑا لیکر بازار میں اسکو تین ہزار روپے میں فروخت کر دیا، اس صورت میں قرض دینے والے کو پانچسو روپے منافع ملا اور ضرورتمند کو تین ہزار روپے ملے، جبکہ بعد میں کپڑا لینے والا شخص کپڑا دینے والے کو تین ہزار روپے کی بجائے تین ہزار پانچسو روپے ادا کرے گا، تو کیا ازروئے شرع یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ اس صورت میں قرض دے کر ضرورتمند کی خیرخواہی کی بجائے مفاد پرستی نمایاں نظر آتی ہے لیکن بیع کی جملہ شرائط کی رعایت کی وجہ سے یہ عقد جائز ہے، اس صورت میں مشتری کا مقصد اور ضروریات پوری ہوجاتی ہیں جبکہ بائع کو بوجۂ نسیئہ مروجہ قیمت سے زیادہ

---

[۱] قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ : اذا اطلع المشتری علیٰ عیب المبیع فھو بالخیار ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۴۴ باب خیار العیب، کتاب البیوع)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۵ باب خیار العیب- کتاب البیوع۔

رقم ملتی ہے جس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ نقد کی نسبت اُدھار میں زیادہ قیمت لگانا جائز ہے۔

لما قال العلامۃ کمال الدین ابن الهمام رحمه الله : کان یحتاج المدیون فیأبی المسئول ان یقرض بل ان یبیع ما یساوی عشرۃ بخمسۃ عشر الی اجل فیشتریه المدیون و یبیعه فی السوق بعشرۃ حالۃ ولا بأس فی هذا فان الاجل قابله قسط من الثمن والقرض غیر واجب علیه دائماً بل هو مندوب فان ترکه بمجرد رغبۃ منه الی زیادۃ الدنیا فمکروه او لعارض یعذر به فلا .... و مالم ترجع الیه العین التی خرجت منه لا یسمّی بیع العینۃ لانه من العین المسترجعۃ لا العین مطلقاً والا فکلٌّ بیعٍ بیع العینۃ ۔ (فتح القدیر ج۶ ص۳۲۴ الکفالۃ) [1]

آٹا پیسنے کے عوض اناج جمع کر کے فروخت کرنا

سوال :- آجکل بعض علاقوں میں مشین سے آٹا پیسنے کے عوض مکئی وغیرہ لی جاتی ہے، تو کیا آٹا پیسنے کے عوض مکئی لینا اور اسے جمع کر کے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- آٹا پیسنے کے عوض مکئی لینا جائز ہے لہٰذا آٹا پیسنے کے عوض مکئی وغیرہ جمع کر کے اپنے لیے استعمال کرنا یا فروخت کرنا دونوں طرح جائز ہے، البتہ پسے ہوئے آٹا سے خصوصی طور پر مزدوری مقرر کر کے لینا قفیز الطحان کے حکم میں ہو کر اجارہ فاسد رہے گا۔

لما قال ابن عابدین رحمه الله : استاجر بغلاً لیحمل طعاماً ببعضه او ثوراً لیطحن برّہ

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمه الله : فان لم یعد کما اذا باعه المدیون فی السوق فلا کراهۃ فیه بل خلاف الاولیٰ لان الاجل قابله قسط من الثمن والقرض غیر واجب علیه دائماً بل هو مندوب ومالم ترجع الیه العین التی خرجت منه لا یسمّی بیع العینۃ لانه من العین المسترجعۃ لا العین مطلقاً و الا فکلٌّ بیعٍ بیع العینۃ واقره فی البحر والنهر والشرنبلالی وهو ظاهر وجعله السیّد ابو السعود محمل قول ابی یوسفؒ وحمل قول محمدؒ والحدیث علیٰ صورۃ العود۔ (رد المحتار ج۵ ص۳۲۶ کتاب البیوع، باب المتفرقات، مطلب بیع العینۃ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۳۵ کتاب الکفالۃ ۔

ببعض دقیقه فسدت .... والحیلة ان یفرز الاجر اولاً او یسمی قفیزًا بلا تعیین ثم یعطیه قفیزًا منه فیجوز قال الرملی وبه علم بالاولی الجواز ما یفعل فی دیارنا من اخذ الاجرة من الحنطة والدراهم معًا ولا شک فی جوازه۔

(ردّ المحتار ج ۶ ص۵۷ کتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی البیع) [1]

مشترکہ زمین سے اپنا حصّہ فروخت کرنا

سوال:۔ چند آدمیوں کے درمیان دس کنال مشترکہ زمین ہے، ان میں سے ایک حصّہ دار اپنا حصّہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا شریعتِ مقدّسہ میں مشترکہ زمین سے کسی حصّہ دار کو اپنا حصّہ فروخت کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب: مشترکہ زمین سے اپنا معلوم حصّہ فروخت کرنا از روئے شرع جائز ہے اگرچہ تقسیم نہ ہوئی ہو، تاہم اگر اپنا حصّہ فروخت کرتے وقت معلوم نہ ہو کہ مثلاً ثلث ہے یا ربع، ایک کنال ہے یا دو کنال، تو ایسی صورت میں یہ بیع جہالت کی وجہ سے باطل شمار ہو کر ناجائز ہوگی۔

لما قال محمد خالد الاتاسیؒ: بیع حصة شائعةٍ معلومة کالنصف والثلث والعشر من عقار مملوك قبل الافراز صحیح لانه لا یشترط فی صحة البیع الافراز عند التسلیم لاتفاقهم علی صحة بیع مشاع لا یمکن افرازه۔ (شرح مجلّة الاحکام تحت المادة ۲۱۴، ۲۱۵ ج۲ ص۱۲۳) [2]

---

[1] قال فی الهندیة: والحیلة فی ذلك لمن اراد الجواز ان یشترط صاحب الحنطة قفیزًا من الدقیق الجید ولم یقل من هذه الحنطة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۴۴۴، کتاب الاجارة، الفصل فی قفیز الطحان وماهو فی معناه)۔

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلّة لسلیم رستم باز تحت المادة ص۱۲۶۔

[2] قال محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوةؒ: اما بیعه فقسمان یحتمل القسمة اولا وکل قسم علی وجهین اما ان باع من اجنبی او من شریکه فالوجه الاول وهو البیع من اجنبی علی صنفین واما ان کان الکل له فباع نصفه او کان بین اثنین فباع احدهما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع کلها۔ (جامع الفصولین ج۲ ص۸۲ الفصل الحادی والثلاثون فی مسائل الشیوع)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۲۲۶ کتاب البیوع۔

مشترکہ طور پر خریدی ہوئی چیز سے اپنا حصہ نکالنے کا طریقہ

سوال: چند ساتھیوں نے آپس میں رقم جمع کرکے ایک چیز خریدی، چند ماہ کے استعمال کے بعد ان میں سے ایک نے اپنا حصہ واپس لینا چاہا تو کیا اُس ساتھی کو اس چیز کی موجودہ قیمت کے لحاظ سے رقم واپس کی جائے گی یا قیمتِ خرید کے حساب سے؟ جبکہ استعمال کی وجہ سے اُس چیز کی قیمت کافی کم ہوگئی ہو؟

الجواب: کوئی چیز مشترکہ طور پر خرید کر استعمال کرنے کے بعد جب کوئی حصہ دار اپنا حصہ واپس لینا چاہے تو اس کو موجودہ وقت کی قیمت کے اعتبار سے رقم واپس کی جائے گی نہ کہ قیمتِ خرید کے مطابق، کیونکہ کسی چیز کے استعمال کرنے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اسکی قیمت میں بھی ضرور اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا رہتا ہے۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: ولو تراضیا ان تقوم الکتب ویأخذ کل بعضها بالقیمة لو کان بالتراضی جاز والا لا۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۶ ص۲۶۱ کتاب الحظر والاباحة)[1]

زیادہ منافع کی اُمید پر کسی چیز کی فروخت میں تاخیر کرنا

سوال: کاروبار کے سلسلے میں اگر کوئی شخص کسی دوسرے شہر سے حیوانات کی خوراک یا غلہ وغیرہ لائے اور اس وقت مارکیٹ میں مندی ہو، اب یہ شخص اس امید پر مال کی فروخت چند ماہ کے لیے مؤخر کردے تاکہ بعد میں منافع زیادہ ملے۔ کیا اس شخص کا یہ اقدام ذخیرہ اندوزی کے دائرہ میں آکر حرام ہے یا جواز کی گنجائش ہے؟

الجواب: ذخیرہ اندوزی میں بنیادی طور پر مقامی لوگوں کی حق تلفی کرکے اپنے منافع و فوائد پیشِ نظر ہوتے ہیں لیکن کسی دوسرے شہر سے اجناس وغیرہ اپنے شہر یا گاؤں کو منتقل کرنے سے اس گاؤں والوں کا حق نہیں رہتا، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا یہ اقدام جائز ہے کیونکہ اس میں مقامی لوگوں کی حق تلفی نہیں ہوتی، تاہم مسلمانوں کو تکلیف میں دیکھتے ہوئے

---

[1] قال فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی رحمہ اللہ: والعبد الواحد والدابة الواحدة یباع ویقسم ثمنها لانها لاتحتمل القسمة وکذلك کل ما یکون فی تبعیضه ضرر۔

(الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۱۵۰ کتاب القسمة)

ومثله فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۱۴۲ ص۶۳۳۔

ذاتی مفادات کو ترجیح دینا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ومن احتکر غلۃ ضیعتہ او ما جلبہ من بلد آخر فلیس بمحتکر۔ (الہدایۃ ج۴ ص۴۲۲ کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع) ۱؎

بیع قطعی سے انحراف درست نہیں

سوال: ایک شخص نے کسی پر بخوشی ورضا اپنی دوکان پچاس ہزار روپے کے عوض فروخت کی اور مشتری نے کچھ رقم ادا کرکے باقی کا وعدہ کیا، چند دنوں کے بعد یہی بائع کسی اور آدمی کے ساتھ دوکان کا سودا کرنا چاہتا ہے، کیا بائع کے لیے اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: باضابطہ طور پر ایجاب وقبول کے بعد بائع بیع فسخ کرکے مبیعہ کو کسی دوسرے پر فروخت کرنے کا شرعاً حق نہیں رکھتا، البتہ اگر بائع اور مشتری نے آپس میں باہمی رضامندی سے بیع فسخ کرلی تو بائع کے لیے مبیعہ کسی دوسرے کو دینے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منہما من عیب او عدم رؤیۃ۔ (الہدایۃ ج۳ ص۲۵ کتاب البیوع) ۲؎

بائع اور مشتری کا ایک بار تولنے پر اکتفاء کرنا

سوال: جب موزونی یا مکیلی اشیاء ناپ تول کے حساب سے خریدی جائیں، اگر مشتری کے سامنے ایک دفعہ جب چیز تولی جائے تو کیا مشتری کے لیے دوبارہ تولنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی چیز کو ناپ تول کے حساب سے خرید کر جب طرفین کی موجودگی میں اس

۱؎ قال فی الہندیۃ: ومن اشتری طعاماً فی مصر و جلبہ الی مصر آخر واحتکرہ فیہ فانہ لا یکرہ ھکذا فی المحیط۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۳ ص۲۱۳ فصل فی الاحتکار کتاب البیوع)

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۹ کتاب الاستحسان۔

۲؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: البیع یلزم بایجاب وقبول ای حکم البیع یلزم بہما لانہ جعلہما غیرہ وانہ یلزم بہما مع ان البیع لیس الا ہما لانہما ارکانہ۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۶۲ کتاب البیوع)

ومثلہ فی التبیین الحقائق ج۴ ص۳ کتاب البیوع۔

مطلوبہ چیز کو ناپ تول لیا جائے تو مشتری کو دوبارہ ناپ تول کی ضرورت نہیں بلکہ خریدنے کے بعد دونوں کی موجودگی میں ہی تولنا کافی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : قال فی الخانیة لواشتری کیلاً مکایلةً او موزوناً موازنةً فکال البائع بحضرة المشتری۔ قال الامام ابن الفضل یکفیه کیل البائع ویجوز له ان یتصرف فیه قبل ان یکیله۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۵۱ مطلب فی تصرف البائع فی المبیع قبل القبض) [1]

شرکاء کا اپنے حصص کا کسی ایک شریک کے ہاتھ فروخت کرنا

سوال:۔ چند شرکاء آپس میں مشترکہ طور پر کوئی چیز خریدتے ہیں، خریدنے کے بعد آپس میں یہ شرکاء بولی کرکے جو زیادہ قیمت پر آمادہ ہو تو وہ مبیعہ لیکر ہر ایک شریک کو اپنی رقم بمع منافع واپس کرتا ہے، توکیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں چونکہ تمام شرکاء مشترکہ طور پر کوئی چیز لے کر آپس میں نیلام کرتے ہیں اور جو زیادہ رقم دینے والا ہو تو مبیعہ اس کے حوالے کیا جاتا ہے، پس اس میں اگر نیلام سے طے شدہ رقم اپنے حصہ کے علاوہ دیگر شرکاء کے حصص کا عوض ہو تو یہ جائز رہے گا ورنہ مجموعہ کو خریدنا جس میں اپنا حصہ بھی شامل ہو جائز نہیں۔

لما قال فی مجلة الاحکام : الشریك مخیر ان شاء باع حصته من شریکه وان شاء باعها عن اجنبی بدون اذن شریکه۔ لکن فی صور خلط الاموال واختلاطها التی بیناها فی الفصل الاول۔ (مجلة الاحکام المادة ۱۰۸۸ ص۲۱۰) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ : اما اذا کاله فی حضرته فانه یغنی عن کیله وهو الصحیح لان المبیع صار معلوماً بکیل واحد۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۸ فصل فی بیان التصرف فی المبیع والثمن قبل قبضه)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۸۵ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : وکل من شرکاء الملك اجنبی فی مال صاحبه. فصح له بیع حصته ولو من غیر شریکه بلا اذن الا فی صورة الخلط۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۰۰ کتاب الشرکة مطلب الحق ان الدین یملك)
وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸۔

قرض کو فروخت کرنا

سوال: میں سعودی عرب میں کاروبار کرتا تھا وہاں میرا کسی کے ذمے دس ہزار روپے قرضہ ہے لیکن اب وہاں جانا اور اپنا قرض وصول کرنا بہت ہی مشکل ہے اس لیے میں یہ قرض کسی پر نو (۹) ہزار روپے پر فروخت کرنا چاہتا ہوں، کیا قرض کی رقم اس طرح فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: مقروض کے علاوہ کسی اور پر قرض فروخت کرنا فقہاء نے ممنوع قرار دیا ہے صورتِ مذکورہ میں چونکہ نقد نو ہزار روپے کے بدلے قرض کے دس ہزار روپے لیے جاتے ہیں جو کہ ربوا نسیئہ کی وجہ سے اس کا خریدنا حرام ہوگا۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : وبیع الدّین لا یجوز ولو باعہ من المدیون او وھبہ جاز ۔ (الاشباہ والنظائر ج ۲ ص۱۱ المادۃ ملا کتاب البیوع)

غیر مسلموں کی متروکہ اشیاء فروخت کرنا

سوال: کسی ملک میں غیر مسلم کچھ عرصہ تک آباد رہنے کے بعد وہاں سے چلے جائیں تو ان کی باقیماندہ اشیاء کا کیا حکم ہے ؟ کیا ان کو فروخت کر کے حاصل ہونے والی قیمت کو ذاتی استعمال میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: کسی مسلم ملک سے غیر مسلم اقوام کے چلے جانے کے بعد ان کی رہ جانے والی جائیداد یا دیگر اشیاء ذاتی مفاد کے لیے فروخت کرنا شرعاً ممنوع ہے بلکہ ان اشیاء کو یا ان کی قیمت کو بیت المال کے حوالہ کرنا ہوگا، اور اگر بیت المال کا کوئی قابلِ اعتماد انتظام نہ ہو بلکہ اُس میں ان اشیاء کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر کسی ایسی جگہ میں خرچ کرنا مناسب ہے جہاں سے عمومی مفادات وابستہ ہوں، ایسے اموال کے لیے دینی مدارس اور درسگاہیں بہترین مقاماتِ مصرف ہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ : وما وجد المسلمون علیھم من اموال

ـــہ قال ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ : بیع ھذہ الدیون من غیر من علیہ والشراء بھا من غیر من علیہ فینظر ان اضاف البیع والشراء الی الدّین لم یجز۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۸۲ فصل واما شرائط الصحۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاویٰ تنقیح حامدیۃ ج ۲ ص۲۴۹ کتاب المداینات ۔

اهل الحرب بغیر قتال یصرف علیه فی مصالح المسلمین کما یصرف الخراج قالوا هو مثل الاراضی التی اجلوا اهلها عنها ۔ (الهدایة ج ۲ ص ۵۶۴ کتاب السیر، فصل، واذا دخل الحربی الینا۔ الخ) [1]

ہم جنس موزونی اشیاء کو بلاوزن فروخت کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں کچھ اشیاء بغیر تول کے فروخت کی جاتی ہیں، پس اگر بعض موزونی اشیاء مثلاً پیاز، لہسن وغیرہ اندازہ سے بغیر تول کے اپنی ہم جنس پر فروخت کی جائیں تو از روئے شرع یہ بیع درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ موزونی اشیاء بغیر تول کے اپنی جنس پر فروخت کرنا اور تبادلہ میں لینا جائز نہیں کیونکہ اس میں ربوٰا (سود) کا شبہ پایا جاتا ہے، پس یہی شبہ حقیقی ربوٰا کے قائم مقام ہو کر بیع جائز نہ ہوگی۔

لما قال علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ویجوز بیع الطعام والحبوب مکایلۃ و مجازفۃ وھٰذا اذا باعه بخلاف جنسه لقوله علیه السلام اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم بعد ان یکون یدًا بیدٍ بخلاف ما اذا باعه بجنسه مجازفۃً لما فیه من احتمال الربٰوا۔ (الهدایة ج ۳ ص ۲۱ کتاب البیوع) [2]

گڑ کا معیار بہتر بنانے کے لیے رنگ کاٹ استعمال کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں گڑ صاف کرنے کے لیے

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وما اخذ منهم بلا حرب ولا قهر کا لهدیة والصلح فهو لا غنیمة ولا فیئ وحکمه حکم الفیئ لا یخمس ویوضع فی بیت المال۔
(رد المحتار ج ۴ ص ۱۳۸ باب المغنم وقسمته، مطلب فی بیان معنی الغنیمة والفیئ)
ومثله فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۷۲ کتاب السیر۔

[2] قال ابن نجیم: وبیاع الطعام کیلاً وجزافاً للحدیث البخاری فاذا اختلف هٰذه الاصناف فبیعوا کیف شئتم ولا یرد علیه بیع الجنس بالجنس من الربٰوا مجازفةً لما سیأتی فی الربٰوا من انه غیر جائز الا اذا کان قلیلاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۸۲ کتاب البیوع)
ومثله فی فتح القدیر ج ۵ ص ۴۶۹ کتاب البیوع۔

رنگ کاٹ (خاص قسم کا کیمیکل) استعمال کیا جاتا ہے تاکہ سفید ہو کر قیمت بڑھ جائے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور بیع پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ اگر گڑ کی صفائی اور اس کا معیار بہتر بنانے کے لیے رنگ کاٹ استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر رنگ کاٹ کے استعمال کا مقصد ادنیٰ قسم کو اعلیٰ ظاہر کرنا ہو یا مشتری کی تلبیس اور اسے دھوکہ دینا مقصود ہو تو یہ ملاوٹ کے مترادف ہو کر ناجائز اور حرام ہوگا۔

اخرج الامام ابو داؤدؒ: عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم مرّ برجل یبیع طعامًا فسئله کیف تبیعه فاخبره فاوحی الیه ان ادخل یدك فادخل یده فیه فاذا هو مبلول فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لیس منّا من غشّ۔

(ابوداؤد ج ۲ ص۱۳۳ باب نهی عن الغش ـ کتاب البیوع) ۱ـه

جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کرنا

سوال:۔ جمعہ کی اذان کے بعد تجارت (کاروبار) کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جمعہ کے دن جب وقت داخل ہونے پر اذان دی جائے تو اس وقت جمعہ کے متعلقہ امور کے علاوہ دیگر امور میں مصروف ہونا مناسب نہیں، اس بنا پر جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جمعہ کی سعی اور تیاری متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کو موقوف کر دینا چاہیئے۔

لما قال الله تبارك وتعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (سورة الجمعة آیت ۹) ۲ـه

۱ـه قال فی الهندیة: ویکره ان یلبس الجید بالردی وان یصبغ اللحم بالزعفران۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۲۱۵ فصل فی الاحتکار)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۱۰۱ باب البیع الفاسد، بعد مطلب احکام نقصان المبیع فاسدًا۔

۲ـه لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: والبیع عند اذان الجمعة قال الله تعالیٰ وذروا البیع ثم فیه اخلال بواجب السعی علی بعض الوجوه وقد ذکرنا الاذان المعتبر فیه فی کتاب الصلوٰة کل ذلك یکره لما ذکرنا ولا یفسد به البیع۔ (الهدایة ج۳ ص۶۹ فصل فیما یکره ـ کتاب البیوع ـ

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۹۹ فصل فی البیع الفاسد۔

ضرورت سے زائد روٹیاں جمع کر کے فروخت کرنا

سوال:۔ بعض لوگ ضرورت سے زائد روٹیاں (ٹکڑے وغیرہ) جمع کر کے فروخت کرتے ہیں تو کیا ان روٹیوں کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید و فروخت کے لیے بنیادی طور پر کسی چیز کا مال متقوم ہونا لازمی ہے، اس بناء پر روٹی اور آٹا چونکہ مال متقوم میں سے ہے لہٰذا اسکی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے۔

لما قال فخرالدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: وشرطہ ان یکون فی العقد عوضان کل واحدٍ منهما مال یتحقق رکن البیع وهو مبادلة المال بالمال۔ (تبیین الحقائق ج۴ ص۱۶ فصل فی قبض المشتری المبیع فی البیع الفاسد بامر البائع) ؎۱

کاریز کا پانی فروخت کرنا

سوال: بعض علاقوں میں پانی کی کمی دور کرنے کے لیے کاریز استعمال کئے جاتے ہیں، تو کیا ان کاریزوں سے حاصل ہونے والا پانی فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے کاریز کو نہر جاری کے حکم میں شمار کیا ہے، نہر کے پانی کی طرح کاریز کا پانی بھی مملوک اور محرز نہیں اسلئے کاریز کا پانی فروخت کرنا جائز نہیں، تاہم اگر اس کو باقاعدہ طور پر محرز کر کے فروخت کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: والثالث اذا دخل الماء فی المقاسم فحق الشفعة ثابت..... ولان البئر ونحوها ما وضع للاحراز وکلا یملك المباح بدونه کالظبی اذا تکنس فی ارضه۔ (الهدایة ج۴ ص۴۸۲ فصول فی مسائل الشرب) ؎۲

؎۱ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وقید بقوله وکل من عوضیه مال لیخرج البیع بالمیتة وکل بیع باطل۔ (البحر الرائق ج۶ ص۹۲ فصل فی البیع الفاسد)

وَمِثْلُهٗ فی حاشیة الشلبی علی هامش تبیین الحقائق ج۴ ص۳ کتاب البیوع۔

؎۲ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: والقناة مجری الماء تحت الارض..... لانه نهر فی الحقیقة نعتبر بالنهر ولان الانهار والابار والحیاض لم توضع للاحراز والمباح لایملك الا بالاحراز۔ (البحر الرائق ج۸ ص۲۱۲ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۶ ص۴۳۹ کتاب احیاء الموات۔

بیع فضولی کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کی مملوکہ زمین اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اس کے بھائی نے فروخت کردی اب وہ اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہے، اس کے اصرار کے باوجود بھی مشتری واپس کرنے پر رضامند نہیں، تو اب مذکورہ زمین کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ کسی کی مملوکہ زمین میں مالک کی اجازت کے بغیر شرعاً کسی کو بھی تصرف کا حق حاصل نہیں لہٰذا جو زمین کسی کی بذریعہ شہادت ثابت شدہ وتسلیم شدہ ملکیت ہو تو اس میں کسی اور کا تصرف درست نہیں اور وہ شرعاً اپنی ملکیتی زمین واپس لینے کا مجاز ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ومن باع ملک غیرہ بغیر امرہ فالمالک بالخیار ان شاء اجاز البیع وان شاء فسخ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۹ کتاب البیوع۔ فصل فی بیع الفضولی)[1]

جانوروں کے خون کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ جانوروں کا خون بیچنا کیسا ہے اور اس سے انتفاع کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ خون بذاتِ خود ایک نجس شے ہے اور اسلام نے اس کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے اس سے بلا ضرورتِ شرعی انتفاع لینا بھی صحیح نہیں، لہٰذا جانوروں کے خون کی خرید و فروخت اور اس سے انتفاع دونوں صحیح نہیں ہے۔

قال العلامۃ التمرتاشیؒ: بطل بیع مالیس بمال کالدم والمیتۃ۔ (تنویر الابصار ج ۴ ص۱۱۲ کتاب البیوع)[2]

کما قال اللہ تعالیٰ: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۔)

کما قال الرسولﷺ: ان اللہ اذا حرم علی قوم اکل شئ حرم علیھم ثمنہ۔

(اعلاء السنن ج ۱۴ ص۸۰ ابواب البیوع الفاسدۃ۔ باب حرمۃ بیع الخمر الخ)

---

[1] قال العلامہ ابن عابدین رحمہ اللہ: شرائط النفاذ اثنان الملک اوالولایۃ وان لایکون فی البیع حق لغیرالبائع فلم ینفذ بیع الفضولی۔ (ردالمحتار ج۴ ص۵۰۵ کتاب البیوع، مطلب شرائط البیع انواع اربعۃ)

ومثلہ فی الھندایۃ ج ۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع ... الخ ـ

[2] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: بیع المیتۃ والدم والحر باطل لانھا لیست اموالاً فلا تکون محلاً للبیع۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۳۳ باب الفاسد۔ کتاب البیوع)

مشترکہ جائیداد اور اراضی کی بیع وشراء کا حکم

سوال:۔ مشترکہ جائیداد اور اراضی کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں؟

الجواب:۔ مشترکہ جائیداد کی خرید و فروخت جائز ہے بشرطیکہ اس میں تمام شرکاء کی رضامندی شامل ہو کیونکہ ہر ایک اپنے حصہ کا مالک ہے اور مالک اپنے حصہ میں تصرّف کر سکتا ہے، لہٰذا یہ بیع صحیح ہے فاسد نہیں ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : اذ باع احد الشریکین نصفها فان ثم یجوز البیع فی نصف الدار لان بیع المالك انصرف الی نصیبه باع احدهما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع۔ (تنقیح الحامدیة ج۱ ص۲۲۵ کتاب البیوع)[1]

مشتری کا بائع کو دھوکا دینا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے بغبن فاحش زمین خریدی، اب وہ تیرہ چودہ سال کے بعد یہ زمین بائع کو واپس کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کو یہ حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ ایسی خرید و فروخت جس میں ایک دوسرے کو دھوکا دیا گیا ہو فریقین کو اسے رَدّ کرنے کا اختیار ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : وان غر المشتری البائع او با العکس اوغره الدلال فله الرّد۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۶۸ باب المرابحة والتولیة)

لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ اس غبن کے معلوم ہونے سے پہلے مشتری نے مبیع میں تصرف نہ کیا ہو اور نہ بائع نے ثمن میں تصرّف کیا ہو جس سے ان کی رضا معلوم ہوتی ہے۔

کما قوله علیه السلام : نهی عن بیع الحصاة وعن بیع الغرر۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۸۹)[2]

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ : هٰذا لانه بالبیع صار شرکة ملك حتی لایجوز لکل واحد منهما ان یتصرف فی نصیب الاجر ثم بالقصد بعد ذٰلك صار شرکة عقد فیجوز لکل واحد منهما ان یتصرّف فی نصیب صاحبه۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۳۱۷ کتاب البیوع)

[2] قال العلامة خالد اتاسیؒ : اذا غر احد المتبایعین الاخر وتحقق ان فی البیع غبنًا فاحشًا فللمغبون ان یفسخ البیع حینئذٍ۔ (شرح المجلة ج۲ ص۱۹۹ الفصل السابع)۔

قربانی کے لیے خریدے گئے حاملہ جانور کی واپسی کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے کسی سے قربانی کے لیے جانور خریدا، بیع ہو جانے کے بعد مشتری کو علم ہوا کہ وہ تو حاملہ ہے، کیا صرف اس وجہ سے اس کو واپس کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- بیع تام ہو جانے کے بعد جب کسی جانور میں عیب کا پتہ چلے اور وہ بائع کے ہاں سے ہی اس جانور میں موجود ہو اور بائع نے بتایا بھی نہ ہو تو اس وجہ سے مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے، کسی جانور کا حاملہ ہونا کوئی عیب نہیں اس لیے صورتِ مسئولہ میں مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں، تاہم اقالہ کی صورت میں مبیعہ واپس کیا جا سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: نعم له ردها بعيب الحبل والحبل عيب في الجارية لا في البهائم۔ (تنقيح الحامدية ج۱ ص۲۷۰ كتاب البيوع - باب الخيارات)[۱]

بیع فسخ کرنے کی صورت میں بائع پر جرمانہ لگانا

سوال:- دو آدمیوں نے کچھ مشترکہ زمین فروخت کی اور مشتری سے کچھ رقم نقد لے لی اور بقیہ رقم رجسٹری کی تکمیل تک مؤخر کر دی گئی اور اس کے ساتھ مشتری نے یہ شرط لگائی کہ اگر بائع نے زمین واپس لی تو اسے پچیس ۲۵ روپے جرمانہ ادا کرنا ہوگا، کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب:- مذکورہ صورت میں اگر یہ شرط اور رقم کی وصولی وغیرہ بیع کے ایجاب و قبول کے وقت لگائی گئی ہو تو یہ بیع فاسد ہے اور اس سے ہر ایک بلا رضائے غیر فسخ کر سکتا ہے، نیز فسخ کی صورت میں وصول کردہ رقم واپس کرنا ضروری ہے تاہم فسخ کرنے والے سے جرمانہ لینا جائز نہیں اور اگر ایجاب و قبول کے بعد ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: طلب في الشرط الفاسد اذا ذكر

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: رجل اشترى حمارًا واحبلها لا يردها بالعيب۔ (خلاصة الفتاوى ج۳ ص۳۷ باب خيار العيب، كتاب البيوع)
وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۶ ص۴۵ باب خيار العيب۔

بعد العقد او قبلہ لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ وفیہ نفع لاحدھما اوفیہ نفع مبیع ھوا ھل الاستحقاق بنفع۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۶ باب بیع الفاسد)[1]

وقتِ معین تک ثمن کی ادائیگی کا اختیار دینا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے متعلق کہ اگر بائع مشتری سے یہ کہے کہ اگر تو شام تک مجھے رقم ادا کردے تو تیرے اور میرے درمیان معاملہ باقی ورنہ رد ہوگا، کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

الجواب:۔ اس طرح کی بیع کرنا بیع کی صحت کے منافی نہیں، لہٰذا اگر صورت مسئولہ کے مطابق اگر مشتری نے شام تک طے شدہ رقم بائع کو ادا نہ کی تو استحساناً بیع ختم ہوجائے گی۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: وعن باع علی انہ ان لم ینقد الثمن الی ثلثۃ ایام فلا بیع بینھما جاز۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۴ باب خیار الشرط)[2]

پشیمان ہونے پر رقم واپس کرنا لازم ہے

سوال: ایک شخص نے کسی سے مکان خریدا اور کچھ پیشگی رقم بھی اسے دے دی، مگر ایجاب وقبول اور مبیعہ پر قبضہ کرنے کے بعد کسی وجہ سے مشتری مکان خریدنے پر پشیمان ہوگیا اور بائع کو مکان واپس کرکے ادا کردہ رقم واپس لینا چاہتا ہے۔ تو کیا مشتری مکان واپس کرکے بائع سے اپنی رقم لینے کا شرعاً حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بائع کے لئے پیشگی کی رقم لینا حرام ہے، بلکہ بائع اپنے مبیع پر قبضہ کے بعد ثمن مشتری کو واپس کردے۔

قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: فان شرط اکثر منہ او اقل فالشرط باطل

---

[1] کما فی الحدیث قولہ علیہ السلام: کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل فبطل الشرط الواحد وکل مالم یعقد الا بہ۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۱۱۳ باب النھی عن البیع بالشرط) ومثلہ فی الھدایۃ ج۳ ص۴۳ کتاب البیوع۔ باب بیع الفاسد۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: فان نقد الثمن تم البیع وان لم ینقد انفسخ البیع وفی بعضھا فسد البیع ولو باع عبد علی انہ ان لم ینقد المشتری الثمن الی ثلثہ ایام فلا بیع صح استحساناً۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۹ کتاب البیوع)

ویرد مثل الثمن الاول لقوله علیه السلام من اقال نادماً بیعته اقال اللہ عثرته یوم القیامة۔ (الهداية ج۳ ص۷۱ باب الاقالة)[1]

بیع میں بیعانہ ضبط کرنے کے رواج کا شرعی حکم

سوال:۔ کسی شخص نے ایک مکان فروخت کیا اور رواج کے مطابق مشتری سے کچھ رقم بطور بیعانہ بھی لے لی، اور اس بیع میں فریقین کے مابین یہ شرط طے پائی کہ ایک مدتِ معین تک اگر بائع انکار کر دے تو وہ مشتری کو دس ہزار روپے بطور جرمانہ دے گا، اور اگر مشتری مقررہ مدت میں باقی رقم ادا کر کے اس مکان کی رجسٹری نہ کرا سکا تو بیعانہ کی رقم ضبط کر لی جائے گی۔ اس کے کسی وجہ سے مشتری اس شرط کو پورا نہ کر سکا تو کیا بائع کو بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں مشروط عقدِ بیع فاسد ہے اور متعاقدین کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے، نیز بائع کو بیعانہ ضبط کرنے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔[2]

کما قوله علیه السلام: نهی عن بیع العربان۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۱۲۷ باب النهی عن بیع العربان)

کلوگرام کے حساب سے کوئی چیز خرید کر سیر کے حساب سے فروخت کرنا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص بیرونِ ملک سے کچھ چیزیں کلوگرام کے حساب سے خرید کر اپنے ملک میں سیر کے حساب سے فروخت کرتا ہے، اسی طرح وہاں سے کپڑا میٹر کے حساب سے خرید کر اپنے وطن میں اُسے گز کے حساب سے فروخت کرتا ہے، تو کیا اس کا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق خرید و فروخت کا یہ طریقہ بالکل جائز ہے

---

[1] قال العلامة ابن الهمامؒ: وحقيقة الفسخ ليس الا رفع الاول كان لم يكن فيثبت الحال الاول وثبوت الحال الاول هو برجوع عين الثمن الاول الى مالكه كان لم يدخل فى الوجود غيره وهو يستلزم تعيين الاول۔ (فتح القدير ج۶ ص۱۱۴ باب الاقالة)

[2] قال العلامة المرغينانیؒ: كل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لاحد المتعاقدين او للمعقود عليه وهو من اهل الاستحقاق يفسده۔ (الهداية ج۳ ص۶۲ باب البيع الفاسد)

بشرطیکہ اس میں کوئی دھوکا نہ ہو۔

قال العلامة المرغینانیؒ: یجوز بیع الطعام والحبوب مکایلة ومجازفة — قال ویجوز باناء بعینه لا یعرف مقدارہ وبوزن حجر بعینه لا یعرف مقدارہ لان الجهالة لا تفضی الی المنازعة۔ (الهدایة ج ۳ ص ۲۷ کتاب البیوع)[1]

نابالغ کی جائیداد جبراً فروخت کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ:۔

(۱) کیا کسی نابالغ کی جائیداد جبراً فروخت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۲) دو نابالغ بھائیوں میں سے ایک اپنے دوسرے بھائی کی جائیداد فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اُس کو اِس کا علم بھی نہ ہو؟

(۳) شفعہ کا حق نسبت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے یا جوار (قُرب) کی وجہ سے؟

الجواب:۔ (۱) کسی اجنبی کو نابالغ کی جائیداد بدون اس کی رضا کے فروخت کرنا درست نہیں، تاہم باپ کو منفعت کے پیشِ نظر تصرف کا حق ہے۔

(۲) اگر یہ فروخت کنندہ بذاتِ خود یتیم ہو اور اس کے ساتھ نابالغ اور غیر عاقل بھی ہو تو اس کی خرید و فروخت کالعدم و نامنظور ہے

لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وشرط اهلیة المتعاقدین یکونهما عاقلین لا یشترط البلوغ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۵ کتاب البیوع)

(۳) اور شفعہ کا حق نسبتِ نسب کی بجائے شرکت اور جوار (قُرب) کی وجہ سے زیادہ حاصل ہے۔

قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمه الله: واذا اکره الرجل علی بیع ماله او علی شراء سلعةٍ او علی ان یقر لرجل بالف یواجر دارہ واکره علی ذلک

---

[1] قال العلامة بدر الدین العینی رحمه الله: یباع الطعام کیلاای من جنس الکیل ویباع ایضاً وجزاماً لان بکل منهما یصیر معلوماً اما المکایلة فظاهر واما الجزاف فلانه بالاشارة تفع الجهالة۔ (عینی شرح کنز ج ۲ ص ۳ تحت فی بیان احکام البیوع)
ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۸۲ تحت احکام البیوع۔

بالقتل او بالضرب الشديد و بالحبس فباع او اشترىٰ فهو بالخيار ان شاء مضى البيع وان شاء فسخه بالمبيع۔ (الهداية ج۳ ص۳۳ كتاب البيوع)[1]

بائع کا منفعت کی شرط لگانا باطل ہے

سوال :- ایک شخص نے کسی پر ایک مکان بطور رہن یہ شرط لگا کر فروخت کر دیا کہ جب رقم واپس کی جائے گی تو مکان بھی واپس مل جائے گا، تو کیا یہ بیع شرعاً جائز ہے ؟

الجواب :- جس بیع میں بائع کی منفعت کے لیے ایسی شرط لگائی گئی ہو تو وہ بیع فاسد ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں اس سے ممانعت کی گئی ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: وكل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لاحد المتعاقدين او للمعقود عليه وهو من اهل الاستحقاق يفسده العقد۔

(الهداية ج۳ ص۶۲ كتاب البيوع، باب البيع الفاسد)[2]

رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے بیع وشراء کا حکم

سوال :- ایک گاؤں کے مکینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنے گاؤں کی چیزیں مثلاً انڈے، مرغیاں وغیرہ فلاں خاص شخص ہی کو فروخت کریں گے، نیز وہ اس معین شخص پر یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ تو ہم کو بیس روپے ماہانہ چندہ دے گا جسے ہم رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کریں گے، تو کیا خرید وفروخت کیلئے ایسی شرط

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: (وقوله بالجور) القضاء بخلاف الحق اما عن خطاء او عمد وكل على وجهين اما في حقه تعالىٰ او حق العبد فالخطاء في حق العبد اما ان يمكن فيه لتدارك والرد اولا فان امكن بان قضى بمال او صدقة او طلاق او عتاق... يبطل القضاء۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۸۰ كتاب القضاء مطلب فيما لو قضى بالجور)

وايضًا (وقف بيع مال الغير) لو الغير بالغًا عاقلًا فلو صغيرًا او مجنونًا لم ينعقد اصلًا كما في الزواهر معزيا للحاوي۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۱۵۲ كتاب الوقف)

[2] قال العلامة المرغيناني رحمه الله: كل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لاحد المتعاقدين الى آخره۔ (الهداية ج۳ ص۶۲ باب بيع الفاسد)

ومثله في خلاصة الفتاوىٰ ج۳ ص۵۴ كتاب البيوع۔ باب البيع الفاسد۔

لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ درج بالا صورت میں منصوبہ بندی سے ایک معین شخص سے خرید وفروخت جائز ہے بشرطیکہ اس سے ذخیرہ اندوزی اور روزہ مرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں بڑھانا مقصود نہ ہو، البتہ چندہ دینے کی شرط لگانا جائز نہیں، ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے چندہ دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وفی مجلة الاحکام: البیع بشرط لیس فیہ نفع لاحد العاقدین یصح والشرط لغو۔ (مجلة الاحکام ص۸۹ المادة ۱۸۹ کتاب البیوع۔ الفصل الرابع فی الشرط بالبیع) [۱]

موہوبہ زمین کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موہوبہ زمین کی خرید وفروخت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موہوبہ زمین کو باقاعدہ ہبہ کے بعد فروخت کیا جا سکتا ہے بلکہ اس سے واہب کو رجوع کا حق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: اذا باع الموھوب لہ الموھوب او اخرجہ عن ملکہ بالھبة والتسلیم لایبقی للواھب حق الرجوع۔ (شرح المجلة۔ المادة ۸۶۷ ص۴۸۱ تحت احکام الھبة) [۲]

الکحل کی تجارت کا حکم

سوال:۔ آجکل بعض ادویات میں الکحل استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا کاروبار رواج پکڑ چکا ہے، تو کیا الکحل کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

---

[۱] قال العلامة سلیم رستم باز اللبنانی رحمہ اللہ: لو شرطا فی البیع نفعاً علی اجنبی کما اذا باعہ شیئاً بشرط ان یقرضہ فلان عشرة دراھم فالبیع صحیح والشرط لغو۔ (شرح مجلة الاحکام ص۸۹ المادة ۱۸۹ کتاب البیوع۔ الفصل الرابع فی الشرط بالبیع)

[۲] قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ: خروج الھبة من ملک الموھوب لہ با لکلمة بان باع الھبة او وھبھا (البحر الرائق ج۷ ص۲۹۳ تحت باب الرجوع فی الھبة)

الجواب:۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اشربہ اربعہ کے علاوہ جب شراب دیگر اناج و اشیاء سے بنائی گئی ہو تو بصورت شرعی مجبوری استعمال کرنا جائز ہے تو اس کی تجارت کی بھی گنجائش موجود ہے۔ موجودہ الکحل (جو کہ شراب ہی کی ایک قسم ہے) چونکہ پٹرول، بھٹی وغیرہ اشیاء سے بنائی جاتی ہے اور ضرورتاً بہت ساری ادویات، رنگوں کے علاوہ دیگر کیمیکلز میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اس لیے بناء بر قول امام ابو حنیفہؒ اس کی خرید و فروخت جائز ہے، موجودہ دور میں عموم بلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: الشراب لغة كل مائع يشرب واصطلاحاً ما يسكر والمحرم منها اربعة...... وصح بيع غير الخمر۔ قال ابن عابدينؒ: تحت قوله صح بيع غير الخمر) اى عنده خلافاً لهما فى البيع والضمان لكن الفتوىٰ على قوله فى البيع۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۴۵۴ كتاب الاشربة) [1]

حیوانات کی ادھار بیع کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے دوسرے شخص سے کہا کہ آپ اس سال مجھے اپنا بیل دے دیں، میں اس کے عوض میں آئندہ سال دوسرا بیل دے دوں گا، تو کیا شرعاً یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسئولہ صورت میں حیوان کی بیع حیوان کے بدلے میں بصورتِ قرض ہے جو کہ شرعاً حرام ہے، اس لیے دونوں عاقدین کی یہ عقدِ بیع جائز نہیں۔

عن ابن عمرؓ ان النبى صلى الله عليه وسلم نهى بيع الحيوان بالحيوان نسيئةً۔

(معانى الآثار ج ۲ ص ۲۲۹ باب النهى عن بيع الحيوان بالحيوان نسيئةً) [2]

---

[1] قال العلامة المرغينانيؒ: الاشربة المحرمة اربعة...... وقد بينا المعنىٰ من قبل الا ان حرمة هٰذه الاشربة دون حرمة الخمر حتىٰ لا يكفر مستحلها ويكفر مستحل الخمر..... ويجوز بيعها ويضمن متلفها عند ابى حنيفة خلافاً لهما فيهما الخ۔ (الهداية ج ۴ ص ۴۹۲ كتاب الاشربة)

[2] قال الشيخ ظفر احمد العثمانيؒ: لا يجوز بيع شئ من الحيوان من الرقيق ولا غيره بشئ من الحيوانات الرقيق ولا غيره نسيئة لان الحيوان لا يجوز فيه السلم اى التاجيل وقال عن عبد الله بن مسعودؓ انه نهى السلم فى الحيوان۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳۸۵ باب النهى عن بيع الحيوان بالحيوان نسيئةً)

وَمِثْلُهٗ فى كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ج ۲ ص ۳۰۸ كتاب البيع، اركان السلم۔

خشک و تر کھجور میں تفاضل

سوال:۔ تیار کھجور جوکہ عام طور پر بازار میں ملتی ہے اگر اس کو تر یعنی کچی کھجور سے (جوکہ ابھی تک درخت پر ہے) دوگنا زیادہ وزن سے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بازار میں دونوں کی قیمت میں بہت فرق ہے، مثلاً تر کھجور فی کلو دس۱۰ روپے اور تیار کھجور تیس۳۰ روپے فی کلو کے حساب سے فروخت کی جاتی ہے۔

الجواب:۔ احناف کے نزدیک رطب اور تمر دونوں ایک جنس سے ہیں اس لیے ان کی بیع برابر سرابر کی جائے گی، زیادتی ربٰو (سود) میں داخل ہے، لہٰذا تر کھجور کو عام کھجور کے مقابلہ میں دوگنا وزن یا قیمت پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ويجوز بيع الرطب بالتمر مثلاً بمثل عند ابي حنيفة رح وقالا لا يجوز لقوله عليه السلام حين سئل عنه او ينقص اذا جف فقيل نعم فقال عليه السلام لا اذا وله ان الرطب تمر لقوله عليه السلام حين أهدى اليه رطب أ وكل تمر خيبر هكذا سماه تمراً وبيع التمر بالتمر بمثله جائز۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج۶ ص۱۶۸ باب الربٰو) [1]

مختلف ممالک کی کرنسی کی تجارت کا حکم

سوال:۔ آجکل صراف بازار میں ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے زیادہ داموں بیچنے کا رواج عام ہے، مثلاً ایک آدمی نے امریکی ڈالر ایک دن قبل پچاس۵۰ روپے کا لیا ہے اب وہ اس کو پچپن۵۵ روپے میں فروخت کرتا ہے۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دو ملکوں کی کرنسی چونکہ مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے اور اسی وجہ سے ان کے نام کی اکائیاں وغیرہ مختلف ہوتی ہیں، اور مختلف الاجناس اشیاء

---

[1] قال العلامة اکمل الدين البابرتی رح: (قال ويجوز بيع الرطب بالتمر مثلاً بمثل) بيع الرطب بالتمر متفاضلاً لا يجوز بالاجماع ومثلاً بمثل جوزه ابو حنيفة رح خاصة وقالا لا يجوز۔

(العناية على هامش فتح القدير ج۶ ص۱۶۸ باب الربٰو)

ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۱۸۱ باب الربٰو۔

کو تفاضل کے ساتھ بیچنا جائز ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے تفاضل کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: وان عدما ...... حلا کهروی بمرویین لعدم العلة فبقی علی اصل الاباحة وان وجد احدهما ای القدر وحده او الجنس حل الفضل وحرم النساء ولو مع التساوی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۱۷۲ باب الربوٰ، مطلب فی الابراء عن الربا) [1]

قبل القبض کسی چیز کی فروخت کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! میں جائیداد کی خرید و فروخت (پراپرٹی) کا کاروبار کرتا ہوں، اس تجارت میں بعض اوقات زمین اور مکانات وغیرہ کا اس کے مالک سے قبضہ لے لیا جاتا ہے تاکہ اس کو کسی اور شخص پر فروخت کر دیا جائے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ قبل القبض کسی چیز کا فروخت کرنا شرعاً ممنوع ہے، البتہ احناف کے نزدیک زمین اس حکم سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا زمین پر قبضہ کرنے سے قبل اس کی بیع کرنا جائز ہے۔

قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائری رحمہ اللہ: أما بیع الاعیان غیر المنقولة قبل قبضها کبیع الارض والضیاع والنخیل والدور ونحو ذلك من الاشیاء الثابتة التی لا یخشیٰ هلاکها فانه یصح۔ (کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة ج ۲ ص ۲۳۴ کتاب البیع، مبحث التصرف فی المبیع) [2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: واذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والاصل فیه الاباحة واذا وجدا حرم التفاضل والنساء لوجود العلة واذا وجد احدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء۔
(الهدایة علی فتح القدیر ج ۶ ص ۱۵۳ باب الربوٰ)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۶ ص ۱۵۳ باب الربوٰ۔

[2] قال الشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ: والثالث لا یجوز بیع مبیع قبل قبضه الا الدور والارض قاله ابو حنیفة وابو یوسف۔ (رحمهم اللہ)
(اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۲۳۶ باب النهی عن بیع المشتری قبل القبض)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۸۱ فصل شرائط صحة البیع۔

قسطوں کے اختتام سے قبل گاڑی کو پہنچنے والے نقصان کا ذمہ دار کون ہے؟

سوال:۔ اگر ایک گاڑی قسطوں پر خریدی جائے اور قسطوں کی مکمل ادائیگی سے قبل اگر گاڑی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ نقصان بائع کا متصور ہوگا یا مشتری کا؟ قرآن وسنت سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ بیع چاہے نقد رقم سے ہو یا اُدھار سے، ایجاب وقبول کر لینے اور قبضہ ہو جانے پر بیع تام ہو جاتی اور مبیع مشتری کی ملکیت بن جاتی ہے، اس کے بعد مبیعہ کو جو نقصان پہنچے گا وہ مشتری کا ہوگا، بائع پر رجوع صحیح نہیں، تاہم اگر مبیعہ بائع کی ملکیت میں ہلاک ہو جائے تو نقصان بائع پر ہوگا۔

قال العلامة سلیم رستم باز :۔ المبیع اذا ھلک فی ید البائع قبل ان یقبضہ المشتری یھلک من مال البائع ولا شئ علی المشتری .... اذا ھلک المبیع بعد القبض ھلک من مال المشتری ولا شئ علی البائع۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۲۹۳، ۲۹۴ ص۱۵۰ الفصل الخامس) ؎۱

قسط لیٹ ہونے کی وجہ سے مبیع واپس نہیں ہوسکتا

سوال: گاڑیوں کی تجارت کرنے والے بعض لوگ قسطوں میں گاڑی فروخت کرتے وقت یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر مشتری نے اتنی مدت میں تمام قسطیں ادا نہ کیں تو ادا کی گئی اقساط ضبط متصور ہوں گی اور مبیعہ میری ملکیت ہوگا، اور دونوں (بائع اور مشتری) ان شرائط پر دستخط کرتے ہیں۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ بعض اقساط لیٹ ہو جانے یعنی عدم ادائیگی کی صورت میں بائع مبیعہ کو واپس لینے کا

؎۱ قال العلامة برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ولو قبضہ المشتری وھلک فی یدہ فی مدة الخیار ضمنہ بالقیمة ...... ولو ھلک فی ید البائع انفسخ البیع ولا شئ علی المشتری اعتبارًا بالبیع الصحیح المطلق۔ (الھدایة علی صدر فتح القدیر ج ۵ ص۵۰۴ کتاب البیوع)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۵۰۴ کتاب البیوع۔

شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید وفروخت میں ایجاب وقبول کر لینے سے بیع تام ہو جاتی ہے، اس کے بعد فریقین میں سے کسی کو بھی شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر مبیعہ پر ہاتھ ڈالے۔ اسی بناء پر صورتِ مسئولہ میں اس قسم کی شرائط طے کرنا لغو ہے، رقم بدستور مشتری کے ذمے واجب الادا ہے، اور اگر وہ ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو قانون کا سہارا لے کر رقم وصول کی جا سکتی ہے، اس طرح لیت ولعل کرنے سے اس کے ذمہ باقی اقساط ختم نہیں ہو جاتیں اور نہ بائع بغیر اس کی رضامندی کے مبیعہ واپس لے سکتا ہے۔

قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: اذا كان البيع لازماً فليس لاحد المتبايعين الرجوع عنه۔ (شرح مجلة الاحكام۔ المادة ۳۷۵ ص ۳۱۱ الفصل الثانی فی احکام انواع البيوع) ۱؎

گاہکوں کو مختلف قیمتوں پر سودا بیچنے کا شرعی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دوکاندار حضرات ایک گاہک کو ایک دام سے کوئی چیز دیتا ہے جبکہ دوسرے گاہک کو وہی چیز کسی اور دام سے دیتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا کہ دونوں گاہکوں میں برابری کرنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ بیع نام ہے ایک مال کو دوسرے مال سے باہمی رضامندی سے تبدیل کرنا، شریعت نے اس معاملے میں کسی کو پابند نہیں کیا ہے، اس لیے دوکاندار کا ایسا کرنا جائز ہے تاہم ناجائز منافع سے پرہیز کیا جائے۔

قال العلامة علی حیدر رحمه الله: وجاء تعريف البيع فی كثير من الكتب الفقهية بانه مبادلة المال بالمال بالرضا۔ (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۱ ص۱۰۶ مقدمة فی بيان الاصطلاحات الفقهية) ۲؎

۱؎ قال العلامة علی حیدر رحمه الله: ليس لاحد المتبايعين او ورثته فی البيع النافذ اللازم ان يرجع عنه رضاء الآخر بوجه من الوجوه۔ (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۱ ص۳۰۱ الفصل الثانی فی بيان احكام انواع البيع)

۲؎ قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: فقال فخر الاسلام البيع لغة مبادلة المال بالمال وكذا فی الشرع لكن زيد فيه قيد التراضی۔ (فتح القدير ج۵ ص۴۵۵ كتاب البيوع)

وَمِثْلُهٗ فی كنز الدقائق ص۲۲۷ كتاب البيوع۔

تجارت میں منافع کا تعین نہیں

سوال :- بعض تاجر ایک چیز جس قیمت سے خریدتے ہیں پھر اس کو دوگنا، سہ گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ کیا اسلام نے منافع کے لیے کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

الجواب :- شریعتِ مقدسہ نے تجارت میں مال کے منافع کی کوئی خاص حد مقرر نہیں کی، یہ دونوں عاقدین کا باہمی معاملہ ہے، جس طرح طے پا جائے اسی طرح جائز ہے البتہ اس حد تک منافع لینا کہ جس سے لوگوں کو ضرر پہنچتا ہو خلافِ مروت ہے۔ حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ وہ ناجائز منافع خوری پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدام کرے۔

قال العلامة علی حیدرؒ: جاء تعریف البیع فی کثیر من الکتب الفقهیة بانه مبادلة المال بالمال بالرضاء۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۱ ص ۱۰۶ مقدمه فی بیان الاصطلاحات الفقهیة) [۱]

بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا مال فروخت کرنا

سوال :- کیا بیوی اپنے شوہر کی مملوکہ چیز بغیر اس کی اجازت کے فروخت کر سکتی ہے یا نہیں؟ مطلع ہو جانے پر شوہر کو اپنی چیز واپس لینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

الجواب :- بیوی باوجود قربت کے شوہر کے مال میں بمنزلہ اجنبیہ کے ہے جس میں اس کے تصرفات، تصرفاتِ فضولی کے حکم میں ہے، علم ہو جانے پر شوہر کو اختیار ہے کہ وہ ایسی بیع کو باقی رکھے یا مسترد کرے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کل تصرف صدر منه تملیکاً کان کبیع وتزویج او اسقاطاً کطلاق واعتاق وله مجیز ای لهذا التصرف من یقدر علی اجازته حال وقوعه انعقد موقوفاً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۱۰۶ فصل فی الفضولی کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابوالبرکات النسفیؒ: هو مبادلة المال بالمال بالتراضی۔ (کنز الدقائق ص ۲۲۷ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۴۵۵ کتاب البیوع۔

[۲] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: البیع الذی یتعلق به حق الغیر کبیع الفضولی وبیع المرهون ینعقد موقوفاً علی اجازة ذلك الآخر۔ (مجلة الاحکام۔ المادة ۳۶۸ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۱ ص ۳۹۱۔ الباب السابع۔ تحت المادة ۳۶۸۔

بجلی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! بجلی کی بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بجلی کوئی عین نہیں؟

الجواب :۔ چونکہ مبیعہ کا عین ہونا ضروری نہیں اس لیے اگر کوئی چیز عین نہ ہو مگر عرفاً وہ مال سمجھی جاتی ہو تو اس کی بیع جائز ہے، لہٰذا بجلی اگرچہ عین نہیں لیکن اس کی بیع وشراء جائز ہے اس لیے کہ اس قسم کی اشیاء مالیت میں داخل ہیں۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : المالية تثبت بتمول الناس كافة او بعضهم۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۱ کتاب البیع ۔ مطلب فی تعریف المال والملك) [1]

ڈرافٹ کی رسید کی بیع کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! میرا بھائی سعودی عرب میں محنت مزدوری کرتا ہے، اگر وہ ڈرافٹ کے ذریعے کچھ پیسے پاکستان اپنے اہل وعیال کے لیے بھیجے اور کسی وجہ سے وہ ڈرافٹ لیٹ ہو جائے اور اس کے اہل خانہ کو رقم کی اشد ضرورت ہو تو کیا میں اُن کے اہلِ خانہ سے اس ڈرافٹ کی مالیت کے عوض وہ ڈرافٹ خرید سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب :۔ ڈرافٹ بل اگرچہ فی ذاتہٖ ایک سادہ کاغذ ہے جس کی کوئی ذاتی قدر وقیمت نہیں مگر اس وقت وہ ایک معین رقم کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے اس وقت بناء بر عرف وہ بھی قیمتی مال بن چکا ہے اس لیے اس کو اتنی قیمت کے بدلے خریدنا جائز ہے جتنی کہ اس کی مالیت ہے ، اسی طرح ٹریول چیک اور بانڈز وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : والمالية تثبت بتمول الناس كافة او بعضهم ۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۱ کتاب البیع ، مطلب فی تعریف المال والملك) [2]

---

[1] قال الشيخ وهبة الزحيلي : المال هو كل عين ذات قيمة مادية بين الناس ۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج۴ ص۳۴۵ الفصل الاول عقد البيع)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المنتقی علیٰ هامش مجمع الانهر ج۲ ص۳ کتاب البیوع ۔

[2] قال الشيخ وهبة الزحيلي : المال هو كل عين ذات قيمة مادية بين الناس ۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج۴ ص۳۴۵ کتاب البیوع)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المنتقی علیٰ هامش مجمع الانهر ج۲ ص۳ کتاب البیوع ۔

زندہ مرغی کو تول کر فروخت کرنا

سوال:۔ آجکل بازار میں زندہ مرغیاں تول کر فروخت کی جاتی ہیں جبکہ ان کا گوشت حساب شدہ وزن سے کم ہوتا ہے، تو کیا ایسا معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ زندہ مرغیوں کے مروجہ طریقہ بیع میں پولٹری فارم والا مشتری پر صرف گوشت فروخت نہیں کرتا بلکہ وہ زندہ مرغی فروخت کرتا ہے اس لیے اصل مبیع معلوم ہونے کی وجہ سے ایسا معاملہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: البیع شرعاً مبادلۃ شئ مرغوب فیہ بمثلہ ...... علیٰ وجہ مفید مخصوص ای بایجاب او تعاط اھ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۵ کتاب البیوع) [۱]

مرغیوں کی بیٹ کو بطور کھاد فروخت کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل مالکانِ پولٹری فارم مرغیوں کی بیٹ کو بصورتِ کھاد زمینداروں پر فروخت کر دیتے ہیں، کیا شرعی ایسی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس بیع سے وصول شدہ رقم کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ پولٹری فارم کی کھاد صرف مرغیوں کی بیٹ پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ اس میں چاول کا چھلکا، مٹی اور لکڑی وغیرہ کا برادہ اور دیگر کئی اشیاء خلط ملط ہوتی ہیں اس لیے اس کو فروخت کرنا مرخص اور اس سے حاصل ہونے والی رقم بھی جائز اور حلال ہے، فقہی ذخائر میں اس کے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: ورجیع الآدمی لم یغلب علیہ التراب فلو مغلوباً بہ جاز کسرقین وبعر واکتفی فی البحر بمجرد خلط

---

[۱] قال الشیخ وہبۃ الزحیلی: البیع: واصطلاحاً عند الحنفیۃ مبادلۃ مال بمال علیٰ وجہ مخصوص او ہو مبادلۃ شئ مرغوب فیہ بمثلہ علیٰ وجہ مخصوص ای بایجاب او تعاط اھ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۳۴۴ الفصل الاول عقد البیع)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۷۳ کتاب البیوع۔

بتراب - قال ابن عابدینؒ تحتہ ویجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع بہ والوقود بہ - (ردالمحتار ج ۴ ص۱۱۱ فصل بیع الفاسد - قبل مطلب الآدمی مکرم شرعاً وکافراً) لہ

تصنیف یا طباعت کے حقوق فروخت کرنا

سوال :- آجکل تصنیف و تالیف اور طباعت کے حقوق کی تجارت عام ہے، مصنف حضرات اپنی تصانیف کے مسودے تاجرانِ کتب پر مہنگے داموں فروخت کردیتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- حقِ تصنیف اگرچہ حقوقِ مجردہ سے متعلق ہے مگر حقوقِ مجردہ کی بھی دو قسمیں ہیں؛ (۱) وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت وابستہ ہو جیسے حقِ وظیفہ وغیرہ - (۲) دوسرے وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت متعلق نہیں، جیسے حقِ شفعہ وغیرہ - شریعتِ اسلامی میں مالی منفعت والے حقوق سے دستبرداری کے عوض مال لینا جائز ہے - حقِ تصنیف کے ساتھ بھی دورِ حاضر میں چونکہ مالی منفعت وابستہ ہے اس لیے اس کی بیع وشراء جائز ہے، فقہی اصطلاح میں اس کو حقِ اسبقیت کہا جاتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: ولا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ وعلیٰ ھذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیھا فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغۃ المذھب عدم اعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبارہ وعلیہ فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ -
الدرالمختار علیٰ ردالمحتار ج ۴ ص۱۶ کتاب البیوع) لہ

لہ قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : ولا بأس ببیع السرقین او السرجین وھو الزبل وبیع البعر لانہٗ منتفع بہ لأنہٗ یلقی فی الارض لاستکثار الریع فکان مالاً والمال محل للبیع -
(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۴ ص۴۴۶ بیع النجس والمتنجس)

۲ لہ قال العلامۃ خالد اتاسیؒ: اقول علیٰ ماذکرہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمالٍ ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال ---- کما جاز النزول عن الوظائف ونحوھا لاسیما اذا کان صاحب حق العلو فقیراً قد عجز عن اعادۃ علوہ فلولم یجز ذلک لہ علی الوجہ الذی ذکرناہ یتضرر فلیتامل ولیحرر (شرح مجلۃ الاحکام - مادۃ ۲۱۶ ج۲ ص۱۲۱ الفصل الثانی فی بیع مایجوز ومالا یجوز)
ومثلہٗ فی نظام الفتاوی ج ۲ ص۳۱۴ کتاب المعاملات -

فارمی مرغیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ آجکل جو فارمی مرغیاں فروخت ہو رہی ہیں ان کو جو خوراک دی جاتی ہے اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ خشک خون بھی ہوتا ہے۔ جو کہ حرام ہے، تو کیا اس طرح خون کھانے والی مرغیوں کی خرید وفروخت اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ان مرغیوں میں نجاست اور خون ملی ہوئی خوراک کھانے کی وجہ سے بدبو پیدا ہو جاتی ہو تو پھر ان کا کھانا ناجائز اور خرید وفروخت مکروہ ہے، اور اگر ان مرغیوں کو نجاست اور خون وغیرہ کھلانا بند کر کے پاک غذا کھلائی جائے یہاں تک کہ ان کی بدبو بالکل ختم ہو جائے تو پھر ان کا کھانا، بیع وشراء اور ہبہ وغیرہ سب درست ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الملتقیٰ المکروہ الجلالة التی اذا قربت وجد منها رائحة فلا توکل ولا یشرب لبنها ولا یعمل علیها ولا یکرہ بیعها وھبتها وفی تلک حالها۔ (رد المحتار حاشیة علی الدر المختار جلد ۵ صـ۲۱۵ کتاب الذبائح) [۱]

چونکہ اس بارے میں تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرغیوں کی غذا میں خون یا دوسرے نجس اجزاء نہایت کم مقدار میں ہوتے ہیں، دوم یہ کہ اس غذا کی تیاری میں کیمیکلز استعمال ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خون اور دیگر نجس اجزاء کی ماہیت بدل جاتی ہے، لہٰذا قلبِ ماہیت اور اجزاء نجسہ کے مغلوب ہو جانے کی وجہ سے فارمی مرغیوں کا کھانا، ان کی خرید وفروخت اور ہبہ وغیرہ سب درست اور جائز ہے۔

---

[۱] وفی الهندیة: انما تکون جلالة اذا نتن وتغیر لحمها ووجدت منه ریح منتنة فهی الجلالة حینئذٍ لا یشرب لبنها ولا یؤکل لحمها وبیعها وھبتها جائز ھٰذا اذا کانت لا تخلط ولا تأکل الا العذرة غالبًا الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ صـ۲۸۹ الباب الثانی فی بیان ما یوکل من الحیوان ومالا) ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ صـ۱۲۳ کتاب الکراهیة۔

کُتیا کا دودھ پینے والے گائے کے بچے کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ گائے کا بچہ اگر کُتیا کا دودھ پی لے اور مالک کو پتہ لگ جائے کہ اس بچھڑے نے کتیا کا دودھ پیا ہے، اب اگر مالک اس کو فروخت کرنا چاہے تو کیا اس کی خرید و فروخت اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر گائے کے اس بچے نے چند دن بعد پاک خوراک کھائی ہو تو پھر اس کی خرید و فروخت کرنا اور کھانا لا بأس بہ ہے ورنہ کراہت سے خالی نہیں۔

لما فی الهندية : الجدی اذا كان يربی بلبن الاتان والخنزير ان اعتلف اياماً فلا بأس بمنزلة الجلالة والجلالة اذا حبست اياماً فعلفت لا بأس بها فكذا هذا۔

(الفتاوى الهندية ج ۵ ص۲۹۰ الباب الثانی فی بيان ما يؤكل من الحيوان وما لا يؤكل) [1]

بائع اول کا مشتری ثانی سے واپس خریدنا جائز ہے

سوال:۔ زید نے عمرو پر ایک گاڑی نقد رقم پر فروخت کی، بعد میں عمرو نے وہ گاڑی بکر کو تین، چار مہینے کے قرض پر دے دی، اب اگر زید اس گاڑی کو بکر سے فروخت کردہ قیمت سے کچھ کم یا زیادہ قیمت پر خرید لے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اسے سود کا معاملہ قرار دیتے ہیں تو کیا واقعی یہ سودی معاملہ ہے؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں بائع اول کے لیے یہ مبیعہ مشتری ثانی سے اُس قیمت سے کم یا زیادہ پر خریدنا جائز ہے جس قیمت پر اس نے مشتری اول پر بیچا تھا اس میں سود کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔

لما فی الهندية : ولو باع المشتری من رجل ثم ان البائع الاول اشتراه

---

[1] قال العلامة الحصكفیؒ : وكره لحمهما ای الجلالة ...... كما حل اكل جدی غذا بلبن خنزير لان لحمه لا يتغير وما غذی به يصير مستهلكاً۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص۲۴۰ كتاب الحظر والاباحة)

ومثله فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۸۲ كتاب الكراهية۔

من المشتری الثانی باقل مما باع جاز۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۳۲ الفصل العاشر فی بیع شیئین احدهما لا یجوز البیع فیه......) ؎۱

نابالغ یتیموں کی جائیداد کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار یتیم بھائی ہیں جن میں سے ایک بالغ اور تین نابالغ ہیں، جن کا کابل شہر (افغانستان) میں ایک مکان ہے، اب وہاں کے حالات کی خرابی اور کمیونسٹ انقلاب کے پیشِ نظر بالغ بھائی اس مکان کو فروخت کرنا چاہتا ہے کیونکہ خطرہ ہے کہ مکان غصب نہ ہو جائے، تو کیا ان تین نابالغ اور ایک بالغ بھائی کے مشورے سے اس مکان کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں اگر مکان نہ بیچنے سے ان یتیموں کا نقصان ہو رہا ہو تو اس کو بیچ دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے ان کے لیے کوئی دوسرا محفوظ پلاٹ، مکان یا زمین خرید لی جائے یا وہ صورت اختیار کی جائے جس میں ان یتیموں کو فائدہ ہو، ضرر اور نقصان نہ ہو۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وجاز شراء مالا بد للصغیر منه وبیعه ای بیع مالا بد للصغیر منه لاخ وعم وام۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۷۶ فصل فی البیع، کتاب الحظر والاباحة) ؎۲

؎۱ قال العلامة الحصکفیؒ: المشتری اذا باع المبیع من آخر قبل نقد الثمن جاز للبائع شراؤه منه بالاقل۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۱۶۷ باب الاقالة)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۱ باب الاقالة۔

؎۲ قال العلامة ابن نجیمؒ: وشراء مالا بد للصغیر منه وبیعه للعم والام والملتقط...... یعنی یجوز لهٰؤلاء الثلاثة ان یشتروا للصغیر ویبیعوا مالا بد منه وذٰلک مثل النفقة والسکونة ولانه لو لم یکن لهم ذٰلک لتضرر الصغیر وهو ممنوع۔ (البحر الرائق ج۸ ص۲۰۹ فصل فی البیع، کتاب الکراهیة)

ژالہ باری سے متاثر ہونے والی مچھلیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :- بعض اوقات بارش اور ژالہ باری کی وجہ سے مچھلیاں پانی کے اوپر تیرنے لگتی ہیں جو کہ بظاہر مری ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان میں کسی قسم کی بدبو اور تعفن نہیں ہوتی، تو بعض لوگ ان مچھلیوں کو اکٹھا کرکے فروخت کرتے ہیں، تو کیا اس طرح کی مچھلیوں کا کھانا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- جو مچھلی طبعی موت سے مری ہو تو اس کا کھانا اور خرید وفروخت برائے خوراک جائز نہیں ہے اور جو مچھلی کسی عارضی سبب مثلاً بارش یا اولے وغیرہ پڑنے کی وجہ سے مری ہو تو اس کا کھانا اور خرید وفروخت جائز ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ کی بیع بھی درست ہے۔

لما فی الهندية: والاصل ان السمك متى مات بسبب حادث حل اكله وان مات حتف انفه لا بسبب ظاهر لا يحل اكله -

(الفتاوى الهندية ج ۵ صـ۴۲۸ الباب السادس فى الصيد السمك)[۱]

بیعہ میں زیادتی بائع کا حق ہے

سوال :- ایک شخص نے دو جریب زمین فروخت کی اور اس کا حدود اربعہ بھی لکھ کر دیدیا اور ہر جریب کی قیمت بھی متعین کرلی، بیع کے بعد زمین مذکورہ کی پیمائش کی گئی تو وہ متعین مقدار سے زائد نکلی، اب یہ زائد زمین مشتری کا حق ہے یا بائع کا؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں مقدارِ متعینہ سے زائد زمین بائع کا حق ہے، البتہ مشتری کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یا تو وہ اس بیعہ کو چھوڑ دے یا پھر اضافی رقم بائع کو ادا کرکے کل بیعہ لے لے۔

---

[۱] قال العلامة الحصكفىؒ: ولا يحل حيوان مائى الا السمك الذى مات بآفة ولو متولداً فى ماء نجس ولو طافية مجروحة وهبانية غير الطافى على وجه الماء الذى مات حتف انفه - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۵ صـ۲۱۶ كتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج ۸ صـ۱۷۲ فصل فى ما يحل وما لا يحل -

لما فی الھندیۃ: ولو قال بعت منک ھٰذا الثوب او ھٰذہ الارض علیٰ انھا عشرۃ اذرع کل ذراع بدرھم فوجدھا عشرۃ لزمتہ بعشرۃ دراھم ولاخیار لہٗ وان وجدھا خمسۃ عشر ذراعاً فھو بالخیار ان شاء اخذ الجمیع کل ذراع بدرھم وان شاء ترکھا۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۳ ص۱۲۴ الفصل الثامن فی جہالۃ المبیع اوالثمن) ۱؎

تصاویر کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں تصاویر کا کاروبار کرتا ہوں، کیا یہ کاروبار جائز ہے یانہیں، اور اس کی آمدنی حلال ہے یانہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی ذی روح کی فوٹو اور تصاویر بنانا اور ان کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے، ظاہر ہے کہ ناجائز اور حرام کاروبار سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی ناجائز ہی ہوتی ہے۔

لما اخرج الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن عون ابن ابی جحیفۃ عن ابیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ عن ثمن الدم وثمن الکلب وکسب البغی ولعن اٰکل الربٰو وموکلہ والواشمۃ والمستوشمۃ والمصور۔

(صحیح البخاری ج۲ ص۸۸۱ باب من لعن المصور۔ کتاب اللباس) ۲؎

زقوم کا پھل کھانے اور اس کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ زقوم (تھوہر) کا پھل

۱؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وان زاد شیٔ علیہ فھو للبائع لان البیع وقع علیٰ مقدار معین والقدر لیس بوصف۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۸۸ کتاب البیع)

۲؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ولایجوز علی الغناء والنوح والملاھی لان المعصیۃ لایتصور استحقاقھا بالعقد فلا یجب علیہ الاجر من غیر ان یستحق علیہ لان المبادلۃ لاتکون الا عند الاستحقاق۔

(البحر الرائق ج۸ ص۲۰ باب الاجارۃ الفاسدۃ)

بڑے شوق سے کھاتے ہیں، اور آجکل بازاروں میں اس کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زقوم جہنم کا درخت ہے اس لیے اس کا پھل کھانا اور خرید و فروخت جائز نہیں ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب:۔ دنیا کے زقوم اور جہنم کے زقوم میں زمین آسمان کا فرق ہے اور زقوم کے پھل میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے لہٰذا اس کا کھانا اور خرید و فروخت دونوں جائز ہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: (البیع) شرعاً مبادلة شئ مرغوب فیہ بمثلہ خرج غیر المرغوب کتراب ومیتة ودم الخ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۴ کتاب البیوع) لہ

اجرت قبل القبض کی خرید و فروخت کا حکم | زید ٹھیکداری کا کام کرتا ہے۔ اس کے ہاں کاروبار کا یہ طریقہ ہے کہ وہ دوسرے اشخاص سے گاڑیاں کرایہ پر لیتا ہے اور اجرت کی رسید دے دیتا ہے۔ مگر اجرت کام ختم ہونے کے بعد دیتا ہے۔ اب اگر گاڑی کے مالک کو پیسوں کی ضرورت ہو۔ اور وہ اس رسید کو ٹھیکدار یا کسی دوسرے پر فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو کیا وہ اس طرح شرعاً کر سکتا ہے یا نہیں۔ بیّنوا توجروا ۞

الجواب:۔ بیع کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ بائع کو مبیعہ پر ملکِ تام حاصل ہو اور مبیعہ قبل القبض پر چونکہ ملکیتِ تام حاصل نہیں ہوتی اس لیے ایسی بیع درست نہیں ہوتی، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں چونکہ موجر نے اجرت کو قبل القبض فروخت کیا ہے اس لیے یہ معاملہ درست نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لایملك الاجرة الا بواحد من

لہ قال العلامة ابن نجیم: (البیع) ھو مبادلة المال بالمال بالتراضی ..... وفی کشف الکبیر المال مایمیل الیہ الطبع ...... والمالیة انما تثبت بتمول الناس کافة او بتقوم البعض والتقوم یثبت بھا وباباحة الانتفاع لہ شرعاً۔
(البحر الرائق جلد ۵ ص۲۵۶ کتاب البیع)

هٰذہ الاربعة والمراد انہٗ لا یستحقہا الموجر الّا بذٰلك ..... لکن لیس لہٗ بیعہا قبل قبضہا ۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۳۰ کتاب الاجارۃ) [1]

گدھوں اور کتوں کے گوشت کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ بعض ممالک میں گدھوں اور کتوں کا گوشت بازار میں فروخت کیا جاتا ہے تو کیا گدھے اور کتے کو ذبح کر کے ان کا گوشت وغیرہ فروخت کرنا عندالاحناف جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ گدھے اور کتے کو اگر باقاعدہ ذبح کیا گیا ہو تو پھر ان کا گوشت اور چمڑا بیچنا جائز ہے لیکن فروخت کرنے کے جواز سے کھانے کا جواز لازم نہیں آتا ۔

لما فی الہندیة : و یجوز بیع لحوم السباع والحمر المذبوحة فی الروایة الصحیحة ولا یجوز بیع لحوم السباع المیتة کذا فی محیط السرخسی واما جلود السباع والحمر والبغال فما کانت مذبوحة او مدبوغة جاز بیعہا وما لا فلا ۔ (الفتاویٰ الہندیة ج ۳ ص ۱۱۵ الفصل الخامس فی بیع المحرم الصید وفی بیع المحرمات) [2]

شیر اور ریچھ کی چربی کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ شیر اور ریچھ کی چربی کو حکماء اور طبیب حضرات خرید کر اسے مختلف امراض میں دوائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، تو کیا ان درندوں کی چربی کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر یہ چربی مذبوح شیر اور ریچھ کی ہو تو اس کی تجارت جائز ہے جبکہ

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ :۔ قولہ وما یستجرہ الانسان الخ ذکر فی البحر ان من شرائط المعقود علیہ ان یکون موجوداً فلم ینعقد بیع المعدوم الخ
(ردالمحتار ج ۴ ص ۱۳ مطلب فی بیع الاستجرار)
ومثلہٗ فی الہندیة ج ۳ ص ۳ کتاب البیوع ۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : قولہ وجلد میتة قید بہا لانہا لوکانت مذبوحة ذباح لحمہا او جلدہا جاز لانہ یطہر بالزکاة الّا الخنزیر خانیة ۔
(ردالمحتار حاشیة علی الدرالمختار ج ۴ ص ۱۲۷ مطلب الدراہم والدنانیر جنس واحد فی مسائل)

مردار زبچھ اور شیر کی چربی کی تجارت جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندية : ويجوز بيع لحوم السباع والحمر المذبوحة فی الرواية الصحيحة ولا يجوز بيع لحوم السباع الميتة كذا فی محيط السرخسی۔

(الفتاوی الهندية ج ۳ ص۱۱۵ الفصل الخامس فی بيع المحرم الصيد وفی بيع المحرمات) [1]

ذبح سے پہلے کھال کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :۔ قربانی کے جانور کی کھال قربانی کرنے سے پہلے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ قربانی کرنے سے پہلے جانور کے چرم وغیرہ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندية : ولو باع الجلد والكرش قبل الذبح لا يجوز فان ذبح بعد ذلك ونزع الجلد والكرش وسلم لا ينقلب العقد جائزاً كذا فی الذخيرة۔

{الفتاوی الهندية ج ۳ ص۱۲۹ الفصل التاسع فی بيوع الاشياء المتصلة بغيرها.........}

صحیح چیز میں ردّی کی ملاوٹ کرکے فروخت کرنا

سوال :۔ ایک شخص اعلیٰ قسم کی مکئی زیادہ قیمت پر اور ادنیٰ یعنی ردّی قسم کی مکئی کم قیمت پر خریدتا ہے پھر ان دونوں کو ملا کر ان کے معیار کے مطابق نرخ مقرر کرکے فروخت کرتا ہے، تو اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگر خریدنے والے کو اس ملاوٹ کے متعلق بتا دیا جائے اور پھر بھی

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ : قوله وجلد ميتة قيد بها لانها لو كانت مذبوحة فباع لحمها وجلدها جاز لانه يطهر بالذكوة الا الخنزير خانية ۔

(رد المحتار حاشية على الدر المختار ج۴ ص۱۲۷ مطلب الدراهم والدنانير جنس واحد فی مسائل)

وقال ايضاً : بخلاف الودك ای دهن الميتة لانه جزءها فلا يكون مالاً ابن ملك فلا يجوز بيعه الخ۔ (رد المحتار حاشية على الدر المختار ج۴ ص۱۲۸ مطلب الدراهم والدنانير جنس واحد)

ومثله فی الخانية على هامش الهندية ج ۲ ص۱۵۳ باب بيع الفاسد ۔

خرید لیتا ہے تو یہ معاملہ لا بأس بہ ہوگا، اور اگر خریدار کو اس ملاوٹ کے متعلق نہ بتایا جائے اور وہ اسے عمدہ اور ملاوٹ سے پاک شئی سمجھ رہا ہو تو یہ معاملہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہے: من غشنا فلیس منّا۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر برجل یبیع طعاما فسالہ کیف تبیع؟ فاخبرہ فاوحیٰ الیہ ان ادخل یدک فیہ فادخل یدہ فیہ فاذا ھو مبلول فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من غش۔ (بذل المجھود فی حل ابی داؤد ج ۵ ص ۱۲۴ کتاب البیوع۔ باب فی النھی عن الغش) لہ

زبانی سودا بیع بالمعدوم کے حکم میں ہے

سوال:۔ احمد نے زید کے ساتھ ایک سودا کیا کہ کل کو ۱۰۰ افغانی (افغان کرنسی) ایک روپیہ چھ آنے پر دوں گا، دوسرے دن احمد نے بکر سے ۱۰۰ افغانی کا ایک روپیہ چار آنے پر سودا کیا، یہ صرف زبانی کلامی سودا تھا، کسی طرف سے قبضہ نہیں ہوا تھا، اب احمد بکر کو زید کے سامنے لاکر زید سے دو آنے منافع لے کر چلا گیا اور باقی معاملہ کو زید اور بکر کے درمیان چھوڑ دیا، تو اب یہ دو آنے منافع احمد کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مبیعہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں صرف زبانی سودا کرنے سے بیع تام نہیں ہوتی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی زید اور احمد کے مابین بیع تام نہیں ہوئی لہٰذا زید کے لیے یہ دو آنے منافع لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الھندیۃ: ومنھا فی المبیع وھو ان یکون موجوداً فلا ینعقد بیع المعدوم وما لہ خطر العدم۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۳ ص ۲ کتاب البیوع) ۲ہ

لہ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر علی صبرۃ طعام فادخل یدہ فیھا فنالت اصابعہ بللا فقال ماھذا یا صاحب الطعام قال اصابتہ السماء یا رسول اللہ فقال افلا جعلتہ فوق الطعام حتی یراہ الناس مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔
(مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۴۸ کتاب البیوع۔ باب المنھی عنھا من البیوع۔ الفصل الاول)

۲ہ قال العلامۃ الحصکفیؒ: لان رکن البیع مبادلۃ المال بالمال ولم یوجد والمعدوم کبیع حق التعلی..... لانہ معدوم۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص ۱۱۳ باب بیع الفاسد مطلب فی بیع المغیب فی الارض)

مشتری کی ٹال مٹول میں بیع کو فسخ کرنا

سوال:۔ اگر بیع ہو جانے کے بعد مشتری ثمن (قیمت) ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو کیا بائع بیع کو فسخ کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ آجکل یہ ایک رواج بن چکا ہے؟

الجواب:۔ بیع ایک ایسا معاملہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے صورتِ مسئولہ میں مشتری کے ٹال مٹول کرنے پر چونکہ بائع راضی نہیں کہ مشتری نہ تو قیمت ادا کرتا ہے اور نہ ہی چیز واپس کرتا ہے لہٰذا اس مجبوری کی وجہ سے بائع کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: لان المشتری لما جحد کان فسخا من جهته اذ الفسخ یثبت به کما اذا تجاحد فاذا عزم البائع علی ترك الخصومة تم الفسخ بمجرد العزم...... ولانه لما تعذر استیفاء الثمن من المشتری فات رضا البائع فیستقبل بفسخه۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ٣٦ مسائل شتی، باب التحکیم)

ادائیگی ثمن کے غیر متعین وقت کا حکم

سوال:۔ آجکل ایک عام رواج ہے کہ گاہک جب کسی جاننے والے دوکاندار کے پاس چلا جاتا ہے تو سودا سلف خریدنے کے بعد اُسے کہہ دیتا ہے کہ پیسے بعد میں دوں گا لیکن ادائیگی کا وقت مقرر نہیں کرتا، تو کیا اس قسم کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اُدھار کی بیع میں جب تک ثمن کی ادائیگی کے وقت کا تعین نہ کیا جائے تو وہ بیع فاسد ہوگی، مگر صورتِ مسئولہ میں چونکہ بیع ہو جانے کے بعد گاہک نے دوکاندار سے کہا ہے کہ پیسے بعد میں دوں گا، لہٰذا اگر دوکاندار بخوشی اسے قبول کرلے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: وصح بثمن حال وهو الاصل او مؤجل الی معلوم لئلا یفضی الی النزاع۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ٢٥ مطلب فی التاجیل الی اجل مجهول) [۱]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیمؒ: قوله وصح بثمن حال و باجل معلوم ای البیع لاطلاق النصوص وفی السراج الوهاج ان الحلول مقتضی العقد وموجبه والاجل لایثبت بالشرط قید بعلم الاجل لان جهالة تفضی الی النزاع۔
(البحر الرائق ج ۵ ص ٢٧٩ کتاب البیع)

مُردار جانوروں کی ہڈیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :۔ اگر کسی جگہ کوئی جانور مردار ہو جائے اور مالک اس کو باہر پھینک دے تو کیا اس کی ہڈیوں کو فروخت کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یا گوشت کی طرح ہڈیوں کی بیع بھی ناجائز ہے ؟

الجواب :۔ ویسے تو شرعاً کسی بھی غیر مذبوحہ جانور کی بیع جائز نہیں مگر اس حکم سے اُس کے بعض اجزاء مثلاً ہڈیاں، بال اور سینگ وغیرہ مستثنیٰ ہیں لہٰذا مردار جانور کے ان اجزاء کی خرید وفروخت جائز ہے ۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله : و بیع جلود المیتات باطل اذا لم تکن مذبوحة او مدبوغة و یجوز بیع عظامها و عصبها و صوفها و ظلفها و قرنها ۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۲ ص۱۳۳ فصل فی البیع الباطل) [۱]

واؤچر کو فروخت کرنے کا حکم

سوال :۔ ہم لوگ تمباکو کمپنی والوں پر فروخت کرتے ہیں اور کمپنی والے نقد ادائیگی کی بجائے اس رقم کی رسید جسے واؤچر کہا جاتا ہے دیدیتے ہیں، تو کیا ہم اس رسید (واؤچر) کو بوقتِ ضرورت کم قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :۔ واؤچر بذاتِ خود کاغذ کا ایک بے قیمت پُرزہ ہے مگر اس رقم کی وجہ سے قیمتی بن جاتا ہے اس لیے اس کو فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن واؤچر میں درج رقم سے کم پر فروخت کرنا سُود سے خالی نہیں اس لیے ناجائز ہے ۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : (الربا) قال فی البحر فضل احد المتجانسین نعم هذا یناسب تعریف الکنز بقوله فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال ۔

(رد المحتار حاشیہ علی الدر المختار ج۴ ص۱۹۶ باب الربو) [۲]

---

[۱] وفی الهندیة : اما شعر المیتة وعظمها وصوفها وقرنها فلا بأس بالانتفاع بها وبیع ذلك کله جائز ۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۱۵ الفصل الخامس فی بیع المحرمات)

[۲] قال العلامة ابن نجیمؒ : فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال ای فضل احد المتجانسین علی الآخر بالعیار الشرعی ای الکیل والوزن ۔ (البحر الرائق جلد ۶ ص۱۲۴ باب الربوٰ)

بیع قبل القبض کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے کسی سے ...۳ ہزار کلوگرام مال کا زبانی سودا کیا لیکن مال نہیں اٹھایا بلکہ بائع کے پاس ہی پڑا ہے، چند دن بعد اس مال کی مارکیٹ میں قیمت بڑھ جاتی ہے تو مشتری بائع سے کہتا ہے کہ آپ مجھے منافع دے کر مال اپنے پاس ہی رکھیں، تو کیا مشتری کے لیے یہ منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- شریعتِ مقدسہ میں مبیعہ پر قبضہ کرنے سے قبل اس کو کسی پر فروخت کرنا جائز نہیں، اس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی بظاہر بیع المنقول قبل القبض ہے اس لیے اس کی بیع جائز نہیں۔

لما فی الهندیة: فمنقول من حکم المبیع اذا کان منقولا ان لا یجوز بیعه قبل القبض الی ان قال واما اذا تصرف فیه مع بائعه فان باعه منه لم یجز بیعه اصلا قبل القبض۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص۱۳ الفصل الثالث فی معرفة المبیع والثمن والتصرف) [1]

مبیعہ کو دوبارہ بائع پر فروخت کرنے کی شرط لگانا

سوال:- بعض لوگ کوئی چیز فروخت کرتے وقت مشتری کے ساتھ یہ شرط لگاتے ہیں کہ جب میرے پاس پیسے آجائیں تو اس چیز کو مجھ پر دوبارہ فروخت کروگے یا جب تم فروخت کرنا چاہو تو معاملہ میرے ساتھ ہی ہوگا کسی اور پر فروخت نہیں کروگے۔ تو کیا بیع کرتے وقت اس قسم کی شرائط لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے بیع پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

الجواب:- بیع میں اس قسم کی شرائط جن میں بائع یا مشتری یا مبیعہ کو کوئی فائدہ ہو لگانا شرعاً جائز نہیں، اس قسم کی شرائط سے کاروبار (بیع) فاسد ہو جاتا ہے لہٰذا صورتِ مذکورہ کی بیع فاسد ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: وهو لا یصح به القبض ...... وقیل بالقبض لان العقد فی ذاته صحیح غیر انه لا یجب علی المشتری دفع الثمن لعدم القبض۔ (رد المحتار ج ۴ ص۴۲ مطلب اشتری دارا ما جورة لا یطالب بالثمن قبل قبضها)

قال العلامة الحصكفیؒ : ولا بیع بشرط عطف علی الی النیروز یعنی الاصل الجامع فی فساد العقد بسبب شرط لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ وفیہ نفع لاحدھما اوفیہ نفع لمبیع۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۱۳۵ مطلب فی البیع بشرط الفاسد) [۱]

سونے کے زیورات کی اُدھار تجارت کا حکم

سوال:۔ہم چند پاکستانی دوست ملائیشیا میں پہلے کپڑے کی ادھار تجارت کرتے تھے لیکن اب کپڑے کی تجارت کا بہت مندہ ہے جبکہ سونے کے زیورات مثلاً انگوٹھیاں، بالیاں، جھومر اور دوسری اشیاء کی زبردست مانگ ہے تو ہم نے یہ تجارت شروع کردی، اب ہم سونے کے یہ زیورات ادھار پر بیچتے ہیں اور ماہانہ قسط وار یہ رقم ہمیں واپس ملتی ہے، اب کسی نے بتایا ہے کہ اس طرح ادھار پر سونے کی تجارت جائز نہیں ہے لیکن عدم جواز کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی، لہٰذا آپ اس کے جواز اور عدم جواز کی وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔اگر سونے کی تجارت اس طریقہ سے ہو کہ سونا نقد ہو اور روپیہ اُدھار جیسا کہ سوال میں ہے تو پھر یہ تجارت جائز ہے اس لیے کہ یہ دونوں مختلف الاجناس اشیاء ہیں، اور اگر دونوں ادھار پر ہوں تو پھر ناجائز ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تنبیہ) سئل الحانوتی عن بیع الذھب بالفلوس نسیئۃ فاجاب بانہ یجوز اذا قبض احد البدلین۔ (رد المحتار حاشیۃ علی الدر المختار ج۴ ص۲۰۵ باب الربو، کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ: ولو باع شیئاً علیٰ ان یھب لہ المشتری او یتصدق علیہ او یبیع منہ شیئاً او یقرضہ کان فاسداً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۱۳۴ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد البیع والتی لا تفسدہ)

[۲] لما فی الھندیۃ: وروی الحسن عن ابی حنیفۃؒ اذا اشتری فلوساً بدراھم ولیس عند ھذا فلوس ولا عند الآخر دراھم ثم ان احدھما دفع وتفرقا جاز وان لم ینقد واحد منھما حتی تفرقا لم یجز کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۲۲۴ الفصل الثالث فی بیع الفلوس)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۵ ص۲ کتاب الصرف۔

جعل سازی کے ذریعے ویزے فروخت کرنا

سوال:- جناب مفتی صاحب! آجکل بعض لوگ پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ پر اصل فوٹو کو تبدیل کرکے جعلسازی سے کسی دوسرے شخص کو سمندر پار ممالک میں بھیجتے ہیں اور اس پر بھاری رقم لیتے ہیں۔ تو کیا ان لوگوں کا یہ کاروبار شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- ویزہ اگرچہ کاغذ کا ایک پرزہ ہوتا ہے مگر متعلقہ ملک کی حکومت کی طرف سے اسے قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے لہٰذا قانونی دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو بیچنا اور اس کی بھاری قیمت لینا شرعاً جائز ہے۔ لیکن کسی خاص (نامی نیٹ) ویزہ میں تصویر تبدیل کرکے کسی دوسرے شخص پر فروخت کرنا سراسر دھوکہ ہے اور نہ ہی ایسے ویزے کی کوئی قانونی حیثیت ہوتی ہے، لہٰذا دھوکہ دہی اور غیر قانونی طریقے سے کسی پر ویزہ فروخت کرکے بھاری رقم لینا ناجائز اور حرام ہے، اس لیے کہ ویزہ کے عوض پیسے لینا قانونی تحفظ کی بناء پر تو جائز ہے نہ کہ دھوکہ دہی کے ذریعے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال) ۔ قال العلامة العینیؒ: فی فتاواہ لیس شیئ یعتمد علیه ولکن العلماء والحکام مشوا ذٰلك للضرورة واشترطوا امضاء الناظر مثلاً یقع فیه نزاع۔

(ردالمحتار جلد۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع مطلب فی النزول عن الوظائف بالمال)

گندے انڈے فروخت کرنے کا حکم

سوال:- ایک دوکاندار نے اپنے گاہک پر کچھ انڈے فروخت کیے، گھر جاکر اس نے جونہی انڈے توڑے تو وہ گندے نکل آئے، تو کیا گاہک کو شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ گندے انڈے دکاندار کو واپس کرکے اس سے اپنی رقم لے لے؟

الجواب:- انڈے جب خراب ہوجائیں تو وہ مال نہیں رہتا، ان کا فروخت کرنا جائز نہیں اگر کہیں ایسا معاملہ ہوگیا ہو اور گاہک ان گندے انڈوں کو استعمال میں نہ لایا ہو تو اس کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوکاندار کو گندے انڈے واپس کرکے اس سے اپنے پیسے لے لے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: من اشتریٰ بیضاً او بطیخاً او قثاءً او خیاراً او جوزاً فکسرہ فوجدہ فاسداً فان لم ینتفع به رجع بالثمن لانه لیس بمال فکان البیع باطلاً۔

(الهدایه ج۳ ص۲۷ باب البیع الفاسد)

باب فی الخیار

(بیع میں خیار کے مسائل و احکام)

خیار رؤیت کا حکم

سوال:۔ اگر ایک چیز ایسی حالت میں خریدی جائے کہ مشتری نے اصالتاً یا وکالتاً نہ دیکھی ہو اور دیکھنے کے بعد مشتری کو پسند نہ آئے تو کیا وہ اس کو واپس کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو چیز بغیر دیکھے خریدی جائے تو بیع کی حقیقت موجود ہو کر معاملہ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں رہتا، تاہم مشتری کو دیکھنے پر اختیار حاصل ہے، اگر اسے پسند نہ ہو تو وہ بغیر کوئی وجہ بتلائے بائع کو واپس کر سکتا ہے، تاہم اگر خریدنے پر آمادہ ہو تو پھر پوری قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی ؒ:۔ ومن اشتری شیئاً لم یرہ فا لبیع جائز وله الخیار اذا راٰہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردہ۔

(الهدایة ج۳ صـ۴۱ کتاب البیوع۔ باب خیار الرویة) [1]

غبن فاحش کا مسئلہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے زمین خریدی، لیکن خریدتے وقت دلّال یا بائع نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے وہ زمین ایسی قیمت پر فروخت کی جو کہ عام مارکیٹ کے حساب سے کہیں زیادہ تھی، تو کیا اس بناء پر مشتری یہ زمین بائع کو شرعاً واپس کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مشتری نے ان تمام حالات کو جانتے ہوئے بھی اس زمین میں تصرّف کیا ہو اور اس کے مالکانہ تصرّفات پر کچھ مدّت گذر گئی ہو تو پھر اس کو واپس کرنے کا حق

---

[1] قال فی الهندیة: من اشتری شیئاً لم یرہ فله الخیار اذا راٰہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردہ سواء راٰہ علی الصفة التی وصفت له او علی خلافها۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ صـ۵۷ الباب السابع فی خیار الرؤیة)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ صـ۲۶ باب خیار الرؤیة۔

حاصل نہیں، کیونکہ غبنِ فاحش میں اگرچہ مشتری کو مبیعہ واپس کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن اس پر علم کے باوجود تصرفات کرنے سے یہ حق باقی نہیں رہتا۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز: المشتری الذی حصل لہ تغریر اذا اطلع علی الغبن الفاحش ثم تصرف فی المبیع تصرف الملاک سقط حق فسخہ کما ...... لو سقی الارض المبیعۃ او غرسہا الی غیر ذلک من التصرفات الدالۃ علی الرضا۔ (شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۳۵۹ ص۲۰۴) [1]

جملہ عیوب سے برأت کا اعلان کر کے کوئی چیز فروخت کرنا

سوال:- ایک آدمی نے کوئی چیز فروخت کرتے وقت مشتری سے یوں کہا کہ اس چیز کے نقائص کے بارے میں اگر کچھ کہنا ہو تو اب کہہ لے ورنہ بعد میں کسی قسم کے عیب کا ذمہ دار نہیں ہوں گا، کیا بائع کا مشتری کو اس طرح کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- خرید و فروخت میں بیع بشرط برأت من العیوب درست ہے کہ بائع مبیعہ کے تمام عیوب سے برأت کا اعلان اور اظہار کرے، اس طرح کرنے سے بعد میں تنازعہ اور کبیدہ خاطری کی گنجائش نہیں رہتی اس لیے اس شرط پر کوئی معاملہ کرنا شرعاً مرخص ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وصح البیع بشرط البرأۃ من کل عیب وان لم یسم خلافاً للشافعی لان البرأۃ عن الحقوق المجھولۃ لا یصح عندہ ویصح عندنا لعدم افضائہ الی المنازعۃ ویدخل فیہ الموجود والحادث بعد العقد قبل القبض فلا یرد بعیب بان قال بعتک ھذا العبد علی انی بری من کل عیب۔ (رد المحتار ج۵ ص۱۷۲ تحت مطلب فی البیع بشرط البرأۃ من کل عیب) [2]

---

[1] قال حافظ الدین محمد بن البزازؒ: کل تصرف یدل علی الرضا بعد العلم بہ یمنع الرد والرجوع بالنقص .... وسقی الارض وزراعتہا وکسر الکرم رضاء۔
(البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۴ ص۳۵۱/۳۵۲ کتاب البیوع۔ باب الخیار)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۳ ص۵۷ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وصح البیع بشرط البرأۃ من کل عیب وان لم یسم خلافاً للشافعی لان البرأۃ من الحقوق المجھولۃ لا تصح عندہ وتصح عندنا لعدم افضائہ الی المنازعۃ۔
(تنقیح الفتاوی الحامدیۃ ج۱ ص۲۷۳ جواب السوال باب خیار الرؤیۃ)

ومثلہ فی شرح المجلۃ لسلیم رستم باز تحت المادۃ ۱۸۹ ص۸۹

بیع بالوفاء کا حکم

سوال:- ایک شخص نے دس ہزار روپے کے عوض زمین کی بیع قطعی کر کے مشتری سے معاوضہ نقد وصول کر لیا ہے اور اب اس زمین میں بائع کا کوئی دخل نہیں رہا، لیکن بیع اس شرط سے طے کی کہ میعادِ مقررہ میں رقم واپس ہونے پر زمین واپس کی جائے گی۔ تو کیا بیع مذکورہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اصل قواعد کی رُو سے یہ معاملہ رہن ہو کر اس زمین سے انتفاع حرام ہوگا اور اگر اس معاملہ کو بیع تصور کیا جائے تو مشروط ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہے، تاہم بحالت اضطرار بائع کے لیے متاخرین کے فتویٰ پر عمل کرنے کی گنجائش ہے لیکن بلاضرورتِ شدیدہ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله، وبيع الوفاء ذكرته هنا تبعاً للدرر وصورته ان يبيعه العين بالف على انه اذا رد عليه الثمن رد العين..... قيل هو رهن قال منلا خسرو عن جواهر الفتاوى انه الصحيح وقيل بيع يفيد الانتفاع به هذا محتمل لاحد القولين، الاول انه بيع صحيح مفيد لبعض احكامه من حل الانتفاع به الا انه لا يملك بيعه وقال الزيلعيؒ في الاكراه وعليه الفتوى۔ الثاني القول الجامع لبعض المحققين انه فاسد في حق بعض الاحكام كحل الانزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۵ ص۲۷۶ كتاب البيوع۔ باب الصرف مطلب بيع الوفاء)[1]

اطلاع علی العیب کا حکم

سوال:- زید نے عمر کو ایک چیز فروخت کرتے وقت یہ کہا کہ اس چیز میں فلاں عیب ہے، مشتری (عمر) نے زید سے کہا کوئی بات نہیں ہے اور وہ چیز خرید لی، مشتری نے اس پر قبضہ بھی کر لیا اور اس میں تصرف بھی کیا، اب ایک سال کے بعد مشتری اس عیب کی وجہ سے

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: القول الثامن الجامع لبعض المحققين انه فاسد في حق بعض الاحكام حتى ملك كل منهما الفسخ وصحيح في بعض الاحكام كحل الانزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض (بحذف يسير) وينبغي ان لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع

(البحر الرائق ج۶ ص۸ باب خيار الشرط، تحت "فرع")

وَمِثْلُهٗ في التبيين الحقائق ج۵ ص۱۸۳ باب خيار الشرط۔

مبیعہ واپس کرنا چاہتا ہے، تو کیا اسے واپسی کا اختیار ہے؟

الجواب:۔ بائع جب مشتری کو مبیعہ میں عیب پر مطلع کردے اور اطلاع علی العیب کے بعد مشتری بیع تام کرکے مبیعہ پر قبضہ اور تصرف کرنے کے بعد بائع کو اس عیب کی وجہ سے واپس کرنا چاہے تو شرعاً اس کو یہ اختیار حاصل نہیں، تاہم اگر بائع و مشتری باہمی رضامندی سے اقالہ کرنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

قال العلامة سليم رستم بازؒ: بعد اطلاع المشتري على عيب في المبيع اذا تصرف فيه تصرف الملك سقط خياره مثلا وعرض المشتري المبيع للبيع بعد اطلاعه على عيب قديم فيه كان عرض المبيع للبيع رضى بالعيب فلا يرده بعد ذلك۔ (شرح المجلة ص۱۸۵ المادة ۳۴۴)

عدم رؤیت کی وجہ سے تبادلۂ زمین منسوخ کرنا

سوال:۔ دو دوستوں زید اور عمر نے آپس میں بن دیکھے زمین کا تبادلہ کیا تھا لیکن بعد میں ایک (زید) کی زمین بنجر اور دوسرے (عمر) کی زمین زرخیز نکلی، تو کیا زید سے عمر اپنی زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع وشراء اور تبادلہ کی صورت میں عاقدین کا مبیعہ یا عوضین کو دیکھ لینا ضروری ہے، اگر کوئی تبادلہ یا سودا بن دیکھے ہوجائے تو عدم رؤیت کی وجہ سے دونوں کو اپنی اپنی چیز واپس لینے اور دینے کا حق حاصل ہے، لہٰذا عمر زید سے اپنی زرخیز زمین واپس لے سکتا ہے۔

قال الشيخ ابن الهمامؒ: ولنا قوله عليه السلام من اشترى شيئاً لم يره فله الخيار اذا رآه۔ (فتح القدير ج۶ ص۳۳۶ باب الخيار)

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: من اشترى شيئاً لم يره فله الخيار اذا رآه ان شاء اخذه بجميع ثمنه وان شاء

لہ لما في الهندية: الاصل ان المشتري متى تصرف في المشترى بعد العلم بالعيب تصرف الملك يبطل حقه في الرد۔

(الفتاوى الهندية ج۳ ص۸۵ كتاب البيوع، باب الخيار)

ردّہ سواء۔ الخ (الهداية ج ۳ ص۳۵ باب خیار العیب)[1]

عیب دار چیز کی خرید و فروخت

سوال:- عیب دار اشیاء کی بیع و شراء (خرید و فروخت) جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- بیع میں مبیعہ کا مال متقوم ہونا ضروری ہے، عیب ایک خارجی شے ہے اس لیے عیب دار اشیاء کی بیع جائز ہے بشرطیکہ عیب کو چھپایا نہ جائے۔

عن زید بن ثابت انہ قال من باع غلاماً بالبراءۃ فھو برئ من کل عیب وکذلک الی آخرہ۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص۹۲۔ باب البیع بالبراءۃ من کل عیب)[2]

غیر ملکی ویزوں کی خرید و فروخت میں خیارِ عیب کا حکم

سوال:- زید نے عمرو سے الریاض (سعودی عرب) کا ویزا اس شرط پر خرید ا کہ کفیل الریاض کا رہنے والا ہوگا، اب عمرو الریاض میں زید کے لیے کفیل کا انتظام کرنے سے قاصر رہا جس کی وجہ سے زید نے کچھ عرصہ پہاڑوں میں حکومت سے چوری چھپے گذارا، بالآخر مجبوراً اپنے آپ کو سعودی حکومت کے حوالہ کر دیا جس نے قانونی کارروائی کے بعد اُسے واپس پاکستان بھیج دیا، زید نے عمرو کو پاکستانی کرنسی میں ۴۰ ہزار روپے نقد دیئے تھے اور مزید ۳۰ ہزار کا وعدہ کیا تھا تو اب اس صورت میں زید عمرو کو حسبِ وعدہ ۳۰ ہزار روپے دینے کا پابند ہے یا عمرو زید کو چالیس ہزار روپے واپس کرے گا؟ شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر سعودی عرب کا ویزا بیع کے وقت موجود تھا

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: رجل اشتری ارضاً وکرماً فظھر ان شربہ فکان علی ناوقۃ ای میزاب توضع علی ظھر نھر او موضع آخر کان لہ ان یردلان ذلک یعد عیبا عند الناس الخ المشتری بالخیار ان شاء امسکھا بجمیع الثمن وان شاء ردّ۔ (تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص۲۷۶ کتاب البیوع، باب الخیار)

[2] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: واذا اطلع المشتری علی العیب فی المبیع فھو بالخیار وان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردّہ۔ (الهداية ج ۳ ص۲۳ باب خیار العیب)

ومثلہٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۷۱ باب خیار العیب۔

اور اس میں الریاض شہر کے ہی کسی باشندہ کی کفالت کا ذکر تھا مگر الریاض پہنچنے پر کفالت کا معاملہ معاہدہ کے برعکس نکلا تو اس میں مشتری کو نقص وفسخ کا حق حاصل ہے

لما فی الهندیة: وان اشتری ثوبًا علیٰ انه عشرة اذرع بعشرة الیٰ قوله فالمشتری بالخیار الیٰ قوله وان نقص فقد فات الوصف المرغوب فیختل رضاه فیخیر الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص ۱۲۴ الفصل الثامن فی جهالة المبیع او الثمن) [1]

اور اشتمال مذکورہ صورت میں بھی ظاہر ہے کہ وصف مرغوب فوت ہوا ہے، لہٰذا مشتری کو نقص کا اختیار حاصل ہے۔

خیارِ رؤیت ناقابلِ انتقال حق ہے

سوال:۔ ہمارے والد صاحب نے کراچی سے کچھ مال منگوایا اور مال پہنچنے سے قبل والد صاحب فوت ہو گئے، جب مال آیا تو وہ عیب دار نکلا جو کہ ہمیں پسند نہیں، اب ہم اس مال کو واپس کرنا چاہتے ہیں مگر کمپنی والے نہیں مانتے، تو کیا شرعاً ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اس مال میں خیارِ رؤیت کا حق استعمال کر کے مال واپس کر دیں؟

الجواب:۔ خیارِ رؤیت ایسا حق ہے کہ جس میں ارث جاری نہیں ہوتا اور نہ یہ ورثا کی طرف منتقل ہوتا ہے، لہٰذا اگر آپ کے والد صاحب نے مال کو نہیں بھی دیکھا ہوا ور ان کے انتقال کے بعد پسند نہ آنے پر آپ کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ خیارِ رؤیت کا حق استعمال کر کے اُسے واپس کریں کیونکہ بیع تام ہو چکی ہے، تاہم اگر کمپنی والے اقالہ کرنا چاہیں تو صحیح ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: خیار الرؤیة لاینتقل الی الوارث فاذا مات المشتری قبل ان یری المبیع لزم البیع ولاخیار لوارثه. وقال العلامة رستم باز: لان خیار الرؤیة لیس الامجرد ارادة ومشیئة وهذا وصف فلا یمکن انتقاله الی الوارث۔ (شرح مجلة الاحکام ص ۱۷۱ المادة ۳۲۱ باب الخیارات)

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: ثم الخیارات بلغت سبعة عشر الثلاثة..... وفوات وصف مرغوب فیه۔ قال ابن عابدینؒ: هو ما یذکره فی هذا الباب فی قوله اشتری عبدًا بشرط خبزه او کتبه الخ۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۴ ص ۵۱، ۵۰ باب خیار الشرط)

ومثله فی البحر الرائق ج ۶ ص ۲۴ باب خیار الشرط۔

باب الاقالۃ

(سوداواپس کرنے کے احکام ومسائل)

اقالہ میں طرفین کا رضامند ہونا

سوال:۔ بائع اور مشتری کے درمیان باقاعدہ عقد (سودا) ہو جانے کے بعد اگر ایک فریق واپسی کی خواہش کرے لیکن دوسرا فریق اس پر رضامند نہ ہو، تو کیا واپسی کا خواہش مند جبراً اپنا حق واپسی منواسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باقاعدہ ایجاب وقبول کے بعد عقد بیع لازم ہو کر کسی ایک کو جبراً عقد ختم کرنے کا حق حاصل نہیں، تاہم اگر اقالہ کی صورت ہو تو اس کے لیے طرفین کی رضامندی ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: من شرائطها اتحاد المجلس ورضا المتعاقدين لان الكلام في رفع عقد لازم واما رفع ما ليس بلازم فلمن له الخيار بعلم صاحبه لا برضاه بحر۔ (ردالمحتار ج۵ ص۱۲۱ باب الاقالۃ)[1]

اقالہ میں قیمت کم کرنے کی شرط لگانا

سوال: انعقاد بیع کے بعد اگر طرفین اس شرط پر بیع فسخ کرنا چاہیں کہ مشتری بائع کو ادا کی ہوئی رقم میں سے کچھ چھوڑے گا، کیا شرعاً دونوں کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع فسخ کرتے وقت اگر بائع اور مشتری قیمت کم کرنے کی شرط لگاتے ہیں تو دونوں کی رضامندی سے بیع فسخ ہو کر بائع مشتری کو پوری رقم واپس کرے گا، رقم منہا کرنے کی شرط کالعدم ہو کر باطل رہے گی۔

لما قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: الاقالۃ جائزۃ فی البیع

---

[1] قال فی الھندیۃ: وشرط صحۃ الاقالۃ رضاء المتقائلین۔
(الفتاوی الہندیۃ ج۳ ص۱۵۷ الباب الثالث عشر فی الاقالۃ)
ومثلہ فی شرح مجلۃ الاحکام لسلیم رستم باز تحت المادۃ ۱۹۰ ص۹۲

بمثل الثمن الاوّل فان شرط اکثر منه او اقل فالشرط باطل ویرد مثل الثمن الاوّل۔

(الهدایة ج۳ ص۷ باب الاقالة) [1]

فروخت شدہ چیز کو کم قیمت پر واپس لینا

سوال:- ایک شخص نے کسی کو قرض پر اونٹ فروخت کیا، قیمت کی ادائیگی کے وقت مشتری نے ادائیگی سے انکار کرتے ہوئے مبیع واپس کرنا چاہا، اب بائع مشتری سے اونٹ اسی قیمت پر یا اس سے کم قیمت پر واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مذکورہ میں باقاعدہ طور پر ایجاب و قبول ہو کر بیع قطعی ہو چکی ہے جس سے مبیعہ بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں آچکا ہے لیکن اب اگر مشتری بیع فسخ کر کے مبیعہ واپس کرنا چاہتا ہے تو بائع کو مبیعہ سابقہ قیمت پر یا اس سے زائد قیمت پر واپس لینے میں کوئی حرج نہیں تاہم یہ جائز نہیں کہ بائع مبیعہ کو کم قیمت پر واپس لے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: لو باع شیئاً اصالةً بنفسه او وکیله او وکالة عن غیره لیس له شراءه بالاقل لا لنفسه ولا لغیره۔

(رد المحتار ج۵ ص۷۲ باب البیع الفاسد، مطلب فی التداوی بلبن البنت۔الخ) [2]

مبیعہ پسند نہ آنے پر واپس کرنا

سوال:- ایک شخص نے دوسرے آدمی پر کوئی چیز اس شرط پر فروخت کی کہ یہ فلاں کمپنی کی مصنوعات

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: الثالث انها لا تفسد الشرط الفاسد وان لم تصح تعلیقها به بل یکون الشرط لغواً فلو تقایلا علیٰ ان یوخر المشتری الثمن سنة او علیٰ ان یحط منه خمسین صحت الاقالة لا التاخیر والحط۔

(شرح مجلة الاحکام لسلیم رستم باز ص۹۱ المادة ۱۹۰ الفصل الخامس فی الاقالة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۵۶ الباب الثالث عشر فی الاقالة۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: شراء ما باع باقل مما باع من الذی اشتراه او من وارثه قبل نقد الثمن لنفسه او لغیره....... فاسد عندنا۔

(خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۴۱ کتاب البیوع، الفصل الرابع فی البیع الفاسد واحکامه)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۳۴ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد والتی لا تفسده۔

ہیں سے ہے جو کہ عمدہ اور اعلیٰ معیار کی حامل ہے، لیکن خریدنے کے بعد اس چیز کی حقیقت کچھ اور نکلی، تو کیا اس وجہ سے مشتری کو مبیعہ واپس کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عقدِ بیع کے وقت کسی چیز کے بیان کیے ہوئے ایسے اوصاف (جن کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے) کا مبیعہ میں موجود ہونا ضروری ہے ورنہ عدم موجودگی کی صورت میں مشتری کو کل قیمت پر لینے یا بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل رہے گا۔ اس بنا پر مذکورہ صورت میں کمپنی کی مصنوعات بوقتِ بیع بیان کردہ اوصاف یعنی عمدگی اور پائیداری سے عاری معلوم ہوں تو مشتری کو کل قیمت پر لینے یا واپس کرنے کا حق حاصل ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: وان اشتری ثوباً علیٰ انہٗ عشرۃ اذرع بعشرۃ او ارضاً علیٰ انھا مائۃ اذرع بمائۃٍ فوجدھا اقل فالمشتری بالخیار ان شاء اخذھا بجمیع الثمن وان شاء ترک وان وجدھا اکثر من الذراع الذی سماہ فھو للمشتری علیٰ خیار للبائع وان نقص فقد فات الوصف المرغوب فیختل رضاہ ولا یحط شیٔ من الثمن کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۳ ص۱۲۴ الفصل الثامن) [1]

اقالہ کی صورت میں رقم میں زیادتی جائز نہیں

سوال:۔ زید نے اپنا کھیت بکر پر مبلغ ایک لاکھ روپے میں فروخت کر دیا، بکر نے موقع پر دس ہزار روپے زید کو پیشگی دیدیئے اور بقایا رقم چند دنوں کے بعد دینے کا وعدہ کیا، ایک مہینہ گذرنے کے بعد زید نے اپنا کھیت بکر سے واپس لینا چاہا اور کہا کہ میں کھیت کو فروخت نہیں کرتا ہوں، اور بکر کو اس کی اصل رقم دس ہزار روپے کے علاوہ پانچ ہزار روپے بطور پشیمانی بھی دیئے، تو کیا بکر کے لیے

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: اشتریٰ من اٰخر فرساً ذکر البائع انھا من نسلِ خیل فلان لفرس مشھور بالجودۃ ثم تبین کذبہ ھل لہ الرد ام لا فاجاب اذا اشتراھا بناءً علیٰ ما وصف لہ بثمن لو لم یصفھا بھٰذہ الصفۃ لا تشتری بذٰلک الثمن والتفاوت بین الثمنین فاحش وھی لا تساوی ما اشترھا بہ لہ الرد اذا تبین خلاف ذٰلک۔ (تنقیح فتاوٰی حامدیۃ ج۱ ص۲۳۲ باب الخیارات)

ومثلہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام، تحت المادۃ ۸۹ ص۸۹ باب الخیارات۔

یہ پانچ ہزار روپے بطور پشیمانی کے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں ایجاب وقبول کے بعد اگرچہ بیع منعقد ہو چکی تھی اور زید زمین کو واپس لینے کا مجاز نہیں تھا مگر جب بکر نے بیع فسخ کرنے پر رضامندگی ظاہر کی اور بیع کو ختم کر دیا (اسے شرعاً اقالہ کہا جاتا ہے) تو اس کے بدلے میں بکر کے لیے زید سے بصورتِ جرمانہ اور پشیمانی کے اپنی اصل رقم کے علاوہ مزید کچھ رقم لینا حلال نہیں ہے۔

لما ورد فی الحدیث: لایحل مال امرءٍ مسلم الا عن طیب قلبه انتھی۔

(مشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۲۵۵ باب الغصب والعاریة) [۱]

ثمن خرچ ہو جانے سے اقالہ کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک آدمی کسی زمیندار سے خریدی ہوئی چیز اسے واپس کرنا چاہتا ہے اور زمیندار بھی واپسی پر راضی ہے لیکن جو رقم اس نے مشتری سے لی تھی وہ اس سے ختم ہو چکی ہے، اب زمیندار مشتری سے کہتا ہے کہ تم مجھے یہ چیز واپس کر دو لیکن پیسے ایک ماہ کے بعد ملیں گے۔ تو کیا ایسا اقالہ کرنا جائز ہے جبکہ واقعتاً زمیندار کے پاس پیسے نہیں ہیں؟

الجواب:۔ ثمن (پیسوں) کا تلف یا ختم ہو جانا اقالہ کے انعقاد کیلئے مانع نہیں ہے اسلئے اگر دونوں متعاقدین باہمی رضامندی سے اقالہ کرنا چاہتے ہوں اور مشتری رقم کی واپسی کا انتظار کر سکتا ہو تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: هلاك الثمن ای تلفه لایمنع صحة الاقالة ــ قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: وذلك لان الاقالة رفع البیع والاصل فی البیع المبیع لا الثمن ولهذا لوهلك المبیع قبل القبض یبطل البیع بخلاف هلاك الثمن۔

(شرح مجلة الاحکام ص۹۵ المادة ۱۹۶ فصل فی الاقالة)

---

[۱] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: قوله وتصح بمثل الثمن الاول حتی لو کان الثمن عشرة دنانیر فدفع الیه دراهم ثم تقابلا وقد رخصت الدنانیر رجع بالدنانیر لابما دفع وکذا الورد بعیب الخ۔

(رد المحتار علی هامش الدر المختار ج۴ ص۱۶۵ باب الاقالة)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۴ باب الاقالة۔

باب المرابحة والتولية
(بیع مرابحہ و تولیہ کے احکام و مسائل)

بیع مرابحہ میں منافع کی مقدار متعین نہیں

سوال:- ایک دوکاندار عام طور پر مارکیٹ سے زائد نرخ پر سودا فروخت کرتا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ نیز کیا شریعت نے کسی چیز کی فروخت پر منافع کی کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت مقدسہ نے خرید و فروخت کو بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی پر موقوف رکھا ہے، بائع اور مشتری جس نرخ پر بھی متفق ہوں وہی نرخ شرعاً جائز ہے۔ فقہاء نے بیع مرابحہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے نرخ کی تعین نہیں فرمائی ہے، البتہ بازار کے عام نرخوں سے زائد پر فروخت کرنا جائز تو ہے مگر خلافِ مروت ہے۔

لما قال فی الهندية: ومن اشترٰی شيئًا واغلٰی فی ثمنه جاز۔

(الفتاوٰی الهندية ج۳ ص۱۶۱ کتاب البیوع، الباب الرابع عشر فی المرابحة والتولية۔ الخ) [۱]

بیع مرابحہ میں شبہ خیانت سے اجتناب ضروری ہے

سوال:- اگر کسی چیز کو ادھار سے خریدا جائے تو فروخت کرتے وقت اُس کو یہ بتلانا ضروری ہے کہ میں نے اس کو اتنی قیمت میں ادھار خریدا ہے اور اتنے نفع میں فروخت کرتا ہوں؟

الجواب:- بیع مرابحہ کا دارومدار دیانت و امانت پر ہے، اس میں ہر اس قدم سے اجتناب ضروری ہے جس سے شبہ خیانت ہو، چونکہ ادھار میں عموماً نقد کی نسبت سے قیمت زیادہ رکھی جاتی ہے اس لیے ادھار سے خریدی ہوئی چیز اگر گاہک کو قیمتِ خرید بتا کر فروخت کرے تو اصل قیمت کے ساتھ ادھار کا اظہار بھی ضروری ہے۔

---

[۱] قال العلامة جلال الدين الخوارزمیؒ: هو مبادلة المال بالمال بالتراضی۔
الکفاية فی ذيل فتح القدير ج۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)
ومِثْلُهٗ فی فتح القدير ج۴ ص۴۵۵ کتاب البیوع۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ومن اشتری غلامًا بالف درهم نسيئة فباعه بربح مائة ولم يبين فعلم المشتري فان شاء رده وان شاء قبل لان للاجل شبهًا بالمبيع الا يرى انه يزاد في الثمن لاجل الاجل۔ (الهداية ج ۲ ص ۵۷ باب المرابحة والتولية) [1]

بیع مرابحہ میں گز اور میٹر کے تعین کی ضرورت

سوال:۔ کپڑے کا ایک دوکاندار بعض کپڑا گز کے حساب سے اور بعض میٹر کے حساب سے خریدتا ہے اور گاہک کو ایک روپیہ فی گز منافع سے کر بیچتا ہے اور بل دکھا کر میٹر اور گز کی تفصیل طے کئے بغیر معاملہ طے ہو جاتا ہے، کیا دوکاندار کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ گاہک کو کسی چیز کی قیمتِ خرید بتا کر فروخت کرنا بیع مرابحہ ہے، میٹر اور گز میں چونکہ تقریباً ساڑھے تین انچ فرق ہے اس لیے میٹر کے حساب سے خریدے ہوئے کپڑے کو میٹر اور گز کا تعین کئے بغیر فروخت کرنے میں خیانت کا قوی احتمال ہے اس لیے معاملہ کو یوں مبہم کر کے چھوڑنا جائز نہیں ہے، دوکاندار کو چاہیئے کہ اوّل تو گاہک کو قیمتِ خرید بتائے ہی نہیں اور اگر قیمتِ خرید بتائے تو پھر گز اور میٹر کا فرق بتا دینا بھی انتہائی ضروری ہے۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ولهذا كان مبناهما على الامانة والاحتراز عن الخيانة وعن شبهتها۔ (الهداية ج ۳ ص ۵۷ باب المرابحة والتولية) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ : اشتراه بالف نسيئة وباع بربح مائة بلا بيان خير المشتري۔ وقال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : اى بعين رده واخذه بالف ومائة حالة لان للاجل شبهًا بالمبيع الا ترى انه يزاد في الثمن لاجله۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۱، ۱۴۲، مطلب اشترى من شريكه سلعة)

وَمِثْلُهُ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص ۲۲۴ باب المرابحة والتولية۔

[2] قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ : فالاصل فيه ان بيع المرابحة والتولية بيع امانة ..... فتجب صيانتها عن الخيانة وعن سبب الخيانة والتهمة لان التحرز عن ذلك كله واجب ما امكن۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۲۲۳ باب المرابحة والتولية)

وَمِثْلُهُ فی رد المحتار ج ۵ ص ۱۳۸ باب المرابحة والتولية۔

آمدورفت کا خرچہ خریدی گئی چیز کی اصل قیمت میں ملانا

سوال:۔ ایک دوکاندار کوئی چیز خریدنے کے لیے کسی دوسرے شہر جائے تو اس پر جو خرچہ آمدورفت وغیرہ آتا ہے وہ اگر اس چیز کی قیمت خرید میں شمار کرکے فروخت کرے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: کسی چیز کے خریدتے وقت اس پر آنے والے اخراجات عقد مرابحہ کی صورت میں قیمت خرید میں ملا کر گاہک سے وصول کرنا شبۂ خیانت کا مقتضی ہے اس لیے ازروئے شرع یہ جائز نہیں کہ بائع اصل قیمت بتاتے وقت یہ اضافی اخراجات بھی اس میں ضم کرے۔ تاہم قیمتِ خرید سے قطع نظر کرکے بائع فروخت کرنے کے لیے جو معیار مقرر کرے اس میں اصل قیمت کے ساتھ اضافی اخراجات بھی شامل ہوں اور مشتری اور بائع کے درمیان باہمی رضامندی سے کسی قیمت پر اتفاق ہو تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: لا يضم نفقة نفسه اى فى سفره ككسوته وطعامه ومركبه وغسل ثيابه۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۳۷ باب المرابحة والتولية) [1]

کسی چیز کی قیمتِ خرید میں اضافی اخراجات ملانے کی صورت

سوال:۔ بیرونِ ملک سے سامانِ تجارت منگوانے کی صورت میں مختلف سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی اور دوسرے اخراجات سے قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ ایک چیز کی قیمت بین الاقوامی منڈی میں ایک ہزار روپے ہو تو یہاں پہنچتے پہنچتے اُس کے مجموعہ اخراجات دس ہزار روپے سے متجاوز ہو جاتے ہیں، تو کیا یہاں اس چیز کو ان کئی گنا اضافی اخراجات کے ساتھ فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سامانِ تجارت پر آنے والے اخراجات کو قیمتِ خرید میں ضم کرنا مرتّص ہے اس صورت میں اضافی اخراجات خریدے ہوئے مال پر تقسیم کرکے گاہک سے وصول کرنے میں

---

[1] لما قال فى الهندية: ولا يحمل عليه ما انفق عليه فى سفره من طعام ولا كراء ولا مؤنة لانعدام العرف فيه ظاهراً كذا فى المبسوط۔

(الفتاوى الهندية ج ۳ ص۱۶۲ الباب الرابع عشر فى المرابحة والتولية)

ومثله فى البحر الرائق ج ۶ ص۱۱۱ كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية۔

شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم شبہ خیانت سے بچنے کے لیے اگر قیمتِ خرید بتانے کی ضرورت محسوس ہو تو اضافی اخراجات ملا کر قیمتِ خرید بتانا دیانت کے خلاف ہے، البتہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔

لما قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ویجوز ان یضیف الی رأس المال اجرۃ القصار والطراز والصبغ والفتل واجرۃ حمل الطعام ویقول قام علیّ بکذا ولا یقول اشتریته بکذا کیلا یکون کاذباً۔ (الہدایۃ ج۳ ص۷۳ باب المرابحۃ والتولیۃ) [۱]

بیع مرابحہ میں خیانت کے باعث مشتری کا مبیعہ واپس کرنا

سوال: مشتری اگر بائع پر اعتماد کرکے دس فیصد منافع دینے پر تیار ہو جس کے نتیجے میں بائع نے چار ہزار کی خریدی ہوئی چیز مشتری پر پانچ ہزار میں فروخت کر دی، بعد میں مشتری کو کسی ذریعہ سے بائع کے جھوٹ پر آگاہی ہوئی کہ یہ چیز تو اس نے چار ہزار میں خریدی تھی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مشتری بائع سے ادا کی گئی زائد رقم (ایک ہزار بیس روپے) واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بیع مرابحہ میں جب بائع کی خیانت ظاہر ہو جائے تو مشتری کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہے تاہم طے شدہ قیمت میں کمی کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں مشتری یا تو خریدی ہوئی چیز بائع کو واپس کر کے اپنی پوری رقم واپس لے لے یا پھر طے شدہ پوری قیمت ادا کرے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: فان اطلع المشتری علی خیانۃ فی المرابحۃ فھو بالخیار عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ترکہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۷۴ باب المرابحۃ والتولیۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: ولہ ان یضم الی رأس المال اجر القصار والصبغ والطراز والفتل وحمل الطعام وسوق الغنم ویقول قام علیّ بکذا ولا یقول اشتریتہ لانہ کذب۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۰ باب التولیۃ والمرابحۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۵ ص۱۳۵ کتاب البیوع، باب المرابحۃ والتولیۃ)

[۲] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: فان ظہر خیانتہ فی مرابحۃ باقرارہ او برہان علیہا او بنکولہ عن الیمین اخذہ المشتری بکل ثمنہ او ردہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۱۳۷ کتاب البیوع باب المرابحۃ والتولیۃ۔

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۶ باب المرابحۃ والتولیۃ۔

سیل ٹیکس قیمتِ خرید میں ملانے کا حکم

سوال:۔ حکومت تاجروں اور چھوٹے دوکانداروں سے سیلز ٹیکس کے نام سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے تو کیا بائع کے لیے اتنی مقدار رقم مبیعہ کی قیمتِ خرید میں ملانا اور مشتری سے وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موجودہ دور میں حکومت کی طرف سے عائد کردہ سیلز ٹیکس یا دیگر ٹیکس چونکہ جائز حدود سے نکل کر ظلم و تعدّی کے دائرہ میں داخل ہیں اور اس میں کسی امیر یا غریب کی تمیز بھی نہیں، شرح ٹیکس بھی اتنی زیادہ ہے کہ دینے والا اس کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہے اس بناء پر سیلز ٹیکس بالکل اُس رقم کی طرح ہے جو راستے میں تاجروں سے ظلماً و جبراً وصول کی جاتی ہے۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں مشتری کو قیمتِ خرید بتاتے وقت اس میں ٹیکس کا اضافہ ضم کرنے میں خیانت کا پہلو غالب ہو جاتا ہے، تاہم اگر بائع مشتری کو قیمتِ خرید بتلائے بغیر جملہ ٹیکسوں کا حساب کر کے اُس سے کسی قیمت پر اتفاق کرلے تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : لایضم اجر الطبیب ...... وما یؤخذ فی الطریق من الظلم الا اذا جرت العادة بضمہ ھٰذا اھو لاصل کما علمت فلیکن المعول علیہ ۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص۱۳۷ باب المرابحة والتولیة)

ضلع ٹیکس، پل ٹیکس، محصول چونگی وغیرہ اخراجات اصل قیمت میں ملانا

سوال:۔ پل ٹیکس، ضلع ٹیکس، راہداری اور محصول چونگی وغیرہ کے اخراجات مبیعہ کی اصل قیمت سے ملانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آجکل حکومت کے عائد کردہ مذکورہ بالا ٹیکس ظالمانہ اور جابرانہ صورت اختیار کر چکے ہیں، ان اضافی اخراجات کا مبیعہ کی قیمتِ خرید میں ملانا یا نہ ملانا تجار کی عادت اور عرف پر موقوف ہوگا، پس اگر تجّار کی عادت اور عرف ملانے کی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز رہے ورنہ اضافی اخراجات کا اصل قیمت میں ملانا جائز نہیں۔[1]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ :۔ ھی ای التولیة بیع بثمن سابق والمرابحة بیع وبزیادة ۔ (البحر الرائق ج ۶ ص۱۰۱ باب المرابحة والتولیة)

ومثلہ فی الھندیة ج ۳ ص۱۶۳ کتاب البیوع ۔ باب المرابحة و التولیة ۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ : لا یضم اجر الطبیب ...... وما یاخذ فی الطریق من الظلم الا اذا جرت العادة بضمہ ھذا ھو الاصل کما علمت فلیکن المعول علیہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۱۳۷ باب المرابحة والتولیة) [1]

قسطوں میں اشیاء کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ آج کل بعض کاروباری ادارے عوام کی سہولت کے لیے روزمرہ استعمال کی اشیاء قسطوں میں فروخت کرتے ہیں لیکن نقد ادائیگی کی نسبت اقساط میں خریدنے کی صورت میں زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، تو کیا بذریعہ اقساط حکومتی یا بعض پرائیویٹ اداروں سے اشیاء ضروریہ خریدنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ دورِ حاضر میں اقساط کے ذریعے روزمرہ استعمال کی چیزوں کی خرید و فروخت کا رواج عام ہو چکا ہے کیونکہ کم آمدنی اور متوسط طبقہ کے لوگ مہنگائی اور تنگدستی کی وجہ سے اپنی ضرورت کی چیزیں نقد ادائیگی کر کے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، لہٰذا انہیں ضروری اشیاء اور دیگر سامان وغیرہ مجبوراً قسطوں میں خریدنا پڑتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بائع اسی وقت اپنا سامان خریدار کی طلب پر اس کے حوالے کر دیتا ہے جبکہ خریدار اُس چیز کی قیمت نقد ادا نہیں کرتا بلکہ طے شدہ قسطوں کی صورت میں ادا کرتا ہے، اس طریقہ پر کوئی چیز خریدنے کی صورت میں اس کی قیمت زیادہ لگائی جاتی ہے، اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہے تو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے جبکہ قسطوں میں ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔

مذکورہ طریقہ بیع میں صرف یہی ایک پیچیدگی نظر آتی ہے کہ ادھار خریدنے کی صورت میں قیمت زیادہ اور نقد خریدنے کی صورت میں قیمت کم دینی پڑتی ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء و محدثین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ میں زیادہ قیمت لگانا شرعاً مرخص ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ عاقدین کسی ایک قیمت پر متفق ہوں

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : والذی یوخذ فی الطریق من الظلم لایضم الا فی موضع جرت العادة فیہ بینھم بالضم ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۱ باب المرابحة والتولیة)

ومثلہٗ فی الھندیة ج۳ ص۱۶۳ کتاب البیوع باب المرابحة والتولیة ۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر بائع یہ کہے کہ یہ چیز میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں، اور طرفین کسی ایک نرخ پر اتفاق کئے بغیر جدا ہوئے تو یہ بیع ناجائز ہے، البتہ اگر اسی مجلس میں نقد یا ادھار میں سے کسی ایک قیمت پر دونوں کا اتفاق ہو گیا تو بیع جائز ہے یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نقد اور ادھار کی بجائے مختلف مدتوں کے مقابلے میں مختلف قیمتیں مقرر کی جائیں، مثلاً نقد سو روپے میں جبکہ ادھار ایک سو بیس روپے میں اور یہ ادھار ایک ماہ کے لیے ہوگا، اور اگر ادھار دو ماہ کا ہو تو ایک سو پچاس روپے میں اور اگر ادھار تین ماہ کے لیے ہو تو اور بھی زیادہ قیمت ہوگی۔ تو جس طرح نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو اسی طرح مدتوں کے اختلاف کی بنا پر بھی قیمتوں میں اختلاف جائز ہے، کیونکہ بیع کی ان دونوں قسموں میں بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عاقدین کے درمیان عقدِ بیع میں مختلف مدتوں اور قیمتوں کے درمیان کسی ایک مدت اور قیمت کا تعین ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا کہ ایک ماہ تک رقم ادا کروگے تو اتنی قیمت، دو ماہ تک ادا کروگے تو اتنی قیمت اور تین ماہ تک ادا کروگے تو اتنی قیمت، اور اگر تعین کئے بغیر جدا ہوئے تو جہالت لازم ہو کر بیع ناجائز ہے۔

قال الامام ترمذی رحمہ اللہ: تحت هٰذا الحدیث نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعةٍ وقد فسر بعض اهل العلم قالوا بیعتین فی بیعة ان یقول ابیعك هٰذا الثوب بنقدٍ لعشرة وبنسئةٍ بعشرین ولا یفارقه احد البیعین فان فارقه فلا بأس به اذا كانت العقدة علیٰ احدٍ منهما۔ (الترمذی ج ۱ ص۲۳۳ کتاب البیوع۔ باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة)[1]

ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا

سوال:- بعض اوقات ایک چیز

---

[1] قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: لان للاجل شبهًا بالمبیع الا یریٰ انهٗ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔

(الهدایة ج ۳ ص۲۶ باب المرابحة والتولیة، کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص۱۱۱ باب المرابحة والتولیة۔

نقد ادائیگی کی صورت میں کم قیمت پر جبکہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر ملتی ہے، کیا نقد اور ادھار کی صورت میں قیمت میں کمی بیشی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نقد اور ادھار کی صورت میں قیمت میں کمی بیشی مرخص ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مجلسِ عقد میں مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد مقرر کر لی جائے۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: لان للاجل شبهاً بالمبیع الا یری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔ (الهداية ج۳ ص۷۶ کتاب البیوع۔ باب المرابحة والتولیة) [1]

بیع مرابحہ میں دھوکہ سے لی گئی زائد رقم پر رجوع کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے شوتل (جانوروں کا چارا) خریدنا چاہا اور اُس سے اس کا نرخ پوچھا تو اس نے بتایا کہ بوری کے حساب سے ۴۵ روپے فی بوری مجھے پڑتی ہے اور آپ کو میں ۵۰ روپے فی بوری کے حساب سے دوں گا، وہ شخص اس سے بوریاں خرید لیتا ہے اور بعد میں اس کو پتہ چلتا ہے کہ بازار میں تو اس کا ریٹ ۴۸ روپے فی بوری ہے، اب شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا وہ بائع سے زیادہ لی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ بیع مرابحہ کی ہے، بیع مرابحہ میں عاقدین کے مابین جو بھی طے پا گیا وہی اس چیز کی قیمت ہے، البتہ غبن فاحش کی صورت میں مشتری کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس سودے کو طے شدہ قیمت پر قبول کرے یا واپس کر کے بائع سے اپنے پیسے واپس لے لے، نقصان یا زیادتی کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: فان اطلع المشتری علی خیانة فی المرابحة فهو بالخیار۔

(الهداية ج۳ ص۵۵ باب المرابحة والتولیة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ:۔ لان للاجل الا تری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔

(البحر الرائق ج۶ ص۱۱۴ کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۶ ص۱۳۳ کتاب البیوع۔ باب المرابحة والتولیة۔

[2] قال العلامة ابو البرکات النسفی رحمہ اللہ: فان خان فی مرابحة اخذ بکل ثمنه۔

(کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۳ ص۱۱۰ تحت باب المرابحة)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۴ ص۱۷۴ باب المرابحة والتولیة۔

مبیع کو زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک دوکاندار آٹھ آنے کی چیز دو روپے میں فروخت کرتا ہے لیکن اپنی قیمتِ خرید کو خفیہ رکھتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے مطابق ایسا کرنا جائز اور حلال تو ہے مگر خلافِ مروت ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مناسب قیمت پر فروخت کرے، قیمتِ خرید کو ظاہر کیے بغیر مبیع بیچنے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ولو اشترٰی ثوبًا بالعشر دراھم رقمهٗ اثنی عشر فباعه مرابحة علی الرقم بغیر بیان جاز اذا کان الرقم معلومًا والربح معلومًا ولا یکون خیانة لانه صادق لکن لا یقول اشتریته لانه یکون کاذبًا فیه۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۳ فی تحت بیان فی المرابحة) [1]

بیع مرابحہ میں فیصدی کے ساتھ منافع کے تعین کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص بیع مرابحہ کرتے وقت اصل قیمت سے زائد رقم کیلئے فیصدی کا سہارا لے، مثلاً زید (تاجر) بکر (گاہک) سے کہتا ہے کہ میں آپ سے اس مال میں پانچ فیصد منافع لوں گا، تو کیا یہ عقد جائز ہے؟ کیا یہ سود کے زمرے میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:- عقدِ مرابحہ میں اس نوعیت سے منافع کا تعین کرنا اگرچہ آجکل کے سودی لین دین کے ساتھ مشابہ ضرور ہے مگر حقیقت میں یہ سود نہیں لہٰذا صرف مشابہت کی بناء پر اس کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق منافع کا تعین فیصد کے اعتبار سے کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اس عقد میں بیع مرابحہ کے جملہ لوازمات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: المرابحة نقل ما ملکه بالعقد الاول بالثمن الاول مع زیادة ربح والتولیة نقل ما ملکه بالعقد الاول بالثمن الاول من غیر زیادة ربح والبیعان جائزان۔ (الهدایة ج۳ ص۵۴ باب المرابحة والتولیة)

ومثلهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۰ تحت باب المرابحة والتولیة۔

وضاحت

★

آجکل بلکہ زمانہ قدیم سے بازار میں ایک رواج چلا آرہا ہے کہ تاجر حضرات کوئی چیز نقد ادائیگی کی صورت میں کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور اُدھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر بیچتے ہیں۔ اہل علم حضرات نے اس کی شرعی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لئے بہت کچھ لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ دارالعلوم حقانیہ کے ترجمان ماہنامہ الحق میں بھی اس موضوع پر ایک طویل سلسلۂ بحث چلا تھا، اس بحث میں مولانا طاسین صاحب کراچی، مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچوی نے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا جبکہ دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے دارالعلوم کا مؤقف دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا ہے، اب افادۂ عام کے لیئے اس سلسلۂ بحث کو فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ ——— (از مرتب) ———

اُدھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مجلس علمی کراچی

زیر نظر مضمون میں میرا اصل مقصد جس خاص مسئلہ کی شرعی حیثیت سے بحث و تحقیق کرنا ہے وہ مسئلہ ہے کہ اُدھار پر کوئی چیز اُس قیمت سے زائد پر فروخت کرنا جو قیمت اس چیز کی بازار میں بصورت نقد رائج ہو، مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں عام طور پر بصورتِ نقد ایک سو روپے ہے اس کو مثلاً ایک سال کے اُدھار پر ایک سو پچاس روپے میں فروخت کرنا اور خریدنا۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی اس میں جس معاشی معاملے کا ذکر ہے قرآن و حدیث کی رُو سے یہ جائز معاملہ ہے یا ناجائز معاملہ؟ اس بحث و تحقیق میں اس کا تعین کرنا اصل مقصود ہے، اور یہ اس لیے کہ متعدد اشخاص نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا ہے اور یہ ایک زندہ مسئلہ ہونے کے ساتھ اپنے اثرات و معروضی نتائج کے لحاظ سے بڑا اہم اور ضروری مسئلہ بھی ہے۔

بحث کے شروع میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حقیقت میں کسی مسئلہ و معاملہ کے متعلق شرعی حکم صرف وہی ہو سکتا ہے جس کا تفصیلی یا اجمالی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود ہو کیونکہ شریعتِ اسلامی کا حقیقی ماخذ و سرچشمہ صرف قرآن و حدیث ہیں لہٰذا اصلاً اس بحث کا دائرہ انہی تک محدود رہے گا، تعامل صحابہ کرامؓ در اصل کتاب و سنت پر مبنی ہے۔ لہٰذا کسی مسئلہ اور معاملہ کی شرعی حیثیت متعین کرنے کے لیے اس کو دیکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے۔ محدثینِ کرام کے ہاں حدیث کا جو وسیع مفہوم ہے اس میں آثارِ صحابہؓ بھی شامل ہیں، مطلب یہ کہ کسی معاملہ کے شرعی جواز و عدمِ جواز کے متعلق صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ فقہ و فتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی اس نص اور دلیل کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی بناء پر اس فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے اور یہ اس لیے بھی کہ وفاقی شرعی عدالت کے جج حضرات کسی فقیہ کے قول کو صرف اس وقت مانتے ہیں جب اس کے ساتھ قرآن و حدیث کی کوئی دلیل موجود ہو کیونکہ دستورِ مملکتِ خداداد پاکستان کے اندر صرف قرآن و حدیث کو اسلامی احکام کا ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔

اصل مسئلہ پر بحث سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ادھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے تو یہ قرآن و حدیث کی رُو سے قطعی طور پر جائز ہے۔ اس کے ثبوت میں قرآنِ مجید کی

آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے، اور یہ بھی کہ بعض دفعہ ادائیگی کے وقت آپؐ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی۔ قرآن و حدیث میں قرضِ حسنہ کے متعلق جو تعلیم ہے اس سے بھی صریح طور پر اُس ادھار کا جواز ثابت ہوتا ہے جس پر کوئی اضافہ نہ ہو۔ کسی ضرورتمند کو ادھار پر اس کی ضرورت کی چیز اسی قیمت پر دینا جو نقد کی صورت میں ہو قرضِ حسنہ کی تعریف میں آتا ہے جو کہ بڑے اجر و ثواب کا نیک عمل ہے، بعض احادیث میں اس کو صدقہ سے تعبیر فرمایا ہے جو نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ مستحب و مستحسن عمل ہے۔

اسی طرح بیع مرابحہ کی وہ شکل بھی قطعی طور پر جائز ہے جس میں فروخت کی جانے والی چیز کی اصل قیمت بھی صحیح بتلائی گئی اور اس پر نفع کی مقدار بھی صرف اتنی لگائی گئی ہو جو تاجروں کے ہاں اور بازار کے عام رواج کے مطابق ہو یا اس سے بھی کم ہو، مثلاً اگر بازار میں عام طور پر نفع کی مقدار دس فیصد رائج ہو اور مرابحہ میں فروخت کرنے والا فروخت کی جانے والی چیز کی اصل قیمت پر زیادہ سے زیادہ دس فیصد منافع لگائے، مثلاً جو چیز اس کو سو روپے میں پڑی ہے اس پر نفع دس روپے یا اس سے کم لگا کر بیع مرابحہ کے طور پر فروخت کرے تو اس کے جواز میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ بالفاظِ دیگر بازار میں عام نرخ کے مطابق ایک چیز کی قیمت ایک سو روپے تھی اور مرابحت کی شکل میں بھی وہ ایک سو روپے میں ہی فروخت کی گئی یا مثلاً رعایت کے ساتھ ایک سو پانچ روپے میں فروخت کی گئی تو بیع مرابحہ کی یہ صورت بالکل جائز ہوتی ہے اور شرعی طور پر یہ معاملہ قطعاً درست ہوتا ہے کیونکہ اس میں فریقین معاملہ کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے، اور یہ اس وجہ سے موجود ہوتی ہے کہ اس میں ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا اس کی مرضی کے مطابق معاوضہ پایا جاتا ہے جو قلبی رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہے۔ بخلاف مرابحت کی ایسی شکل کے کہ جس میں فروخت کرنے والا خریدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز بازار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نفع پر فروخت کرتا ہے، مثلاً یہ دیکھتے ہوئے کہ خریدار نقد ادائیگی نہیں کر سکتا کچھ عرصہ کے ادھار پر لینا چاہتا ہے لہٰذا ادھار کی وجہ سے نفع دس فیصد کی بجائے بیس یا تیس فیصد لگا دیتا ہے، اس صورت میں خریدار کی اگرچہ ظاہری طور پر رضامندی موجود ہوتی ہے لیکن حقیقی طور پر موجود نہیں ہوتی کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ جو چیز وہ ادھار کی وجہ سے مثلاً ڈیڑھ سو روپے میں خرید رہا ہے وہ بازار میں بصورتِ نقد سو روپے میں ملتی ہے اور یہ کہ فروخت کرنے والا دوسرا فریق اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پچاس روپے کا اضافہ کر رہا ہے چنانچہ وہ ضرورت کے تحت لے تو لیتا ہے لیکن دل سے خوش نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کے لیے پچاس روپے کا مادی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا مرابحہ کی یہ شکل بلحاظِ حقیقت

درست نہیں ہوتی بلکہ باطل معاملہ کی تعریف میں آتی ہے، اس کی مزید کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

اب میں اپنے اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ اُدھار کی صورت میں کوئی چیز نقد قیمت کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو انتہائی تلاش و جستجو کے باوجود مجھے قرآنِ کریم، احادیثِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی جس سے معاملہ مذکورہ کا جواز نکلتا اور ثابت ہوتا ہو۔ البتہ عدم جواز کے متعلق قرآن، حدیث اور آثار صحابہؓ میں واضح اور قطعی دلائل ملتے ہیں۔ تحریم ربوٰ سے متعلق جو آیات، احادیث اور آثار ہیں ان سے معاملہ زیر بحث کا قطعی طور پر ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ قرآن حکیم نے عہدِ جاہلیت کی جس متعارف ربٰو کو قطعی طور پر حرام و ممنوع قرار دیا ہے اس کی چند شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی تھی کہ ایک شخص دوسرے پر کوئی چیز ادھار بیچتا تو مدتِ قرض کے لحاظ سے اس کی قیمت میں اضافہ کرتا۔ مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں ایک سو درہم ہوتی ایک سال کے اُدھار پر ڈیڑھ سو درہم میں بیچتا، پھر جب ایک سال کے بعد بھی مقروض ڈیڑھ سو درہم ادا نہ کرسکتا تو قرض خواہ اس سے کہتا میں مدتِ قرض میں مزید اتنا اضافہ کر دیتا ہوں تم اپنے ذمہ رقم کی مقدار اتنی بڑھا دو اور پھر قرض کی رقم کی مقدار مزید ایک سال کے لیے دو سو درہم کر دی جاتی، پھر اگر دوسری مدت میں بھی وہ ادا نہ کرسکتا تو مزید مہلت کے عوض قرض کی رقم میں مزید اضافہ کر دیا جاتا، اس طرح بڑھتے بڑھتے یہ رقم اصل کے کئی گنا ہو جاتی یعنی اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً بن جاتی، یہی حال نقد کے قرض میں بھی ہوتا، ایک آدمی دوسرے کو مثلاً ایک سو درہم ایک سال کے لیے قرض دیتا تو اس مدت کے لحاظ سے اس میں اضافہ کر دیا جاتا جو درمیان میں ہر ماہ یا سال کے بعد یکمشت اصل کے ساتھ واجب الادا ہوتا، جیسا کہ موجودہ بینکاری نظام میں ہوتا ہے۔ غرضیکہ قرآنِ حکیم نے ربٰوالنسیئہ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا اُن میں سے ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل بھی تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربٰو کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے:۔

(۱) عن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ قال کان الربوٰ الذی اذن اللہ فیہ بالحرب لمن لم یترکہ عند الجاھلیۃ یکون للرجل علی رجل حق الی اجل فاذا حل الاجل قال صاحب الحق اتقضی ام تربی، فان قضاہ اخذ منہ والا طواہ۔ (جامع الاصول ج ۱ ص ۴۷۹ رقم حدیث ۳۰۴، باب الربوٰ الفرع الثالث فی عادات المتقدم)

(ترجمہ) "حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا وہ ربٰو جس کو ترک نہ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اعلانِ جنگ فرمایا عہدِ جاہلیت میں اس کی شکل اس طرح تھی کہ ایک آدمی کا دوسرے پر ایک خاص

مدت کے لیے حق یعنی دین و قرض ہوتا پس جب مقررہ وقت آتا تو صاحبِ حق یعنی قرض خواہ اپنے مقروض سے کہتا ادا کرتے ہو یا مزید مہلت کے عوض مالِ قرض میں اضافہ کرتے ہو اگر وہ ادا کرتا تو ٹھیک معاملہ ختم کر دیتا ورنہ اس کو ہر مرتبہ بڑھاتا چلا جاتا۔"

(۲) عن مجاهدؒ انہٗ قال فی ربٰو الذی نهی الله عنه کان فی الجاهلیة یکون للرجل علی الرجل دَین فیقول لك کذا وکذا وتؤخرعنی فیؤخرعنه ۔ (تفسیر الطبری ج۳ ص۱۰۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت مجاہدؒ نے فرمایا وہ ربٰو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا عہدِ جاہلیت میں اس کی شکل یہ ہوتی کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر واجب الادا دَین (قرض) ہوتا تو جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو مقروض آدمی اپنے قرض خواہ سے کہتا مہلت بڑھا دو اور مطالبہ مؤخر کر دو اس کے بدلے آپ کے لیے اتنا اتنا مزید ہوگا چنانچہ وہ مطالبہ مؤخر کر کے مہلت بڑھا دیتا اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔"

(۳) عن سعید بن جبیرؒ قال ان الرجل کان یکون لہٗ علی الرجل المال فاذا حل الاجل طلبه من صاحبه فیقول المطلوب اخرعنی وازید لك فی مالك فیفعلان ذلك ۔ (تفسیر الدر المنثور ج۱ ص۳۶۵ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت سعید بن جبیرؒ نے ربٰو جاہلی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا وہ اس طرح تھی کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر بطور قرض مال ہوتا پھر جب قرض کی مقررہ مدت پوری ہوتی تو قرض والا اپنے مقروض سے اپنا مال طلب کرتا پھر اگر مقروض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا تو مقروض سے کہتا مجھے مزید مہلت دیجئے میں اس کے عوض آپ کے مال میں آپ کے لیے اضافہ کر دیتا ہوں، چنانچہ وہ آپس میں ایسا کر لیتے اور یوں یہ سلسلہ جاری رہتا۔"

(۴) عن قتادہؒ قال ان ربٰو الجاهلیة یبیع الرجل البیع الی اجل مسمّی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبه قضاء زاده واخرعنه ۔ (تفسیر الطبری ج۳ ص۱۰۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ربٰو جاہلی کی ایک شکل یہ تھی کہ ایک آدمی اپنی کوئی چیز ایک خاص وقت تک کے لیے قرض پر بیچتا پھر جب وہ خاص وقت آتا اور اس کے مقروض کے پاس ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو مال بڑھا کر مزید مہلت دے دیتا۔"

(۵) عن عطاء ابن ابی رباح قال کانت ثقیف تدائن فی بنی المغیرة فی الجاهلیة فاذا حل الاجل قالوا نزیدکم وتؤخرون ۔ (تفسیر الدر المنثور ج۲ ص۱۲۸ سورۃ آل عمران آیت ۱۳۰)

(ترجمہ) "حضرت عطاء بن ابی رباحؒ نے فرمایا عہدِ جاہلیت میں بنو ثقیف، بنو المغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو بنو المغیرہ بنو ثقیف سے کہتے ہم تمہارا مال زیادہ کر دیتے ہیں

آپ ہمیں مزید مہلت دے دیجئے۔“

ان مذکورہ روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ربٰو الجاہلی جس کا دوسرا نام ربٰوالنسیۃ ہے، قرض کا ایسا معاملہ تھا جس میں مہلت اور مدتِ قرض کے عوض مال قرض میں اضافہ کیا جاتا تھا خواہ وہ قرض نقد کی صورت میں ہو یا کسی فروخت کردہ چیز کی قیمت کی صورت میں، اور یہ کہ اس کو قرآن حکیم نے حرام ممنوع ٹھہرا کر اس خیال کی نفی اور تردید کر دی کہ قرض دینے والا مہلت قرض کے عوض مقروض سے قرض کے اصل مال پر کچھ بھی زائد مال لے سکتا ہے۔

یہاں یہ مناسب اور مفید سمجھتا ہوں کہ اکابر مفسرین کرام کی کچھ عبارات پیش کر دوں جو انہوں نے ربائے جاہلی کی تفسیر میں فرمائی ہیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح واضح ہو جائے۔ چنانچہ امام ابوبکر الجصاص اپنی جلیل القدر فقہی تفسیر میں ربٰو کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:-

والربٰوا الذی کانت العرب تعرفہ وتفعلہ انما کان قرض الدراھم والدنانیر الیٰ اجل بزیادۃ علیٰ مقدار ما استقرضہ علیٰ ما یتراضون بہ ھذا کان المتعارف المشھور عندھم۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵۲ باب الربٰو)

(ترجمہ) ”وہ ربٰوا جس کو اہل عرب جانتے پہچانتے اور کیا کرتے تھے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ایک مقررہ مدت تک دراہم و دنانیر کے قرض کا معاملہ تھا جس میں یہ طے پاتا تھا کہ قرض کے اصل مال پر کچھ زائد بھی ضرور لینا دینا ہوگا، ربٰو کا یہی معاملہ عربوں کے ہاں متعارف اور مشہور تھا۔“

اس سے کچھ آگے ایک اور عبارت اس طرح ہے:-

ولم یکن تعاملھم بالربٰو الاعلی الوجہ الذی ذکرنا من قرض دراھم ودنانیر الیٰ اجل مع شرط الزیادۃ۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵۳ باب الربٰو)

(ترجمہ) ”عربوں کے اندر جس ربٰو پر عملدرآمد تھا اس کی وہی شکل تھی جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی ایک خاص مدت تک دراہم و دنانیر کا قرض جس کے ساتھ زیادتی کی شرط ہوتی تھی۔“

پھر دو صفحات کے بعد ایک تیسری عبارت کچھ اس طرح ہے:-

انہ معلوم ان الربٰو الجاھلیۃ انما کان قرضاً مؤجلاً بزیادۃ مشروطۃ فکانت الزیادۃ بدلاً من الاجل فابطلہ اللہ وحرمہ وقال وان تبتم فلکم رءوس اموالکم لاتظلمون ولا تظلمون۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵۴ باب الربٰو من ابواب الربٰو الذی تضمنت الآیۃ تحریمہ)

(ترجمہ) ”یہ ایک معلوم اور جانی ہوئی بات ہے کہ عہد جاہلیت کی ربٰو سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ

زیادتی کی شرط کے ساتھ میعادی قرض کا معاملہ تھا اور اس میں قرض کے اصل مال پر جو زیادتی ہوتی تھی وہ مدت اور مہلتِ قرض کا بدل سمجھی جاتی تھی پس اس کو اللہ تعالیٰ نے باطل قرار دیا اور فرمایا اگر تم اس سے توبہ کر کے باز آجاؤ تو پھر تمہارے لیے صرف تمہارے اصل اموال ہیں جو تم نے بطور قرض دیئے تھے نہ تم ان پر کچھ زائد لیکر اپنے مقروضوں پر ظلم کرو اور نہ وہ تمہارے اصل اموال روک کر تم پر ظلم کریں"۔

واضح رہے کہ یہاں ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں۔

اس تیسری عبارت میں جو بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ کہ قرض کے اصل مال پر جو زیادتی مشروط ہوتی تھی وہ اجل یعنی مدتِ قرض کا عوض اور بدل سمجھی جاتی تھی۔

دوسرے مفسر امام فخر الدین الرازیؒ نے اپنی عظیم المرتبت تفسیر مفاتیح الغیب میں جو کہ تفسیر الکبیر کے نام سے معروف ہے، ربٰو کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

اما الربٰو النسیئۃ فھو الامر الذی کان مشھورًا متعارفًا فی الجاھلیۃ وذٰلک انھم کانوا یدفعون المال علیٰ ان یاخذوا کل شھر قدرًا معینًا ویکون رأس المال باقیًا، ثم اذا حل الدّین طالبوا المدیون برأس المال فان تعذر علیہ الاداء زادوا فی الحق والاجل فھٰذا ھو الربٰو الذی کانوا فی الجاھلیۃ یتعاملون۔ (تفسیر الکبیر ج ۷ ص ۹۱ سورۃ البقرہ)

(ترجمہ) "البتہ ربٰو النسیئۃ جو عہدِ جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھی عملاً اس کی شکل اس طرح تھی کہ بعض لوگ اپنا مال دوسروں کو بطور قرض اس شرط پر دیتے کہ وہ ہر ماہ اپنے مقروض سے خاص مقدار میں کچھ مال بطور سود لیتے رہیں گے اور قرض کا اصل مال اپنی حالت پر باقی رہے گا پھر جب ادائیگی مقررہ وقت آتا تو وہ مقروض سے اصل مال کا مطالبہ کرتے پھر اگر اس کے لیے ادائیگی مشکل ہوتی تو اپنے حق اور قرض کی مہلت میں اضافہ کر دیتے، پس یہی وہ ربٰو تھی جس کا لوگ عہدِ جاہلیت میں لین دین اور کاروبار کرتے تھے"۔

اسی تفسیر میں ربٰو سے متعلق ایک اور عبارت کچھ اس طرح ہے :۔

کان الرجل فی الجاھلیۃ اذا کان لہٗ علیٰ انسان مائۃ درھم الی الاجل فاذا جاء الاجل ولم یکن المدیون واجدًا لذٰلک قال زدنی فی المال حتیٰ ازید فی الاجل فربما جعلہ مائتین۔ (تفسیر الکبیر ج ۹ ص ۲ سورۃ آل عمران آیۃ ۱۳۰)

(ترجمہ) "زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی کے کسی انسان پر ایک خاص وقت کیلئے ایک سو درہم قرض ہوتے پھر جب وہ وقت آتا اور مقروض کے پاس ادائیگی کیلئے مال نہ ہوتا تو وہ کہتا تم میرے حق میں اضافہ کر دو تاکہ میں اجل کو زیادہ کر دوں پس بسا اوقات وہ سو درہم کے دو سو درہم کر دیتا"۔

مذکورہ عبارات میں اس کی تصریح ہے کہ عہدِ جاہلیت کی ربٰو جس کو قرآن مجید نے قطعی حرام بتلایا ہے اس کے اندر جو مرکزی تصوّر کارفرما تھا وہ یہ کہ مقرض یعنی قرض دینے والا مدتِ قرض کے بدلے قرض کے اصل مال پر کچھ زائد مال کا حقدار قرار پاتا ہے، قرآنِ کریم نے اس ربٰو کو حرام قرار دے کر اور یہ فرما کر کہ مقرض اپنے اصل مال پر جو کچھ بھی زائد لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے، تصورِ مذکور کی نفی کر دی ہے، گویا یہ فرمایا کہ اجل اور مدتِ قرض کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مال کا بدل بن سکتی ہو اور جس کا کوئی معاوضہ لیا دیا جا سکتا ہو۔

یہاں تک ربٰو الجاہلی اور ربٰو النسیئۃ کی حقیقت و ماہیت اور اس کی شرعی حیثیت کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ جو کچھ لکھا اور عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں جب ہم اپنے زیرِ بحث معاملے کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت، اپنے منشاء و مقاصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربٰو النسیئۃ جیسا معاملہ ہے، وہ اس طرح کہ اس میں ایک شے جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جب ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس میں پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے، نیز جس طرح ربٰو النسیئۃ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر لیا جانے والا زائد مال بلا عوض ہوتا اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے۔ اسی طرح زیرِ بحث معاملہ میں بیچی جانے والی شے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لیے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا حق لیتا اور اس کی حق تلفی کرتا ہے، نیز جس طرح ربٰو النسیئۃ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے و تموّل کو بڑھانا ہوتا ہے اسی طرح زیرِ بحث بیع المؤجل کے معاملہ میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیدا آور محنت اور عملی جدوجہد کے اور بغیر کسی نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ربٰو النسیئۃ کے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور غیر فطری نشیب و فراز رونما ہوتا اور ملکی دولت چند اغنیاء اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح زیرِ بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے غرضیکہ وہ تمام اخلاقی، معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربٰو النسیئۃ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام نے ربٰو النسیئۃ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ٹھہرایا ہے، وہ سب زیرِ بحث بیع مؤجل کے معاملہ سے بھی لازماً ظہور میں آتی ہیں لہٰذا اصول قیاس کا تقاضا یہ

ہے کہ اس معاملہ کا بھی وہی شرعی حکم ہونا چاہیئے، جو معاملہ ربٰوالنسیئۃ کا ہے یعنی حرام کیونکہ بنیادی طور پر ان کے درمیان کچھ فرق نہیں صرف لفظی فرق ہے جس کا عقود و معاملات میں شرعًا کوئی لحاظ اور اعتبار نہیں ہوتا۔ الاعتبار فی العقود للمقاصد والمعانی لاللالفاظ والالمبا مسلّم قاعدہ کلیہ ہے ۔

قرآن مجید کی جس دوسری آیت سے معاملہ زیر بحث کی شرعی حیثیت پر روشنی پڑتی اور اس کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے وہ سورۃ النساء کی یہ آیت کریمہ ہے :۔

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ (سورۃ النساء آیت ۲۹)

(ترجمہ) "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت کا طریقہ ہو جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو۔"

اس آیتِ کریمہ کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں باطل طریقہ سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی ممانعت ہے اور اِلّا حرفِ استثناء کے بعد دوسرے حصہ میں ایسی تجارت کے طریقہ سے ایک دوسرے کا مال لینے کی اجازت ہے جس میں ہر فریق کی حقیقی اور دلی رضامندی پائی جاتی ہو۔ پہلے حصہ میں جو لفظ باطل ہے وہ حق کی ضد ہے، اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ناحق کیا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کرام نے باطل کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول پیش کیا ہے :۔

الباطل هو كل ما يوخذ من الانسان بغير عوض۔ (تفسیر الکبیر ج ۱۰ ص ۷۱ سورۃ النساء آیت ۳۰)

(ترجمہ) "ہر وہ مال لینا باطل ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض کے لیا جائے۔"

علامہ رشید الرضا باطل کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

اما الباطل ما لم يكن في مقابلة شئ حقيقي۔ (تفسیر المنار ص)

(ترجمہ) "باطل وہ ہے جو کسی حقیقی شے کے مقابلہ میں نہ ہو یعنی اس کے بالمقابل کوئی حقیقی چیز نہ ہو۔"

لہٰذا آیت مذکورہ کے پہلے حصہ کا مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بغیر عوض کے نہ لو، یعنی معاوضے کے معاملات میں ایک دوسرے کا مال بغیر ایسے عوض کے نہ لو جو مالیت اور قدر و قیمت میں اس کے برابر ہو کیونکہ کسی مال کا صحیح عوض اور بدل صرف وہ ہوتا ہے جو قدر و قیمت میں اس مال کے برابر ہو، بنا بریں آیت کریمہ کے پہلے حصہ کی رُو سے ہر وہ معاشی معاملہ باطل اور ممنوع قرار پاتا ہے جس میں ایک فریق کے لیے اس کے مال کا سرے سے عوض موجود ہی نہ ہو یا عوض تو موجود ہو لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے اس مال کے مساوی نہ ہو۔ آیت کریمہ کے دوسرے حصہ

میں معاوضے کے صرف اس معاملہ کو باطل سے مستثنیٰ اور جائز بتلایا گیا ہے جس میں ہر فریق کیلئے اس کی چیز کا بدل موجود ہوتا لہٰذا فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے، چونکہ تجارت یعنی بیع وشراء کا معاملہ ایسا ہی ہے اس میں بائع کو اپنی چیز کا عوض ثمن اور قیمت کی شکل میں اور مشتری کو اپنی چیز کا عوض خریدی ہوئی شے یعنی مبیع کی شکل میں ملتا ہے۔ البتہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع مشتری کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز اُس قیمت سے زائد پر بیچ دیتا ہے جو عام طور پر بازار میں اس چیز کی ہوتی ہے، یا بعض دفعہ مشتری بائع کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی چیز اُس قیمت سے کم پر خرید لیتا ہے جو بازار میں عام طور پر ہوتی ہے، لہٰذا بیع وشرائع کی ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہیں ہوتی اس وجہ سے کہ اس کے لیے اس کی چیز کا پورا اور صحیح عوض و بدل موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیع وشراء کا ایسا معاملہ کسی ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز وممنوع قرار پاتا ہے۔ جہاں تک ظاہری اور زبانی رضامندی کا تعلق ہے وہ تو معاملۂ ربٰو میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ربٰو کا معاملہ حرام وممنوع رہتا ہے، بلکہ حقیقت میں رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا صحیح عوض وبدل موجود ہونا ہے، وہ موجود ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود ہونا ہے اور موجود نہ ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود نہ ہونا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تفسیر میں جو عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں معاملۂ زیر بحث کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ معاملہ باطل کا بھی مصداق نظر آتا ہے کیونکہ اس میں بیچنے والا ادھار کی وجہ سے اپنی سو روپے کی چیز جو ڈیڑھ سو میں بیچتا ہے تو اس میں خریدار سے جو پچاس روپے زائد لیتا ہے ان کا کوئی عوض اس کی طرف سے خریدار کے لیے موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ بغیر عوض کے دوسرے کا مال لیتا ہے جس کو آیت کے اندر باطل سے تعبیر کر کے ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، نیز بیع وشرائع کا یہ ایسا معاملہ دکھائی دیتا ہے جس میں ایک فریق کے لیے اس کی چیز کا عوض موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کی رضامندی موجود نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ اس میں خریدار کے لیے مذکورہ بالا مثال کے مطابق پچاس روپے کا عوض موجود نہیں ہوتا جو قرض کی وجہ سے بیچنے والا خریدار سے لیتا ہے لہٰذا اس کی حقیقی رضامندی بھی موجود نہیں ہوتی لہٰذا اس پہلو سے بھی یہ معاملہ ناجائز اور ممنوع قرار پاتا ہے۔

زیر بحث معاملہ کی شرعی حیثیت سے متعلق جہاں تک احادیث نبویہ کا تعلق ہے تو متعدد احادیث سے بھی اس کا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے، ان کثرت احادیث سے بھی جن میں ربٰو کی سختی کے ساتھ مذمت اور ممانعت ہے، طوالت سے بچتے ہوئے میں ان کو یہاں نقل اور ذکر نہیں کر رہا، بیع عینہ کی ممانعت

سے متعلق جو احادیث ہیں ان سے بھی اس معاملے کا عدم جواز مفہوم و مستنبط ہوتا ہے البتہ یہاں میں اس حدیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں ربٰوا النسیئہ کی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے جو کہ حدیث کی بعض کتابوں میں ان الفاظ سے موجود ہے :-

عن علیؓ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل قرض جر منفعۃ فھو ربًا - (بلوغ المرام مترجم ، ص۱۷۱ حدیث ۸۸۲)

ترجمہ) "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے"

مطلب یہ کہ جو قرض، قرض دینے والے کیلئے قرض لینے والے کی طرف سے مالی منفعت کا سبب اور ذریعہ بنتا ہو وہ ربٰو ہے ۔ اس حدیث کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ سند کے لحاظ سے اگرچہ ضعیف ہے، لیکن اس کے مضمون کی تائید چونکہ متعدد آثار صحابہ کرامؓ سے ہوتی ہے لہٰذا اس کو ہمیشہ قابل اعتماد سمجھا گیا اور فقہاء کرام اس سے استدلال کرتے رہے ہیں، صحابہ کرامؓ کے وہ آثار جن سے اس حدیث کو تقویت ملتی ہے سنن الکبرٰی للبیہقیؒ اور اعلاء السنن وغیرہ میں مذکور ہیں ۔ ان آثار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ قرض دینے والا قرض کی وجہ سے اپنے مقروض سے کسی طرح کا کوئی مادی فائدہ اٹھائے اگرچہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، میں بغرض اختصار ان کو یہاں نقل نہیں کر رہا جو دیکھنا چاہے کتب مذکورہ میں دیکھ سکتا ہے ۔ مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ نے ربٰو کے موضوع پر اپنے رسالہ کشف الدجیٰ میں ان کو یکجا جمع کر دیا ہے ۔ جو امداد الفتاوٰی میں بھی شامل ہے ۔

بہر حال اس حدیث کی رُو سے بھی معاملہ زیر بحث ناجائز قرار پاتا ہے کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو شخص مثلاً ایک سو روپے کی چیز ادھار پر ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کرتا ہے وہ پچاس روپے جو زائد لیتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قرض سے فائدہ اٹھاتا اور منفعت اندوز ہوتا ہے، اگر قرض نہ ہوتا تو نقد کی صورت میں اس کو اس چیز کے صرف سو روپے ملتے ۔ پھر جب یہ معاملہ حدیث مذکور کے مطابق ربٰو کی تعریف میں آتا ہے تو اس کا بھی وہی شرعی حکم ہو سکتا ہے جو ربٰو و سُود کا ہے یعنی حرام و ناجائز ہونا ۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس کی بنا پر پورے وثوق و یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر بحث معاملہ قرآن و حدیث کی رُو سے حرام اور ناجائز معاملہ ہے ۔

اس کے بعد یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے بعض علماء کرام نے اپنی کتابوں میں بطور فتویٰ لکھا ہے کہ معاملہ مذکور شرعاً جائز معاملہ ہے یعنی شرعاً اس میں کچھ حرج نہیں کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زائد قیمت پر بیچی جائے، چنانچہ اسی فتوے کے پیش نظر بلا سود بینکاری کے لیے سود کے متبادل جو معاملات تجویز کیے گئے ہیں ان میں سے ایک معاملہ یہ بھی ہے گویا بینک کو اس کی اجازت دیدی گئی ہے کہ اس سے اگر کوئی شخص مشین وغیرہ خریدنے کے لیے قرضہ مانگے تو وہ اس کو سود پر نقد دینے کی بجائے اس سے یہ کہے کہ میں تیری مطلوبہ چیز خرید کر تم کو ایک سال کے ادھار پر دیدیتا ہوں اور ادھار کی وجہ سے مرابحہ کے نام پر اس کی اتنی قیمت لگائے جو بازار کی مروجہ قیمت سے کہیں زائد ہو، مثلاً یہ کہے کہ یہ چیز جو مجھے سو روپے میں پڑی ہے پچاس روپے کے نفع کے ساتھ بیچتا ہوں تم ایک سو پچاس روپے ایک سال کے بعد ادا کر دینا، مطلب یہ کہ اس طرح کے معاملہ کو بینک کیلئے جائز قرار دیا گیا ہے جو حقیقت میں اپنے مقصد اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربا کی طرح کا معاملہ ہے اگرچہ اس کو بیع مرابحہ اور بیع مؤجل کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ویسے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا بیع مرابحہ بھی شرعاً اُس وقت جائز ہے جب اس میں ربح و نفع کی مقدار بازار کے عام عرف و رواج کے مطابق ہو، اسی بیع مؤجل بھی شرعاً اُس وقت جائز ہے جب بیچی جانے والی چیز کی قیمت اُدھار میں بھی اتنی ہی ہو جتنی نقد کی صورت میں تھی۔

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات علماء کرام معاملہ زیر بحث کو شرعاً جائز سمجھتے اور کہتے ہیں ان کے وہ دلائل کیا ہیں جن کی بناء پر وہ ادھار کی چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کو جائز و درست مانتے ہیں لیکن اس بارے میں نہ میں اُن حضرات میں سے کسی کا اسم گرامی ذکر کروں گا اور نہ اس کتاب کا نام لکھوں گا جس میں کسی نے ایسا لکھا ہے بلکہ صرف وہ دلائل ذکر کروں گا جو ان حضرات نے اپنے مؤقف کے ثبوت میں پیش فرمائے ہیں اور فیصلہ اہل علم حضرات پر چھوڑ دوں گا جو استدلال اور استنباط کے مختلف طریقوں کا غیر معمولی علم و فہم رکھتے، صحیح اور غلط استدلال کے درمیان تمیز کر سکتے اور فیصلہ کرنے میں انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔

قارئین کرام یہ پڑھ کر حیران و متعجب ہوں گے کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں نہ تو قرآن مجید کی کوئی آیت پیش کرتے ہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث، نہ آثار صحابہؓ میں سے کوئی اثر، نہ ائمہ مجتہدین کا کوئی اجتہادی قول اور نہ مسلمہ قواعد فقہیہ میں سے کوئی قاعدہ پیش فرماتے ہیں بلکہ اس کے ثبوت میں بطور دلیل فقہ حنفی کی دو مشہور کتابوں مبسوط اور

ہدایہ کی ایک ایسی عبارت پیش کرتے ہیں جس سے کسی طرح بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا خریدنا شریعتِ اسلامی کی رو سے جائز ہے۔ میں اُس عبارت کو پیش کرنے سے پہلے جس سے ان حضرات نے استدلال فرمایا ہے اُس سیاق وسباق کا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں وہ عبارت ذکر ہوئی ہے تاکہ حقیقتِ واقعہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جس سیاق وسباق میں وہ عبارت واقع ہے اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ فقہ حنفی کی مذکورہ بالا کتابوں میں جہاں بیع مرابحہ کی بحث ہے اس میں بیع المرابحہ کی فقہی تعریف، اس کی صحت کی شرائط اور اس کی مختلف شکلوں اور ان کے متعلق شرعی احکام کا بیان ہے۔ بیع مرابحہ کی تعریف جن الفاظ میں کی گئی ہے اردو زبان میں اس کا مطلب اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے بیع مرابحہ خرید وفروخت کا ایسا معاملہ ہے جس میں ایک شخص یہ کہہ کر اپنی کوئی چیز دوسرے پر فروخت کرتا ہے کہ یہ چیز میں نے اتنے میں خریدی یا مجھے اتنے میں پڑی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں اور دوسرا اس پر اعتماد وبھروسہ کر کے وہ چیز خرید لیتا ہے گویا اس میں کوئی چیز اس کی قیمتِ خرید پر متعین نفع کے ساتھ بیچی خریدی جاتی ہے، چونکہ اس بیع میں سچائی اور دیانتداری بنیادی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کو بیع الامانۃ بھی کہا جاتا ہے، اس بیع کی صحت اور تکمیل کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ حقیقتاً جھوٹ اور خیانت موجود نہ ہو بلکہ اس کا شبہ بھی نہ پایا جاتا ہو، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ معاملہ طے پا جانے کے بعد اگر جھوٹ و خیانت کا شبہ ظاہر ہو جائے تو خریدار کو اس کے ردّ وقبول کا خیار ہوتا ہے یعنی چاہے تو اس کو برقرار رکھے اور چاہے تو ختم کر دے۔

بیع المرابحہ کی وہ شکلیں جن میں جھوٹ وخیانت کے شبہ کی بنا پر خریدار کو معاملہ طے ہو جانے کے بعد ردّ وقبول کا خیار ہوتا ہے ان میں سے ایک شکل جس کا امام محمد الشیبانیؒ نے اپنی کتاب جامع الصغیر میں ذکر کیا ہے، اس طرح ہے :۔

من اشترٰی غلامًا بالف درهم نسيئة فباعه بربح مائة درهم ولم يبين فعلم المشتري فان شاء ردّه وان شاء قبل۔ (جامع الصغیر ص ۳۴۸ باب فی المرابحۃ والتولیۃ)

(ترجمہ) "ایک شخص نے ایک غلام ایک ہزار درہم میں ادھار پر خریدا اور پھر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو فروخت کر دیا اور خریدار کو یہ نہیں بتلایا کہ میں نے ایک ہزار درہم میں اُدھار پر خریدا تھا، معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو اس کا علم ہوا تو ایسی صورت میں اس کو ردّ وقبول دونوں کا اختیار رہتا ہے۔"

جامع الصغیر میں امام محمد الشیبانیؒ نے عبارت مذکورہ کے بعد اس کی کوئی توجیہہ نہیں فرمائی کہ اس صورت میں خریدار کو معاملے کے رد کا کیوں اختیار ہوتا ہے؟ اس کی عقلی طور پر کیا وجہ ہے؟ لیکن بعد کے بعض حنفی فقہاء کرام نے مذکورہ جزیئے کو نقل کرنے کے بعد اس کی توجیہہ بھی لکھی ہے شمس الائمۃ السرخسیؒ نے اپنی کتاب المبسوط میں اس کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے"۔

قال رحمه الله واذا اشترى شيئا نسيئة فليس له ان يبيعه مرابحة حتى يتبين انه اشتراه نسيئة لان بيع المرابحة بيع الامانة تنفى عنه كل تهمة وخيانة ويتحرز فيه من كل كذب وفي معاريض الكلام شبهة فلا يجوز استعمالها في بيع المرابحة ثم الانسان في العادة يشتري الشئ بالنسيئة باكثر مما يشتري بالنقد۔ (المبسوط ج ۱۳ ص ۸۶ باب المرابحة والتولية)

اس عبارت کا وہ حصہ جو اس بحث کا مقصود ہے یہ ہے:۔

ثم الانسان فی العادة یشتری الشئ بالنسیئة باکثر مما یشتری بالنقد۔

(ترجمہ) پھر انسان عادۃً ادھار کی چیز اس قیمت سے زائد پر خرید لیتا ہے جو نقد کی صورت میں ہوتی ہے"۔

مطلب یہ کہ ادھار پر خریدی ہوئی چیز جب مرابحہ کے طور پر فروخت کی جائے تو امانتداری اور راست گوئی کا تقاضا یہ ہے کہ فروخت کرنے والا خریدار کو صاف بتلادے کہ یہ شے میں نے ادھار پر اتنے میں خریدی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں، اور یہ بتادینا اس لیے ضروری ہے کہ حاجتمند انسان جب کوئی شے ادھار پر خریدتا ہے تو عادتاً بمقابلہ نقد کے زیادہ قیمت پر خرید لیتا ہے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ یہ چیز بھی اس نے اپنی حاجتمندی اور ناداری کی وجہ سے زیادہ قیمت پر خرید لی ہو جو بصورت نقد بازار میں اس کی نہ ہو، اور اب چونکہ وہ نقد کی صورت میں فروخت کر رہا ہے ادھار کی صورت میں نہیں کر رہا لہٰذا اس پر لازم ہے کہ خریدار کو اس حقیقت سے آگاہ کردے، چنانچہ آگاہ ہوجانے کے بعد بھی اگر وہ اس کو مطلوبہ قیمت پر خرید لیتا ہے تو پھر اس کو طے شدہ معاملہ فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا بخلاف اس صورت کے کہ وہ خریدار کو اس سے آگاہ نہیں کرتا اور معاملہ طے پا جانے کے بعد اسے اس کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس معاملے کو فسخ کرسکتا ہے۔

المبسوط کی مذکورہ عبارت میں جس انسان اور اسکی عادت کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ وہی ہوسکتا ہے جو کسی چیز کا حاجتمند ہو اور ناداری کی وجہ سے نقد پر نہ خرید سکتا ہو اور وہ چیز اس کو نقد کی قیمت پر بطور قرض حسنہ کے بھی نہ مل سکتی ہو، ایسا انسان اپنی حاجت براری کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ وہ ادھار دینے والے کی مرضی کے مطابق زیادہ قیمت پر خرید لے۔ اور لفظ عادت کا مطلب ہے کہ ایسا ہوتا ہے یہ مطلب نہیں کہ

ایسا لازماً اور دائماً ہوتا ہے، کیونکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قرضِ حسنہ کی اسلامی تعلیم پر عمل کرنے والے اور ربٰو کی ہر شکل سے بچنے اور اجتناب کرنے والے متقی مسلمان جب کسی حاجتمند انسان کو اس کی ضرورت کی چیز اُدھار پر دیتے ہیں تو اسی قیمت پر دیتے ہیں جو بصورت نقد بازار میں اس کی رائج ہوتی اُدھار کی وجہ سے زیادہ قیمت پر نہیں دیتے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مادی فائدہ کے بغیر کسی کو قرض نہیں دیتے اور اپنے معاشی معاملات میں اسلامی اصول و احکام اور حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتے، اسی لیے ایسے لوگوں کا رویہ اور طرزِ عمل شریعتِ اسلامی کی رُو سے جائز و درست نہیں ہوتا۔ شمس الائمہ السرخسیؒ کی مذکورہ عبارت میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ ان کے نزدیک لوگوں کی مذکورہ عادت شرعاً جائز و درست عادت ہے، رہا یہ سوال کہ پھر انھوں نے اس کو ناجائز کیوں نہیں لکھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ان کا مقصد اس عادت کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا نہیں بلکہ ان کا اصل مقصد بیع المرابحہ کی ایک خاص شکل سے متعلق امام محمدؒ کے مذکورہ قول کی توجیہ کرنا ہے جو عادت مذکورکے ناجائز ہونے کی شکل میں بھی ہو جاتی ہے۔

مبسوط کی مذکورہ عبارت کے بعد اب میں صاحب الھدایہ علامہ المرغینانیؒ کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جس سے زیرِ بحث معاملے کے جواز کے لیے استدلال فرمایا گیا ہے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:-

قال من اشترىٰ غلاماً بالف درهم نسيئة فباعه بربح مائة ولم يبين، فعلم المشتری فان شاء ردّه وان شاء قبل لان للاجل شبها بالمبيع الا یرى انه يزداد فی الثمن لاجل الاجل والشبهة فی هذا ملحقة بالحقيقة فصار كانه اشترى شيئين و باع احدهما مرابحة بثمنهما۔ (ھدایۃ اخیرین ص ۵۷، ۵۸ باب المرابحة والتولية)

(ترجمہ) "امام محمدؒ نے کہا جس نے ایک ہزار درہم کے بدلے ایک غلام ادھار پر خریدا اور پھر مرابحہ کے طور پر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو بیچ ڈالا اور خریدار کو نہیں بتلایا کہ میں نے یہ ادھار پر خریدا تھا بعد میں خریدار کو اس کا علم ہوا، پس اب اگر وہ چاہے تو اس کو رد کردے اور چاہے تو اس کو قبول کرسکتا ہے کیونکہ اجل یعنی قرض کی مہلت اور مدت بیچی جانے والی چیز سے کچھ مشابہت رکھتی ہے کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور چونکہ مرابحت کے باب میں شبہ مبیع کو حقیقت مبیع سے ملحق کر دیا گیا ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ گویا بیچنے والے نے جس قیمت میں دو چیزیں خریدی تھیں یعنی غلام اور اجل، اس قیمت پر ان میں سے ایک یعنی غلام کو بیچ دیا۔"

اس عبارت میں مقصود بحث اس کا وہ حصہ ہے جس میں صاحب ہدایہ نے امام محمدؒ کے قول مذکور کی توجیہ پیش فرمائی ہے یعنی مرابحہ کی مذکورہ شکل میں معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو معاملہ فسخ کرنے کا جو اختیار حاصل ہوتا ہے، عقلی طور پر اسکی وجہ کیا ہے، وہ وجہ صاحب ہدایہ کے نزدیک مرابحہ کی اس شکل میں شبہ خیانت کا پایا جانا ہے جس سے بیع مرابحہ کو پاک ہونا چاہیئے کیونکہ بیع المرابحہ بیع الامانۃ ہے، اور شبہ خیانت کی جو وضاحت انہوں نے فرمائی ہے وہ یہ کہ جو شخص ادھار پر کوئی چیز خریدتا ہے اس کے متعلق گو یقین نہ سہی لیکن یہ شبہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس نے جس قیمت میں وہ چیز خریدی ہے وہ قیمت تنہا اس چیز کی نہ ہو بلکہ ادھار کی جو اجل اور مہلت ہے اس کی بھی ہو کیونکہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ادھار کی مہلت اور مدت کی وجہ سے فروخت کی جانے والی چیز کی قیمت بڑھا دیتے ہیں، لہٰذا ادھار پر خریدی ہوئی ہر چیز کے متعلق یہ شبہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اسکی جو قیمت ہے وہ تنہا اس کی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ اجل اور مہلت ادھار کی بھی ہو بنا بریں جو شخص نقد کی صورت میں بھی اس شئے کی وہی قیمت وصول کرتا ہے جو ادھار کی صورت میں اس شئے کی تھی تو گویا وہ دو چیزوں کی قیمت ایک چیز سے وصول کرتا ہے کیونکہ نقد کی صورت میں اجل نہیں ہوتی صرف چیز ہوتی ہے لہٰذا وہ ایک طرح کی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے جو مرابحہ کے معاملہ میں عیب ہے اور چونکہ مبیع میں عیب ظاہر ہونے کی صورت میں خریدار کو رد و قبول کا خیار ہوتا ہے لہٰذا بیع المرابحہ کی اس شکل میں بھی خریدار کو رد و قبول کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

اس توجیہ کے ضمن میں علامہ مرغینانیؒ نے اپنی اس بات کی تائید میں کہ اجل مبیع سے کچھ مشابہ ہے فرمایا الا یری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل یعنی ادھار کی مدت کی وجہ سے شئے کی قیمت بڑھا دی جاتی ہے، اس سے بعض اہل علم حضرات نے یہ مطلب نکالا ہے کہ ادھار کی چیز کی قیمت بمقابلہ نقد کے بڑھا دینا شریعتِ اسلامی کی رُو سے جائز ہے، حالانکہ عبارت مذکور سے یہ مطلب بالکل نہیں نکلتا۔ اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے بلحاظ واقعہ بالکل درست ہے کہ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں یعنی ادھار کی چیز کی قیمت زیادہ کر دیتے ہیں لیکن ان کا ایسا کرنا قرآن و حدیث کی رُو سے جائز ہوتا ہے یا ناجائز؟ عبارت مذکور کے کسی لفظ سے اس کا اظہار نہیں ہوتا اسلئے کہ صاحب ھدایہ کا مقصد یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اجل کی مبیع سے کچھ مشابہت یا اجل کے مبیع ہونے کا شبہ ہے کیونکہ کچھ لوگ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرتے ہیں یہاں ان کا مقصد اس کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا اور یہ بتلانا نہیں کہ ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ یہی وجہ ہے کہ ہدایہ کے شارحین نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں لکھا، فتح القدیر، بنایۃ، غایۃ اور کفایۃ وغیرہ کو دیکھ لیجئے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اجل کی وجہ سے شئے کے ثمن میں اضافہ کرنا جائز ہے۔ اسی طرح کسی کا اس کو ناجائز نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں پر مقصد اس کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا ہے ہی نہیں، نیز جو معاملہ بدیہی طور پر

ناجائز ہو اس کو ناجائز لکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بہرحال کسی معاملے کے جائز یا ناجائز ہونے کا اصل معیار قرآن وحدیث اور ان کے اصول واحکام ہیں، چنانچہ جو معاملہ ان کے مطابق ہو وہ جائز اور جو مطابق نہ ہو بلکہ خلاف ہو وہ ناجائز قرار پاتا ہے۔ لوگوں کا اس کو کرنا یا نہ کرنا اس کے جواز وعدم جواز کا کوئی معیار نہیں ورنہ شریعت ایک کھلونا بن کر رہ جائے گی۔

علاوہ ازیں اگر مذکورہ عبارت یعنی یزاد فی الثمن لاجل الاجل سے یہ مفہوم ہے کہ اجل یعنی مہلت قرض کسی ثمن وقیمت کا عوض وبدل بن سکتی ہے تو تین سطروں کے بعد خود صاحب ہدایہ نے واضح الفاظ سے اس کی نفی کر دی ہے، فرمایا "وان استهلكه ثم علم لزمه بالالف ومائة لان الاجل لا يقابله شئ من الثمن" اور اگر مذکورہ مثال میں خریدار نے خریدنے کے بعد غلام کو ہلاک یا فروخت کر دیا یعنی اس کے ہاتھ میں نہ رہا اور پھر اس کو یہ علم ہوا کہ وہ ایک غلام ایک ہزار درہم میں ادھار پر خریدا گیا تھا اور ایک سو درہم منافع کے ساتھ مجھ پر فروخت کیا گیا تو اب وہ فروخت کرنے والے سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا اور اس کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جو گیارہ سو روپے آپ کو دیئے ہیں ان میں جو اجل کا عوض تھے وہ مجھے واپس کر دو کیونکہ اجل ایک ایسی چیز ہے جس کے مقابلہ میں کوئی ثمن نہیں ہو سکتا "لان الاجل لا يقابله شئ من الثمن" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اجل اور مہلت ادھار کے بالمقابل کوئی مال لینا دینا جائز نہیں۔ اور چونکہ ہمارے زیر بحث معاملہ میں بصورت ادھار نقد کے مقابلہ میں جو زائد قیمت لگائی جاتی ہے وہ اجل اور مدت ادھار کی وجہ سے لگائی جاتی ہے، لہٰذا ھدایہ کی اس دوسری عبارت سے الٹا اس معاملے کا ناجائز ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ المبسوط اور الہدایہ کی جن عبارات سے معاملہ زیر بحث کے جواز کے لیے استدلال کیا گیا ہے، اگر کچھ بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ استدلال بے جان نظر آتا ہے اور ان عبارات سے کسی طرح اس معاملے کا جواز نہیں نکلتا جبکہ اس کے مقابلہ میں عدم جواز کے دلائل قرآن وحدیث سے تعلق رکھتے اور مضبوط ومستحکم دلائل ہیں جو قدرے تفصیل کے ساتھ پہلے عرض کیے گئے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس مسئلہ پر از سر نو پڑھیں اور غور وفکر کریں گے اور پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ اس معاملے کی شرعی حیثیت کا تعین فرمائیں گے

جواب از

حضرت العلامہ مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدظلہٗ کلاچی

استفتاء:۔ بخدمت گرامی استاذِ محترم حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدظلہٗ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! گذارش یہ ہے کہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک بابت رجب ۱۴۱۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۹۱ء میں حضرت مولانا طاسین صاحب کا ایک مضمون آیا ہے جس میں انہوں نے بیع نقد اور نسیہ میں قیمت کے فرق کو ناجائز قرار دیا ہے اور حرام تک سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ ہمارے اکابرین اسے جائز قرار دیتے رہے ہیں، جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ امدادیہ میں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امداد المفتین میں، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہٗ نے احسن الفتاویٰ میں اور مفتی کل ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ کفایت المفتی میں ہے۔

ان سب حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے ــــــ آپ صحیح صورتحال سے مطلع فرمائیں کہ ان دونوں باتوں میں تعارض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس کو صحیح سمجھا جائے اور پوچھنے والوں کو کیا بتلایا جائے ــــــ اگر اجازت ہو تو آپ کا جواب تطبیق یا ترجیح کا الحق کو بھیج دوں ــــــ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الحق بھی مولانا طاسین صاحب کی رائے کی تائید میں ہے کیونکہ اس نے بلا کسی نکیر کے اس کو شائع کیا ہے۔

حافظ عبدالقیوم حقانی خطیب جامع مسجد لوہاراں کلاچی ۲۸ رجب ۱۴۱۲ھ

الجواب:۔ دونوں فتوؤں میں تعارض ظاہر ہے ــــــ اکابر علماء مذکورین فی السوال کے فتویٰ کو غلط سمجھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، حضرت مولانا طاسین صاحب کا مضمون الحق میں ادھورا ہے میثاق میں غالباً پورا ہے، اور مجھے کسی صاحب نے اُن کے مضمون کا عکس (فوٹوسٹیٹ) بھی بھیجا ہے۔ مولانا نے اپنے مضمون میں دو باتیں فرمائی ہیں میں مختصراً ان پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ جواز کا فتویٰ دینے والوں کے پاس دلیل ہدایہ اور مبسوط کی یہ عبارت ہے الا تریٰ انہٗ یزاد الثمن لاجل الاجل، آپ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ

معاملہ جائز بھی ہے انہوں نے مرابحہ کی بحث میں صرف لوگوں کی عادت کا ذکر کر دیا ہے اس کو جائز کہنے کی بات نہیں کی ــــــ دوسری بات یہ کہ جائز کہنے والوں کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل تو کیا کسی مجتہد کا قول بھی نہیں۔

اس ناکارہ کے ناتمام مطالعہ کے مطابق حضرت مولانا کی یہ دونوں باتیں محلِ نظر ہیں آپ کا یہ فرمانا کہ علامہ سرخسیؒ نے صرف لوگوں کی عادت کا ذکر کیا ہے خود اسے جائز نہیں فرمایا، اس کے لیے ناظرین کو علامہ سرخسی رحمہ اللہ کی مبسوط جلد ۱۳ ص ۸ ملاحظہ فرمالینا چاہیئے، عبارت یہ ہے:۔

واذا عقد العقد علیٰ انہٗ الیٰ اجل کذا بکذا و بالنقد بکذا او قال الیٰ شھرٍ بکذا والیٰ شھرین بکذا اوھو فاسد لانہٗ لم یعاملہ علیٰ ثمنٍ معلومٍ ولنھی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم عن شرطین فی بیع وھٰذا ھو تفسیر الشرطین فی بیع۔

(ترجمہ) "جب عقد اس طرح کیا جائے کہ اجل پر قیمت اتنی ہے اور نقد پر اتنی یا ایک مہینہ کا اجل ہو تو قیمت اتنی اور دو ماہ کا اجل ہو تو قیمت اتنی، تو یہ عقد فاسد ہوگا اور فاسد اسلئے ہو گا کہ معاملہ میں ثمن معلوم نہ ہوسکا تردد میں چھیڑ دیا، اور اس لیے بھی فاسد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے اور شرطین فی بیع کے یہی معنی ہیں، (یعنی ثمن یا مبیعہ میں تردد)"۔

آپ نے دیکھا کہ اس صورت کے فساد کی وجہ علامہ سرخسیؒ نے تردد فی الثمن کو کہا ہے جو اصولِ بیع کے بھی خلاف ہے اور نصِ صریح کے بھی۔ علامہ سرخسیؒ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ صورت چونکہ ربٰو النسیئۃ میں داخل ہے اس لیے فاسد ہے ــــــ اس پر بھی اگر اطمینان نہیں تو علامہ سرخسیؒ کی اس عبارت کے ساتھ متصل یہ صریح عبارت بھی پڑھ لیجیئے، آپ فرماتے ہیں:۔

وھٰذا اذا افترقا علیٰ ھٰذا فان کان یتراضیان بینھما ولم یتفرقا حتیٰ قاطعہ علیٰ ثمنٍ معلومٍ واتمّا العقد فھو جائز لانھما ماافترقا الا بعد تمام شرط صحۃ العقد۔

(ترجمہ) "یعنی فساد اس صورت کا اس وقت ہے کہ جب بائع اور مشتری اسی متردّدانہ حالت میں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں، لیکن اگر وہ دونوں راضی ہوگئے اور جدا ہونے سے پہلے پہلے ثمن معلوم کر لیا اور عقد کو اتمام تک پہنچا دیا (یعنی ایک ہی صورت اجل والی یا نقد والی متعین کر لی) تو پھر یہ عقد جائز ہے کیونکہ اب بائع اور مشتری صحتِ عقد کی شرط کو پورا کر کے آپس میں جدا ہو گئے ہیں"۔

تو ایسی صورت میں نہ تو بیع کے عام اصول کی خلاف ورزی ہوئی کہ نہ ثمن مجہول ہے اور نہ مبیع

اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کی خلاف ورزی ہوئی کیونکہ شرطین فی بیع کے معنی علامہ سرخسیؒ نے یہی بیان فرمائے کہ ثمن وغیرہ میں یہ تردد ہو یا یہ یا وہ، جیسا کہ انہوں نے فرمایا وھٰذا ھو الشرطین فی بیع۔ اب آپ خود ہی فرمائیں کہ مولانا کی اس تاویل میں کتنی جان ہے کہ علامہ سرخسیؒ نے لوگوں کی عادت کا ذکر کیا ہے کہ جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

دوسری بات کہ مجوزین کے پاس کسی مجتہد کا قول بھی نہیں ہے (اس سے تنا تو بہرحال معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کے نزدیک غیر مجتہد کے لیے (جیسے کہ ہم سب ہیں) مجتہد کا قول بھی دلیل شرعی ہے) تو اس کے لیے کتاب الاصل المعروف بالمبسوط کا صفحہ ۱۹ جلد ۵ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ واضح رہے کہ کتاب کی لوح پر یہ عبارت درج ہے اور جس میں غالباً کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

کتاب الاصل المعروف بالمبسوط

للامام الحافظ المجتہد الربانی ابی عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللہ تعالیٰ

آپؒ فرماتے ہیں: واذا باع الرجل بیعاً فقال ھو بالنسیئۃ بکذا وبالنقد بکذا کذا او قال الی اجل کذا بکذا۔ وکذا فافترقا علی ھٰذا فانہ لایجوز بلغنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ نہی عن شرطین فی بیع قال محمدؒ حدثنا بذالک ابوحنیفۃؒ رفعہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ـــ "یعنی جب کوئی اس طرح بیع کرے کہ قرض پر اتنی قیمت ہے اور نقد پر اتنی یا ایک ماہ کی مدت پر اس کی قیمت یہ ہے اور دو ماہ کی مہلت پر قیمت وہ ہے اور پھر تردد کی حالت میں بائع اور مشتری ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے، یعنی ثمن وغیرہ کا تردد، جیسا کہ شرح سرخسیؒ میں پہلے گذر چکا ہے"

کتاب الاصل کی یہ عبارت اس لیے نقل کی گئی ہے تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو کہ زیر بحث صورت کو جائز کہنے والوں کے پاس کسی مجتہد کا قول ہے یا نہیں۔ باقی رہے وہ بہت سے دلائل اور کثیر عبارتیں جو آپ نے اپنے مضمون میں تحریر فرمائی ہیں تو ان کی تفصیل میں گئے بغیر اتنا عرض ہے کہ مولانا کے خیال میں زیر بحث صورت ربٰو بالنسیئۃ میں داخل ہے اور مجوزین کے نزدیک جن میں صاحب ھدایہ اور صاحب مبسوط (سرخسیؒ) اور خود مجتہد ربانی امام محمد شیبانیؒ شامل ہیں، یہ صورت ربٰو النسیئۃ میں داخل نہیں ہے ورنہ اس کے عدم جواز کو صورت تردد تک محدود نہ رکھتے اور تعیین صورت یا نقد یا نسیہ پر جواز کا فتویٰ نہ دیتے اور صاف فرما دیتے کہ یہ صورت ربٰو النسیئۃ کی ہے اس لیے حرام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اجل ایک وصف ہے اور وصف کا نہ کوئی عوض لیا جا سکتا ہے نہ دیا جا سکتا ہے

لیکن وصف مرغوب کی وجہ سے قیمت بڑھ سکتی ہے اور نامرغوب کی وجہ سے قیمت گھٹ جاتی ہے۔ دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اصول بتادیا کہ جیّدھا وردیہا سواءٌ، جید اور ردی کا مقابلہ ہو بھی تو برابر برابر لینا ہوگا جودت کے عوض زیادتی نہ دے سکتے ہو نہ لے سکتے ہو، بہترین کھجور کے ایک سیر کے بدلہ میں معمولی کھجور کے دو سیر دینے سے منع فرمادیا کیونکہ اس میں سیر کے بدلے سیر آجاتا اور دوسرا سیر وصف جودت کے عوض میں لیا جاتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔ لیکن خود ہی حیلہ کی یہ صورت بتلادی کہ ردی کھجور کو کم قیمت پر بیچ ڈالو بجائے ایک سیر کے دو سیر فروخت کر دو اور پھر بہتر کھجور کو زیادہ قیمت سے لے لو۔ تو کیا بہترین کھجور کی قیمت کا اضافہ اس وصف مرغوب کی وجہ سے نہیں ہوا۔ اس عقلی اور فطری بات کا انکار آخر کون کر سکتا ہے کہ مرغوب چیز کی قیمت بمقابلہ نامرغوب کے زیادہ ہوگی، اسکے باوجود یہ صورت جائز نہیں کہ ایک سیر بہتر کھجور کے بدلہ میں معمولی کھجور کا ایک سیر تو سیر کے مقابلہ میں ہو اور دوسرا سیر جودت کے مقابلہ میں ہو۔ اور اسی طرح یہ بھی ناجائز ہے کہ بہتر کھجور والے کو معمولی کھجور کا ایک سیر اور مثلاً ایک روپیہ بھی ساتھ دیدیا جائے کیونکہ اس صورت میں بیہ روپیہ یا دوسرا سیر وصف کے عوض ثابت ہوگا اور وصف کا عوض لینا جائز نہیں حالانکہ بہتر کھجور کو عام کھجوروں کے نرخ سے زیادہ قیمت پر خریدنا بالکل جائز ہے حالانکہ یہاں بھی قیمت کی زیادتی وصف کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے۔ یہی معاملہ ہے اجل کا بھی ــــ کہ نفس اجل کا عوض لینا ناجائز ہے لیکن بوجہ اجل کے قیمت کا بڑھ جانا فطری اور عقلی بات ہے اور شریعت نے اس کو منع نہیں فرمایا، جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصف کے متعلق فرمایا کہ بہتر کھجور کو زیادہ قیمت سے خرید لیا کرو۔ اُسی کو فقہاء اسلام نے فرمایا ان الاجل لایقابلہ الثمن اور وان الثمن یزاد لاجل الاجل۔ نفس اجل پر عوض لینے کی وہی صورت ہے جو آپ کی عبارات میں بھی ہے اور جس کو ربوٰ النسیۃ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ عقد ہوا اس پر کہ ایک ماہ کے بعد اس مبیعہ کا ایک روپیہ دے دو اور جب مشتری نے ایک ماہ کے بعد روپیہ نہیں دیا تو بائع نے کہا کہ چلو دوسری پہلی پر دے دو لیکن چار آنے بڑھا کر، تو یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ اجل ہی کو بیچا گیا۔ لیکن اجل ایک وصف مرغوب ہے کہ مشتری کو فوری رقم نہیں دینی پڑتی اور آسانی سے اپنا کام چلالیتا ہے، ہاں جنس اور قدر ایک ہونے کی صورت میں اس آسانی سے کام چلانے کا اعتبار نہیں کیونکہ اموال ربویہ ہیں اور نص کے خلاف اس لیے اس کی قیمت بڑھ گئی جیسے جید کھجور کی قیمت بوجہ جودت کے بڑھ گئی ــــ حالانکہ صرف جودت کا عوض نہ اپنی جنس سے دیا جا سکتا ہے نہ غیر جنس سے، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔

بہرحال فقہاء کرام حتیٰ کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زیر بحث صورت ربٰوا النسیئۃ میں داخل نہیں بلکہ اس مسئلہ میں اب مولانا (طاسین صاحب) کے ہمخیال حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مرحوم کا اسی مسئلہ پر ایک مضمون جنوری کے "حکمتِ قرآن" میں چھپ چکا ہے جس میں انہوں نے بہت سی وہی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے جو کہ مولانا کے مضمون میں ہیں کہ سُود سے اس بیع مؤجل کا فرق دو وجہوں سے ہے کہ یہ دَین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی سے ثمن مہنگا بتلا دیتا ہے نیز مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ پھر آگے دیکھا کہ یہ زیر بحث صورت اگرچہ عین ربٰو تو نہیں مگر یہاں بھی ذہنیت وہی سود خوارانہ ہے، پھر کہتے ہیں کہ یہ مقصد اور مفاسد کے لحاظ سے ایک حرام حیلہ ہے یا اگر نرم الفاظ استعمال کئے جائیں تو مکروہ اور شریعتِ اسلامی کے اصل مزاج کے خلاف ایک حیلہ ہے۔ (اگر حضرت مفتی صاحب مرحوم بقیدِ حیات ہوتے تو ان سے اسلام کے اصل مزاج اور غیر اصل مزاج کا فرق دریافت کیا جاتا) بہرحال مفتی صاحب کے نزدیک بھی ان عبارات سے مسئلہ زیر بحث یقینی طور پر ثابت نہیں کیونکہ ربٰوا النسیئۃ اور اس صورت میں دو وجہوں سے فرق ہے، ربٰوا النسیئۃ عین سود ہے جبکہ یہ عین سود نہیں اس کو حرام کہنے کی بجائے مکروہ کہنے کی گنجائش ہے۔

باقی رہی مولانا کی یہ جذباتی بات کہ اس سے مجبور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ تو گذارش یہ ہے کہ اگر ضروریاتِ زندگی کی بنیادی چیزیں مثلاً اشیاء خورد و نوش، علاج و ادویات کی چیزیں ستر پوشی کا عام لباس حتیٰ کہ جانوروں کا چارہ اور گھاس وغیرہ کمیاب ہونے کی وجہ سے مہنگے داموں بیچی جائیں تو وہ یقیناً حرام اور عذابِ الٰہی کا باعث ہے۔ مگر اس میں نہ تو مؤجل اور معجل کا فرق ہے، اگر نقد کی صورت میں ایسا کرے تو بھی کبیرہ گناہ اور اجل کی صورت میں ایسا کرے تو بھی عذابِ الٰہی کا مستحق، اور نہ بایں معنیٰ کہ وہ بیع ہی نہیں ہوئی، بیع ہوگئی، طے شدہ دام دینے پڑیں گے ہاں بوقت ضرورت حکومت تسعیر سے کام لے سکتی ہے اور اس کی مخالفت پر تعزیر کا حق بھی رکھتی ہے۔ مگر اس سے زیر بحث مسئلہ کو مطلقاً حرام اور سود کہنا یا بار بار قطعی حرام کہنا مناسب نہیں، اس سے یا تو تمام فقہاء مجوزین اور ان کے متبعین کی تجہیل لازم آتی ہے یا تفسیق، جو کسی طرح بھی اخلافِ صالحین کے شایانِ شان نہیں، تجہیل اس لیے کہ یہ روایات اور عبارات عام معروف ہیں اور یقیناً مولانا صاحب کے پیشِ نظر ہوں گی اور تفسیق اس صورت میں کہ جان بوجھ کر ان سے چشم پوشی کی اور لوگوں کو غلط راستہ پر ڈالا اگر اخلاف اسی طرح بیبا کی سے اسلاف کو بدنام کرتے رہے تو نفاذِ اسلام و شریعت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہا۔ والامر بید اللّٰہ۔ علاوہ ازیں یہ کاروبار، قرض پر مال خریدنا ہمیشہ مجبوری سے ہی نہیں ہوتا

بلکہ زیادہ تر صورتیں ایسی ہیں کہ کاروباری لوگ اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے ایسا کرتے ہیں تو ایسے میں ظاہر ہے کہ گناہ بھی نہیں، اسی طرح وہ اشیاء جو صرف عیاشی کے لیے خریدی جاتی ہیں یا زیادہ سہولت کے لیے ان کو گراں قیمت پر دینے میں بھی کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ۔ فقط۔ واللہ اعلم

الحق کو بھیجنے میں کوئی حرج نہیں، باقی ان کا خیال تو ان کو ہی معلوم ہوگا، شاید تکمیل مضمون کے بعد کوئی تائید یا ترمیم و تردید لکھیں۔ بہتر ہے کہ "حکمت قرآن" لاہور کو بھی بھیجدیا جائے کیونکہ انہوں نے اس موضوع پر مختلف مقالات شائع کرنے کی پیشکش کی ہے۔

جواب از

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

یہ مضمون درحقیقت حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کے اس مضمون کا تجزیہ اور تفصیلی تجربہ ہے جو مجلہ "الحق" کی جلد ۲۷ کے شمارہ ۴/۳ میں "ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ قبل ازیں حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کا وقیع مضمون بھی "الحق" کے حوالہ سے بطور جواب قارئین کرام کی نذر سے گذرا ہوگا جس میں کافی حد تک زیر بحث مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اول الذکر مضمون نگار کی اسلامی اور جدید معاشیات پر عمیق نظر اور متعلقہ فن میں وافر معلومات رکھنے سے کسی کو انکار نہیں، موصوف کا ملک کی اُن چند گنتی چنی شخصیات میں شمار ہوتا ہے جن کو اہل نظر جدید معاشی نظام میں اسلامی نظام معیشت کا وکیل سمجھتے ہیں۔ آپ کی علمی کاوشیں "مجلس علمی" میں ادبی اور ریسرچ و تحقیق کے میدان میں مسلم ہیں، بایں ہمہ ممکن ہے کہ موصوف کی زیر بحث مسئلہ میں رائے وقتی مصلحت یا مروجہ حالات و واقعات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے موزوں ہو لیکن شرعی نقطہ نظر سے موصوف کے اٹھائے ہوئے نکات قابل توجہ ہی نہیں بلکہ محل نظر بھی ہیں۔ موصوف کی رائے کہ "ادھار کی صورت میں قیمت کی زیادتی حرام اور ناجائز ہے" کے تجزیہ سے قبل ہم قرآن وحدیث کے حوالہ سے مسئلہ کا ایک طائرانہ مطالعہ کر کے داخلی اور خارجی قرائن کی رو سے اس کا جائزہ لیں گے لیکن اس سے قبل مسئلہ کا اجمالی تعارف بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قارئین کرام کسی الجھن اور غلط فہمی کے شکار نہ ہوں۔

قدیم معاشرہ کے مطالعہ سے قطع نظر موجودہ معاشرہ کی ۹۸ فیصد آبادی ایسے معاشی مسائل میں

جکڑی ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی ضرورت کی کسی چیز کو یکمشت نقد خریدنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی آمدنی اور قوتِ برداشت کو مدنظر رکھ کر ماہانہ یا سالانہ قسط وار خریدنے پر تیار ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ بائع نقد گاہک یعنی یکمشت زرِ بیع ملنے کی صورت میں ادھار پر فروخت کرنے کے لیے بہت کم آمادہ ہو گا (معاملات میں تقویٰ اور دیانتداری کی بات اگرچہ اس سے الگ ہے) کیونکہ اُدھار کی صورت میں اس کی مالی منفعت لازمی طور پر متاثر ہو گی، اس لیے بائع کو اُدھار پر آمادہ کرنے کے لیے قیمتِ فروخت میں نقد کی نسبت سے کچھ زیادتی رکھی جاتی ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر نقد کی حالت میں اس چیز کی قیمت کھلی مارکیٹ میں ایک سو روپے ہو تو ادھار کی وجہ سے اس کی قیمت ایک سو بیس روپے تک پہنچ جاتی ہے، اب بائع کا ادھار کی وجہ سے قیمت میں بیس روپے کا اضافہ وصول کرنے یا مُشتری کے ایسے معاملے کے ارتکاب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ میرے ناقص خیال میں دوسرے عام فہم مسائل کی طرح اس کا جواب بھی نہایت آسان الفاظ میں دیا جا سکتا ہے لیکن موصوف کے علمی وتحقیقی مزاج اور باریک بینی نے اس کو ایک نظری اور پیچیدہ مسئلہ بنا دیا۔

آسان اور سہل ہونے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اٹھانوے فیصد فقہ حنفی کے مقلد ہیں، شاید ملک کے طول وعرض میں "تبحر فی العلم" والے حضرات بہت کم تعداد میں ہوں لیکن مجتہدین فی الشرع، فی المذہب، فی المسائل کے رتبہ تک پہنچنے والے تو درکنار اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح کے پایہ کا بھی کوئی شخص نظر نہیں آتا، ایسے علمی انحطاط کے حوالے سے ہمیں سیدنا امام ابو حنیفہؒ یا ان کے مذہب کے مسلّمہ قواعد وضوابط کی رُو سے مسلک کے ذیلی مجتہدین میں سے کسی ایک کے فرمودات پر اعتماد کرتے ہوئے اصل مراجع یعنی آیتِ قرآنی یا حدیث کے مطالبہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ایسے نازک مرحلہ پر طبقہ ثالثہ کے سرخیل علامہ سرخسیؒ یا طبقہ خامسہ کے نامور فقیہ صاحبِ ہدایہ (علامہ مرغینانیؒ) کے قول پر بغیر کسی تاویل اور حیل وحجت کے اعتماد کرنا ہمارا فریضۂ منصبی میں سے ہے۔

قدیم فقہی ذخائر میں کسی واضح جزئیہ کے میسّر ہونے کے باوجود اصل مراجع یعنی قرآن وحدیث سے کسی دلیل کا مطالبہ کرنا درحقیقت مجتہدین کا کام ہے، اس لیے موصوف کا یہ تمہیدی بیان اکابرینِ اُمت کی رائے سے موافقت نہیں رکھتا کہ:

"کسی معاملہ کے شرعی جواز وعدم جواز کے متعلق صرف اتنا کافی نہیں کہ فقہ وفتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کی اُس نص اور دلیل کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس کی بناء پر اُس

فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے"۔ (ماہنامہ الحق ج ۲۷ شمارہ ۳ ص۲۱)

مقلد کی ذمہ داری میرے خیال میں مقلد کو تسلیم و رضا کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ورنہ شاید ایسے بے موقع لب کشائی سے اپنے مذہب و مسلک پر بدگمانی کا شکار ہو کر اس سے ہاتھ دھونا نہ پڑیں۔ بارہویں صدی کے نامور فقیہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ اصول افتاء کے ضمن میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

فاقول ان هٰذا الشرط راعني لا يحل ان يفتي بقولنا حتى يعلم من اين قلنا) كان في زمانهم اما في زماننا فيكتفي با لحفظ كما في القنية وغيرها فيحل الافتاء بقول بل يجب وان لم من اين قال۔ رشرح عقود رسم المفتی ص۲۷ فليس الا القول بالتفصيل)

(ترجمہ) "میرے خیال میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کہ "ہمارے قول پر اس وقت تک فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک اصل مرجع معلوم نہ ہو" کا اشتراط ان کے اپنے دور میں تھا ہمارے وقت میں محض مذہب کی جزئیات پر فتویٰ دینا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ امام نے کس دلیل کی روشنی میں یہ بات کہی ہے"۔

مقلدین کو دلیل کا مطالبہ کرنا مقلدین کا کام نہیں بلکہ مجتہدین کا کام ہے، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:۔

ولاشك ان هٰذا خاص بالمفتي المجتهد دون المقلد المحض فان التقليد هو الاخذ بغير معرفة دليل۔ رشرح عقود رسم المفتی ص۲۸ فليس الا القول بالتفصيل)

(ترجمہ) "اس میں کوئی شک نہیں کہ دلیل کا مطالبہ کرنا مجتہد کا کام ہے اور مقلد کے لئے تو بغیر دلیل کے مطالبہ کرنے کے صرف جزئیہ پر عمل کرنے سے اور کوئی چارہ نہیں"۔

دلیل کے مطالبہ کی حقیقت کیونکہ دلیل کا یہ مطلب نہیں کہ متعلقہ مسئلہ میں صرف قرآن حکیم کی آیت یا حدیث کا اجمالی تذکرہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے اجمالی علم کارآمد ہے جو ابتداء ہی سے فقہی اقوال پر قناعت کا نظریہ نہ رکھتا ہو بلکہ دلیل کا مطالبہ کرتے وقت اس میں مذہب و مسلک کے قواعد و ضوابط کی رو سے طریقہ استدلال اور پھر داخلی و خارجی قرائن کے حوالہ سے پرکھنے کی صلاحیت ضروری ہے اور متعلقہ مسلک کے جملہ مسائل پر علم بھی ضروری ہے تاکہ سیاق و سباق کے حوالہ سے مسئلہ پر پورا علم رکھے، ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی علمی بصیرت اس معیار پر پہنچی ہوئی ہو تو تقلید کی جگہ یہ خود

مجتہد بننے کا حقدار ہے پھر اس کو تقلید کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی، جیسا کہ علامہ موصوف مزید فرماتے ہیں:۔

لان معرفة الدليل انما تكون للمجتهد لتوقفها على معرفة سلامته من المعارض وهى متوقفة على استقراء الادلة كلها ولا يقدر على ذلك الا المجتهد اما مجرد معرفة ان المجتهد الفلانى اخذ الحكم الفلانى من الدليل الفلانى فلا فائدة فيها۔ (شرح عقود رسم المفتی ص۲۴ فليس الا القول بالتفصيل)

(ترجمہ) "دلیل کی پہچان مجتہد کا وظیفہ ہے کیونکہ اس کے لیے دلیل کے معارضہ سے محفوظ ہونے کا علم ضروری ہے جس کے لیے جملہ دلائل کا استقرا ضروری ہے اور اس پر مجتہد کے سوا اور کوئی قادر نہیں تاہم محض یہ جاننا کہ فلاں امام نے فلاں دلیل سے یہ حکم لیا ہے کسی خاص فائدہ کا حامل نہیں"۔

ہم تو مقلد ہیں اور ہمارے لیے علامہ مرغینانیؒ یا علامہ سرخسیؒ کا جزئیہ تو درکنار بلکہ محض حضرت تھانویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کی رائے بھی حرفِ آخر ہے، تقلید کے حوالہ سے ہم ان ائمہ کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہوئے اصل مراجع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن یہاں زیر بحث مسئلہ میں مولانا محترم اور آپ کے ہمنوا حضرات کی تسلی کے لیے اپنے طالبعلمانہ مطالعہ کے حوالہ سے چند حوالہ جات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ قارئین پر واضح ہو کہ فقہاء کا یہ مسئلہ ان کی ذاتی اختراع یا عندیہ نہیں بلکہ اس کی تائید میں منصوص واقعات، آیت اور حدیث بطور استناد کے موجود ہیں۔

زیر نظر مسئلہ میں قیمت میں زیادتی کی حقیقت

اس کی پوری حقیقت تو انشاء اللہ آئندہ صفحات میں موصوف کے مضمون کے تجزیہ کے بعد واضح ہو جائے گی کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں یہ تفاوت کیا ادھار کا عوض ہے یا ادھار کی وجہ سے ہے، دونوں کا دائرہ کار کیا ہے؟ اور دونوں کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے؟ تاکہ منصوص حرام و ناجائز کاروبار "ربوٰ النسیئۃ" سے اس کا فرق ہو سکے۔ سر دست ہم یہ مقدمہ رکھ کر دلائل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں کہ زیر نظر مسئلہ میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں یہ تفاوت اُدھار کا معاوضہ نہیں، حقیقت میں ایسا کبھی نہیں کہ زیر بیع میں کچھ قیمت مبیعہ کی ہے اور کچھ قیمت اس اجل کی ہے تاکہ بوقتِ ضرورت کوئی ایک دوسرے سے الگ ہو سکے بلکہ معاشرتی اور واقعاتی نظائر و حالات کو مدنظر رکھ نقد میں ادھار کی نسبت منافع، فوائد اور دوسری خوبیوں کی فراوانی کی وجہ سے

کچھ زیادتی آتی ہے" ہم آسانی کے لیے اسے یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ "ان الزیادۃ ھھنا لاجل الاجل لا لعوض الاجل" یعنی "یہاں پر زیادتی ادھار کی وجہ سے ہے ادھار کے عوض میں نہیں"۔
قرآن وحدیث میں اس کے متعدد نظائر پائے جاتے ہیں جس میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آتی ہے بلکہ صحابہ کرامؓ کے بعض واقعات عملی طور پر اس کے شاہد ہیں۔

قرآن سے استدلال قرآن مجید کی "آیت المداینہ" پر سوچ و فکر کرنے سے شاید اس حقیقت شناسی کے لیے مواد مل سکے کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں تفاوت جائز ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے:

"خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک کیے ہوئے عقدِ سلم کے معاملہ کو اپنی کتاب میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۲) کی رُو سے حلال قرار دے کر اجازت دی ہے"۔ (تفسیر المظہری جلد ا ص۱۲۱/۲ سورۃ البقرہ)

اور حضرت ابن عمرؓ بھی فرماتے ہیں:

لا بأس بالطعام الموصوف بسعر معلوم الی اجل معلوم۔ (بخاری شریف ص۱۲/۳)

(ترجمہ) "مقررہ مدت تک مقررہ نرخ پر معلوم غلہ کے کاروبار میں کوئی حرج نہیں"۔

معلوم ہوا کہ آیت مداینہ بنیادی طور پر "عقدِ سلم" کے بارے میں ہے اور عقدِ سلم کی تعریف علماءؒ نے یوں کی ہے: "بیع اجل بعاجل"۔ (فتح القدیر جلد ۶ ص۲۰۴ باب السلم)

اس اجمال کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی مشتری مقررہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے مثلاً کسی شخص کو ایک ہزار روپے دیکر یہ معاہدہ کرے کہ یہ رقم پیشگی وصول کر کے فلاں وقت مجھے گندم اس نرخ کے اعتبار سے دینے کے پابند رہو گے اور بائع بھی مقررہ شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے رقم وصول کر کے معاہدہ قبول کرے تو اسے "عقدِ سلم" کہا جاتا ہے۔ خیر القرون کے دور سے لیکر آج تک بغیر کسی انکار کے یہ معاملات جائز اور مشروع ہیں "عقدِ سلم" کی ماہیت پر غور وخوض کرنے کے بعد یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں کہ مشتری وقتی طور پر یکمشت زرِ سلم کی ادائیگی پر تیار رہ کر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کے لیے انتظار کس جذبہ کے تحت کرتا ہے؟ کیا اس کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کا کوئی حسین جذبہ کارفرما ہے؟ کبھی نہیں! اگر خیر خواہی کا جذبہ ہوتا تو قرضۂ حسنہ کی صورت میں بائع سے اس آڑے وقت میں تعاون کا ہاتھ بڑھا دیتا، متعدد شرائط کی رعایت کر کے پیشگی رقم دیکر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کا

انتظار کرنے سے بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بارگراں کے تحمل کے عوض اس کو مقررہ وقت پر مبیعہ ارزاں قیمت پر میسر ہو کیونکہ عقدِ سلم میں مبیعہ بازار کی قیمت سے بائع کو عموماً سستا پڑتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ عقدِ سلم کی مشروعیت میں اس فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

انما ابیح علی خلاف القیاس رفع حاجة الفقیر حالا عن نفقة عیاله القادر علی المسلم فیه مالا وحاجة المشتری الی الاستبیاح لعیاله وهو بالسلم اسهل اذ یکون المبیع فی المسلم نازلا عن قیمته فی البیع غالباً۔ (التفسیر المظهری ج۔۱ ص۴۰۲ سورۃ البقرہ)

(ترجمہ) "عقدِ سلم خلاف القیاس ہونے کے باوجود اس وجہ سے جائز قرار دیا کہ اس میں بائع اپنی خستہ حالی میں بچوں کے لیے خرچہ کا بندوبست کر کے مستقبل میں اسکی ادائیگی پر قادر ہو کر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جبکہ مشتری کو سلم میں فائدہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ عموماً عقدِ سلم میں قیمت مروجہ قیمت سے ارزاں ہوتی ہے۔"

معلوم ہوا کہ عقدِ سلم میں زرِ بیع کی پیشگی ادائیگی اور مبیعہ کی تاخیر سے قیمت کی مارکیٹ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی، عقدِ سلم میں ادھار یعنی نسیہ لازمی شرط ہے، اگر اس میں ادھار نہ ہو تو سلم کی حقیقت ختم ہو جائے گی، لہٰذا جب بیع عاجل بعاجل میں نسیہ اور ادھار کی وجہ سے قیمت میں تفاوت کا آنا ممنوع نہیں سود کے زمرہ میں نہیں آتا تو زیرِ نظر معاملہ یعنی ادھار میں جو بیع عاجل بعاجل کی مخصوص صورت میں قیمت کا تفاوت کیوں ممنوع قرار دیا جا رہا ہے، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عقدِ سلم خلاف القیاس وارد ہو کر اس پر دوسرا معاملہ قیاس نہیں کیا جاتا کیونکہ عقدِ سلم غیر موجود مبیعہ کی فروخت کے جواز کی حیثیت سے خلاف القیاس ہے نہ ہم اس پر کوئی قیاس کرتے ہیں بلکہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نقد اور ادھار میں مبیعہ یا ثمن کا متاثر ہو کر کمی یا زیادتی کا آنا مشروع معاملہ ہے ربٰو بالنسیہ کے زمرہ میں نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عملی واقعہ سے استدلال

نسیہ کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آنے کے جواز کی نشاندہی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا تعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں "باب شراء النبیؐ بالنسیئة" کے عنوان سے باب باندھ کر یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر نقد کی طرح بعض اوقات ادھار پر بھی ضروریاتِ زندگی خریدیں، اس باب میں امام بخاریؒ نے اس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت لائی ہے جس میں

آپ فرماتی ہیں :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشتری طعاما من یہودی الی اجل ورہنہ درعا من حدید ۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص۳۴۱ باب الرھن عند الیہود وغیرھم)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ادھار پر خریدا اور اپنا لوہے کا بنا ہوا ایک درع اس کے پاس رہن میں رکھا۔"

امام بخاریؒ نے یہ روایت متعدد بار مختلف مسائل میں نقل کی ہے، اس لیے نسیہ پر معاملہ کا جواز ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ موصوف بھی اپنے مقالہ کی ابتداء میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

"جہاں تک ادھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے قرآن و حدیث کی رو سے قطعی طور پر جائز ہے، اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے اور یہ بھی کہ بعض ادائیگی کے وقت آپؐ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی۔" (ماہنامہ الحق جلد ۲۷ شمارہ ۳ ص۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جیسے دوسرے معاملات کے مطالعہ سے قطع نظر ہم یہودی سے مذکورہ معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں، ایک متعصب دشمنِ اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اور پھر اس کے بعد روزمرہ ضرورت آنے والی چیز "درع" کو رہن کرنے کے پسِ پردہ واقعات کے جائزہ سے جو صورت سامنے آتی ہے اس میں زیرِ نظر مسئلہ کے جواز کے لیے قوی مستدل موجود ہے۔ اس پسِ پردہ حقیقت کے جاننے کے لیے ہمیں اس واقعہ کا مطالعہ مدینہ منورہ کے معاشی حالات کو مدنظر رکھ کر کرنا ہوگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہو تو اس کا گاہک بھی زیادہ ہوتا ہے اور جب خریدار زیادہ ہوں تو اس چیز کے بدلنے کے مواقع وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، ایسے وقت میں بائع ادھار کی نسبت سے نقد کو زیادہ ترجیح دیتا ہے الا یہ کہ ادھار میں اگر کہیں مالی منفعت بہ نسبت نقد کے زیادہ ہو تو پھر وہ صوابدید پر فیصلہ کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملہ کے وقت مدینہ منورہ کی معاشی حالت کے حوالہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مدینہ منورہ میں غلّہ کی بہت زیادہ ضرورت تھی، عموماً لوگوں کو بیرونی قافلوں کے آنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا اور جب کسی قافلہ کے آنے کی خوشخبری سنائی جاتی تو بسا اوقات فاقہ زدہ معاشرہ کی حالت غیر ہو جاتی

اور اپنی جان کی خبر تک نہ رہتی، چنانچہ ایک دفعہ صحابہ کرامؓ کو تجارتی قافلہ آنے کی خبر اس وقت ملی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو صحابہ کرامؓ کثیر تعداد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلے چھوڑ کر قافلہ کی طرف دوڑ پڑے جس پر سورۃ الجمعہ کی آخری آیتیں نازل ہوئیں۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت مدینہ منورہ میں خرید و فروخت کی مارکیٹ پر یہودی چھائے ہوئے تھے وہ قافلہ والوں سے غلہ خرید کر بعد میں من مانی قیمت پر فروخت کرتے تھے ان کو نقد کا گاہک ایسی ضرورت کی اشیاء میں لازمی طور پر میسر تھا، یہ لوگ نقد کی نسبت ادھار کو ترجیح کسی شوق کی وجہ سے نہیں دیتے تھے بلکہ مالی منفعت کی خاطر یہ لوگ ادھار کا معاملہ کرتے تھے، ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادھار کے معاملہ سے غالب گمان یہ ہے کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں قیمت کا تفاوت لازمی طور پر اختیار کیا گیا ہو گا ورنہ نقد کے گاہک ملنے کے باوجود یہودی کو ادھار کا معاملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مالی منفعت اور زیادہ قیمت کی وصولی کے سوا یہودی کے اس اقدام کے لیے اور کوئی دوسرا محرک نظر نہیں آتا۔

اس میں اس کا احتمال بھی نہیں کہ یہودی نے کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض احسان کے جذبہ سے حسن سلوک کر کے محض نقد کی قیمت پر بطور ادھار دیا ہو کیونکہ لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا کے صریح ہونے کے باوجود یہودیوں جیسی متعصب قوم سے مسلمانوں کے ساتھ اور خاص کر حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر خواہی، حسن سلوک اور مواسات کے جذبات کی توقع کرنا بے سود ہے۔ بلکہ حدیث میں ورھنہ درعہ کے الفاظ سے بھی خیر خواہی کے جذبہ کی تردید ہو رہی ہے، آخر کار جب ہمدردی مقصود تھی آپؐ سے توثیق کے لیے رہن کا مطالبہ کیوں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی درعہ بطور رہن رکھنے کے لیے کیسے تیار ہوئے جو آپؐ کی مجاہدانہ زندگی کی روزمرہ ضرورت تھی۔

یہ ایسے امور ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں نسیہ کی صورت میں نقد کی نسبت سے قیمت زیادہ رکھی گئی ہو۔

خیر القرون میں زیر بحث مسئلہ کا عملی ثبوت

مذکورہ شہادات کے علاوہ صحابہ کرامؓ کی زندگی میں بھی ہمیں ایسا واضح، غیر مبہم اور

ٹھوس ثبوت ملتا ہے جس سے مسئلہ کی شرعی حیثیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے جواز میں صحابۂ کرامؓ کے دور میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور صحابۂ کرامؓ خود ایسے معاملات کرتے تھے، سیدہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زید بن ارقمؓ کے واقعہ میں اس کی صریح دلیل موجود ہے! امام احمدؒ روایت میں کچھ اضافہ بھی ہے، لیکن صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سیدنا امام ابو حنیفہؒ کے واسطہ سے مروی ہے؛ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان امرأۃ قالت لعائشۃؓ ان زید بن ارقم باعنی جاریتہ بثمانمائۃ درھم ثم اشتراھا منی فقالت ابلغیہ عنی ان اللہ قد ابطل جھادہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لم یتب۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۷ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کی کہ زید بن ارقمؓ نے مجھ پر ایک لونڈی آٹھ سو درہم میں فروخت کر کے دوبارہ چھ سو درہم میں خریدی؛ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میری طرف سے زید بن ارقمؓ کو یہ پیغام پہنچاؤ کہ اگر اس نے اپنے اس کئے ہوئے کام سے توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کا وہ جہاد ضائع کر دے گا جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں کیا ہے"۔

اگرچہ اس روایت میں نقد اور نسیہ (ادھار) کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن مسند احمد کی روایت میں اس پر یہ اضافہ آیا ہے:۔

انی بعث من زید غلاما بثمانمائۃ درھم نسیئۃ واشتریتہ بستمائۃ نقد۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۷ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "کہ میں نے اس سے آٹھ سو درہم ادھار پر غلام خرید کر چھ سو درہم نقد پر دوبارہ اس پر فروخت کیا ہے"۔

اس روایت کو دیکھ کر کسی کے ذہن میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے، کیونکہ زید بن ارقمؓ کے اس معاملہ میں نقد کی قیمت اگر چھ سو درہم ہے تو ادھار کی قیمت آٹھ سو درہم مقرر کی جا رہی ہے۔

شاید اس پر کسی کو شبہ ہو، ممکن ہے کہ یہ حضرت زید بن ارقمؓ کا انفرادی عمل ہو اور دوسرے صحابہؓ آپؓ سے اتفاق نہ رکھتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس پر مطلع ہو کر بہت سخت الفاظ میں پیغام بھیجا کہ اگر اس نے اپنے کیے ہوئے کام سے رجوع نہ کیا تو اس کا جہاد جیسا مبارک عمل بھی ضائع ہو جائے گا، گویا آپ نے یہ اقدام گناہ کبیرہ سمجھ کر دوسرے اعمال کے لیے مبطل قرار دیا۔

لیکن یہ شبہ بے بنیاد ہے کیونکہ یہاں پر حضرت زید بن ارقمؓ کے اس معاملہ میں دو چیزیں ہیں پہلی چیز یہ ہے کہ نقد اور اُدھار کی قیمت میں آپ نے تفاوت رکھا، دوسری چیز یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فروخت کیے ہوئے غلام یا لونڈی کو دوبارہ کم قیمت پر قبل نقد الثمن خرید کر بظاہر سُودی معاملہ کا ارتکاب کیا، حضرت عائشہؓ کے انکار کا تعلق اول الذکر مسئلہ سے نہیں بلکہ اتنی شدت سے انکار آپ نے دوسرے معاملہ کو مدنظر رکھ کر کیا، آپ نے اسے ربٰو کی ایک ذیلی شکل قرار دے کر اس پر ربٰو کی آیت تلاوت کی، پھر ربٰو کا تعلق بھی اول معاملہ سے نہیں تھا یعنی نسیہ میں اس چیز کی قیمت آٹھ سو روپے مقرر کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی، اگر صرف یہ عقد ہوتا تو اس پر انکار کی گنجائش نہ رہتی لیکن دوسرے معاملہ میں کہ اپنی ہی فروخت کی ہوئی چیز کو قبل نقص الثمن کم قیمت پر خریدنے میں سُودی عناصر نظر آ رہے تھے اس لیے آپ نے انکار کیا اور پہلا معاملہ بھی اس اعتبار سے درست نہ رہا کہ دوسرے حرام معاملہ کی پوری عمارت اس پر بنی ہوئی تھی، اس لیے حضرت عائشہؓ نے دونوں پر انکار کر کے فرمایا کہ بری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی علامہ جلال الدین الخوارزمیؒ اس تفرقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

وانما ذمت البیع الاول وان کان جائزا عندھا لانھا صادت ذریعۃ الی البیع الثانی ھو موسوم بالفساد - (الکفایۃ علی الھدایۃ - فتح القدیر ج ۶ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "آپ نے پہلی بیع کی مذمت بھی کی حالانکہ یہ آپ کے ہاں بھی جائز معاملہ تھا کیونکہ یہ دوسرے ناجائز اور فسادِ عقد کے لیے ذریعہ تھا"

یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں "بئس ما اشتریت واشتریت" بری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی" عقد ثانی باعتبار وجود مؤخر ہونے کے باوجود آپ نے ذم کرتے ہوئے پہلے ذکر کیا کیونکہ بنیادی طور پر اس کی مذمت مقصود تھی۔

حضرت زید بن ارقمؓ کے اس تفاوت پر اقدام اور حضرت عائشہؓ کا اس تفاوت پر خاموشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادھار کے معاملہ میں قیمت کا تفاوت خیر القرون کے معاشرہ میں بھی مروج تھا اس پر کوئی انکار نہیں کر رہے تھے اور نہ کسی نے اس کو "ربٰو النسیئۃ" میں شمار کیا۔

مختلف الجنس اشیاء کے تبادلہ میں تفاضل حقیقی و حکمی دونوں جائز ہیں

از روئے شرع خرید و فروخت کا معاملہ عاقدین کی باہمی رضامندی پر مشتمل ہے لیکن اموال ربویہ میں ان پر چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں "اشیاء ستہ" کی حدیث

سے جہاں دوسرے ائمہ نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق علت نکال کر ربو کی شکلیں متعین کیں تو احناف نے "جنس وقدر" کی علت نکالی، اس لیے جہاں کہیں دونوں علتیں پائی جاتی ہیں وہاں پر احناف نے تفاضل حقیقی اور تفاضل حکمی (نسیہ) دونوں حرام قرار دیں، مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے پر گندم کے عوض گندم فروخت کرتا ہے تو ایک من کے بدلے میں جیساکہ دو من خریدنا حرام ہے، ایسا ہی تفاضل حکمی (کہ ایک چیز وصول کرکے دوسرے کی وصولی کے لیے مہلت دی جائے) بھی حرام ہے اور اگر کہیں جنس و قدر میں سے کوئی ایک علت پائی جائے تو وہاں پر تفاضل حکمی تو حرام ہے لیکن تفاضل حقیقی میں کوئی حرج نہیں اسلئے کہ ایک من گندم کے عوض دو من مکئی لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس میں نسیہ حرام ہے، اور جہاں کہیں جنس وقدر دونوں نہ ہوں تو مختلف الجنس اشیاء میں "واذا اختلف الجنسان فبیعوا کیف شئتم" کی رو سے تفاضل حقیقی اور حکمی دونوں حلال ہیں۔

زیر نظر معاملہ میں ثمن اور مبیع دونوں مختلف جنس ہیں جن کے درمیان قدر بھی مشترک نہیں اس لیے تفاضل میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیئے، تاہم نسیہ اور نقد کے مابین تفاوت کا اعتبار کرنا عقد کی تکمیل کے بعد ثانوی امور ہیں جن کا عقد کے قوام سے کوئی تعلق نہیں۔

نقد و نسیہ کی قیمت میں تفاوت کا جواز ائمہ کا اختلافی مسئلہ ہے

ائمہ کرام کے درمیان زیر نظر مسئلہ میں اتفاق ہونے کی نشاندہی ایک دوسرے مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت زید بن ارقمؓ کی سابقہ روایت پیش کی جاتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص اگر کوئی چیز نسیہ اور ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے اور پھر بغیر کسی ثمن کی ادائیگی کے دوبارہ اپنی فروخت کی ہوئی چیز بغیر کسی ثالث کے حائل ہونے کے نقد پر کم قیمت سے خریدے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ثالث کے حائل نہ ہونے کے بغیر بھی یہ عقد جائز ہے لیکن احناف کے نزدیک ثالث کے حائل ہونے کے بغیر یہ عقد ناجائز ہے تاہم اگر درمیان میں ثالث آجائے اور فروخت کرتے وقت نسیہ کی وجہ سے اس کی قیمت پانچسو روپے رکھی گئی تھی لیکن دوبارہ بائع نے نقد رقم دے کر اپنی فروخت کی ہوئی چیز کم قیمت یعنی چارسو روپے پر خریدی تو پھر شوافع کی طرح احناف کے نزدیک بھی جائز ہے ایسا ہی ثمن کی وصولی کے بعد جواز اتفاقی ہے۔ علامہ کمال ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

وقید بقولہ قبل نقد الثمن لان ما بعدہ یجوز بالاجماع

باقل الثمن۔ (فتح القدیر ج ۶ ص۶۸ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "ثمن کی ادائیگی سے قبل مسئلہ کی تقیید سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر معاملہ بعد نقد الثمن کا ہو تو پھر بالاتفاق جائز ہے۔"

اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اصل قیمت کی زیادت میں جیسا کہ نقد میں زیادتی کا احتمال ہے تو "حالۃ او نسیئۃ" کے عموم سے نسیہ کا بھی احتمال ہے تو نسیہ میں زیادہ قیمت مقرر کرکے بعد میں کم قیمت نقد پر خرید نے سے ہمارے مؤقف کی تائید ہوتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ مقالہ نگار کے انداز بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیر نظر مسئلہ فقہ حنفی میں شاید صرف ان دو کتابوں تک محدود ہے لیکن حقیقت میں یوں نہیں ہے بلکہ فقہ حنفی کی اکثر کتابوں میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ نے یہ مسئلہ علاؤ الدین الحصکفیؒ کی عبارت کی شرح میں "رد المحتار علی الدر المختار" جلد ۴ ص۱۵۸ پر، اور ابن نجیم المصریؒ نے البحر الرائق جلد ۶ ص۱۱۴ پر یہ مسئلہ ذکر کیا ہے، اگرچہ اکثر فقہاء نے جو علت بیان کی ہے وہ ایک نظر آتی ہے لیکن میرے خیال میں فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس میں یہ مسئلہ نہ ہو۔ لیکن محض فقہی ذخائر سے عبارات کا نقل کرنا موصوف کے نزدیک کسی خاص فائدہ کا حامل نہیں اس لیے عبارات کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ زیر نظر مسئلہ کے عدم جواز کے بارے میں کسی ایک کتاب میں بھی کوئی صریح جزئیہ نہیں ملتا، اس لیے موصوف کو اپنے مؤقف کے اثبات کے لیے دوسرے جزئیات کا سہارا لینا پڑا، اگر یہ کہیں ناجائز ہوتا تو اتنے ضخیم فقہی ذخائر میں کہیں نہ کہیں اس پر تصریح ضرور ہوتی۔

موصوف کے مقالہ کا جائزہ یہاں تک اصل مسئلہ کے جواز کے بارے میں بات ہو رہی تھی اب ہم ذرا آگے قدم بڑھاتے ہوئے موصوف کے ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جن کی وجہ سے موجودہ معاملہ ناجائز اور حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ دو قسطوں پر مشتمل مقالہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عدم جواز کا نظریہ تین باتوں پر مبنی ہے:۔

(۱) ربٰوا النسیۃ: آپ کے نزدیک زیر نظر مسئلہ "ربٰوا النسیۃ" کی ایک ذیلی قسم ہے، کبریٰ تو مسلمات دین میں سے ہے کہ قرآن و حدیث کی رو سے ربٰو کی جملہ قسمیں حرام ہیں، اس لیے یہ معاملہ بھی حرام ہے ظاہر بات ہے کہ کبریٰ کے تسلیم ہونے کی وجہ سے اس پر بحث کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن صغریٰ

ایک نظری مسئلہ ہونے کی وجہ سے کافی غور وخوض کا محتاج تھا اس لیے موصوف نے اس پر بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے، چنانچہ پہلی قسط کا ۲/۴ سے زائد حصہ اس پر مشتمل ہے، موصوف فرماتے ہیں :-

"غرضیکہ قرآن کریم نے ربوٰا النسیئۃ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا ان میں ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل بھی تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربوٰ کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔" (الحق ج ۲۷ ش ۳ ص ۲۳)

آپ نے ربوٰا النسیئۃ کی حقیقت زید بن اسلمؓ، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؓ، قتادۃؓ، اور عطاء بن ابی رباح جیسے بلند پایہ اکابرین کے حوالہ سے نقل کرکے یہ کوشش کی ہے کہ یہی حقیقت ربوٰ زیر نظر مسئلہ میں بھی کارفرما ہے۔ پھر مزید وضاحت کے لیے آپ نے ابوبکر الجصاصؒ اور امام فخرالدین رازیؒ کے اقوال کا سہارا بھی لیا ہے جن میں ربوٰا النسیئۃ کی حقیقت بیان ہوتی ہے، اس خیال کو مزید تقویت دیتے ہوئے موصوف نے ان اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو سُود کی وجہ سے معاشرہ پر پڑتے ہیں، آپ کے خیال میں یہی زیر نظر معاملہ کے بھی اثرات ہیں۔

(۲) **بیع باطل**: موصوف نے جس دوسری حقیقت پر زیر نظر مسئلہ کے عدم جواز کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی ہے وہ بیع باطل کی تعریف ہے، آپ حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسن بصریؒ اور علامہ رشید رضا کے حوالہ سے بیع باطل کی حقیقت بیان کرتے ہوئے بعد ازاں مروجہ معاملہ پر یہی حقیقت منطبق کرکے فرماتے ہیں :-

"آیت مذکورہ کی تفسیر میں جو عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں معاملہ زیر بحث کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ معاملہ باطل کا بھی مصداق نظر آتا ہے۔"

(الحق ج ۲۷ شمارہ ۴ ص ۳۶)

(۳) تیسری چیز جو موصوف اپنے موقف کی تائید کے لیے پیش کرتے ہیں وہ قرض میں کسی منفعت کی حرمت کا حکم ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کی روایت کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربوٰ ہے۔" موصوف اس روایت کے آخر میں فرماتے ہیں :-

"بہرحال اس حدیث کی رو سے بھی معاملہ زیر بحث ناجائز قرار پاتا ہے۔" (الحق ج ۲۷ شمارہ ۴ ص ۳۶)

اس کے علاوہ موصوف کے مقالہ کے آخر میں ہدایہ اور مبسوط سرخسی کے واضح جزئیات سے جان چھڑانے کے لیے ایسی کمزور اور رکیک توجیہات کی گئی ہیں جو "توجیہ بما لا یرضی قائلہ" کا مصداق ہے۔ ان توجیہات کی حقیقت، قوام وثبات یا ضعف وکمزوری کے لیے قارئین کرام حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کے مقالہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم آئندہ موصوف کے ان تین نکات پر بحث کریں گے جو بزعم مقالہ نگار زیر نظر مسئلہ کی حرمت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلی وجہ کی کمزوری

جہاں تک زیر نظر معاملہ کو "ربوا النسیئۃ" کی قسم قرار دینے کی بات ہے تو ربوا کا دائرہ اتنا وسیع نہیں جو اُدھار کے معاملہ کو بھی سمیٹ سکے، چند وجوہات کی وجہ سے ادھار کا معاملہ ربوٰ النسیئۃ سے مختلف ہے۔

١۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "ربا النسیہ" میں اجل کو باقاعدہ مستقل مبیعہ کی حیثیت سے اعتبار دیا جاتا ہے۔ موصوف کے مقالہ کے حوالے سے اکابرین امت سے اس کی جو حقیقت نقل کی گئی ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقررہ مدت کے خاتمہ پر دائن مدیون کے پاس جا کر کہہ دیتا کہ میری فلاں رقم جو تیرے ذمہ ہے ادا کرو۔ اگر ابھی ادا نہیں کر سکتے ہو تو اتنی مدت کے بعد مجھے اس مدت کے عوض مقررہ رقم کے ساتھ مزید اتنی رقم دو گے۔ عروض کی طرح اجل کی کمی اور زیادتی کو دیکھ کر قیمت لگائی جاتی اجل میں مالیت وتقوم کی حقیقت معدوم ہونے کی وجہ سے دائن کو اصل رقم پر بغیر کسی معاوضہ کے زیادت دی جاتی۔ جس کو قرآن نے حرام قرار دیا۔ شیخ عبدالرحمن الجزیری ربا کی تقسیم کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وینقسم الی قسمین الاول ربٰو النسیئۃ وھو ان تکون الزیادۃ المذکورۃ فی مقابلۃ تاخیر الدفع...... لا خلاف بین ائمۃ المسلمین فی تحریم ربٰو النسیئۃ وھو کبیرۃ من الکبائر بلا نزاع۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ٢ ص ٢٤٥ مباحث الربٰو)

(ترجمہ) "ربوٰ کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم "ربوا النسیۃ" ہے، یہ وہ قسم ہے کہ جس میں مذکورہ زیادتی تاخیر سے دینے کے مقابلہ میں دی جاتی ہے..... اکابرین امت میں اس کی حرمت میں کسی کا اختلاف نہیں یہ بالاتفاق گناہ کبیرہ ہے۔"

یہی وہ حقیقت ہے جو مفسرین، محدثین، فقہاء اور دوسرے ارباب تحقیق کی تحریرات میں نظر آتی ہے شاید تعبیر میں کوئی مبالغہ نہ ہو کہ ہم اس سے یوں کہیں کہ یہ زیادتی اجل کا معاوضہ ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں زیر نظر معاملہ میں یہ مفروضہ زیادتی معاوضہ کی حیثیت سے نظر نہیں

آتی ، نہ مقررہ میعاد کی کوئی قیمت مقرر کی جاتی اور نہ اس کو عاقدینِ مبیعہ کا کوئی جز تسلیم کرتے ہیں تاکہ کسی وقت مقررہ قیمت، مبیعہ اور اجل پر تقسیم ہوسکے، یہی وجہ ہے کہ عام فقہاء اس زیادتی کیلئے بعوض الاجل کی جگہ "لاجل الاجل" کی علت ذکر کرتے ہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں : یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔ ابن عابدینؒ اور ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں : ویزاد فی الثمن لاجلہ۔ گویا دونوں کا بنیادی فرق یہی ٹھہرا کہ ادھار کے معاملہ میں زیادتی "لاجل الاجل" اور "ربوٰ النسیئۃ" میں زیادتی لعوض الاجل ہے، ایسے واضح فرق ہونے کے باوجود پھر بھی یہ معاملہ ربوٰ کی ذیلی قسم قرار دینا غلط فہمی یا سینہ زوری ہے۔ تاہم یہ فرق باریک ہے، شاید اس فرق کی مزید وضاحت ایک مثال سے ہوسکے مثلاً ایک شخص کراچی سے پشاور تک ریل گاڑی میں سفر کرتا ہے تو اصل کرایہ تین سو روپے ہے جو کسی بھی گاڑی میں اپنے لیے سیٹ مقررہ مسافت تک اس قیمت پر لے سکتا ہے لیکن اسی گاڑی میں ایئر کنڈیشن سیٹ کا کرایہ پانچسو روپے لگایا جاتا ہے لہٰذا دونوں کرایوں کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصل کرایہ تو تین سو روپے ہے لیکن مؤخر الذکر سیٹ کے کرایہ میں یہ اضافہ محض سہولیات اور مراعات کے اضافہ کی وجہ سے ہے یہ اضافہ کسی سہولت کا معاوضہ نہیں۔

ایسا ہی یہاں پر بھی معاملہ ہے کہ ادھار میں یہ زیادتی کسی اجل کا معاوضہ نہیں کہ اس کو حرام اور ممنوعہ معاملات میں شمار کیا جاسکے بلکہ یہ النقد خیر من النسیئۃ کو مدنظر رکھتے ہوئے مؤخر ادائیگی کی وجہ سے مقرر کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ نقد وصولی میں مشتری کو بروقت ادائیگی کی زحمت ہو لیکن بائع کو فائدہ ہوگا جبکہ تاخیر سے ادائیگی میں مشتری کو سہولت دی جاتی ہے اور بائع کے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے قیمتِ فروخت نسبتاً زیادہ لگائی جاتی ہے تاکہ بائع بطیب خاطر ادائیگی کے لیے تیار رہے اور مشتری بھی اپنی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے خوشی سے وہ قیمت ادا کرے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ حرام معاملہ میں ایسی دو اشیاء کا تبادلہ ہے جن کی جنس اور قدر آپس میں متحد ہے۔ چونکہ دائن جب مدیون سے معاہدہ کے اختتام پر یہ کہتا ہے کہ اگر ابھی میرے پیسے مثلاً ایک ہزار روپے نہیں دیتے ہو تو چھ مہینوں کے بعد ایک ہزار کی جگہ پندرہ سو روپے دو گے گویا اس میں تبادلہ عرض اور ثمن کا نہیں رہا، چونکہ اختتام معاہدہ پر دائن کا حق مبیعہ نہیں رہتا بلکہ مبیعہ کی قیمت رہی تو تبادلہ رقم کا رقم سے آیا، ایسی حالت میں لازمی بات ہے کہ جنس اور قدر کی موجودگی میں تفاضل حقیقی اور حکمی دونوں آئے جو کہ قطعی حرام ہے۔

لیکن زیرِ نظر معاملہ میں یہ صورت بالکل نہیں، یہاں پر تبادلہ مبیعہ اور ثمن کا ہے، اوّل ہی سے بائع اور مشتری کے درمیان ایجاب و قبول میں یہی قیمت منظور نظر رکھی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں جہاں بیع مطلق کی تعریف صادق آتی ہو یعنی بیعہ اور ثمن کا تبادلہ ہو تو تفاضل میں کوئی حرج نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں بائع اور مشتری کے درمیان نقد قیمت پر معاہدہ طے پائے اور بعد ازاں مشتری نقد ادائیگی سے قاصر ہو اور یہ کسی معاوضہ کی وجہ سے ثمن کی ادائیگی نہ کرے تو اس وقت یہ لازمی طور پر ربوٰ النسیئۃ کے مترادف ہے کیونکہ نقد ادائیگی پر معاہدہ کے وقت بائع کا حق ابھی مقررہ ثمن کی مقدار میں متعین ہوا تو ابھی اجل کی وجہ سے زیادتی نہیں اس مقررہ حق کے مقابلہ میں ہے جو ناجائز ہے۔

دوسری وجہ کی کمزوری جہاں تک موصوف کی دلیل کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے تو یہ بھی شبہ سے خالی نہیں، یہ مشکل ہے کہ بیع باطل کی تعریف زیرِ نظر معاملہ پر صادق ہو۔ اس کے بطلان کے لیے ہم پہلے ایک مقدمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ عقد بیع میں ایجاب و قبول کے بعد جب تک اس عقد کا فسخ ہو کر کسی دوسرے معاملہ کی تجدید نہ ہو تو کمی اور زیادتی کی نسبت اصل عقد کی طرف جائے گی۔ مثلاً بائع اور مشتری ایجاب و قبول کر کے معاہدہ کریں اور بعد ازاں بائع مقررہ مبیعہ کے ساتھ یا مشتری مقررہ قیمت سے کوئی زیادتی ادا کرے تو اس کی نسبت اصل عقد کی طرف کی جائے گی، چنانچہ استحقاق کی صورت میں یہ کمی اور زیادتی لازمی طور پر ظاہر ہوگی۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں :۔

ویجوز للمشتری ان یزید للبائع فی الثمن ویجوز للبائع ان یزید للمشتری فی المبیع ویجوز ان یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک فالزیادۃ والحط یلتحقان باصل العقد عندنا۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۵۲ کتاب البیوع)

(ترجمہ) "مشتری کے لیے جائز ہے کہ وہ بائع کے لیے قیمت میں زیادتی کرے جبکہ بائع مشتری کو مبیعہ میں اضافہ کر سکتا ہے اور قیمت میں کمی بھی جائز ہے، استحقاق ان تمام سے متعلق ہوگا، پس کمی اور زیادتی ہمارے نزدیک اصل عقد سے ملحق ہوتی ہے۔"

اس قاعدہ پر چلتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ نظر معاملہ میں قیمت میں یہ زیادتی اصل مبیعہ کے عوض میں آتی ہے اگر قیمت نقد کی صورت میں کم ہو یا ادھار کی صورت میں زیادہ ہو ہر دو صورتوں میں مبیعہ کی قیمت سمجھی جائے گی۔ تو بیع باطل کی تعریف "مایؤخذ من الانسان بغیر عوض" یا "مالم یکن فی مقابلۃ

شئ حقیقی" مروجہ معاملہ پر کبھی صادق نہیں آتی، اس میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بائع کو زیادتی بغیر عوض ملی بلکہ تمام قیمت مبیعہ کی ہے، اصل اور اضافہ دونوں کے درمیان ایسا شدید اتصال موجود ہے کہ دونوں کی دوسرے سے جدائی متصور نہیں، یہ کبھی نہیں کہا جاتا ہے کہ اس قیمت کا اتنا حصہ مبیعہ کا ہے اور اتنا حصہ درمیان میں اجل کا ہے، آخر کار "اجل" میں اتنی قوت کہاں ہے جس کو مبیعہ شمار کیا جا سکے۔ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

لان الاجل فی نفسہ لیس بمال فلا یقابلہ شئ حقیقۃ اذا لم یشترط زیادۃ الثمن بمقابلۃ قصدًا ویزاد فی الثمن لاجلہ اذا ذکر الاجل بمقابلۃ زیادۃ الثمن قصدًا۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۱۵۸ باب المرابحۃ والتولیۃ)

(ترجمہ) "کیونکہ اجل بذاتِ خود کوئی مال نہیں، پس حقیقت میں جب ثمن کی زیادت قصدًا اس کے عوض میں شمار نہیں کی گئی ہو تو کوئی چیز اس کا معاوضہ نہیں، البتہ قیمت میں زیادتی کی جا سکتی ہے جبکہ اجل زیادتِ ثمن کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہو۔"

بہر حال بیع باطل کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی اس لیے لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کی رُو سے یہ ناجائز نہیں بلکہ اِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ کی رو سے جائز ہے، قسط وار ادائیگی کی صورت میں مشتری کی سہولت کو مدنظر رکھ کر یہ کہنا بے جا نہیں کہ مشتری بیک وقت ادائیگی کے تحمل کے بوجھ سے چھٹکارا پاکر معمولی اضافہ برداشت کرنے پر لازمی طور پر خوش ہوگا ورنہ ممکن ہے کہ مشتری کو بیک وقت ادائیگی کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے کہیں مبیعہ کی خریداری سے محروم ہونا پڑے۔ اس لیے مشتری کی رضامندی نہ ہونے کا دعویٰ کرنا خلافِ واقع ہے، یہ الگ بات ہے کہ اگر بائع احسان سے کام لے کر کم قیمت پر مبیعہ فروخت کرنے پر تیار ہو تو اس سے مشتری کو خوشی حاصل ہوگی، لیکن اس سے مزید ایک خوشی کی اور صورت بھی ہے کہ بائع محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے مبیعہ بغیر کسی عوض کے مجاناً مشتری کے حوالہ کرے لیکن اس کو معاشرہ کا لازمی حصہ قرار دینا یا ہر ایک کو احسان کا پابند کرنا شریعت کے عادلانہ نظام سے متصادم ہے کیونکہ شریعت کسی پر ایسے اضافی بوجھ ڈالنے کے حق میں نہیں البتہ تقویٰ اور نیکی حاصل کرنے کے دروازے دونوں پر ہر وقت کھلے ہیں۔

تیسری وجہ کی کمزوری

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کہ "ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے" کا حکم بھی بظاہر اس معاملہ پر چسپاں کرنا

مشکل نظر آتا ہے، کیونکہ یہ حکم وہاں ہے جہاں قرض کی موجودگی میں دائن مدیون سے کسی مادی منفعت کا استفادہ کرے۔ظاہر ہے کہ یہ حکم وہاں ہو سکتا ہے جہاں قرض کا معاملہ باعتبار وجود منفعت کے حصول سے مقدم ہو، لیکن یہاں پر معاملہ کی نوعیت اس سے مختلف ہے، یہ کبھی نہیں ہوتا کہ پہلے قرض دیکر پھر منفعت کا معاملہ کیا جائے، بلکہ اس معاملہ کی ہم یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی وجہ سے فائدہ یعنی مشتری کو رقم دینے میں سہولت کا فائدہ اور بائع کو قیمت میں مالی فائدہ آیا، گویا ظاہری انتفاع کا دائرہ ایسا بھی نہیں جو صرف دائن کی ذات تک محدود ہے بلکہ دائن اور مدیون دونوں اس فائدہ سے بہرہ ور ہوتے ہیں تاہم کسی غیر واقعی اور امکانی احتمال شبہ انتفاع کی وجہ سے ممکن ہے اس عقد پر غیر مستحسن کا حکم لگایا جاتا ہے جو خواص کے دائرہ تک محدود رہتا ہے لیکن اس کو بالکل حرام اور ناجائز قرار دینے کا حکم دوسرے اصول سے بھی متصادم ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ کی ۹۸ فیصد آبادی اس کاروبار میں مبتلا ہے اسے کسی جواز کے احتمال کے ہوتے ہوئے حرام کے کھاتے میں ڈالنا دانشمندی نہیں، جہاں کہیں جواز کا امکان ہو اور یہ احتمال کسی شرعی نص سے بظاہر متصادم نہ ہو تو جواز کے معاملہ کے لیے ایسے احتمال کو بنیاد بنانا اوفق بالروایۃ والدرایت ہے اگرچہ حرمت کے لیے دوسری جانب میں کوئی احتمال نظر آتا ہے، تاہم تقویٰ کا میدان اس سے الگ ہے جس کے لیے ایسے مشتبہات سے بچنا بھی کمال سمجھا جاتا ہے۔

باب السلم

(بیع سلم کے مسائل واحکام)

بیع سلم کی حقیقت

سوال:۔ ایک کمپنی اپنی مصنوعات بیرون میں فروخت کرے تو ایک قیمت لگاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان کو پیشگی رقم دے دے تو کمپنی اُسے خصوصی رعایت دیتی ہے اور مقررہ قیمت سے کم وصول کر کے حسب وعدہ اپنی مصنوعات اسے دیتی ہے، کیا کسی کمپنی یا فیکٹری کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ کسی کمپنی کو پیشگی رقم دے کر مقررہ وقت پر رعائتی قیمت سے اس کی مصنوعات خریدنا عقد سلم کے حکم میں ہے، ایسا عقد اُس وقت جائز ہے جب اس میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں: ۱۔ جنس معلوم ہو ۲۔ نوع معلوم ہو ۳۔ صفت معلوم ہو ۴۔ قدر اور اندازہ معلوم ہو ۵۔ مدت معلوم ہو (کم از کم ایک ماہ ہو) ۶۔ راس المال معلوم ہو ۷۔ مطلوبہ چیز دینے کا مکان معلوم ہو ۸۔ جدائی سے قبل راس المال پر قبضہ ہو۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۵ ص۲۱۶)

لما قال العلامة الحصکفی ؒ: السلم هو...... شرعاً بیع آجلٍ وهو المسلم فیه بعاجلٍ وهو راس المال۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۲۰۹ باب السلم) [۱]

مالدار کے لیے بیع سلم کی اجازت

سوال:۔ کیا شریعت مطہرہ میں غنی کیلئے بیع سلم کی اجازت ہے یا یہ بیع صرف غرباء کے لیے خاص ہے ؟

الجواب:۔ عقد سلم کے جواز میں اگرچہ غرباء اور فقراء کی ضرورت بنیادی طور پر محرک اور سبب ہے لیکن ضرورت کی موجودگی ایک خفیہ معاملہ ہے جس پر ہر کسی کو مطلع ہونا مشکل ہے، اس لئے شریعت نے ایسی حالت میں بیع سلم میں شرائط کی موجودگی کو اعتبار دے کر غرباء اور امراء دونوں

---

[۱] قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: معناه الشرعی بیع آجل بعاجل..... وسیذکر المصنف شرائطه۔ (فتح القدیر ج۶ ص۲۰۴ باب السلم)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۷۸ باب السلم۔

کے لیے جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ سفر کی حالت میں مشقت اور تکلیف سے قطع نظر کرکے محض سفر کو مشقت کا قائم مقام قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ولما كان جوازه للحاجة وهي باطنة انيطت بامر ظاهر كما هو المستمر في قواعد الشرع كالسفر للمشقة ونحوه وهو ذكر الاجل فلم يلتفت بعد ذلك الى كون المبيع معدوما عند المسلم اليه حقيقة او موجودا قادرا هو عليه۔ (فتح القدير ج۶ ص۲۱۸ باب السلم)[1]

کرنسی نوٹوں میں بیع سلم کی اجازت ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے امریکی ڈالر وصول کرکے ان کے عوض میں پاکستانی کرنسی نوٹ دینے کی میعاد کرکے معاملہ طے کیا کہ تین ماہ بعد پاکستانی کرنسی نوٹ ادا کروں گا، کیا مذکورہ طریقہ سے معاملہ طے کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کرنسی نوٹ چونکہ خلقی طور پر ثمن نہیں بلکہ عرف اور رواج کی وجہ سے ثمن کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں اس لیے ثمن عرفی بننے کے بعد اس میں کوئی قدر نہ رہی بلکہ عددِ متقارب کے حکم میں آکر عقدِ سلم کے جواز کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ پس اگر سلم کی شرائط کی رعایت کرکے کوئی شخص ایسا معاملہ کرے تو بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر سودخوری کے لیے یہ طریقہ اپنایا جائے تو پھر اس سے اجتناب بہتر رہے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين ابوبكر الكاساني رحمه الله: واما السلم في الفلوس عددا فجائز عند ابي حنيفة وابي يوسف وعند محمد لا يجوز بناء على ان الفلوس اثمان عنده فلا يجوز السلم فيها كما لا يجوز السلم في الدراهم والدنانير وعندهما ثمنيتها ليست بلازمة بل تحتمل الزوال لانها ثبتت بالاصطلاح فتزول

---

[1] قال العلامة جلال الدين الخوارزمي: قلنا شرعيته لرفع حاجة المفاليس والافلاس امر باطن لا يمكن الوقوف على حقيقته والشرع بنى هذه الرخصة على الحاجة ...... والبيع بالخسران دليل الحاجة ونظيره اقامة السفر مقام المشقة اقامة النكاح مقام الماء في النسب۔ (الكفاية في ذيل فتح القدير ج۶ ص۲۱۹، باب السلم، قادرا تحت قوله: لو كان قادرا على التسليم لم يوجد المرخص)
ومثله في العناية على هامش فتح القدير ج۶ ص۲۱۷ باب السلم۔

بالاصطلاح ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۲۰۸ باب السلم، فصل: واما الذی یرجع الی المسلم فیه فانواع) [1]

بیع سلم میں تمام قیمت کی وصولی ضروری ہے

سوال:۔ بائع اور مشتری کے درمیان دو ہزار روپے پر دس من اناج کا عقد اس شرط پر ہوا کہ سولہ سو روپے حالاً ادا کرے گا، جبکہ چار سو روپے دو ماہ بعد اناج وصول کرتے وقت ادا کرے گا، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع سلم میں راس المال کا تعین اور عقد مجلس میں ادائیگی لازم ہے لہٰذا اگر رأس المال کے قبض کرنے سے قبل اگر طرفین جدا ہوئے تو یہ بیع درست نہ ہوگی، تاہم رأس المال کا جتنا حصہ ادا کیا گیا ہو اتنے میں ہی سلم جاری ہوگا، پس مذکورہ معاملہ میں بھی آٹھ من اناج میں بیع سلم درست ہو کر دو من میں باطل ہوگی، البتہ اگر مجلس برخواست کرنے سے قبل تمام رقم ادا کر دی جائے تو عقد جائز ہے۔

وفی الهندیة: السادس ان یکون مقبوضاً فی مجلس السلم سواء کان رأس المال دینا اوعینا عند عامة العلماء استحسانا وسواء قبض فی اول المجلس اوفی آخره لان ساعات المجلس لها حکم ساعة واحدة وکذا لو لم یقبض حتی قاما یمشیان فقبض قبل ان یفترقا بابدانهما جاز۔ اھ
(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۷۹ الباب الثامن عشر فی السلم) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ویصح فی العددی المتقارب کالبیض والجوز والفلس لانه عددی یمکن ضبطه فیصح السلم فیه وقیل لایصح عند محمدؒ لانه ثمن مادام یروج وظاهر الروایة عن الکل الجواز۔
(البحر الرائق ج۶ ص۱۵۶ باب السلم)
وَمِثْلُهُ فی ردالمحتار ج۵ ص۲۱۱ باب السلم۔

[2] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وبقی من الشروط قبض رأس المال ولوعیناً قبل الافتراق بابدانهما وان ناما او سارا فرسخا او اکثر۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله قبض رأس المال) فلو انتقض القبض بطل السلم۔ اھ
(ردالمحتار ج۵ ص۲۱۶ کتاب البیوع۔ باب السلم)
وَمِثْلُهُ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۲ ص۳۴ باب السلم۔

جانوروں میں بیع سلم کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حیوانات میں بیع سلم شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب : حیوانات میں بیع سلم کا مسئلہ فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک چونکہ بیع سلم کے لیے مبیعہ کا وزنی، کیلی یا عددیات متقاربہ ہونا ضروری ہے اور حیوانات ان میں سے کسی بھی قسم میں داخل نہیں، اس لیے حنفیہ کے نزدیک حیوانات میں بیع سلم جائز نہیں ۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ وھم یسلفون فی الثمر فقال من اسلف فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم ۔ (جامع الترمذی ج۱ ص۲۴۵ باب ما جاء فی السلف فی الطعام والتمر) [1]

مالکانِ رسائل وجرائد کا خریداروں سے پیشگی قیمت لینا

سوال :- جناب مفتی صاحب ! آجکل مذہبی اور غیر مذہبی رسائل وجرائد کے مالکان خریداروں سے سالانہ چندہ کی رقم پیشگی وصول کر لیتے ہیں جبکہ پورے سال کا رسالہ انہیں بعد میں وصول ہوتا ہے۔ تو کیا مالکان رسائل و جرائد کا پیشگی رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب : رسائل وجرائد کی سالانہ رقم پیشگی لینے کا معاملہ بیع سلم کا معاملہ ہے جو شرعاً جائز ہے اسلئے کہ اس میں اصل معاملہ کاغذ کا ہوتا ہے اور وہ سال بھر بازار میں موجود رہتا ہے ۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : السلم شرعاً بیع آجل وھو المسلم

---

[1] قال الشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ : عن ابن عباس رضی اللہ عنہ: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن السلف فی الحیوان ، اخرجہ الحاکم فی المستدرک ج۲ ص۵۲ وقال صحیح الاسناد ۔ (اعلاء السنن ج۴ ص۳۱۹ باب النہی عن السلف فی الحیوان)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۲۱۱ باب السّلم ۔

فیہ بعاجل وھو رأس المال ورکنہ رکن البیع حتی ینعقد بلفظ بیع فی الصح......
وشرطہ ای شروط صحتہ التی تذکر فی العقد سبعۃ بیان جنس کبر وتمر و
بیان نوع کسقی او بعلی وصفتہ وقدر واجل و بیان قدر رأس المال اھ
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص۲۱۴،۲۱۲ باب السلم) [1]

جوس کے کریٹوں میں بیع سلم کا حکم | **سوال**:۔ شربت اور جوس بنانے والی کمپنیوں کا اپنی مصنوعات فروخت کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کمپنی اپنے کسی ڈیلر کو عام ریٹ پر مثلاً ۶۲ روپے فی کریٹ دیتی ہے لیکن اگر ڈیلر کمپنی کو یہ رقم سیزن سے کچھ مدت پہلے ادا کرے تو کمپنی اُسے ۵۲ روپے فی کریٹ دیدیتی ہے اس طرح سے ڈیلر کو دس روپے فی کریٹ بچت ہو جاتی ہے، یہ طریقہ خرید وفروخت میعاد مقرر اور غیر مقرر دونوں طرح کا ہوتا ہے، تو کیا یہ طریقہ بیع شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ بیع بیع سلم کے طریقے سے ہو تو شرائط سلم کی موجودگی میں بیع درست ہوگی، بیع سلم کی شرائط یہ ہیں، ۱ جنس معلوم ہو ۲ مال کی قسم معلوم ہو ۳ صفت معلوم ہو ۴ مقدار معلوم ہو ۵ مدت کا تعین ہو ۶ مبیع کے ادا کرنے کی جگہ مقرر ہو۔
(اشراق نوری شرح قدوری ص۱۳۴ باب السلم) اور اگر پیشگی کی یہ رقم کمپنی کو بطور قرض دی جاتی ہو تو بموجب حدیث کل قرضٍ جرّ نفعاً فھو ربوًا یہ سودی معاملہ ہوگا۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وشرطہ ای شروط صحتہ التی تذکر فی العقد سبعۃ بیان جنس ونوع ..... وصفۃ ...... وقدر .... واجل واقلہ فی السلم شھر....... و بیان مکان الایفاء للمسلم فیہ الخ
(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۲۳۱ باب السلم)

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: وھو ان یسلم عوضاً حاضراً فی عوض موصوف فی الذمۃ الی اجل........ الثامن ان یکون جنس المسلم فیہ ای المبیع موجوداً فی الاسواق بنوعہ وصفتہ من وقت العقد الی حلول اجل التسلیم ولا یتوھم انقطاعہ عن ایدی الناس۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۵۹۸، ۶۰۸ المطلب الثانی تعریف السلم)

مسلّم فیہ ناپید ہوجائے تو۔۔۔ | **سوال:۔** اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ بیع سلم کرے اور وقتِ معینہ سے قبل ہی وہ شے ناپید ہوجائے تو کیا مشتری اس کے بدلے کوئی اور چیز لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیع سَلَم میں جب مسلّم فیہ (جس کے بارے میں بیع ہوئی ہے) اگر مدتِ معینہ میں ناپید ہوجائے اور مسلَم الیہ (بائع) ادا کرنے سے عاجز ہو تو اس صورت میں مشتری کو اختیار ہے کہ وہ مسلّم فیہ تک انتظار کرے یا اپنے پیسے واپس لے لے، اس کے بدلے میں دوسری چیز لینا شرعاً جائز نہیں، تاہم عقد ختم کرنے یعنی اپنی رقم واپس لینے کے بعد نئے سرے سے عقدِ بیع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : ولو انقطع بعد الاستحقاق خیر ر ب السّلم بین انتظار وجودہ والفسخ واخذ رأس المال۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۴ ص۲۳۹ باب السلم)[1]

جانبین سے موزونی اشیاء میں بیع سَلَم جائز نہیں | **سوال:۔** ایک آدمی نے چند بوری چینی ۱۰۸ روپے فی بوری کے حساب سے ایک شخص پر ۲/۱-۲ ماہ کی میعاد پر فروخت کی اور اس سے وعدہ لیا کہ آپ اس وقت مجھے سرسوں دیں گے، جبکہ معاہدہ کرتے وقت سرسوں کی قیمت ۱۰۶ روپے فی من تھی، جب میعاد پوری ہوگئی تو سرسوں کی قیمت تقریباً گیارہ سو روپے فی من تھی، اِس پر اُس شخص نے سرسوں دینے سے انکار کر دیا، بالآخر ۹۰۰ روپے فی من پر فیصلہ ہُوا، تو اب یہ نفع یعنی ۲۹۰ روپے فی من لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بظاہر بیع سَلَم کی یہ صورت ناجائز ہے لہٰذا فریقین اس عقد کو ختم کرکے اپنا اپنا مال یا اس کا مثل اگر عین مال موجود نہ ہو واپس لے لیں، اور اگر سَلَم کی تمام شرائط موجود بھی ہوں تب بھی چینی اور سرسوں میں سَلَم جائز نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اس بیع پر بیع فاسد کا حکم جاری ہوگا کیونکہ یہ عقدِ ربوٰ ہے اور عقدِ ربوٰ بیع فاسد کے حکم میں ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : من جملۃ صور البیع الفاسد

---

[1] وفی الھندیۃ : ولا یجوز ان یأخذ عوض رأس المال شیئاً من غیر جنسہ فان اعطاہ من جنس اجود منہ او اردأ فی الصفۃ الخ (الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۱۸۶ الفصل الثالث فیما یتعلق بقبض رأس المال والمسلم فیہ)

جملة العقود الربوية۔ (رد المحتار علیٰ حاشیہ الدر المختار ج۴ ص۱۹۷ باب الربوٰ)

وقال العلامة خالد الآتاسیؒ، ثم اعلم ان اسلام الموزون فی الموزون والمکیل فی الموزون لا یصح لوجود محلی الربٰو او احدهما الخ۔ (شرح المجلۃ ج۲ ص۳۸۷ باب السلم) [1]

چلغوزی میں بیع سلم کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے (ایجنسی وزیرستان) میں لوگ چلغوزی کے دانوں میں بیع سلم کرتے ہیں، یہ چلغوزی پورے ملک کی مختلف مارکیٹوں میں سال کے بارہ مہینے ہر وقت بکتی ہے جبکہ ہمارے علاقے میں ابھی تک درختوں میں ہے، تو کیا ایسی چلغوزی میں بیع سلم جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ ظاہر ہے کہ بیع سلم اس جدید چلغوزی میں ہے جو ابھی تک درختوں پر ہے اور مارکیٹ میں ابھی نہیں پہنچی ہے اور مارکیٹ میں موجود بھی نہیں ہے اس لیے یہ بیع سلم درست نہیں۔

لما فی الهندیة: السادس ان یکون المسلم فیه موجوداً من حین العقد الی حین المحل حتی لو کان منقطعا عند العقد موجوداً عند المحل وعلی العکس او منقطعاً فیما بین ذلك وهو موجودٌ عند العقد والمحل لا یجوز کذا فی فتح القدیر وحد الوجود ان لا ینقطع من السوق وحد الانقطاع ان لا یوجد فی السوق وان کان یوجد فی البیوت هکذا فی السراج الوهاج۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۸۰ الباب الثامن عشر فی السّلم۔ الفصل الاول) [2]

---

[1] وفی الهندیة: العاشر ان لا یشمل البدلین احد وصفی علة ربا الفضل وهو القدر او الجنس وهذا مطرد الا فی الاثمان فانه یجوز اسلامهما فی الموزونات لحاجة الناس۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۸۰،۱۸۱ الباب الثامن عشر فی السّلم۔ الفصل الاول)

[2] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ولا فی حنطة حدیثه قبل حدوثها لانها منقطعة فی الحال وکونها موجودة وقت العقد الی وقت المحل شرط فتح القدیر۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۲۰۳ باب السلم)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۵۵ باب السلم۔

افیون میں بیع سلم جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص مثلاً زید نے بکر سے کہا کہ مجھے ایک ہزار روپے دے دو، اس کے بدلے میں میں آئندہ سال فصل کے موقع پر ایک سیر افیون دے دوں گا، جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگلے سال افیون کی قیمت تین ہزار روپے فی سیر ہوگی، تو کیا یہ معاملہ سودی تو نہیں ہے یا جائز ہے؟

الجواب:۔ پہلے تو افیون کی بیع سے بلا ضرورت احتراز کرنا لازم ہے لیکن مال متقوم ہونے کی وجہ سے صورت مسؤلہ میں جو عقد کیا گیا ہے یہ بیع سلم کی صورت ہے لہٰذا اگر بیع سلم کی تمام شرائط کا لحاظ رکھا جائے تو جائز ہے، آئندہ سال افیون کی قیمت کی کمی یا زیادتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: (السلم) ھو .... بیع آجل .... بعاجل .... و رکنہ رکن البیع .... ویصح فیما امکن ضبط صفتہ ومعرفۃ قدرہ کمکیل وموزون الخ۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج۴ ص۲۲۶ باب السّلم)[1]

کپڑے میں بیع سلم کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی تاجر کسی فیکٹری کے مالک سے اس طرح معاملہ طے کرے کہ آئندہ سال گرمی کے موسم میں مجھے اتنے تھان کپڑا درکار ہوگا اور جملہ شرائط طے کرکے رقم فیکٹری کے مالک کے حوالے کردے تو کیا یہ سودا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ بیع سلم کا مسئلہ ہے لہٰذا سودا طے کرتے وقت اگر اس کے جملہ اوصاف، مقدار، کپڑا کس چیز سے بنا ہوگا، وغیرہ کی وضاحت کردی جائے تو شرعاً یہ سودا جائز ہے۔

لمافی مجلۃ الاحکام: الکرباس والجوخ وامثالھما من المذروعات یلزم تعیین طولھا وعرضھا ورقتھا ومن ای شیٔ نسیج ومن نسیج ای محل ھی۔

{شرح المجلۃ لرستم باز ص۲۱۸ المادۃ ۳۸۵
الفصل الثالث فی السّلم}

---

[1] وفی الھندیۃ: ان یکون السلم فیہ موجوداً من حین العقد الیٰ حین المحل... ان یکون السلم فیہ مما یتعین بالتعیین۔ وھٰکذا شروط اُخر۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۳ ص۱۸۰ باب السلم)

كتاب

الربٰو

يا ايها الذين امنوا لا
تاكلوا الربوا اضعافا
مضاعفة واتقوا الله تفلحون.

کتاب الرّبوٰا
(سُود کے احکام و مسائل)

سُود کی حقیقت

سوال: جناب مفتی صاحب! سود کی تعریف کیا ہے اور یہ کن کن چیزوں میں کن صورتوں میں پایا جاتا ہے؟

الجواب: قرض دار کو کچھ رقم ایک خاص مدت کے لیے اس شرط کے ساتھ دینا کہ واپس کرتے وقت اصل زر سے زائد دے گا، سُود کہلاتا ہے اور اسے اُدھار کا سود کہتے ہیں۔

لما قال الامام الجصاص الرازیؒ: هو القرض المشروط فيه الاجل وزيادة مال على المستقرض۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۴۶۹ باب البیع)

ایک ربوٰ معاملاتِ بیع و شراء کا ہے، حضور انورؐ نے اس بارے میں چھ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے کہ آپس میں ان کا تبادلہ برابر ہونا چاہیئے، وہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور اور انگور ہیں۔ ان اشیاء میں سُود کی علت عندالاحناف قدر (پیمانہ) اور جنس ہے، اگر جنس بدل جائے اور کوئی چیز وزنی اور کیلی نہ ہو تو پھر تبادلے میں کمی بیشی جائز ہے، اگر کسی بھی چیز کے اندر قدر اور جنس ہو تو تبادلہ کے وقت کمی یا زیادتی کی تو یہ سُود ہوگا، ان میں اُدھار کا معاملہ بھی سُود ہوگا۔ اگر سُود کی دونوں علتوں میں سے ایک علت پائی جائے تو کمی بیشی جائز ہوگی لیکن اُدھار پھر بھی سُود کے زمرہ میں آئے گا۔

قال الحصکفیؒ: الربا و شرعاً فضل ولو حکماً فدخل ربا النسیئة والبیوع الفاسدة فکلها من الربوا خال عن العوض بمعیار شرعی وهو الکیل والوزن مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضة وعلة القدر مع الجنس وان وجد احرم الفضل والنساء وان وجد احدهما حل الفضل وحرم النساء۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۴ ص۱۷۶ باب الربوا) [1]

[1] لما فی الهندیة: وهو فی الشرع عبارة عن فضل مال لا یقابله عوض فی معاوضة مال بمال وهو محرم فی کل مکیل و موزون بیع مع جنسه وعلته القدر والجنس وان وجد القدر والجنس حرم الفضل والنساء وان وجد احدهما وعدم الآخر حل الفضل وحرم النساء۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۱۷ باب الربوا)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۲۴ باب الربوا۔

سُود سے بچنے کا حیلہ

سوال:- آجکل بینک لوگوں کو ٹریکٹر خرید کر دیتا ہے، پھر بینک نے ٹریکٹر کمپنی کو جتنی رقم ادا کی ہوتی ہے اُس رقم کو گاہک سے مع سُود کے قسط وار وصول کرتا ہے، کیا اس سُود سے بچنے کا کوئی حیلہ ہے؟

الجواب:- (۱) اگر بینک کمپنی سے ٹریکٹر خرید کر خود آگے بیچتا ہے تو قسط وار زیادہ رقم قیمتِ خرید سے وصول کر سکتا ہے اور ثمن کی یہ زیادتی اُدھار کی وجہ سے ہے جو کہ شرعاً مرخص ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: الا يرى انه يزاد في الثمن لاجل الاجل۔
(الهداية ج۳ ص۶۴ باب الربو)

(۲) اگر بینک گاہک کا وکیل بن کر ٹریکٹر اپنے مؤکل کو خریدشدہ قیمت سے زیادہ پر دیتا ہے تو یہ ناجائز ہے کیونکہ وکیل اپنے مؤکل کی شرائط کے مطابق چلے گا۔

لما قال العلامة الكاساني رح: اذا قال له اشترلي جارية بالف درهم فاشترى جارية باكثر من الالف تلزم الوكيل دون المؤكل لانه خالف امر المؤكل فيصير مشتريا لنفسه۔
(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۹ بيان في حكم التوكيل)

(۳) بینک نے مثلاً گاہک کی طرف سے کمپنی کو ایک لاکھ روپے دے دیئے اور گاہک سے ڈیڑھ لاکھ وصول کرنا چاہتا ہے، ٹریکٹر گاہک نے کمپنی سے خرید لیا لیکن اب بینک کی رقم اس کے ذمہ قرض ہے اور بینک زیادہ وصول کرنا چاہتا ہے، تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ بینک اپنے ایک لاکھ کے عوض گاہک سے زمین وغیرہ خرید کر اپنے قبضہ میں لے لے پھر اس زمین کو گاہک کے ہاتھ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کرے اور قسط وار ڈیڑھ لاکھ وصول کرتا رہے۔

قال العلامة ابن نجيم: رجل له على آخر عشرة دراهم فاراد ان يؤجلها الى السنة ويأخذ منه ثلاثة عشر فالحيلة ان يشترى منه بتلك العشرة متاعاً ويقبض المتاع منه وقيمة المتاع عشرة ثم يبيع المتاع منه بثلاثة عشر الى سنة۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۲۶ باب الربو) [1]

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: رجل له آخر عشرة دراهم فاراد ان يؤجلها الى سنة ويأخذ منه ثلاثة عشر فالحيلة ان يشترى منه بتلك العشرة متاعاً ويقبض المتاع منه وقيمة المتاع عشرة ثم يبيع المتاع منه بثلاثة عشر الى سنة۔ (خلاصة الفتاوى ج۲ ص۱۰۲ باب الربو)

سُودی رقم کامصرف

سوال:۔ بینک کی طرف سے منافع کی شکل میں ملنے والی سودی رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اول تو بینک میں رقم رکھنے سے گریز ہی کرنا چاہیئے اور اگر مجبوراً حفاظت کی نیت سے رکھ دی جائے تو اس پر جو سود منافع کی صورت میں ملتا ہے وہ وہ بینک والوں کے لیے نہ چھوڑے بلکہ اُن سے لے کر غرباء اور فقراء پر بلا نیتِ ثواب صدقہ کردے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کما لوغصب عبداً وآجرہ فینقص فی ھٰذہ الاجارۃ...... وان استغلہ فنقصہ الاستغلال او آجر المستعار ونقص ضمن النقصان وتصدق بما بقی من الغلۃ والاجرۃ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ویؤمر ان یتصدق بھا لاستفادتھا ببدل خبیث وھوالتصرف فی مال الغیر۔ (الدرالمختار ورد المحتار ج ۲ ص۱۸۸ کتاب الغصب)[1]

گڑ، گندم قرض پر دے کر واپسی کے وقت زیادتی کی شرط لگانا سُود ہے

سوال:ایک شخص نے کسی آدمی سے گڑ اور گندم ایک خاص پیمانہ کے مطابق خاص مدت کے لیے قرض لیا اور وقت معین پر واپسی کے ساتھ زیادتی کی شرط لگادی کہ قرض ادا کرتے وقت اتنی مقدار میں گڑ اور گندم ساتھ زیادہ بھی دوں گا، کیا اس طرح معاملہ کرنا ازروئے شرع صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اشیاء ربویہ میں باہم قرض و اقراض جائز ہے لیکن واپسی کے وقت مساوات شرط ہے، گندم تو منصوص ہے، حدیث میں مساوات کی شرط ہے اور گڑ میں اس منصوص کی علت قدر اور جنس پائی جاتی ہے، لہٰذا گندم اور گڑ واپس کرتے وقت زیادتی کی شرط سود ہے۔

---

[1] لما قال العلامۃ ابن البزاز رحمہ اللہ: ولو بلغ المال الخبیث نصاباً لا یجب فیہ الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق۔ (البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۴ ص۸۶ کتاب الزکوٰۃ۔ الفصل الثانی فی المصرف)

قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: الحنطة بالحنطة مثلاً بمثل یداً بید والفضل ربٰو وعد الاشیاء الستة۔

(الهداية ج۳ ص۷۷ باب الربٰوا) ؎۱

سُود پر قرضہ دینا ناجائز ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! کیا سُود پر قرضہ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سود پر قرضہ دینا شرعی طور پر قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں صراحتاً اس کی ممانعت ہے، اس لیے سُود پر قرضہ دینا جائز نہیں ہے۔

لما قال اللہ تعالیٰ: احل اللہ البیع وحرم الربٰو۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) ؎۲

دَینِ مؤجل میں کمی کرکے معجل وصول کرنا حرام ہے

سوال: ایک شخص کا دوسرے آدمی کے ذمہ پانچ ہزار روپے قرض تھا، مقروض نے اس میں کمی کا مطالبہ کیا، قرض خواہ نے کہا کہ دو ہزار روپے اس شرط پر کم کرکے معاف کرتا ہوں کہ بقایا تین ہزار روپے فوراً واپس کردو تو مقروض کا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قرض خواہ کا مقروض کو اس شرط پر دو ہزار روپے معاف کرنا کہ بقایا تین ہزار روپے فوراً وصول کرے ناجائز ہے، عقد میں جو مدت مقرر کی گئی تھی یہ اس کا عوض ہے، دَینِ مؤجل کو معجل کر رہا ہے اور یہ حرام ہے۔

قال الامام الجصاص الرازی رحمہ اللہ: الرجل یکون علیہ الف درہم دَینٍ مؤجل

؎۱ قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: کل قرض جر نفعاً حرام اذا کان مشروطاً۔

(رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ باب الربٰوا۔ مطلب کل قرض جر نفعاً حرام)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۵۴ باب الربٰوا۔

؎۲ وفی الهندية: قال محمدؒ فی کتاب الصرف ان ابا حنیفةؒ کان یکرہ کل قرض جر منفعة۔ (الفتاوی الهندية ج۳ ص۲۰۲ فصل فی الصرف)

ومثلہٗ فی الهداية ج۳ ص۱۳۱ کتاب الحوالة۔

فیصالحہ منہ علی خمس مأۃ حالہ فلا یجوز۔ (الاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۸۷) سلہ

قرض دے کر نفع متعین کرنا ناجائز ہے

سوال:۔ ایک آدمی کو کاروبار کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، کسی دوسرے آدمی نے کہا کہ اس شرط پر سرمایہ دوں گا کہ دس فیصد منافع مجھے ضرور دو گے، کیا اس شرط پر قرضہ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ روپے بطور قرض دے کر اس پر دس فیصد یا کوئی بھی فیصد منافع مقرر کرنا سود ہے جو کہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کل قرض جرّ نفعاً حرام ای اذا کان مشروطاً کما علم مما نقلہ عن البحر۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۶۶ باب الربٰو۔ مطلب کل قرض جر نفعا حرام) سلہ

مساوی حقوق کے وقت قرعہ اندازی سود نہیں

سوال:۔ چند آدمی ہر ماہ کچھ رقم جمع کرتے ہیں اور پھر قرعہ اندازی کے ذریعے جس کا نام نکل آتا ہے تو وہ جمع شدہ رقم لے لیتا ہے پھر ہر ماہ اپنے حصے کی رقم جمع کرتا رہتا ہے لیکن قرعہ اندازی سے اس کا نام نکل جاتا ہے، اس طرح باری باری قرعہ اندازی میں ہر ایک کا نام آتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ قرعہ اندازی سود ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ چند افراد کا اس طرح ہر ماہ برابر برابر رقم جمع کرکے قرعہ اندازی کے

سلہ قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: لو کانت لہٗ الف مؤجلۃ فصالحہٗ علی خمس مأۃ حالۃ لم یجز لان المعجل خیر من المؤجل وھو غیر مستحق بالعقد فیکون بازاء ما حطہ عنہ وذٰلک اعتیاض عن الاجل وھو حرام۔

(الھدایۃ ج ۳ ص ۲۵۱ باب الصلح فی الدَّین)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج ۲ ص ۷ کتاب الصلح۔

سلہ قال العلامۃ قاضی ثناء اللہؒ: قولہ وحرم الربٰو والمعنٰی ان اللہ تعالٰی حرم الزیادۃ فی القرض علی القدر المرفوع۔ (تفسیر مظہری ج ۱ ص ۲۹۹ سورۃ البقرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاحکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۱۸۹ سورۃ البقرۃ۔

ذریعے کسی ایک کو دینا امدادِ باہمی اور قرض ہے اس میں تملیک اور تملک نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک شریک چاہتا ہے کہ اس بار جمع کی گئی رقم مجھے مل جائے، تو رفع نزاع اور خوش دلی کے لیے قرعہ اندازی کر لیتے ہیں، جہاں سب شرکاء کے حقوق مساوی ہوں وہاں طیبِ خاطر کے لیے قرعہ ڈالنا جائز ہوتا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ویکتب اسامیھم ویقرع لتطییب القلوب۔
(رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ کتاب القسمۃ) [1]

مشتری کے ہاتھ مبیع نفع کی شرط پر بیچنے کا وعدہ سود نہیں

سوال:۔زید بکر کو سود پر قرضہ دینا چاہتا تھا لیکن بکر نے انکار کر دیا، اس پر دونوں نے سود سے بچنے کے لیے ایک حیلہ سوچا، زید نے بکر سے کہا کہ میں تمہیں دو ہزار روپے دیتا ہوں آپ اس کا کپڑا خریدیں اور آنے جانے کا خرچہ اور کرایہ بھی تمہیں دوں گا، مال اپنے قبضے میں لے لوں گا پھر ایک آنہ فی روپیہ نفع کے حساب سے ادھار پر آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا، تو کیا سود سے بچنے کا یہ حیلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔سود سے بچنے کا مذکورہ حیلہ درست ہے، بکر زید کا وکیل بن کر مال خریدے اور زید کے حوالے کر دے پھر زید بکر کے ہاتھ دو ہزار کا کپڑا ایک آنہ فی روپیہ منافع کے حساب سے اُدھار پر فروخت کر دے تو یہ بیع صحیح ہے کیونکہ اس صورت میں زید نفع پر اپنا مال بکر کے ہاتھ بیچ رہا ہے اگرچہ سودا ادھار ہے، اس میں کسی قسم کا سود نہیں، زید نے صرف ابتداءً بکر کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ مال آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا، یہ بھی کوئی ناجائز بات نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: کل حیلۃ یحتال بھا الرجل یتخلص

---

[1] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: لاکان القرعۃ یتعلق بھا حکم بل لتطییب النفوس ولورود السنۃ بھا وکان ذلک انفی للتھمۃ فکان سنۃ۔
(بدائع الصنائع ج۷ ص۱۹ کتاب القسمۃ)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۵۲ کتاب القسمۃ۔

بہا عن حرام او یتوصل بہا الیٰ حلال فہی حسنۃ ۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۳۱۹ کتاب الحیل)[1]

سُودی رقم کے عوض سودی رقم دے کر ذمہ فارغ کرنا

سوال:۔ ایک آدمی کی بینک میں کچھ رقم تھی جس پر اس کا سود جمع ہو گیا، اب اس شخص نے اپنی کسی ضرورت کے لیے بینک سے کچھ رقم قرض لی، اس پر بھی بینک کا سُود آیا، کیا یہ شخص اپنا سود بینک کے سود کے عوض قبل القبض یا بعد القبض دے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بینک میں رقم رکھنا دونوں طرف سے سودی معاملہ ہے، بینک میں رقم رکھنا یا بینک کی کسی کے ذمہ رقم دونوں قوی دَیْن ہیں، دونوں جب ایک دوسرے کو اپنا اپنا سود چھوڑ رہے ہیں تو یہ بیع مقاصہ اور سود سے نفع حاصل کرنا ہے، اس لیے سود کی حرمت کی وجہ سے یہ معاملہ بھی حرام ہے ۔

قال اللہ تعالیٰ : احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵)[2]

شئ مرہونہ سے نفع کی شرط سُود ہے

سوال:۔ زید سے عمرو نے پانچسو روپے قرض لیے اور اپنی کچھ زمین زید کے پاس اس شرط پر گروی رکھی کہ زمین کی پیداوار میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، شرعاً اس معاملہ کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ اگر زید نے قرضہ اس شرط پر دیا ہے کہ شئ مرہونہ سے انتفاع لے گا تو یہ حرام ہے کیونکہ کل قرض جرّ نفعاً فھو ربوا کے حکم میں آئے گا ۔ اذا کان مشروطاً

---

[1] قال العلامۃ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللہ : وکل حیلۃ یحتال بہا الرجل لیتخلص بہا عن حرام اولیتوصل بہا الیٰ حلال فہی حسنۃ ۔

(شرح المجلۃ ج۲ ص۴۵۲ احکام الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۶ ص۳۹۰ کتاب الحیل ۔

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : کل قرض جرّ نفعاً حرام ۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ باب الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الاحکام القرآن للجصاصؒ ج۲ ص۱۸۹ سورۃ البقرۃ ۔

صار قرضاً فیہ منفعة وھو ربوا والا فلا بأس، اگر نفع کی شرط نہ بھی لگائی ہو پھر بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: والغالب من احوال الناس انھم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاہ لما اعطاہ الدراھم وھذا بمنزلة الشرط لان المعروف کالمشروط وھو ما یعین المنع۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۳۱۰، ۳۱۱ کتاب الرھن) ؎۱

اشتراکِ قدر (پیمانہ) کی صورت میں اُدھار تبادلہ ناجائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کو مکئی کی ضرورت ہے اور وہ کسی زمیندار سے معاہدہ کے تحت خاص مقدار میں مکئی لیتا ہے، اس زمیندار سے یہ کہتا ہے کہ میں تین ماہ بعد اتنی مقدار میں اس کے بدلے میں گندم دوں گا، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ اس قسم کے اُدھار کا تبادلہ شرعاً جائز نہیں، اگرچہ مکئی اور گندم کی جنس مختلف ہے لیکن مکئی اور گندم دونوں کیلی ہیں یعنی پیمانہ سے یہ دونوں تولے جاتے ہیں، دو چیزوں کے تبادلہ میں جب جنس یا قدر میں اشتراک ہو تو تفاضل جائز ہے اور اُدھار ناجائز، اس کو ربا النسیئہ کہتے ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وان وجد احدھما ای القدر وحدہ او الجنس وحدہ حل التفاضل وحرم النساء۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۴ ص ۲۹۹ باب الربوٰ) ؎۲

؎۱ قال الامام ابو بکر الجصاص الرازیؒ: قال ابو حنیفةؒ وابو یوسفؒ ومحمدؒ والحسن بن زیادؒ و زفرؒ لا یجوز للمرتھن الانتفاع بشیئ من الرھن ولا للراھن ایضاً۔

(الاحکام القرآن ج ۱ ص ۵۳۱ باب ضمان الرھن)

وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج ۳ ص ۲۴۴ کتاب الرھن۔

؎۲ قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللّٰہ: والنساء فقط باحدھما ای وحرم التاخیر لا الفضل بوجود القدر فقط او الجنس فقط۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۱۲۸ باب الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایة ج ۳ ص ۷۹ باب الربوٰ۔

نفع کی شرط پر قرض رقم دینا سود ہے

سوال :۔ ایک دوکاندار سے کسی گاہک نے کوئی چیز خریدنی چاہی جبکہ وہ چیز اس دوکاندار کے پاس نہ تھی اور اس نے گاہک سے کہا کر مجھ سے یہ رقم لے کر خود اپنے لیے مطلوبہ چیز خرید لو لیکن میری رقم مجھے واپس کرتے وقت اصل زر کے ساتھ اتنا منافع بھی دینا ہوگا، شرعاً اس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ مذکورہ دوکاندار کا یہ فعل بعینہٖ ربوا کا معاملہ ہے کیونکہ گاہک کو قرض رقم دے کر واپسی کے لیے اپنی اصل رقم سے زیادتی کی شرط لگا رہا ہے جو کہ سود ہے، دکاندار کو صرف اپنی قرض رقم واپس لینے کا حق ہے ۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ : الذھب بالذھب مثلاً بمثل وزناً بوزنٍ یداً بیدٍ والفضل ربٰو۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۰۶ کتاب الصرف) [۱]

اُدھار کی وجہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا سود نہیں ہے

سوال، ایک دوکاندار ایک شے کی جو نقد قیمت لگاتا ہے جب اُسی شے کو اُدھار پر بیچتا ہے تو قیمت بڑھا دیتا ہے ،کیا اس طرح کرنا سود تو نہیں ؟

الجواب :۔ کوئی چیز اُدھار پر بیچنے کی وجہ سے اس کی قیمت میں زیادتی جائز ہے اس لیے کہ اُدھار کے مقابلے میں نقد رقم کے فوائد اور منافع زیادہ ہیں ،مثل مشہور ہے کہ " نو نقد اچھے تیرہ ادھار بُرے " اس لیے نقد اور ادھار سودے کی قیمت میں تفاوت رکھنا جائز ہے ۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللّٰہ : الا یری انہٗ یزاد

---

[۱] قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللّٰہ : اذا بیع جنس الاثمان بجنسہٖ کالذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ یشترط فیہ التساوی والتقابض قبل الافتراق ولا یجوز التفاضل فیہ ۔

(تبیین الحقائق ج۴ ص۱۳۵ کتاب الصرف)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۹۲ کتاب الصرف ۔

فی الثمن لاجل الاجل۔ (الهدایة ج ۳ ص۷۶ باب المرابحة والتولیة) ؎۱

اشیاءربویہ میں قرض کامعاملہ

سوال:۔ اشیاءربویہ میں خرید و فروخت کے وقت برابری اور نقد کا معاملہ ہوتا ہے ادھار کا معاملہ ان میں صحیح نہیں ہوتا، اگر ایک آدمی کسی کو گندم قرض دے کر یہ کہے کہ تین ماہ بعد میری قرض گندم واپس کرنی ہوگی، ان اشیاء میں قرض کا معاملہ از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب:۔ اشیاءربویہ میں خرید و فروخت کے معاملہ کے وقت کمی زیادتی اور اُدھار ناجائز ہے لیکن قرض کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ قرض تبرع اور احسان ہے اس کا کچھ عوض نہیں ہوتا بلکہ مقررہ مدت کے بعد اس شے کا بدل واپس کیا جاتا ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: ان القرض تبرع الا یری انه لا یقابله عوض للحال ......کان المستقرض انتفع بالعین مُدّة ثمّ ردّ عین ما قبض وان کان یرد بدله فی الحقیقة۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳۹۶ کتاب القرض)

قال الکاسانیؒ: فیختص جوازه بماله مثل۔ (〃 〃 〃 ص۳۹۵ 〃) ؎۲

الحاصل یہ کہ قرض مثلی اشیاء میں جائز ہے۔

نقدرقم کوقسط وار کرکے زیادہ وصول کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے اپنا ٹرک ایک شخص کے ہاتھ فروخت کیا اور

؎۱ قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ویزاد فی الثمن لاجله اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة الثمن قصداً فاعتبر مالاً فی المرابحة احترازاً عن شبه الخیانة ولم یعتبر مالاً فی حق الرجوع عملاً بالحقیقة۔

(ردالمحتار ج۴ ص۱۷۷ باب الربوا)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۶ ص۱۱۵ باب المرابحة والتولیة۔

؎۲ وفی الهندیة: ویجوز القرض فیما هو من ذوات الامثال کالمکیل والموزون والعددی المتقارب کالبیض۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۲۰۱ باب فی القرض والاستقراض)

وَمِثْلُهٗ فی الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۴ ص۱۷۱ باب القرض۔

کچھ رقم نقد دے کر مشتری سے کہا کہ وہ بقایا رقم مبلغ تین ہزار روپے قسط وار ہر ماہ مجھے ادا کرتا رہے، اسی دوران ٹرک کے مالک کو رقم کی ضرورت پڑ گئی تو اس نے کسی تیسرے شخص سے چالیس ہزار روپے نقد لے کر مشتری کو اس کے حوالہ کر دیا اور اسے یہ کہا کہ وہ ستر ہزار روپے قسط وار آپ کو ادا کرتا رہے گا، یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ بائع کا مشتری کو اس طرح کسی تیسرے شخص کے حوالہ کرنا صحیح نہیں یہ بعینہٖ ربوا ہے کیونکہ اس صورت میں تیسرا شخص چالیس ہزار روپے نقد دے کر ستر ہزار قسط وار وصول کرے گا تیس ہزار روپے اس کو سود کے مل رہے ہیں اس لیے یہ معاملہ شرعاً ناجائز و حرام ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) [1]

مضاربت کا منافع سُود نہیں

سوال:۔ میرے بھائی نے مجھ سے بیس ہزار روپے کاروبار کے لیے اس شرط پر لیے کہ اس پر جو منافع ہو گا اس کا نصف آپ کا اور نصف میرا ہو گا، اس نے یہ بھی مجھ سے کہا کہ میں ہر ماہ حساب کتاب نہیں کر سکتا اس لیے اندازہ اور تحری سے حساب لگا کر منافع دے دیا کروں گا، اس طرح وہ مجھے کبھی ۱۰۰ روپے اور کبھی ۳۰ روپے دیتا رہا اور اس میں کمی بیشی ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیتے ہیں، کچھ عرصہ کے بعد مجھے تردد ہوا کہ یہ تو سود ہے اس لیے میں نے بھائی سے اس سلسلہ کو ختم کرنے کی بات کی، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کا کاروبار شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ سودی معاملہ نہیں ہے بلکہ مضاربت کی ایک صورت ہے اور نفع کو تحری سے معلوم کرنا مفضی الی الجہالۃ نہیں ہے اس لیے یہ صورت جائز ہے، مضاربت میں ایسی شرط لگانا جو جہالت فی الربح کا باعث ہو ناجائز ہے۔

کما نقل الشیخ علاؤ الدین بن محمد الحصکفیؒ من الجلالیۃ: کل شرط یوجب جہالۃ

---

[1] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: وقد نہی الرسول علیہ السلام عن قرض جرّ نفعاً۔ (الہدایۃ ج۳ ص۱۳۱ کتاب الحوالۃ)

ومثلہٗ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۸۵ کتاب الحوالۃ۔

فی الربح او بقطع الشرکۃ فیہ یفسدھا والا بطل الشرط وصح العقد اعتبارًا بالوکالۃ ۱ھ

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۵۴۰ کتاب المضاربۃ) لہ

بینک ڈرافٹ کی شرعی حیثیت

سوال :۔ آجکل لوگ بینک کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ڈرافٹ کی شکل میں رقم بھیجتے ہیں جس پر بینک والے بھیجی جانے والی رقم سے کچھ زیادہ وصول کرتے ہیں، کیا یہ سود ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بینک کے ذریعے ڈرافٹ کی شکل میں رقم ارسال کرنا بینک کو قرض دینا ہے امانت نہیں، کیونکہ رقم بدلتی بھی ہے اور ضائع ہونے کی صورت میں بینک ذمہ دار بھی ہوتا ہے اس لیے زیادتی کی شرط سود ہے البتہ اس میں یہ تاویل کرنا ممکن ہے کہ زیادتی رقم کو کتابت اور فارم وغیرہ کی فیس قرار دیا جائے، اس طرح سفتجہ کی شکل بن جائے گی جس کو فقہاء کرام نے مکروہ کہا ہے ، ابتلائے عام کی وجہ سے اس میں جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے کیونکہ پوری دنیا میں یہ طریقہ رائج ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے "امداد الفتاوی" میں منی آرڈر کے بارہ میں یہی تحقیق کی ہے۔ ۲ھ

لہ وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : الرابع ان یکون الربح بینھما شائعًا کالنصف والثلث لاسھمًا معینًا یقطع الشرکۃ کمائۃ درھم الخامس ان یکون نصیب کل منھما معلومًا فکل شرط یؤدی الی الجھالۃ الربح فھی فاسدۃ وما لا فلا۔ ۱ھ

(البحر الرائق ج۷ ص۲۶۴ کتاب المضاربۃ)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۴ ص۲۸۷ کتاب المضاربۃ - الفصل الاول۔

۲ھ قال العلامۃ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ : منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے، ایک قرض جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرا اجارہ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دی جاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے ، اور چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے اس لیے یہ تاویل کرکے جواز کا فتویٰ مناسب ہے۔

(امداد الفتاوی ج۳ ص۱۴۶ کتاب الربوا)

ڈاکخانہ میں جمع شدہ رقم پر منافع لینے کا حکم

سوال :۔ ڈاک خانہ میں جو رقم جمع کی جاتی ہے، سال بعد اس پر نفع ملتا ہے، اس نفع کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب :۔ جس طرح بینک سے سود لینا منع ہے اسی طرح ڈاک خانہ میں جمع شدہ رقم پر منافع (سود) لینا بھی منع ہے، سود کی حقیقت جہاں بھی پائی جائے وہ حرام ہوگی۔

قال الله تعالیٰ : احل الله البیع وحرم الربوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) [۱]

بیع محاقلہ ربٰو (سود) میں داخل ہے

سوال :۔ جو گیہوں ابھی بالیوں میں موجود ہو اُس کو صاف کئے ہوئے گیہوں کے عوض فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ جن چھ چیزوں کے تبادلہ میں برابری، نقد قیمت اور دست بدست ہونا ضروری ہے اُن میں گندم بھی داخل ہے، اس کے تبادلہ کے وقت جب جنس ایک ہو تو کمی بیشی یا ادھار سود شمار ہوگا، کھیت میں کھڑی گندم کی فصل کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض فروخت کرنا بیع محاقلہ ہے جبکہ بیع محاقلہ ربوٰ (سود) میں داخل ہے، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے۔

لما قال العلامۃ برهان الدین المرغینانی رحمہ اللہ : نهی عن المزابنۃ والمحاقلۃ فالمزابنۃ ما ذکرنا والمحاقلۃ بیع الحنطۃ فی سنبلها بحنطۃ۔

(الهدایۃ ج۳ ص۵۶ باب بیع الفاسد) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانیؒ : وقد نهی الرسول علیہ السلام عن قرضٍ جرّ نفعًا۔ (الهدایۃ ج۳ ص۱۳۱ کتاب الحوالۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۴۴ کتاب الحوالۃ۔

[۲] قال العلامۃ ابن الهمامؒ : نهی رسول الله عن المزابنۃ والمحاقلۃ۔

(فتح القدیر ج۶ ص۵۳ باب بیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۷۶ باب بیع الفاسد۔

پی ایل ایس (غیر سودی کھاتہ)

سوال: آج کل لوگ بینکوں میں پی ایل ایس کے نام سے اکاؤنٹ کھولتے ہیں، کیا اس کھاتہ میں رقم جمع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بینکوں کے تمام معاملات سود سے منسلک ہیں، حکومت نے سود سے بچنے کے لیے نفع نقصان کے نام سے یہ شاخ کھولی ہے لیکن اس کا صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا مشکوک ہے، اگرچہ حکومت اور بینکوں کی انتظامیہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں سودی عنصر نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ پی ایل ایس میں بھی اکاؤنٹ نہ کھولا جائے، احتیاط اسی میں ہے اس لیے کہ سود بہت بڑا گناہ ہے بشبہ سود اس میں ترک ہی بہتر ہے۔

لما اخرجه الامام ابوداؤدؒ: لما لعن رسول الله آکل الربوا ومؤکلہ وکاتبہ و شاھدیہ و قال وھو سواء۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۴۷۳ باب الربٰو) [1]

انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: آجکل پرائز بانڈز پر انعامات ملنے کا رواج عام ہے، کیا ایسا انعام لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: پرائز بانڈز (انعامی بانڈز) سود اور قمار (جوا) کی مثل ہیں، حکومت کے بجٹ میں جب بھی خسارہ ہوتا ہے تو اس کو پورا کرنے کے لیے مختلف حیلے بہانے اختیار کرتی ہے، انعامی بانڈز بھی حکومتی بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، خرید شدہ بانڈز کی قیمت پر سود لگتا ہے اور جو سود بنتا ہے اس کو قرعہ اندازی کے ذریعے جوا بنا دیا جاتا ہے، چند افراد کے نام ہی قرعہ نکلتا ہے اور باقی فی الحال محروم رہ جاتے ہیں، لہٰذا سود اور قمار کی وجہ سے ان بانڈز کی خرید وفروخت اور ان پر نکلا ہوا

---

[1] کما ورد فی الحدیث: عن جابر رضی الله عنه قال لعن رسول الله (صلی الله علیه وسلم) اکل الرّبوٰا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال وھو سواء۔

(مسلم شریف ج ۲ ص ۲۷ باب الربٰو)

وَمِثْلُہٗ فی الترمذی ج ۱ ص ۲۲۹ باب ما جاء فی اکل الربٰو، ابواب البیوع۔

انعام لینا شرعاً جائز نہیں۔

قال اللہ تعالیٰ: (۱) اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (البقرۃ ۲۷۵)

(۲) اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ۔ (المائدۃ ۹۰) [1]

مروجہ کرنسی نوٹوں کے تبادلہ میں مساوات شرط ہے

سوال:۔ ایک ملک کی کرنسی یعنی نوٹوں کے تبادلہ میں کمی زیادتی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آجکل دنیا میں رائج الوقت کرنسی نوٹوں کی حیثیت ثمنِ عرفی کی ہے جن کو ہم فلوس نافقہ کہہ سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک فلوس نافقہ کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ اس لئے ان کے ہاں ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ باہمی کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔

لیکن امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں، اس لیے کہ آجکل پوری دنیا میں کاغذی کرنسی کا رواج ہے، سونا چاندی بالکل مبیعہ ہوکر رہ گئی ہے، اگر اس کے تبادلہ میں تفاضل کی اجازت دے دی گئی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا لہٰذا امام محمدؒ کے قول کے مطابق کرنسی نوٹوں کے تبادلہ میں تفاضل کو ناجائز قرار دینا چاہیئے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قولہ فلس بفلسین ھذا عندھما وقال محمدؒ لایجوز۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۱۱۸ باب الربوٰ) [2]

دارالحرب میں کسی غیر مسلم سے سود لینا منع ہے

سوال:۔ کیا مسلمان کے لیے دارالحرب میں کسی غیر مسلم سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: ولاخلاف بین اھل العلم فی تحریم القمار وان المخاطرۃ من القمار۔ (الاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۲۹ البقرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص ۱۳۱ کتاب الحوالۃ۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: صح بیع الفلس بفلسین معینین عندھما وقال محمد لایجوز۔ (البحرالرائق ج ۶ ص ۱۳۱ باب الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۳ ص ۱۱۸ الباب الربوٰ، الفصل السادس فی تفسیر الربوٰ واحکامہ۔

الجواب: امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود لینے کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن سود کی حرمت کے بارے میں قرآن وحدیث میں نصوص مطلق ہیں، جس سے ہر جگہ سود کی حرمت معلوم ہوتی ہے، جمہور علماء اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دارالحرب میں کسی بھی غیر مسلم سے سود لینا حرام ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود نہ لیا جائے۔

قال الامام المرغینانیؒ: ولا بین المسلم والحربی فی دار الحرب خلافاً لابی یوسفؒ والشافعیؒ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۸۲ باب الربٰو) [۱]

دارالاسلام میں کسی بھی غیر مسلم سے سود لینا جائز نہیں

سوال: دارالاسلام میں جو غیر مسلم ذمی رہتے ہیں اور دیگر کفار جب مالِ تجارت وغیرہ لے کر کچھ عرصہ کے لیے آئیں تو اُن سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قرآن وحدیث میں مطلقاً سود کی حرمت مذکور ہے، اور فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ کسی ذمی غیر مسلم سے سود لینا منع ہے، اس لیے دارالاسلام میں کسی غیر مسلم سے سود لینا ناجائز ہے۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: بخلاف المستأمن منھم لان مالہ صار محظوراً بعقد الامان۔ (الھدایۃ ج۳ ص۸۲ باب الربٰو) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ای لاربا بینھما فی دار الحرب عندھما خلافاً لابی یوسفؒ۔
(البحر الرائق ج۶ ص۱۳۵ باب الربٰو)

لما قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللہ: وقال ابویوسفؒ والشافعیؒ لا یجوز لان المسلم التزم بالامان ان لایتملک اموالھم الا بالعقد۔
(تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربٰوا)

[۲] قال العلامۃ ابن الھمامؒ: بخلاف المستأمن منھم عندنا لان مالہ صار محظوراً بالامان۔ (فتح القدیر ج۶ ص۱۷۸ باب الربٰو)
ومثلہٗ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربٰو۔

تفسیر عبارت لاربا بین المسلم والحربی

سوال: فقہ حنفی کی کتابوں میں صراحتاً مذکور ہے: ولاربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دار الحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا جائز ہے، براۓ مہربانی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب: اوّل تو اس میں اختلاف ہے، جمہور علماء اور امام ابویوسفؒ، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ اور پیش کردہ عبارت کا مطلب ومفہوم یہ ہے کہ دار الحرب میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین سرے سے سود کا تحقق ہی نہیں ہوتا کیونکہ حربی کا مال مباح اُسے کسی بھی طریقے سے حاصل کیا جائے تو وہ جائز ہوتا ہے، اس لیے فقہاء کرام اس عبارت کی تشریح میں فرماتے ہیں: ولان مالهم مباح فی دارهم فبای طریق اخذه المسلم اخذ مالاً مباحاً اذلم یکن فیه غدر۔ فقہاء کرام نے اس کے لیے لفظ جواز استعمال نہیں کیا، حدیث میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔

قال العلامه برهان الدین المرغینانیؒ: لاربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ (الهدایة ج ۳ ص۸۷ باب الربوٰ) [1] یہاں بھی ربوٰ (سود) کی نفی ہے

پراویڈنٹ فنڈ اور سود کا مسئلہ

سوال: ہر سرکاری ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ حکومت تنخواہ کا کچھ حصہ وضع کرتی رہتی ہے پھر سال کے بعد اس رقم پر سود لگتا ہے، اختتام ملازمت (ریٹائرمنٹ) پر حکومت یہ ساری جمع شدہ رقم ملازم کو مع سود کے ادا کر دیتی ہے، اس رقم کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: حکومت کی طرف سے سرکاری ملازم کو جو رقم اختتام ملازمت کے وقت ملتی ہے وہ شرعاً سود نہیں کیونکہ سود دو آدمیوں کے مابین عقد ہوتا ہے جبکہ دونوں طرف سے مال ہو اور مال ان کا مملوک ہو، مسئلہ مذکورہ میں ملازم کی تنخواہ سے جو

---

[1] قال الامام ابن الهمامؒ: ولان مالهم مباح واطلاق النصوص فی مال محظور وانما یحرم علی المسلم اذا کان بطریق الغدر فاذا لم یاخذ غدراً فبای طریق یأخذه حل بعد کونه برضا۔ (فتح القدیر ج ۶ ص۱۷۸ باب الربوٰ)
ومثله فی تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربوٰ۔

رقم کٹتی ہے وہ ملازم کی ملک نہیں ہوتی۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں: قوله بل بالتعجيل او بشرطيه او بالاستفهاء او بالتمكن اى لا يملك الاجرة الا بواحد من هذه الاربعة۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۰۰) اس رقم پر ابھی مالک کا قبضہ نہیں ہوا اور نہ ہی اسکے وکیل نے قبضہ کیا ہے، اس کے تصرفات اس میں نافذ نہیں، ایسی رقم کے ساتھ حکومت کا معاملہ یکطرفہ ہے، اس جمع شدہ رقم کو اگر حکومت سود پر دے یا کوئی اور معاملہ کرے یا اس پر خود سود لگائے یہ سب یکطرفہ کاروائی ہے، اختتام ملازمت پر جب حکومت یہ رقم ملازم کو دے تو حکومت کی طرف سے اجرت ہی کہلائے گی، اس طرح یہ رقم اُجرت کا جزء مؤجل ہوگی نہ کہ سود۔ [1]

جی پی فنڈ کی رقم حصول سے قبل کسی کمپنی یا بینک کو سود پر دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی سرکاری ملازم درخواست دے کر جی پی فنڈ کی رقم کٹتی کمپنی یا بینک کے حوالے کرکے اس پر سود حاصل کرے تو اس سودی رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ کوئی بھی سرکاری ملازم اگر درخواست دے کر اپنے جی پی فنڈ کی رقم کسی بینک یا بیمہ کمپنی کے حوالہ کردے تو وہ کمپنی اس کی وکیل بن جائے گی، وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہوتا ہے للہٰذا کمپنی وکیل کے اعتبار سے جتنا سودی کاروبار کرے گی وہ ایسا ہوگا جیسے یہ خود اس میں ملوث ہے، کیونکہ ملازم نے با اختیار خود یہ رقم کمپنی کے حوالہ کی ہے، یہ سودی رقم دوبارہ حکومت کے خزانہ میں جاکر جمع ہوجاتی ہے، اختتام ملازمت پر جب یہ رقم ملازم کو ملے گی تو سودی رقم ہوگی اس کو وہ شرعاً اپنے مصرف میں نہیں لاسکتا۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: وقد نهى الرسول عليه السلام عن قرض جر نفعاً۔ (الهداية ج۳ ص۱۳۱ كتاب الحوالة) [2]

---

[1] قال الشيخ المفتى محمد شفيع الديوبنديؒ: جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود کے نام پر رقم ملتی ہے وہ شرعاً سود نہیں بلکہ اُجرت (تنخواہ) ہی کا ایک حصہ ہے۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص۲۰)

وَمِثْلُهٗ فى امداد الفتاوىٰ ج۳ ص۱۴۸ کتاب الربٰو۔

[2] قال الشيخ المفتى محمد شفيع الديوبنديؒ: اگر بینک یا کمپنی وغیرہ اس رقم پر کچھ سود دے تو یہ شرعاً بھی سود ہوگا جس کا لینا ملازم کے لیے قطعاً حرام ہوگا۔

(پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص۲۶)

ملازم کی اجازت سے اس کی تنخواہ سے پراویڈنٹ فنڈ کی کٹوتی کا حکم

سوال: کوئی بھی سرکاری ملازم جب اپنی تنخواہ سے بلاجبر واکراہ اپنی مرضی سے کچھ رقم کٹوائے اور وہ جمع ہوتی جائے تو اختتامِ ملازمت (ریٹائرمنٹ) کے وقت اس جمع شدہ رقم کے ساتھ حکومت کی طرف سے جو مزید رقم دی جاتی ہے از روئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اس صورت میں پراویڈنٹ فنڈ کے ساتھ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مزید رقم تشبہ بالربوٰ ہے، اگرچہ ملازم اپنی اُجرت وصول کرنے سے قبل یہ رقم کٹواتا ہے لیکن پھر بھی اپنی اجرت میں تصرف ہے اور سود خوری کا ذریعہ بننے کا قوی احتمال ہے لہٰذا ایسی رقم سے اجتناب ہی کیا جائے خواہ محکمہ سے وصول کرے یا نہ کرے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: کل قرض جرّ نفعاً حرام اذا کان مشروطاً۔
(رد المحتار ج ۵ ص ۱۶۶ باب الربوٰ۔ مطلب کل قرض جرّ نفعاً حرام)[1]

گاڑی دلوانے کے عوض اصل رقم سے زائد کا مطالبہ کرنا سود ہے

سوال: آجکل ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں یہ رواج ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو اپنے پیسوں سے گاڑی خرید کر دیتا ہے اور اس سے یہ اقرار نامہ تحریر کراتا ہے کہ سال یا دو سال کے بعد دو لاکھ کی جگہ تین لاکھ دے گا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کاروبار کی مذکورہ صورت سودی ہے اسلئے کہ گاڑی خریدنے والا مشتری کا وکیل ہے اور گاڑی کی رقم مشتری کے ذمے قرض ہے جبکہ قرض پر منافع لینا شرعاً ربوٰ (سود) ہے البتہ یہ جائز ہے کہ پہلے گاڑی اپنے لیے خریدے اور پھر تین لاکھ روپے میں مشتری پر فروخت کر دے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کل قرض جرّ نفعاً حرام۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۵ ص ۱۶۶ فصل فی القرض)[2]

---

[1] قال الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ: پراویڈنٹ فنڈ میں رقم اپنے اختیار سے کٹوائی جائے تو اس میں تشبہ بالربوٰ بھی ہے اور ذریعہ سود بنا لینے کا خطرہ بھی ہے اسلئے اس سے اجتناب کیا جائے۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص ۴)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۲۵۴ کتاب الحوالۃ۔

[2] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: القرض الذی جرّ منفعۃ قال الحنفیۃ فی الراجح عندھم کل قرضٍ جرّ نفعاً حرامٌ اذا کان مشروطاً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۴ ص ۷۲۴ فصل فی القرض)

انعامی اسکیموں کا حکم

سوال:۔ لکی انعامی سکیم یا دیگر انعامی ٹکٹوں کا کاروبار کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اس میں ملنے والے انعام کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس قسم کی انعامی سکیموں پر جوئے کی تعریف صادق آتی ہے اسلئے لکی انعامی سکیم یا دیگر کسی بھی قسم کی انعامی ٹکٹوں کا کاروبار شرعاً جائز نہیں اور اس سے ملنے والی انعامی رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: اكتسب حراماً واشترى به..... تصدق بالربح والّا لا وهذا قياس وقال ابوبكر كلاهما سواء ولا يطيب له۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۲۱۹ مطلب اذا اكتسب حراماً ثم كثار) [۱]

غیر ملکی کرنسی کو اضافی قیمت پر خریدنا

سوال:۔ آجکل غیر ملکی کرنسی کی خرید وفروخت کا کاروبار عام ہے، تاجر لوگ غیر ملکی کرنسی کم قیمت پر خرید کر زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں، مثلاً سعودی ریال ۱۳ روپے میں خرید کر ۱۵ روپے میں فروخت کیا جاتا ہے۔ تو کیا اس طرح غیر ملکی کرنسی کی خرید و فروخت سود میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سود متحقق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اشیاء ایک ہی جنس سے ہو، اگر جنس مختلف ہو جائے تو ان میں تفاضل (یعنی) جائز ہے۔ موجودہ دور میں مختلف ممالک کی کرنسی مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے، اس لیے ان کی خرید وفروخت میں کمی بیشی جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ایک سعودی ریال ۱۳ روپے میں خرید کر ۱۵ روپے میں فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابوالحسن القدوريؒ: فاذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم اليه حل التفاضل والنساء واذا وجد حرم التفاضل والنساء واذا وجد احدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء۔ (مختصر القدوري على صدر اللباب ج۱ ص۱۲۱ باب الربوٰ)

---

[۱] وفي الهندية: لان المال بمقابلة المعصية فكان الأخذ معصية والسبيل في المعاصى ردها وذلك ههنا برد المأخوذ ان تمكن من رده بان عرف صاحبه وبالتصدق به ان لم يعرفه۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۵ ص۳۴۹ الباب الخامس عشر في الكسب۔ كتاب الكراهية)

بینک کی تعمیر کے لیے زمین دینا

سوال:۔ بینک بنانے کے لیے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو قیمتاً دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حکومت کو بینک بنانے کے لیے زمین دینے سے اجتناب کرنا چاہیئے، کیونکہ زمین دینے والے کو زمین کے عوض سود سے حاصل شدہ رقم ملے گی۔ اور دوسرا یہ کہ بینک کا موجودہ نظام اندرون ملک و بیرونِ ملک بڑے بڑے سودی کاروباروں میں پھنسا ہوا ہے جبکہ زمین دینے کی صورت میں اعانت علی المعصیت لازم ہے، پس جس طرح سود سے اجتناب ضروری ہے اسی طرح سودی نظام کو سہارا دینا بھی مناسب نہیں۔ اس بناء پر حکومت کو بینک کے لیے زمین دینے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال الله تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۲) [1]

پرانے کرنسی نوٹ نئے نوٹوں کے ساتھ کم قیمت پر تبدیل کرنا

سوال:۔ پرانے کرنسی نوٹوں کی تبدیلی کے لئے طریقۂ کار یہ ہے کہ جب کوئی شخص پھٹے پرانے نوٹ نئے نوٹوں سے تبدیل کرنا چاہتا ہے تو بینک اس سے کچھ کٹوتی کرتا ہے۔ مثلاً سَو روپے کے پھٹے پرانے نوٹ کے بدلے میں نئے نوٹ پانچ یا دس روپے کم ملتے ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب:۔ مروّجہ کرنسی کی حیثیت فلوس نافقہ کی ہے اس میں صفت ثمنیت عرف کی وجہ سے آئی ہے۔ فلوس نافقہ کی باہمی تفاضل کے ساتھ بیچنے میں احناف کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے ہاں ان کی باہمی بیع تفاضل کے ساتھ جائز ہے۔ جبکہ امام محمدؒ کے ہاں جائز نہیں۔ اگرچہ عمومی طور پر ربا (سود) سے بچنے کے لئے فی زمانا امام محمدؒ کا قول مفتی بہ ہے مگر پھٹے پرانے نوٹوں کا بینک کے ساتھ تبادلے میں کافی پیچیدگیاں ہیں۔

---

[1] قال العلامۃ سلطان بن علی القاری رحمہ اللہ: عن جابرؓ قال لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ قال النواوی فیہ تصریح بتحریم کتابۃ المترابیین والشھادۃ علیھما وبتحریم الاعانۃ علی الباطل وقال ھم سواء۔

(المرقاۃ ج۶ ص۵۹ باب الربٰوا۔ الفصل الاول)

ومثلہٗ فی الجامع الصغیر ص۴۲۹ باب الربٰو۔

لہٰذا ان پیچیدگیوں کی وجہ سے شیخین کے فتویٰ کی بنا پر پھٹے پرانے نوٹوں کو نئے نوٹوں کے ساتھ کمی بیشی پر تبدیل کرنا جائز ہے۔

کما قال العلامۃ مرغینانیؒ: ویجوز بیع الفلس بالفلسین بأعیانھما عند أبی حنیفۃؒ وأبی یوسفؒ وقال محمدؒ لایجوز الخ۔ (الھدایۃ علی صدر البنایۃ ۱۰/۲۱۷ کتاب البیوع۔ باب الربا)

زمین کا زمین سے تبادلہ جائز ہے

سوال: ایک شخص اپنی زمین کا مخصوص حصہ دوسرے شخص کو زمین کی معینہ مقدار کے عوض دیتا ہے تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ اموالِ ربویہ میں زیادتی اس وقت حرام ہے جب جنس اور قدر ایک ہو ورنہ کسی ایک کی موجودگی میں تفاضل جائز ہے لہٰذا زمین کا زمین کے عوض فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: سئل فیما اذا کان لزید قطعۃ ارض جاریۃ فی ملکہ فباعہ من عمرو بقطعۃ ارض مثلھا بیع مقائضۃ بیعًا باتا شرعیًا مسلّمًا لدی بینۃٍ شرعیۃ فھل صح البیع المزبور۔ الجواب نعم۔

(تنقیح الفتاوی الحامدیۃ ج ۱ ص۲۶۴ کتاب البیوع) [1]

گندم اور مکئی کا تبادلہ

سوال:۔ گندم اور مکئی کا تبادلہ کبھی برابر اور کبھی کبھار کمی بیشی سے کیا جاتا ہے، اسی طرح کبھی دست بدست اور کبھی اُدھار سے معاملہ طے ہوجاتا ہے، کیا اس طریقہ سے گندم اور مکئی کا تبادلہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گندم اور مکئی کا تبادلہ اگر دست بدست ہو تو جائز ہے خواہ ایک کم اور دوسرا زیادہ کیوں نہ ہو لیکن اُدھار درست طریقہ نہیں کیونکہ دونوں قدر میں متحد اور جنس میں مختلف ہیں اس لیے ادھار پر بیچنے سے اجتناب کیا جائے۔

---

[1] قال محمد خالد الاتاسیؒ: بیع المقایضۃ بیع العین بالعین ای مبادلۃ مالٍ بمالٍ غیر النقدین ثم ان اتفقا جنسًا وقدرًا اشترط لصحتھا تساوی البدلین وتعینھما۔

(شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۲۲ ج ۲ ص۱)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص۱۲۸ تحت قولہ والنساء فقط بأدائھما۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والاصل فیه الاباحة واذا وجد حرم التفاضل والنساء لوجود العلة واذا وجد احدهما وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النساء مثل ان یسلم هرویا فی هروی وحنطة فی شعیر فحرمة ربا الفضل بالوصفین وحرمة النساء باحدهما۔ (الهدایة ج ۳ ص ۸۱ باب الربوٰ) ؎۱

فصل کے بدلے اناج دینا

سوال:۔ ایک شخص کو غلّہ کی ضرورت ہے لیکن فصل ابھی تیار نہیں ہوئی، ایسی حالت میں اگر وہ کسی سے تیار غلہ خرید کر اس کے عوض کھیت میں کھڑی فصل دے دے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسی صورت میں تیار غلّہ کے بدلے میں وہ غلّہ لیا جاتا ہے جو کہ کھیت میں ہے اور اس کی مقدار معلوم نہیں صرف تخمیناً اس کا اندازہ کرکے فروخت کیا جاتا ہے، چونکہ غلہ کی غلّہ کے بدلے فروخت میں مقدار معلوم کرنا ضروری ہے ورنہ اس میں ربٰوا (سود) کا شبہ باقی رہتا ہے اس لیے مذکورہ صورت تبادلہ کی جائز نہیں۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا یجوز..... بیع المزابنة ..... والمحاقلة فالمزابنة ماذکرنا والمحاقلة بیع الحنطة فی سنبلها بحنطة مثل کیلها خرصاً ولانه باع مکیلاً بمکیل من جنسه فلا یجوز بیع بطریق الخرص کما اذا کان موضوعین علی الارض۔ (الهدایة ج ۳ ص ۵۴ باب ما یجوز وما لا یجوز) ؎۲

؎۱ قال السلیم رستم باز اللبنانیؒ: بیع المقایضة بیع العین بالعین ای مبادلة مال بمال غیر النقدین وشرط صحة المقایضة التساوی فی التقایض ان اتفقا جنساً وقدراً کبیع حنطة بحنطة والا فالتقایض لا التساوی کبیع کر حنطة بکری شعیر۔

(شرح المجلة تحت المادة ۱۲۲ ص ۱۴ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۱۲۸ باب الربوٰ۔

؎۲ قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: والمزابنة ای لم یجز بیع المزابنة لنهیه صلی اللہ علیه وسلم عن بیع المزابنة والمحاقلة۔ والمحاقلة بیع الطعام فی سنبله بالبرّ۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۷۶ تحت قوله والمزابنة۔ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۶ ص ۵۴ باب البیع الفاسد۔

سونا چاندی قرض کی صورت میں زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر زرگر (سنار) حضرات سونا اور چاندی گاہک کو نقد مثلاً ۶۰۰/- روپے فی تولہ دیتے ہیں اور اگر قرض پر دیں تو ۶۵۰/- روپے فی تولہ دیتے ہیں، تو کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ باحوالہ جواب تحریر فرمائیں؟

الجواب:- موجودہ کرنسی نوٹ نہ سونے چاندی کی طرح ثمن خلقی اور نہ سونے چاندی کی رسید بلکہ قانونی تحفظ اور تقرر کی بناء پر ثمن عرفی یعنی فلوس نافقہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جو جنسیت میں سونے چاندی سے الگ ہے، اسی طرح سونا چاندی مقدوری ہے، بخلاف موجودہ کرنسی کے کہ وہ عددی ہے، اس لیے دونوں کی باہمی تجارت تفاضل اور ادھار دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ احدالعوضین (دونوں میں سے کسی ایک پر قبضہ ہو چکا ہو۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں سونے چاندی کو نقد ۶۰۰/- روپے فی تولہ اور ادھار کی صورت میں ۶۵۰/- روپے فی تولہ فروخت کرنا جائز ہے مگر عندالعقد سونے چاندی پر مشتری کا قبضہ کرنا صحتِ بیع کے لیے ضروری ہے بدوں اس کے بیع صحیح نہیں ہوگی۔

لما قال العلامۃ مفتی محمد تقی عثمانی: لیکن اس زمانے میں علماء اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو ان کاغذی نوٹوں کو ثمن عرفی کے طور پر مال قرار دیتی تھی۔
(فقہی مقالات جلد ۱ ص۲۳ دنیا کے کرنسی نظام میں... الخ)

وقال ایضاً: اسی طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے اور اب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ (فقہی مقالات جلد ۱ ص۲۱)

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: باع فلوساً بمثلها او بدراهم او بدنانیر فان نقد احدهما جاز وان تفرقا بلا قبض احدهما فلا یجز۔

(الدر المختار ج ۴ ص۲۰۴ باب الربوٰ، مطلب فی استقراض الدراهم)

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئۃ فاجاب بانه یجوز اذا قبض احد البدلین۔

(ردالمحتار ج ۴ ص۲۰۵ باب الربوٰ، مطلب فی استقراض الدراهم)

اسٹیٹ لائف کمپنی کی دجل وتلبیس

اور

بیمہ کی شرعی حیثیت پر دارالعلوم حقانیہ کا اصل فتویٰ

سودی نظام کی محافظ حکومت اور ایک بیمہ کمپنی کی دجل وتلبیس کا تازہ شاہکار ذیل کا وہ جعلی فتویٰ ہے جو انہوں نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی حضرت مولانا محمد فرید مدظلہ سے منسوب کر کے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے، جس پر مفتی صاحب موصوف کے دستخط اور فتویٰ نمبر دونوں جعلی ہیں۔

استفتاء کے جواب میں مفتی صاحب سے منسوب جعلی فتویٰ کی عبارت درج ذیل ہے:۔

جواب:۔ ”ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ دینی مسائل گذشتہ اوقات بدلتی سے بدلتے ہیں برصغیر کی اکثریت جن علماء کی پیروی کرتی ہے اکثر کا فتویٰ بیمہ کو جائز قرار دیتا ہے۔

اس بات میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ شراکت کا مسئلہ بظاہر قابل اعتراض نہیں ہے پس اگر بیمہ کمپنی ان رقوم سے تجارت، صنعت، خدمات اور دیگر شعبوں میں ممبران کو منافع کی شکل میں کچھ نہ کچھ دیتی ہے تو قابل اعتراض نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ سائل نے اپنی غیر مقدمی تحریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے یہ سچ ہے کہ تمام حوالہ جات (اشارہ) وہ مشہور اور تسلیم شدہ حقائق ہیں اور اس میں کسی بحث وتمحیص کی گنجائش نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار وافتراق سے بچنے کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک اسلامی ملک میں رہتے ہوئے اس کو بار بار پیچیدہ مسئلہ نہ بنایا جائے۔ الغرض سود سے مراد وہ رقم ہے جو قرض دی جائے یا لی جائے“۔

اہل علم، قارئین اور حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ اور ان کے طرز تحریر سے واقف حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ جعلی فتویٰ کی یہ عبارت کس قدر بیہودی اور جہالت پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کا اصل فتویٰ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے ماہنامہ الحق میں شائع ہوچکا ہے ذیل میں وہی فتویٰ دوبارہ نذر قارئین ہے تاکہ سودی نظام کی محافظ حکومت کا شرمناک کردار اور بیمہ کمپنی کی جعل سازی اور دجل وفریب بے نقاب ہوجائے۔ (مرتب)

بیمہ زندگی کی شرعی حیثیت

سوال : یہاں پر تمام ملک (انگلینڈ) میں ایسی کمپنیاں ہیں، جو کہ آدمی کو انشورنس (بیمہ) کرکے اس سے جوان سے کے قواعد کے مطابق خرچ ہوتا ہے وہ لے کر اس کو اس کے بعد اس معینہ مدت کے اندر یہ ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر اس کو کچھ ہو جائے تو اس کو ایک اچھی خاصی رقم جتنی کہ اس طرح کی پالیسی کرتے وقت عائد ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے باقیماندہ وارثوں کو دے دیتے ہیں اس کے علاوہ یہاں پر کام بھی جب ہی ملتا ہے کہ یہاں کے گورنمنٹ کے قانون کے مطابق انشورنس پہلے کرنی پڑتی ہے۔ آپ از راہ کرم اس کے متعلق پوری تفصیل لکھیں کہ اسلامی قوانین اس قسم کی چیزوں کے کرنے پر کسی طرح کی خلاف ورزی کرنی پڑتی ہے۔ امید ہے آپ اس کی پوری تحقیق کرکے ہمیں اچھی طرح آگاہ کریں گے۔ ہماری کمیٹی کی طرف سے آپ تمام بزرگوں کو سلام مسنون قبول ہو۔

الجواب : ہمارے علم کی حد تک بیمۂ زندگی کی جو کچھ حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ یہ بیمہ اشخاص اور کمپنیوں کے درمیان ایک خاص قسم کا معاملہ اور عقد ہے جس میں افراد اور کمپنیوں کے مابین ان کے قوانین کے تحت حسب ذیل چند امور طے پاتے ہیں۔

(۱) بیمہ دار شخص ایک معین مقدار کی رقم (مثلاً ایک ہزار روپیہ) معینہ مدت مثلاً ایک سال یا دو سال تک بالاقساط ادا کرتا ہے۔ اور کمپنیاں اس کو معینہ منافع سالانہ پیش کرتی ہیں۔

(۲) یہ رقم کمپنیاں جس کام میں چاہیں صرف کر لیتی ہیں، خواہ وہ کام جائز ہوں جیسے عمارات وغیرہ) یا ناجائز ہوں جیسے سودی لین دین کے معاملات۔

(۳) بیمہ شدہ شخص اگر معینہ مدت تک بقید حیات رہے۔ اور پوری معین رقم بالاقساط اس نے کمپنی کو ادا کر دی زرہ کمپنی سے یکمشت بالاقساط مجموعہ رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ مقررہ مدت سے پہلے مر جائے۔ تو زر بیمہ کا مستحق اس کے ورثاء میں سے وہ شخص ہوگا۔ جو اس نے نامزد کیا ہو۔

(۴) بالفرض اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے قبل اقساط کی ادائیگی کو بند کر کے عقد بیمہ کو فسخ کرنا چاہے، تو جتنی رقم اس نے بالاقساط کمپنی کو ادا کی ہے۔ اس کو وہ رقم واپس نہیں ملے گی۔"

اگر درحقیقت "بیمۂ زندگی" کی حقیقت یہی ہو جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ تو اس کو ہم درج ذیل وجوہ کی بنا پر ناجائز اور حرام سمجھتے ہیں۔

وجہ اول : پہلی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں ایک طرف سود پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ کمپنی اس کو سالانہ

معینہ منافع پیش کرتی ہے۔ نیز معینہ مدت تک زندہ رہنے۔ اور تمام اقساط ادا کرنے کی صورت میں بیمہ دار شخص اقساط کی مجموعہ رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور کمپنی سے وہ اس کو یک مشت بھی لے سکتا ہے۔ اور بالاقساط بھی۔ اور یہ سود کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

وجہ۲ دوم : دوسری طرف یہ عقد میسر اور قمار پر مشتمل ہے۔ کیوں کہ اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے پہلے مر جائے تو اس صورت میں ایک خطیر رقم کا مالک وہ شخص بن جاتا ہے جو بیمہ دار شخص نے کمپنی کے سامنے نامزد کیا ہے۔ اور اس میں میسر اور قمار کا معنی پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں محض ایک امر اتفاقی کی وجہ سے کثیر رقم نامزد شدہ شخص کی ملک میں آگئی۔ جیسی میسر اور میں آجاتی ہے اور چونکہ اسلامی شریعت نے سود اور قمار کو قطعی طور حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا بیمہ کا یہ مقصد بھی ان دونوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے قبل عقد بیمہ کو فسخ کر کے اقساط کی ادائیگی کو روکنا چاہے۔ تو اس صورت میں کمپنی اس تمام رقم کی مالک قرار پائے گی۔ جو اقساط کی صورت میں اس نے کمپنی کو ادا کی ہے۔ اور یہ بھی میسر اور قمار ہے۔

وجہ۳ سوم : عقد بیمہ کے ناجائز اور حرام ہونے کے لیے تیسری وجہ یہ ہے کہ اس بیمہ دار شخص کی موت کی صورت میں کمپنی کو اس کی ادا کردہ تمام رقم کا مالک صرف وہ شخص ہوتا ہے جو اس نے نامزد کیا ہے اور باقی تمام ورثاء اس رقم سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی قانون وراثت کی رو سے اس رقم میں وہ تمام ورثاء بھی حقدار ہیں۔ جو شرعاً اس کے جائز ورثاء ہوں اس بنا پر اس عقد میں بعض تقادیر پر شرعی قانون وراثت کی صریح طور پر خلاف ورزی بھی پائی جاتی ہے۔ جو یقیناً ناجائز ہے۔

وجہ۴ چہارم : مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ اس عقد بیمہ کے حرام اور ناجائز ہونے کے لیے چوتھی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس کمپنی کے ساتھ تعاون علی الاثم والعدوان بھی پایا جاتا ہے۔ جو قرآن کریم کی رو سے یہ عمل ناجائز ہے۔ لا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ کیونکہ کمپنی نہ روئے قانون اس بات کی پابند نہیں ہے کہ اس رقم کو وہ لازماً جائز اور مباح کاموں میں صرف کرے گی۔ بلکہ وہ اس کو سودی لین دین کے معاملات میں بھی صرف کر سکتی ہے۔" بہر حال شرعی قوانین اور احکام کی روشنی میں بیمہ زندگی کے بارہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر جائز عقد نہیں بلکہ حرام ہے۔"

ایک اشکال اور اس کا جواب

سوال ہو سکتا ہے کہ ہماری مندرجہ بالا معروضات پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ بیمہ زندگی کا یہ عقد اور معاملہ عقد مضاربت کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے کیوں کہ جس طرح مضاربت میں ایک طرف سے سرمایہ ہوتا ہے

اور دوسری طرف سے محنت اور منافع رب المال اور مضارب دونوں کے درمیان تقسیم ہوتے ہیں۔ اسی طرح بیمہ زندگی میں جس بیمہ شدہ شخص کی طرف سے سرمایہ ہوتا ہے اور کسی کی طرف سے محنت۔ اور منافع سرمایہ کار اور کمپنی دونوں کے درمیان شخص کیئے جاتے ہیں۔ تو کیوں نہ ہم عقد بیمہ کو مضاربت کی طرح جائز قرار دیں۔

الجواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ "بیمہ زندگی" کا معاملہ تصور جدیدہ میں سے ہے اور شریعت میں اس کے متعلق کوئی صریح نص وارد نہیں ہوئی ہے۔ اور اس قسم کے معاملات کے احکام معلوم کرنے کے لیے اس میں کوئی چارہ نہیں کہ ایسے جدید معاملات کو کسی ایسے عقد اور معاملہ سے ملحق کیا جائے جس میں شریعت نے اپنا کوئی منصوص حکم بیان کیا ہو۔ اور جس کے ساتھ یہ جدید قسم کے عقود اور معاملات زیادہ مشابہت رکھتے ہوں۔ اس طرح منصوصی معاملات اور عقود میں سے جو بھی عقد اور معاملہ ایسا مل جائے گا جس سے جدید معاملات اور عقود زیادہ مشابہ اور مطابق ہوں تو دونوں پر ایک قسم کا حکم جاری کیا جائے گا۔ مگر یہاں مصیبت یہ ہے کہ بیمہ زندگی کا الحاق عقد مضاربت سے حسب ذیل چند وجوہ سے صحیح نہیں ہے اگرچہ بظاہر دونوں کے درمیان مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک نوعیت کے معاملات اور عقود ہیں۔ اور دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیئے. جن وجوہ سے ہم اس الحاق کو صحیح تسلیم نہیں کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ بیمہ اور مضاربت میں کئی بنیادی فرق موجود ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے مثلاً مضاربت میں شرط صحت بالاجماع یہ تسلیم کی گئی ہے کہ اس میں منافع کی تقسیم نسبت کی بنیاد پر ہو۔ اور مضارب رب المال میں سے کسی ایک کو معین منافع نہیں ملیں گے بلکہ اس کا اشتراط عقد مضاربت کے لیے مفسد قرار دیا گیا ہے۔ بخلاف بیمہ کے کہ اس میں سرمایہ کار کو معین منافع (مثلاً دس فی صد سالانہ ملا کرتے ہیں اور نسبت کی بنیاد پر منافع کی تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ یعنی اس میں مضاربت کی طرح یہ نہیں ہوتا ہے کہ منافع میں سے نصف حصہ یا ثلث اور یا ربع وغیرہ کسی ایک فریق کو ملے گا۔ اور باقیماندہ منافع دوسرے فریق کو ملیں گے اس فرق کو سامنے رکھ کر اصول اجتہاد اور قوانین قیاس اس بات کے متقاضی ہیں کہ بیمہ کو مضاربت پر قیاس کر کے دونوں کا حکم ایک نہ قرار دیا جائے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بیمہ اور مضاربت میں ایک اور فرق بھی ایسا پایا جاتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ۔

مضاربت میں اگر نقصان واقع ہو تو سرمایہ کار (رب المال) کو وہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اور بیمہ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ہے۔ یہاں سرمایہ کار کو منافع ہی منافع ملتے ہیں۔ اور نقصان سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ کمپنی کو اگر کوئی نقصان پیش آجائے تو کمپنی ہی اس کا ذمہ دار ہوگی بیمہ دار شخص پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔

۳۔ پھر اس پر مزید یہ کہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار کا انتقال ہو جائے۔ تو وارثین کو صرف اتنا ہی سرمایہ مل سکتا ہے جتنا کہ دن کے مورث نے مضارب کو سپرد کیا تھا۔ اور اس سے زائد رقم ہرگز انہیں نہیں مل سکتی۔ برخلاف اس کے بیمہ میں اگر بیمہ دار شخص کا نقصان ہو جائے تو اس کی موت کے بعد جس شخص کو زر بیمہ ملنے والا ہے وہ ایک بڑی رقم یعنی زر بیمہ کا حقدار قرار دیا جاتا ہے یہ ایک ایسا مخاطرہ ہے جس سے شارع علیہ السلام نے روکا ہے۔ کیوں کہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں ہے۔ کیونکہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں ہے۔ کیوں کہ بعض اشخاص تو ایسے نکلیں گے کہ آج انہوں نے بیمہ کرایا۔ اور کل ان کے کسی وارث نے اس خطیر رقم پر قبضہ کر لیا۔ اور بعض ایسے اشخاص ہوں گے جو بیمہ کرانے کے ایک طویل مدت بعد اس رقم پر قبضہ کرنے کے حقدار ہوں گے۔

۴۔ اس کے علاوہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار مر جائے تو مضارب کے پاس اس کی جو رقم ہے وہ تمام وارثین کے مابین شرعی قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہوگی۔ اس کے برخلاف بیمہ میں اگر بیمہ دار شخص کا انتقال ہو جائے تو زر بیمہ کا مستحق صرف وہی شخص ہوتا ہے جو بیمہ دار نے نامزد کیا ہو اور باقی وارثین اس میں اصلاً حقدار نہیں ہوتے ہیں یہ ایک طرف ان پر عظیم ظلم ہے اور دوسری طرف اس میں اسلام کے قانون وراثت کی صریح خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔ ۔۔۔ ان جوہری فرق کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا قیاس باطل ہے۔ اور کوئی عالم اس کے جواز کا قائل نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جب کہ اس میں سود اور قمار بھی پائے جاتے ہیں۔ جو قطعی طور پر حرام ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم یہاں بھی لیں کہ انہیں بعض وجوہ ایسے ہیں جو اس کے جواز حلت کے متقاضی ہیں مگر اس سے بھی تو انکار ممکن نہیں ہے کہ اس عقد میں ایسی بھی وجوہ پائی جاتی ہیں۔ جو اس کے عدم جواز اور حرمت کے متقاضی ہیں جیسا کہ اوپر بالتفصیل بیان کی گئیں تو حضورؐ کے اس ارشاد کے بموجب دع ما یریبک الی ما لا یریبک، اس عقد سے اجتناب کرنا چاہئے کیونکہ اس میں احتیاط کا پہلو راجح ہے۔ حضورؐ نے ایسے ہی معاملات کے بارے میں فرمایا ہے کہ: ما اجتمع الحلال والحرام الا وقد غلب الحرام علی الحلال۔ اسی سے علماء اصول حدیث اور اصول فقہ نے یہ قانون بنایا ہے کہ بوقت تعارض محرّم کو مبیح پر ترجیح حاصل ہوگی۔

فقط واللہ اعلم

سود لینے دینے پر گواہ بننا اور حالتِ اضطرار میں سود دینے کا حکم

سوال :- (۱) ایک آدمی سود دیتا ہے، دوسرا دیتا ہے اور چند افراد اس سودی معاملے میں گواہ بن جاتے ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان تینوں کا کیا حکم ہے ؟
(۲) اگر کوئی شخص حالتِ اضطرار میں ہو تو کیا اس کے لیے سود پر قرض لینا جائز ہے یا نہیں؟ دینے والے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :- (۱) سودی لین دین ایسا حرام قطعی عمل ہے کہ جس پر قرآنی آیات، احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری اُمت کا اجماع دال ہے، اسکی حرمت میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں، سود خوری کو اپنی ماں سے زنا کرنے کے برابر جرم قرار دیا گیا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں سود خور، سود دینے والے، لکھنے والے اور اس معاملے پر گواہ بننے والوں کو بھی برابر کی سزا کا حقدار قرار دیا گیا ہے اور ان سب پر لعنت کی گئی ہے ۔۔ صحیح مسلم اور دوسری کتبِ احادیث میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ :-

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربٰو ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء ۔

البنایہ میں ہے : قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ اکل الربٰو ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ اذا علموا بہ ملعونون علیٰ لسانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اھ۔

اس لیے سودی لین دین کرنے، اس پر گواہ بننے اور اسکی دستاویز لکھنے سے پرہیز کیا جائے ۔
(۲) اگر کوئی انتہائی حالتِ اضطرار میں ہو اور کوئی دوسرا راستہ اس کو اپنی ضرورتِ شدیدہ کو پورا کرنے کے لیے نظر نہ آتا ہو اور ضرورت بھی اس درجے کی ہو جو اس کے لیے موت و حیات سے وابستہ ہو تو اس صورت میں مجبوری کے تحت گنجائش موجود ہے لیکن سود لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

کما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ، قلتُ، وقد قالت الفقھاء بجواز اعطاء الرشوۃ للمضطر لدفع مضرۃ لا تندفع الا باعطائہ واما اخذ الرشوۃ فلا یجوز بحالٍ والربٰو والرشوۃ من باب واحدٍ فمقتضاہ ان یجوز اعطاء الربٰو للمضطر لدفع مضرۃ لا تندفع الا باعطائہ واما اخذ الربٰو فلا یجوز اصلاً۔ اھ (امداد الاحکام ج ۳ ص ۵۴۲ کتاب الربٰو)

☆ ☆ ☆

كتاب الرهن

وإن كنتم على سفرٍ
ولم تجدوا كاتباً
فرهان مقبوضة

کتاب الرّھن

(رہن کے مسائل واحکام)

مرہونہ زمین کے اخراجات کی ذمّہ داری کا حکم

سوال:۔ اگر زمین مرہونہ ہو اور مرتہن نے بغیر کسی انتفاع کے سرکاری آبیانے اور ٹیکس کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کچھ رقم ادا کی۔ کیا مرہونہ زمین کی واپسی کے وقت مرتہن کو راہن سے ان اخراجات کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر راہن کی اجازت سے مرتہن مرہونہ زمین پر رقم خرچ کرے تو اجازت کی وجہ سے مرتہن مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے ورنہ بصورتِ دیگر مرتہن کئے ہوئے اخراجات میں متبرع ہے، راہن سے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا ہے۔

لما قال الامام ابن البزاز الکردریؒ: اخذ السلطان الخراج والعشر من المرتھن لایرجع علی الراھن لانہ ان تطوع فھو متبرع ان مکرھا فقد ظلمہ السلطان والمظلوم لایرجع الا علی الظالم اھ (الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۵۹ نوع نفقۃ الرّھن) [۱]

مرہونہ سے اِنتفاع کا حکم

سوال:۔ اگر مالک مرتہن کو مرہونہ سے فائدہ لینے کی اجازت دے دے تو کیا اس کی اجازت کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتہن کے لیے مرہونہ سے انتفاع لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ مالک کی باقاعدہ اجازت اس کی مملوکہ چیز سے انتفاع لینے کی گنجائش کی صورت مہیا کرکے جواز کی دلیل بن سکتی ہے لیکن مرتہن کو راہن کی طرف سے جو اجازت

---

[۱] لما قال الشیخ سلیم رستم بازرحمہ اللہ: کل من الراھن والمرتھن اذا انفق علی الرھن ما لیس علیہ بدون اذن الآخر یکون متبرعا ولیس لہ ان یطالب الآخر بما انفق۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۷۲۵ ص۳۹۹ کتاب الرھن)

ومثلہ فی الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۴۵۵ الباب الرابع فی نفقۃ الرھن۔

دی جاتی ہے اس کے پس منظر میں کون سے جذبات کارفرما ہیں،
جس کی وجہ سے مالک اپنی ملکیت سے اپنی ضرورت کے باوجود دوسرے کو استفادہ کا موقعہ دیتا ہے، راہن اور مرتہن کے باہمی معاملات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مرتہن کو یہ موقعہ اس کے قرض کے عوض دیا جاتا ہے جو کہ مالک دے چکا ہے، مالک مرتہن کے احسان سے مجبور ہو کر بلا چون وچرا مرتہن کے سامنے سر تسلیم خم کرکے اجازت دے دیتا ہے، اس کی یہ اجازت مجبوری کی اجازت ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ مالک کی اجازت کے باوجود مرتہن کے لیے رہن سے انتفاع لینے کی گنجائش نہیں ہے۔

لما قال العلامة السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قولہ وسیجیٔ آخر الرھن) قلت والغالب من احوال الناس انھم یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاہ لما اعطاہ الدراھم وھذا بمنزلۃ الشرط لان المعروف کالمشروط وھو مما یعین المنع واللہ تعالیٰ اعلم انتھیٰ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۴ ص۲۳۴ کتاب الرھن) [1]

رہن سبب ملک نہیں

سوال:۔ اگر کسی شخص کے پاس مدتوں سے زمین بطورِ رہن ہو تو کیا اس سے مرتہن کی ملکیت ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں اور راہن کو کب تک ملکیت کے دعویٰ کا حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ رہن صرف ایک وثیقہ اور ذریعہ اعتماد ہے جس سے مرتہن مرہونہ چیز کا مالک نہیں بن سکتا اس کا مالک راہن ہی رہے گا، جب چاہے مرتہن کو قرض ادا کرکے مرہونہ شے واپس لے سکتا ہے تاہم مالک قرض کی ادائیگی کے بغیر مرہونہ کی واپسی کا حق نہیں رکھتا۔

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والغالب من احوال الناس انھم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاہ لما اعطاہ الدراھم وھذا بمنزلۃ الشرط لان المعروف کالمشروط وھو مما یعین المنع۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (رد المحتار ج ۶ ص۴۸۲ کتاب الرہن)

لما قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمہ اللہ : الرھن امانة عند المرتھن کالودیعة ۔
(الفتاوی البزازیة علی ھامش الھندیة ج ۶ ص۸۶ کتاب الرھن الباب الرابع فی اعارتہ) [1]

مرتہن کا بلا اجازتِ مالک مرہونہ سے انتفاع موجبِ ضمان ہے

سوال :- اگر مرتہن نے مالک کی اجازت کے بغیر مرہونہ سے فائدہ حاصل کیا تو کیا مالک کو اس سے تاوان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب :- مفتیٰ بہ قول کی رُو سے جب مالک کی اجازت کے باوجود مرتہن کے لیے اِنتفاع لینا مرخص نہیں ہے تو اجازت کے بغیر یہ مالک کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے اِس لیے مالک اس سے ضمان کے مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے ۔

لما قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ : رجلٌ استقرض دراھم واسکن المقرض فی دارہٖ قالوا یجب اُجر المثل علی المقرض لان المستقرض انما اسکنہ فی دارہٖ عوضًا منفعة القرض لا مجانًا فیجب اجر المثل علی المقرض ۔ [2]
(الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیة ج ۲ ص۳۰۹ کتاب القرض)

مرہونہ کے اجارہ کا حکم

سوال :- اگر مرتہن مرہونہ سے انتفاع لے کر راہن کو اجارہ دیا کرے تو کیا اس سے مرتہن کیلئے

---

[1] قال المحدث والفقیہ علی بن سلطان محمد القاریؒ : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یغلق الرھن - أی عقدہ (الرھن) ای المرھون (من صاحبہ) أی مالک (الذی رھنہ) ای صاحبہ بحیث یزول عنہ منفعتہٗ بل یکون المرھون کالباقی فی ملک الراھن ۔ (المرقاة شرح مشکوٰة ج ۶ ص۹۳ کتاب الرھن)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیة ج ۵ ص۴۶۵ الباب الثامن فی تصرف الراھن والمرتھن ۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : رجلٌ استقرض دراھم واسکن المقرض فی دارہ قالوا یجب اجر المثل علی المقرض لان المستقرض انما اسکنہ فی دارہ عوضًا عن منفعة القرض لا مجانًا ۔ (رد المحتار ج ۶ ص۶۳ کتاب القرض)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی تنقیح الحامدیة ج ۲ ص۱۲۳ کتاب القرض ۔

اِنتفاع کے جواز کی صورت پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:- اجارہ ایک جائز معاملہ ہے، مالک اپنی زمین ہر اس شخص کو اجارہ کی شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے اجارہ پر دے سکتا ہے جس پر اعتماد ہو، خواہ مرتہن ہو یا اور کوئی شخص، لیکن جہاں کہیں مالک اور آجر کے درمیان اس سے قبل رہن کا معاملہ موجود ہو تو رہن کے بعد اجارہ کی تجدید معاہدہ سے سابقہ عقدِ رہن ختم ہو کر باقی نہیں رہتا اور مرتہن کے اِنتفاع لینے میں کوئی حرج نہیں تاہم راہن مقررہ مدت کے بعد بغیر کسی قرض کی ادائیگی کے اپنی زمین مرتہن سے واپس لے سکتا ہے اور مرتہن واپس کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اما الاجارة فالمستأجر ان کان هو الراهن فهي باطلة..... وان هو المرتهن وجدد القبض للاجارة..... بطل الرهن والاجرة للراهن۔ (رد المحتار ج ۶ ص۵۱۱ کتاب الرهن) [1]

مرہونہ میں مالک کا تصرّف مرتہن کی اجازت پر موقوف ہے

سوال:- کیا راہن کو بحیثیتِ مالک مرہونہ میں مالکانہ حقوق کے اجراء کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟ یا اگر مالک مرہونہ کو فروخت کردے تو کیا یہ بیع نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:- رہن سے مالک کی ملکیت اگرچہ زائل نہیں ہوتی لیکن مرتہن کے حقوق کی وابستگی کی وجہ سے مالک کے جملہ مالکانہ تصرفات مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوں گے اس لیے مالک کی مرہونہ کے فروخت کا معاملہ مرتہن کی اجازت کا محتاج ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: توقف بیع الراهن رهنه علی اجازة مرتهنه او قضاء دینه فان وجد احدهما نفذ وصار ثمنه رهناً۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: ولکن انما توقف علی اجازة الراهن بیع المرتهن فان اجاز جاز والا فلا۔ انتهی۔ (رد المحتار ج ۶ ص۵۰۶ کتاب الرهن) [2]

---

[1] لما فی الهندیة: وکذلک لو استاجره المرتهن صحت الاجارة وبطل الرهن اذا جدد القبض للاجارة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۴۶۵ الباب الثامن فی تصرف الراهن والمرتهن... الخ)
ومثلهٗ فی العنایة شرح الهدایة علی هامش فتح القدیر ج ۹ ص۱۱۱ کتاب الرهن۔

[2] لما قال الشیخ سلیم رستم باز: لو باع الراهن الرهن بدون رضی المرتهن لا ینفذ البیع ولا یطرأ خلل علی حق الحبس الثابت للمرتهن ولکن اذا قضی الراهن الدین نفذ البیع وکذا لو اجاز المرتهن ذلک البیع فانه ینفذ۔ (شرح المجلة الاحکام، مادة ۷۴۲ ص۲۳۴ بیع الوفاء)
ومثلهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۴۶۲ الباب الثامن فی تصرف الراهن والمرتهن۔

مرہونہ زمین چھڑائے بغیر کسی دوسرے پر فروخت کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں کہ زید نے اپنی آبائی ملکیتی زمین عمرو کے پاس رہن رکھی، کچھ مدت کے بعد زید نے اپنی مرہونہ زمین عمرو سے فک کرائے بغیر خالد کو اس شرط پر فروخت کر دی کہ اگر میری یہ زمین جو کہ عمرو کے پاس رہن ہے ایکٹ میں آگئی تو وہ زر رہن جس پر زمین رہن کی گئی ہے وہ مرتہن (عمرو) کو نہ دو گے بلکہ مجھے دو گے۔ اب زید اس بیع قطعی کرنے سے پشیمان ہے اور خالد سے کہتا ہے کہ مجھے بیع قطعی کا انتقال واپس کر دو، حالانکہ اب تک خالد کا اس زمین پر قبضہ ہوا ہی نہیں بلکہ مرتہن (عمرو) کے قبضہ میں ہے اب اس بیع قطعی کا عندالشرع کیا حکم ہے؟ فاسد ہے یا صحیح؟ اگر فاسد ہے تو واجب الرد ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ کا جواب دو شق پر تحریر کیا جاتا ہے۔

(۱) راہن کا مرہونہ زمین میں تصرف قبل از سقوط از رہن فی المرہون دو قسم ہے۔ ایک وہ تصرف ہے جو قابل فسخ ہے مثلاً بیع، کتابت، اجارہ، ہبہ، صدقہ، اقرار وغیرہ۔ دوسرا وہ تصرف ہے جس میں فسخ کا احتمال نہ ہو جیسا کہ عتق، تدبیر، استیلاد۔ قسم دوم تصرف خارج از بحث ہے اور قسم اول کے تصرف (جو کہ فسخ کا احتمال رکھتا ہے) کا حکم یہ ہے کہ یہ تصرف بغیر رضائے مرتہن کے نافذ نہیں ہوتا اور مرتہن کا حق حبس مرہونہ میں باطل نہیں ہوتا یعنی اس قسم کا تصرف اگر راہن کرے تو وہ مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے، اگر وہ اجازت دے تو تب نافذ ہوگا۔ اور مرتہن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جب تک وہ اپنا زر رہن وصول نہ کرلے اس وقت تک مرہونہ کو اپنے پاس بند رکھے۔ اور جب راہن مرتہن کو اپنا دین ادا کر دے اور مرہونہ کو بند رکھنے کا حق باطل ہو جاتا ہے، تو راہن کا وہ سابق تصرف جو کہ موقوف تھا اب نافذ ہو جائے گا۔ یہ تفصیل فتاوی عالمگیری جلد ۵ صفحہ ۴۸۷ کی مندرجہ ذیل عبارت سے لی گئی ہے:۔

تصرف الراهن قبل سقوط الدين في المرهون اما تصرف يلحقه الفسخ كالبيع فالكتابة والاجارة والهبة والصدقة والاقرار ونحوها اوتصرف لايحتمل الفسخ كالعتق والتدبير والاستيلاد۔ اما الذي يلحقه الفسخ لاينفذ بغير رضاء المرتهن ولايبطل حقه في الحبس واذا قضى الدين وبطل حقه في الحبس نفذت التصرفات كلها۔

اسی طرح اگر مرتہن نے زر رہن وصول کرنے سے پہلے اجازت دے دی تو نافذ ہو جائے گی اور اب پھر رہن راہن نہیں رہے گا مگر زر رہن بہر حال تو راہن کے ذمہ ہوگا اور اجازت دینے سے مرتہن کا حق باطل نہیں ہوگا۔ اور اس صورت میں اگر یہ تصرف بیع ہو تو اب بجائے مرہونہ کے اس کا ثمن (زر بیع) مرہون ہوگا۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں اسی صفحہ (جلد ۵ ص۴۸۷) پر ہے:

ولو اجاز المرتهن تصرّف الراهن نفذ وخرج من ان يكون رهنًا والدّين على حاله وفى البيع يكون الثمن رهنًا مكان المبيع... الخ

فقہاء کی اس تحقیق کی روشنی میں صورتِ مسئولہ میں راہن نے جو تصرف کیا ہے وہ بیع کا تصرف ہے پس وہ اجازتِ مرتہن پر موقوف ہوگا۔ اب اگر عمرو (مرتہن) نے راہن (زید) کو اجازت دی ہو تو اس کا یہ تصرف نافذ ہوگا اور عمرو (مرتہن) کا زر رہن زید کے ذمہ لازم ہے اور اگر عمرو (مرتہن) نے اجازت نہ دی ہو تو یہ بیع موقوف ہے اور تا وصولی زر رہن عمرو (مرتہن) زمین مرہونہ کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔

(۲) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ایسی شرائط جو ملائم عقد نہ ہوں ان سے عقد بیع فاسد ہوتا ہے جس کی تفصیل فقہاء نے یوں کی ہے، الدر المختار میں ہے: ولا بيع بشرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لاحدهما او فيه نفع لمبيع الخ۔۔۔ علامہ شامیؒ بصورت تنبیہ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں: قوله وفيه نفع لاحدهما المراد بالنفع ما شرط من احد المتعاقدين على الآخر (ج ۴ ص۱۶۷)

اور بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ مشتری بیع کا مالک ہو جاتا ہے یعنی بیع فاسد مفید للملک ہے اور ہر ایک پر بائع اور مشتری میں سے اس کا فسخ واجب ہے قبل القبض، اور اسی طرح بعد القبض بھی، جب تک کہ مبیع مشتری کے ہاتھ میں باقی ہو اور اس میں مرافع الی القاضی کی شرط نہیں ہے کیونکہ جو چیز شرعاً واجب ہوتی ہے وہ قضاء قاضی کی محتاج نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کسی نے بائع یا مشتری میں سے کسی نے اس کے باقی رکھنے پر اصرار کیا تو قاضی کو جبراً اسے فسخ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

علامہ   فرماتے ہیں: ويجب على كلّ واحدٍ منهما فسخهٗ قبل القبض ويكون امتناعًا عنه او بعده ما دام المبيع بحاله فى يد المشترى   للفساد لانهٗ معصية فيجب رفعها ولذا لا يشترط فيه قضاء قاضٍ لان الواجب شرعًا لا يحتاج

للقضاء واذا امر احدهما على امساكه وعلم به القاضي فله فسخه جبرًا عليهما حقًا للشرع۔ (در مختار بهامش الشامی ج۴ ص۱۷۳)

اس تحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے صورت مسئولہ میں مرتہن (زید) کی اجازت سے راہن نے مشتری (خالد) سے جو عقدِ بیع کیا ہے میرے نزدیک یہ بیع فاسد ہے کیونکہ زید نے عین عقد میں جو شرط لگائی ہے کہ اگر میری زمین ایکٹ میں آگئی تو زررہن مرتہن کو نہ دوگے بلکہ مجھے دوگے اور مشتری (خالد) نے اس کو منظور کیا، تو یہ ایک ایسی شرط ہے جو نہ عقد کی مقتضیٰ ہے اور نہ ملائم عقد ہے اور اس میں احد العاقدین (زید بائع) کو نفع ہے لہٰذا اس سے بیع فاسد ہوگئی ہے اور اس کا فسخ کرنا واجب ہے۔ پس زید اس کو فسخ کر سکتا ہے کیونکہ مشتری (خالد) نے ابھی تک قبضہ بھی نہیں کیا ہے، اگر زید اس بیع کے باقی رکھنے پر اصرار کرے تو بذریعہ عدالت فسخ کرایا جا سکتا ہے۔ هٰذا هو الذی یعلم ما ذکر فی کتب مذهبنا ولم ینشرح به القلب ولم تطمئن به النفس فان للمقال فیه مجالاً۔ (فقط واللہ اعلم)

غیر مسلم کی مرہونہ زمین سے انتفاع

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ میں مسلمانوں کے علاوہ سکھ اور ہندو بھی رہتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اچھے مراسم بھی ہیں۔ خرید و فروخت، اجارہ، شادی و غمی اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شرکت وغیرہ، گویا دنیاوی طور پر ایک دوسرے سے لین دین رہتا ہے۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہندو نے مجھ سے پچاس ہزار روپے قرض لیے اور اپنی مملوکہ زمین میرے پاس رہن رکھوائی۔ تو کیا میں اس زمین میں فصل وغیرہ کاشت کر سکتا ہوں اور اس کی آمدنی میرے لیے جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض علماء کرام سے ہم نے سنا ہے کہ مرہونہ زمین سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ برائے مہربانی مسئلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ یہاں تک تو سب کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی مرہونہ چیز سے انتفاع لینا جائز نہیں لیکن بعض علماء کرام کے نزدیک غیر مسلم حربی کا مال مباح ہے، اس لیے ہندو کی مرہونہ زمین سے فائدہ لینا آپ کے لیے جائز ہے البتہ پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے رہونہ سے انتفاع درست نہیں۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: الجواب: بعض علماء کے قول پر (یباح مال الحربی رضاه ولو بعقد فاسد) جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۳ ص۴۶۶ کتاب الرہن)

مرہونہ زمین کے محاصل راہن کو واپس کرنا لازم ہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ یار حسین (ضلع صوابی) میں قرض لینے دینے کے سلسلہ میں یہ رواج ہے کہ قرض رقم دینے والا اس کے عوض میں کچھ زمین رہن رکھ لیتا ہے اور اس مرہونہ زمین سے اُسے (مرتہن کو) انتفاع لینے کی راہن کی طرف سے اجازت ہوتی ہے ۔ اسی سلسلہ میں کچھ عرصہ قبل بندہ نے ایک استفتاء بھیجا تھا جس کے جواب میں آنجناب نے راہن کی اجازت کے باوجود مرہونہ زمین سے انتفاع لینے کو ناجائز تحریر فرمایا تھا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے مرہونہ زمین سے فائدہ حاصل کیا ہو اور اسے استعمال بھی کیا ہو تو وہ اپنے آپ کو اس سے کس طرح فارغ الذمہ کر سکتا ہے اور اس کی عملاً کیا صورت ہوگی ؟

الجواب:۔ مرہونہ زمین انتفاع لینا راہن کی اجازت کے باوجود بھی مفتیٰ بہ قول کے مطابق ناجائز وحرام ہے۔ اب اگر کسی نے ایسا کیا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے فارغ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ مرہونہ زمین سے اس نے جو محاصل لیے ہیں وہ جملہ محاصل یا ان کی قیمت راہن کو واپس کر دے تب اس کا ذمہ فارغ ہوگا ۔

لما قال العلامۃ محمد عبد الحی اللکھنوی ؒ : (الجواب) بکر کو اس محاصل کا واپس کرنا لازم ہے اور بکر کو اس محاصل سے نفع حاصل کرنا جائز نہ تھا اور ایک روپیہ کے عوض میں اس محاصل کو بیچ نہیں سکتا، البتہ کل محاصل کے واپس کر دینے سے نجات حاصل ہو جائے گی ۔ (مجموعۃ الفتاوی (اردو) ج ۳ ص ۱۲۹ کتاب الرہن)

**

كتاب الاجارة

اعطوا الاجير أجره
قبل ان يجف عرقه

کتاب الاجارۃ

(اجارہ کے احکام و مسائل)

عقدِ اجارہ میں تعیینِ مدت ضروری ہے

سوال:۔ مؤجر نے مستاجر کو بغیر تعیینِ مدت کے دوکان اجارہ پر دے دی، اب چند سال بعد ہر چیز کے نرخ بڑھ جانے کی وجہ سے دوکان کا مالک بھی کرایہ بڑھانا چاہتا ہے لیکن مستاجر نہ تو دوکان خالی کرنے کو تیار ہے اور نہ ہی پہلے کرایہ سے زیادہ دینے کو تیار ہے جبکہ مؤجر حکومتی قانون کی وجہ سے مجبور ہے، کیونکہ حکومت کا قانون یہ ہے کہ جب تک مُستاجر (کرایہ دار) خود دوکان خالی نہ کرے مؤجر (مالکِ دوکان) اس کو بیدخل نہیں کر سکتا اور کرایہ میں کمی بیشی کرنا بھی حکومت کے اختیار میں ہے، کیا اس صورت میں مستاجر گنہگار تو نہیں ہوگا؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال یہ اجارہ فاسد ہے، مؤجر کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ مستاجر سے ہر ماہ کے شروع میں دوکان خالی کرنے یا کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کرے ورنہ بصورتِ دیگر عقدِ اجارہ فسخ کر سکتا ہے، اس مطالبہ میں مستاجر کا لیت ولعل کرنا حرام ہے اور انکار کی صورت میں مستاجر پر مؤجر کا مطلوبہ کرایہ دینا لازم ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله:۔ آجرحانوتاً کل شهر بکذا جاز فی واحد فقط وفسد فی الباقی لجهالتها والاصل انه متٰی دخل کل فیما لایعرف منتهاه تعین ادناه واذا مضی الشهر فلکل فسخها بشرط حضور الآخر لانتهاء العقد الصّحیح۔

(ردالمحتار ج ۶ ص۵ باب الاجارۃ الفاسدۃ) [1]

---

[1] قال العلامة ابن بزاز رحمه الله: آجر دارہ کل شهر بکذا ینعقد عند رأس کل شهر ولکل خیار الفسخ عند رأس کل شهر فلو ابرأ المستاجر من اجرۃ الابد لایصح الا عن شهر واحد۔ (الفتاوی البزازیة علٰی هامش الهندیة ج ۵ ص۱۷ کتاب الاجارات، الفصل الثانی فی صفتها)

وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، مادۃ ۴۹۴ ص۲۶۲ الفصل الرابع فی المسائل التی تتعلق بمدۃ الاجارۃ۔

طویل مدت کے لیے زمین اجارہ پر دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی ذاتی مملوکہ اراضی کسی دوسرے شخص کو پچاس سال کے لیے اجارہ پر دے دی ہے، کیا اپنی مملوکہ زمین طویل مدت کے لیے اجارہ پر دینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اپنی مملوکہ زمین طویل مدت کے لیے اجارہ پر دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ دیگر شرائط فاسدہ سے اجارہ خالی ہو خواہ اجرت کم مقرر ہوئی ہو یا زیادہ۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: والمنافع تارة تصير معلومة بالمدة كاستيجار الدور للسكنى والارضين للزراعة فيصح العقد على مدة معلومة اى مدة كانت لان المدة اذا كانت معلومة كان قدر المنفعة فيها معلوماً اذا كانت المنفعة لاتتفاوت وقوله اى مدة كانت اشارة الى انه يجوز طالت المدة اوقصرت لكونها معلومة۔ (الهداية ج۳ ص۲۹۴ كتاب الاجارات) [1]

معروف اجرت پر اجارہ کا حکم

سوال:۔ ہمارے ہاں تین مزدور پچاس روپے یومیہ کے حساب سے مزدوری کرتے ہیں، چونکہ کام کے وقت میں صبح کے کھانے کا وقت ہوتا ہے اس لیے صبح کا کھانا ہمارے گھر سے ملتا ہے، درمیان میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا اب مزدوروں کا مطالبہ ہے کہ چونکہ رمضان المبارک میں صبح کا کھانا نہیں ملتا اس لیے بجائے پچاس کے ساٹھ روپے دیہاڑی ملنی چاہیئے، تو کیا ان مزدوروں کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر ماہِ رمضان المبارک میں یہ اجرت برضا ورغبت جانبین کی طرف سے مقرر ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر یہ مقدار معروف ہو تو تب بھی درست ہے ورنہ بصورتِ دیگر یہ اجارۂ فاسدہ کے حکم میں ہے جو صحیح نہیں۔

---

[1] قال العلامة اكمل الدين البابرتي: ولا فرق بين طويل المدة وقصيرها عندنا اذا كانت بحيث يعيش اليها العاقدان لان الحاجة التى جوزت الاجارة لها قد تمس الى ذالك۔

(العناية على هامش فتح القدير ج۸ ص۸/۷ كتاب الاجارات)

وَمِثْلُهٗ فى الجوهرة النيرة ج۱ ص۳۱۷ كتاب الاجارات۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز رحمہ : لو استاجر احد اجیر علیٰ ان یعمل یوماً یعمل من طلوع الشمس الی العصر او الی الغروب علیٰ وفق عرف البلدۃ فی شان العمل ۔
(شرح مجلۃ الاحکام لسلیم، مادۃ ۴۹۵ ص۲۷۴ الکتاب الثانی فی الاجارۃ ۔ الباب الرابع فی المسائل التی تتعلق بمدۃ الاجارۃ) لے

مجہول الوقت کا عقدِ اجارہ

سوال :۔ ایک ملازم نے مالک مکان سے پانچسو روپیہ کرایہ پر مکان لے لیا، چند ماہ بعد اس نے مالکِ مکان ماہانہ سے کہا کہ میں تین ماہ کی چھٹی پر اپنے گھر جا رہا ہوں واپس آکر اس مکان کو دوبارہ کرایہ پر لوں گا اور ملازم اپنا سامان اسی مکان میں رکھ کر چلا گیا، اب ان دونوں کے درمیان تنازع پیدا ہو گیا ہے مالک مکان کا مؤقف یہ ہے کہ چونکہ تمہارا سامان اسی مکان میں پڑا رہا ہے اور جاتے وقت تم نے عقد کو ختم بھی نہیں کیا تھا لہٰذا تمہیں ان تین ماہ کا کرایہ بھی ادا کرنا پڑے گا جبکہ ملازم کا کہنا ہے کہ چونکہ میں نے جاتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ واپس آکر نئے سرے سے کرایہ پر لوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجارہ ختم ہو گیا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کا مؤقف درست ہے؟ نیز کیا ملازم (کرایہ دار) ان تین ماہ کا کرایہ ادا کرنے کا شرعاً پابند ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جب مدت کا تعین نہیں ہوا ہے صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ ماہانہ کرایہ پانچسو روپے ہو گا تو اس صورت میں کرایہ دار اور مالکِ مکان ہر ایک کو مہینہ کے اختتام پر ایک دوسرے کی موجودگی میں اجارہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا جب ملازم نے واضح طور پر مالکِ مکان سے یہ کہہ دیا کہ چھٹیوں کے بعد واپس آکر میں اس مکان کو

لے قال العلامۃ قاضیخانؒ : رجل استاجر اجیراً یوماً یعمل لہ کذا قالوا ان کان العرف بینھم انھم یعملون من طلوع الشمس الی العصر فھو علیٰ ذلک وان کان العرف انھم یعملون من طلوع الشمس الی غروب الشمس فھو علیٰ ذلک وان کان العرف مشترکاً فھو علیٰ طلوع الشمس الی غروبھا اعتباراً للذکر الیوم ۔ (الفتاوٰی قاضیخان مع الہندیۃ ج۲ ص۳۳ کتاب الاجارات فصل فی اجارۃ الدواب والضمان فیما یجب وفیما لا یجب) ۔
ومثلہ فی الفتاوی الہندیۃ ج۴ ص۴۱۶ کتاب الاجارۃ ۔ الباب الثالث فی الاوقات التی یقع علیھا عقد الاجارۃ ۔

دوبارہ کرایہ پر لوں گا تو یہ اجارہ ملازم کے گھر جانے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا ہے لہٰذا یہ ملازم ان تین ماہ کا کرایہ دینے کا پابند نہیں ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: لو استوجر عقاراً کل شهر بکذا من دون بیان عدد الاشهر یصح العقد فی شهر واحد فقط ویفسد فی بقیة الشهور لجهالتها والاصل انه متی دخلت لفظة کل فیما لا یعرف منتهاه تعین ادناه (در منتقیٰ) لکن عند ختام الشهر الاول لکل من الآجر والمستاجر فسخ الاجارة فی الیوم ولیلته من الشهر الثانی الذی یلیه۔ (شرح مجلة الاحکام لسلیم، مادة ۴۹۴ ص۲۷۲ کتاب الذی فی الاجارات، باب الرابع فی المسائل التی تتعلق بمدة الاجارة)[1]

گاڑیوں کے ٹائر کرایہ پر دینا

سوال: آجکل بعض دوکاندار لوگ گاڑی والوں کو ٹائر کرایہ پر دیتے ہیں، کیا اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: اجارہ نام ہے کسی چیز کے منافع سے اجرت کے عوض فائدہ حاصل کرنا، بشرطیکہ اس میں جملہ شرائط اجارہ موجود ہوں، اسلئے اگر صورتِ مسئولہ میں مدت اور کرایہ معلوم ومتعین ہو تو گاڑیوں کے ٹائر کرایہ پر دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما فی مجلة الاحکام: یشترط ان تکون الاجرة معلومة ــــ یشترط فی الاجارة ان تکون المنفعة معلومة بوجه یکون مانعاً للمنازعة۔ (شرح المجلة رستم باز، مادة ۴۵۰، ۴۵۱ ص۲۵۱ الفصل الثالث فی شروط صحة الاجارة)[2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: ومن استاجر داراً کل شهر بدرهم فالعقد صحیح فی شهر واحد فاسد فی بقیة الشهور الا ان یسمی جملة الشهور معلومة۔

(الهدایة ج۳ ص۳۰۲ کتاب الاجارات۔ باب الاجارة الفاسدة)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۸ ص۱۷ کتاب الاجارة۔ باب الاجارة الفاسدة۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: فی شرح الطحاوی عقد الاجارة لا یجوز الا ان یبین البدل من الجانبین جمیعاً اما بیان المنفعة فباحدی معان ثلاثة بیان الوقت وهو الاجل وبیان العمل وبیان المکان۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۱۰۳، الفصل السادس فی الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۲ ص۱۰۳ کتاب الاجارة۔

اجارہ پر لی ہوئی زمین میں ہونے والے درختوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے اس کی مملوکہ زمین دس بارہ سال تک کاشت کرنے کے لیے اجارہ پر لی ہے، اب اس زمین میں درخت بھی ہیں تو کیا شرعاً یہ درخت مؤجر (مالکِ زمین) کے ہیں یا مستاجر (کاشتکار) کے ؟

الجواب:۔ اگر یہ درخت مالکِ زمین نے لگائے ہوں اور خدمت کاشتکار نے کی ہو تو یہ درخت مالکِ زمین کے ہوں گے اور خدمت کرنے والے کو خدمت کا معاوضہ ملے گا اور اگر درخت اجارہ دار نے مالکِ زمین کی اجازت سے لگائے ہوں تب بھی یہی حکم ہے اور اگر بلا اجازتِ مالک کے لگائے ہوں تو درخت اجارہ دار کے ہوں گے اور مالکِ زمین کو زمین سے انتفاع کا اجرِ مثل دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمہ اللہ :۔ وقد اطال صاحب التنقیح الکلام فی تحقیق هٰذه المسئلة قال فالحاصل ان من زرع ارض غیره بلا اذنه علی وجه الغصب فان کانت الارض ملکاً اعدّها ربها للزراعة اعتبر العرف فی الحصة ان کان ثمة عرف والا فان اعدّها للایجار فالخارج کله للزارع وعلیه اجر مثلها لربها والا فان انتقصت فعلیه النقصان والا فلا شیٔ علیه ۔ (فتاوی کاملیة ص۲۹ کتاب الاجارة) [1]

اجارہ کردہ چیز کی مرمت کا خرچہ مستاجر کے ذمہ لگانے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں زمیندار زمین کی کاشت کے لیے زرعی مشینری اجارہ پر لیتے ہیں، مالکِ مشین اور زمیندار کے مابین عقد ہوتا ہے کہ آمدنی کا تیسرا حصہ مالکِ مشین کا ہوگا اور اگر مشین خراب ہو جائے تو مرمت کا خرچہ زمیندار

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : فالحاصل ان من زرع ارض غیره بلا اذنه ولو علی وجه الغصب فان کانت الارض ملکاً واعدّها ربها للزراعة اعتبر العرف فی الحصة ان کان ثمة عرف والا فان اعدّها للایجار فالخارج کله للزارع وعلیه اجر مثلها لربها والا فان انتقصت فعلیه النقصان والا فلا شیٔ علیه ۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۷۲ کتاب الغصب)

ومثله فی ردّ المحتار ج۶ ص۱۹۵ کتاب الاجارة ۔

کے ذمہ ہوگا، تو کیا اس طرح کا عقد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کا اجارہ دو وجوہ کی بنا پر فاسد ہے (۱) اس میں اجرت متعین نہیں ہے (۲) یہ کہ مشین کی مرمت مستاجر (زمیندار) کے ذمے لگائی گئی ہے، اور اس شرط کا لگانا اجارہ کو فاسد کرتا ہے لہٰذا مستاجر پر اجرِ مسمّٰی واجب نہیں بلکہ اجرِ مثل واجب ہے، بشرطیکہ اجرِ مثل مقرر کردہ کرایہ سے زیادہ نہ ہو ورنہ بصورتِ دیگر مقرر کردہ کرایہ لازم ہوگا۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: وكذا لو استاجر داراً او حانوتاً سنة بمائة درهم على ان يرمّها المستاجر كان على المستاجر اجر المثل بالغاً ما بلغ لانه لما شرط المرمة على المستاجر صارت المرمة من الاجر فيصير الاجر مجهولاً فاما اذا كان فساد الاجارة بحكم شرط فاسد۔ (الفتاوی قاضیخان ج۲ ص۲۱ کتاب الاجارات، باب الاجارة الفاسدة)[1]

تین ماہ سے قبل نوکری چھوڑی تو تنخواہ نہیں ملے گی، اجارہ فاسد ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اس شرط پر نوکر رکھا کہ اگر تین ماہ سے قبل نوکری چھوڑ دے گا تو تنخواہ نہیں دوں گا، مگر اس شخص (نوکر) نے تین ماہ سے پہلے ہی نوکری چھوڑ دی، تو کیا یہ شخص نوکری کے ایام کی تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اجارہ میں اس قسم کی شرائط لگانا صحیح نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان دونوں کا اجارہ فاسد ہے، اس لیے نوکر کو اجرِ مثل دیا جائے گا بشرطیکہ اجرِ مسمّٰی سے کم ہو۔

---

[1] قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمه الله: سئلت عمن استاجر داراً باجر مجهول هل تفسد الاجارة فالجواب نعم قال فی جامع الفصولین كل جهالة تؤثر فی البيع تؤثر فی الاجارة ويفسد بها العقد سواء كانت الجهالة فی الاجرة والمدة او العمل المستاجر عليه ويجب اجر المثل فی فاسدها ولا يجاوز بها المسمّٰى ثم لا يجاوز المسمّٰى لو علم الاجر والا يجب بالغاً ما بلغ فلو استاجر بيتاً سنة بمائة على ان يرمّها المستاجر فعليه اجر مثله بالغاً ما بلغ اذ المرمّة لما شرطت على المستاجر صارت من الاجر وجهل الاجر. اھ (فتاوی کاملیة ص۱۹۹ کتاب الاجارة، مطلب تفسد الاجارة بجهالة الاجر)

ومثلهٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۳۲ باب الاجارة الفاسدة۔

وفی الھندیۃ: وان تکاراھا الی بغداد علی انہا ان بلغتہ بغداد فلہ اجر عشرۃ دراھم والا فلا شیٔ لہ فالاجارۃ فاسدۃ وعلیہ اجر مثلھا بقدر ما سار علیھا۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۴ ص۴۴۳ الفصل الثانی فیما یفسد العقد فیہ لمکان الشرط) لہ

اجارۂ فاسد کی ایک اور صورت

سوال:۔ ایک شخص اپنا تجارتی مال بذریعہ ٹرک بنوں سے لاہور لے جانا چاہتا ہے، ٹرک کے مالک اور مال والے کے درمیان معاہدہ کچھ اس طرح ہوا کہ ٹرک کے مالک کو راستے میں ٹیکس والوں کو ادائیگی رقم کی ذمہ داری قبول کرنے پر دس ہزار روپے ملیں گے ورنہ بصورتِ دیگر صرف پانچ ہزار روپے کرایہ کے ملیں گے۔ کیا ایسا عقدِ اجارہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ یہ اجارہ فاسد ہے اور اجارۂ فاسد کا حکم یہ ہے کہ ایسی مزدوری جتنی اُجرت مروّج ہو وہ دی جائے گی اور جو کچھ طے ہوا ہے وہ نہ دیا جائے گا، لیکن اگر مروّج زیادہ ہو اور فریقین کے درمیان طے شدہ اجرت کم ہو تو طے شدہ اجرت ہی دی جائے گی۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: (تفسد الاجارۃ بالشروط المخالفۃ لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع) مما مر (یفسدھا) کجھالۃ ماجور او اُجرۃ او مُدۃ او عمل وکشرط طعام عبد وعلف دابۃ ومرمۃ الدار او مغارمھا وعشر او خراج او مُؤنۃ۔ (رد المحتار ج۶ ص۴۶/۴۷ باب الاجارۃ الفاسدۃ) ۲ہ

حیوان کو نصف پر رکھنا

سوال:۔ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کو گائے یا بھینس کا بچہ اس شرط پر دے کہ وہ اس کی تربیت کرے اور پالے پوسے اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اسے فروخت کر کے قیمت آپس میں برابر برابر تقسیم کریں گے، کیا ایسا

لہ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وان بلغت بغداد فلہ کذا والا فلا شیٔ لہ فھی فاسدۃ وعلیہ اجر مثل ما سار علیھا۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ باب الاجارۃ الفاسدۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۳۱۷ باب الاجارۃ الفاسدۃ۔

۲ہ وفی الھندیۃ: والاجارۃ تفسدھا الشروط التی لا یقتضیھا العقد کما اذا شرط علی الاجیر الخاص ضمان ما تلف بفعلہ الخ (الفتاویٰ الھندیہ ج ص۴۴۲ الفصل الثانی فیما یفسد العقد فیہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ باب الاجارۃ الفاسدۃ۔

عقد اجارہ کرنا شرعاً جائز ہے؟ اور اگر ناجائز ہے تو پھر جواز کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

الجواب:۔ یہ اجارہ قفیز الطحان کے حکم میں ہے، لہٰذا اس پر اجارۂ فاسدہ کا حکم لگایا جائے گا۔ لعدم تعیین الاجرۃ ولعدم تعیین المدۃ۔ جانبین کو چاہیئے کہ مدت اور اجرت کی تعیین کریں اور مدت ختم ہونے کے بعد اجیر کو متعین قیمت کے عوض نصف گائے دی جائے۔

وفی الھندیۃ: دفع بقرۃ الی رجل علیٰ ان یعلفھا وما یکون من اللبن والسمن بینھما انصافاً فالاجارۃ فاسدۃ وعلیٰ صاحب البقرۃ للرجل اجر قیامہ وقیمۃ علفہ ان علفھا من علف۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۴۵ کتاب الاجارۃ۔ الفصل الثالث فی قفیز الطحان وماھو فی معناہ) [۱]

مزدوری میں زمین دینا

سوال:۔ کیا مزدور کو مزدوری کے عوض میں زمین دینا جائز ہے جبکہ عقد میں رقم دینا طے کیا گیا ہو؟

الجواب:۔ عقد اجارہ کی اجرت میں ہر وہ چیز دینا جائز ہے جو مال متقوم ہو لہٰذا مزدور کو مزدوری میں زمین دینا جائز ہے اگرچہ ابتداءِ عقد میں رقم دینے کا معاہدہ ہی ہو چکا ہو۔

وفی الھندیۃ: وماصلح ان یکون ثمناً فی البیع کالنقود والمکیل والموزون صلح ان یکون اجرۃ فی الاجارۃ ومالا یصلح ثمناً لا یصلح اُجرۃ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۱۱ کتاب الاجارۃ فی الباب الاول) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ: وفی فتاوی النسفی رجل دفع بقرۃ الی رجل بالعلف مناصفۃ وھی التی بالفارسیۃ کاو نیم سود بان دفع علیٰ ما یحصل من اللبن والسمن بینھما نصفان فھٰذا فاسد والحادث کلہ لصاحب البقرۃ والاجارۃ فاسدۃ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۱۱۴ کتاب الاجارات، ومایتصل بھٰذا)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۵ ص۳۷ کتاب الاجارۃ، النوع الثالث فی الدواب۔

[۲] قال العلامۃ خالد الاتاسیؒ: ماصلح بدلاً فی البیع یصلح بدلاً فی الاجارۃ۔

(مجلۃ الاحکام مادۃ ۴۶۳ ص۲۶ فی بدل الاجارۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۹۸ کتاب الاجارۃ۔

اجارہ میں زمیندار کو کاشت کی عام اجازت دینا

سوال:- اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی زمین بایں طور عقدِ اجارہ پر دیدے کہ آپ جو چاہیں اس میں کاشت کریں، تو کیا از روئے شرع ایسا عقد کرنا جائز ہے؟

الجواب:- عقدِ اجارہ میں اگرچہ فصل وغیرہ کا تعین کرنا ضروری ہے بدون تعین کے اجارہ فاسد ہوگا، لیکن اگر مؤجر نے مستاجر کو اس بات کی عام اجازت دی ہو کہ وہ جو چاہے اس میں کاشت کرسکتا ہے، تو اس صورت میں شرعاً یہ اجارہ صحیح اور درست متصور ہوگا۔

وفی الهندية: ولا بد فی اجارة الاراضی من بیان مایستاجر له من الزراعة والغرس والبناء وغیر ذلک فان لم یبین کانت الاجارة فاسدة الا اذا جعل له ان ینتفع بما شاء هکذا فی البدائع۔ (الفتاوی الهندية ج۴ ص۴۴۰ کتاب الاجارة۔ الباب الخامس عشر فی بیان ما یجوز من الاجارة وما لا یجوز) [۱]

اجارہ علی الاجارہ جائز ہے بشرطیکہ اپنے مؤجر پر نہ ہو

سوال:- بعض علاقوں میں رواج ہے کہ ایک آدمی کسی زمیندار سے نصف آمدن پر زمین اجارہ کرتا ہے اور پھر اس زمین کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ دو تہائی پر اجارہ کرتا ہے، دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا اجارہ پر لی ہوئی زمین کسی دوسرے شخص کو اجارہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مستاجر کے لیے اجارہ علی الاجارہ جائز ہے بشرطیکہ اپنے مؤجر کے ساتھ نہ ہو اور اُجرتِ اولیٰ یا اس سے کم پر ہو، اور اگر اجرتِ اولیٰ سے زیادہ پر ہو تو اضافی رقم کو فقراء پر تصدق کردے۔ ہاں دو صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: اوّل یہ کہ اجارہ ثانیہ خلافِ جنس

---

[۱] قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله: ولا يصح العقد حتى يسمى ما يزرع فيها لانها قد تستاجر للزراعة ولغيرها وما يزرع فيها متفاوت فلا بد من التعيين كی لا يقع المنازعة او يقول ان يزرع فيها ما شاء لانه لما فوّض الخيرة اليه ارتفعت الجهالة المفضية الى المنازعة۔ (الهداية ج۳ ص۲۹۶ کتاب الاجارات، باب ما يجوز من الاجارة وما يكون خلافاً فيها)

ومثلُهٗ فی فتاوی الكاملية ص۱۹۱ کتاب الاجارة۔

پر ہو، دوم یہ کہ مستاجر اجارہ کی ہوئی چیز کی اصلاح کرے، مثلاً اگر مکان ہو تو اس کی مرمت اور سفیدی وغیرہ کرے یا زمین ہو تو اس کی نالیوں وغیرہ کو ٹھیک کرے۔ ان دو صورتوں میں اجارۂ دوم اجارۂ اول سے زیادہ پر بھی جائز ہے۔

وفی الهندية: واذا استاجر دارًا وقبضها ثم اجرها فانه يجوز ان اجرها بمثل مااستاجرها واقل وان آجرها باكثر مما استاجرها فهي جائزة ايضًا الا انه ان كانت الاجرة الثانية من جنس الاجرة الاولى فان الزيادة لا تطيب له ويتصدق بها وان كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة ولو زاد في الدار زيادة كما لو وتد فيها وتدًا او حفر فيها بيرًا او اصلح ابوابها او شيئًا من حوائطها طابت له الزيادة -
(الفتاویٰ الهندية ج ۴ ص۴۲۵ کتاب الاجارة. الباب السابع فی اجارة المستاجر) [1]

مستاجر یا مؤجر کی موت سے اجارہ کا ختم ہونا

سوال:- اگر دو آدمیوں کے درمیان چند سالوں کے لیے کوئی عقدِ اجارہ ہو جائے لیکن اسی مدت کے اندر مؤجر یا مستاجر کی موت واقع ہو جائے تو کیا اس کے بعد بھی عقدِ اجارہ باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب:- اگر متعاقدین نے عقدِ اجارہ اپنے لیے کیا ہو تو دونوں میں کسی ایک کی موت واقع ہو جانے سے عقدِ اجارہ فسخ ہو جائے گا لہٰذا ان کے پسماندگان کیلئے عقد کی تجدید ضروری ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: واذا مات احد المتعاقدين وقد عقد الاجارة لنفسه انفسخت الاجارة - (الهداية ج ۳ ص۳۱۳ کتاب الاجارة ـ باب فسخ الاجارة) [2]

---

[1] قال ابن عابدينؒ: (قوله المستاجر ان يوجر الخ) اى ما استاجره بمثل الاجرة الاولى او بانقص فلو باكثر تصدق بالفضل الا فی مسئلتين كما مر اول باب ما يجوز من الاجارة. (رد المحتار ج ۶ ص۹۱ مسائل شتى مطلب فی اجارة المستاجر.... الخ)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوىٰ ج ۳ ص۱۲۵ کتاب الاجارات فی الجنس الثانی۔

[2] قال العلامة ابوالبركات النسفیؒ: وتنفسخ بموت احد المتعاقدين ان عقدها لنفسه وان عقدها لغيره لا۔ (كنز الدقائق ص۳۱۳ کتاب الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۸۳ کتاب الاجارة۔

جعلی سند پر بھرتی ہونے والے ملازم کی تنخواہ کا حکم

سوال:۔ حکومت نے سکولوں میں دینیات پڑھانے کے لیے اساتذہ کی بھرتی کا اشتہار شائع کیا اور یہ شرط لگائی کہ امیدوار کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو، اس پر ایک شخص نے کسی دینی مدرسے کے مہتمم کو پیسے دے کر اپنے نام کی جعلی سند لے لی اور انٹرویو کے دوران پیش کرکے بھرتی ہوگیا، تو کیا اس طرح بھرتی ہونے والے اس استاد کو حکومت کی طرف سے جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ اس کے لیے شرعاً حلال ہے یا حرام؟

الجواب:۔ عقد اجارہ سے ملنے والی اُجرت کی حلت کا دارومدار اس کام کا اہل ہونے پر ہے، لہٰذا مذکورہ شخص اگر مفوضہ ڈیوٹی کا اہل ہو تو تنخواہ حلال ہوگی ورنہ حرام، لیکن دھوکہ دہی رشوت دینے اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے گنہگار ضرور ہوگا۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: واما رکنها فهو الایجاب والقبول والارتباط بینهما واما شرط جوازها فثلاثة اشیاء اجر معلوم وعین معلوم وبدل معلوم ومحاسنها دفع الحاجة بقلیل المنفعة واما حکمها فوقوع الملك فی البدلین ساعة فساعة ـ

(البحر الرائق ج ۸ ص۳ کتاب الاجارة) [۱]

امام مسجد میں اہلیت نہ ہو تو اُسے معزول کیا جاسکتا ہے

سوال:۔ ایک شخص کافی عرصے سے ایک مسجد کا امام چلا آرہا ہے لیکن اب اس کے مقتدیوں میں سے بعض لوگ اسے امامت سے معزول کرنا چاہتے ہیں، تو کیا ان کو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی امامت اجارہ کے حکم میں ہے، اگر اجیر میں ذمہ داری ادا کرنے کی صلاحیت نہ رہے تو اجارہ فسخ کرنا جائز ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاوی الصغری رجل استاجر

---

[۱] قال العلامة ابن البزازؒ: لایجوز عقدها حتی یعلم البدل والمنفعة وبیان المنفعة باحد ثلاث بیان الوقت وهو الاجل وبیان العمل والمکان فالاجر ببیان النقد ـ

(البزازیة علی هامش الهندیة ج ۵ ص۱ کتاب الاجارات)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۳ ص۱۰۳ کتاب الاجارة ـ

رَجُلاً لیعلّمہ حرفۃ کذا ھٰذہ السنۃ فمضی نصف السنۃ و لم یعلّمہ شیئاً فللمستاجر ان یفسخ الاجارۃ ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۳ ص ۱۲۱ کتاب الاجارۃ الفصل السابع فی فسخ الاجارۃ) لہ

امامتِ مسجد اور تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کا حکم

سوال:۔ کیا مسجد کی امامت اور تعلیم قرآن پر اُجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ امام ابوحنیفہؒ طاعات پر اجرت لینے کو ناجائز کہتے ہیں، لیکن یہ اُس دور کی بات ہے جب اہلِ علم اور خادمینِ دین کی معاشی ضروریات بیت المال سے پوری کی جاتی تھیں لیکن بعد میں جب حکومتوں کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو گیا تو فقہاء کرام نے تعلیمِ قرآن اور شعائرِ دینیہ کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے اُجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیدیا تاکہ دین کے یہ خادم دنیا کے دیگر کاموں سے ہٹ کر دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینی کام میں لگے رہیں۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ :۔ وبعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لانہ ظھر التوانی فی الامور الدینیۃ ففی الامتناع یضیع حفظ القرآن وعلیہ الفتوی ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۳۰۱ کتاب الاجارات) ؎۲

لہ وفی الھندیۃ، واذا استاجر استاذاً لیعلّمہ ھذا العمل فی ھذہ السنۃ فمضی نصف السنۃ فلم یعلّمہ شیئاً فللمستاجر ان یفسخ ما رأیت روایۃ فی ھذا لکن افتی الشیخ الامام علی الاسبیجابی فافتیت انا ایضاً، کذا فی الصغری ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۴ ص ۴۶۲ کتاب الاجارۃ ۔ الباب التاسع عشر)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۵ ص ۳۹ کتاب الاجارۃ نوع فی تعلیم القرآن والحرف ۔

لہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ : اعلم ان علامۃ کتب المذھب من متون وشروح وفتاوی کلھا متفقۃ علی ان الاستیجار علی الطاعات لا یصح عندنا واستثنی المتاخرون من مشائخ بلخ تعلیم القرآن فجوزوا الاستیجار علیہ و عللوا ذلک فی شروح الھدایۃ وغیرھا بما مر و بالضرورۃ وھی خوف ضیاع القرآن لانہ انقطعت العطایا من بیت المال وعدم الحرص علی الدفع بطریق الحسبۃ لیشتغلوا بہ معلمون بہ بمعاشھم ولا یعلمون احداً ولضیع القرآن فافتی المتاخرون بالجواز لذلک ۔

(تنقیح الحامدیۃ ج ۲ ص ۱۳۷ ۔ الفتوی علی جواز الاجارۃ علی تعلیم القرآن)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق ص ۳۶۴ کتاب الاجارۃ ۔

نکاح خوانی پر اُجرت لینے کا مسئلہ

سوال:- کیا نکاح پڑھانے پر اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: نکاح پڑھنے پر اُجرت لینا فقہاءِ کرام کے ہاں مختلف فیہ ہے، چونکہ اس میں ایک گونہ تعلیم و تلقین بھی ہے اور تعلیم و تلقین پر اجرت لینا مفتیٰ بہ قول کے مطابق جائز ہے اس لیے فقہاءِ کرام نے اس میں اجرت کے جواز کو قولِ راجح قرار دیا ہے لہٰذا بناء برایں نکاح پڑھنے پر اُجرت لینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

قال العلامة قاضیخان رحمه الله: اختلف المشائخ فی الدلالة فی النکاح هل یکون لها الاجر قال الشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل رحمه الله لا اجر لها لانه لا منفعة للزوج من کلامها بغیر عقد و انما منفعة الزوج فی العقد والعقد ما قام بها وقال غیره من المشائخ لها اجر مثلها لان معظم الامر فی النکاح یقوم بالدلالة فان النکاح لا یکون الا بمقدمات تکون من الدلالة فکان لها اجر المثل بمنزلة الدلال فی البیع فانه یستحق الاجر۔ (الفتاویٰ قاضیخان ج۳ ص۲ باب الاجارة الفاسدة) [1]

اجیرِ خاص کو ڈیوٹی کے اوقات میں کوئی دوسرا کام کرنا جائز نہیں

سوال:- زید ایک سکول ٹیچر ہے کیا وہ سکول ڈیوٹی کے دوران کسی قریبی مسجد میں امامت کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: سکول ٹیچر چونکہ اجیرِ خاص ہوتا ہے اور اجیرِ خاص کے لیے ڈیوٹی کے اوقات میں دوسری ملازمت کرنا جائز نہیں، ورنہ اس کی تنخواہ سے بقدرِ غیر حاضری کے کٹوتی کی جائے گی۔ البتہ چھٹی یا تفریح کے وقت میں اگر وہ کوئی دوسرا کام کرنا چاہے تو بلا شک کر سکتا ہے، تاہم مذکورہ بالا صورت میں اگر اس کا عملِ تدریس متاثر نہیں

---

[1] وفی الهندیة: الدلالة فی النکاح لا تستوجب الاجر وبه یفتی الفضلی فی فتاواه وغیره من مشائخ زماننا کانوا یفتون بوجوب اجر المثل وبه یفتی کذا فی جواهر الاخلاطی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۴۵۱ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا کان المستاجر مشغولا لغیره) ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۱۱۷ کتاب الاجارة۔

ہوتا ہو تو امامت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولیس للخاص ان یعمل لغیرہ ولو عمل نقص من اجرتہ بقدر ما عمل فتاوی نوازل۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ باب ضمان الاجیر)[1]

اجیرِ خاص اپنا کام دوسرے آدمی سے نہیں کرا سکتا

سوال:۔ زید ایک سکول ٹیچر ہے لیکن بجائے زید کے اس کا بھائی عمرو سکول میں ڈیوٹی دیتا ہے، تو کیا زید کا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں زید اجیرِ خاص ہے اور اجیرِ خاص شرعاً کسی دوسرے شخص سے اپنا کام نہیں کرا سکتا ورنہ کسی حادثہ کی صورت میں تمام تر ذمہ داری اس کی ہوگی، لہٰذا زید کے لیے ایسا کرنا ناجائز ہے۔

قال العلامۃ خالد اتاسیؒ: الاجیر الذی استوجب علی ان یعمل بنفسہ لیس لہ ان یستعمل غیرہ مثلاً لو اعطی احد جبۃ لخیاط علی ان یخیطھا بنفسہ بکذا دراھم فلیس للخیاط علی ان یخیطھا لغیرہ بل یلزم ان یخیطھا بنفسہ وان خاطھا بغیرہ وتلفت فھو ضامن۔ (مجلۃ الاحکام، مادۃ ۵۷۱ ص۳۰ الفصل الرابع فی اجارۃ الآدمی)[2]

اجیرِ خاص کا استحقاق

سوال:۔ اگر کسی علاقے کے سرکاری سکول میں طلباء نہ ہوں اور وہاں اساتذہ کا تقرر ہو چکا ہو جبکہ اساتذہ طلباء کی عدم موجودگی کی وجہ سے سکول حاضر نہیں ہوتے، تو کیا ان اساتذہ کو گورنمنٹ سے

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: وانما سمی اجیر وحد لانہ لا یمکنہ ان یعمل لغیرہ لان منافعہ فی المدۃ صارت مستحقۃ لہ والاجر مقابل بالمنافع ولھذا یبقی الاجر مستحقاً وان نقص العمل۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۱۱ کتاب الاجارات، باب ضمان الاجیر)

وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لسلیم، مادۃ ۴۲۲ ص۲۳۹ الکتاب الثانی فی الاجارۃ۔ الباب الاول

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: واذا شرط علی الصانع ان یعمل بنفسہ فلیس لہ ان یستعمل غیرہ لان المعقود علیہ اتصال العمل فی محل بعینہ فیستحق عینہ کالمنفعۃ فی محل بعینہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۹۶ کتاب الاجارات۔ باب الاجر متی یستحق)

وَمِثْلُہٗ فی العنایۃ علیٰ ھامش فتح القدیر ج۸ ص۲۱

تنخواہ لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ سکولوں کے اساتذہ اجیرِ خاص کے حکم میں ہوتے ہیں لہٰذا سکولوں میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہونے کی وجہ سے ہی تنخواہ کے مستحق ہوں گے، بصورتِ دیگر عدمِ حاضری کی وجہ سے تنخواہ لینے کے حقدار نہیں ہوں گے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله:۔ والاجير الخاص الذى يستحق الاجرة بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة او لرعى الغنم۔

(الهداية ج۳ ص۳۰۸ كتاب الاجارات۔ باب ضمان الاجير) ؎

ملازم کے لیے مفوضہ ڈیوٹی کے علاوہ کوئی اور کام کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص فوج میں ملازم ہے، عموماً عصر کی نماز کے وقت افسرانِ بالا کی جانب سے گراؤنڈ میں حاضر ہونے کا حکم ہوتا ہے، چنانچہ ایک طرف نماز باجماعت کی فضیلت اور دوسری جانب افسروں کا حکم ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو نمازِ عصر سے پہلے گراؤنڈ میں پہنچنے کا حکم ملتا ہے، اس صورت میں اگر چند فوجی جوان مل کر کمرے میں ہی جماعت سے نماز پڑھ لیں تو عنداللہ گنہگار تو نہیں ہونگے؟

الجواب:۔ ایسے شخص کے لیے ڈیوٹی کے معین وقت پر پہنچنا ضروری ہے، تاہم اگر مسجد کی جماعت نہ ملے تو چند افراد مل کر کمرے میں ہی جماعت سے نماز پڑھ لیں تو درست ہے لیکن فرض نماز چھوڑنا بھی جائز نہیں اور نہ ہی وقت سے پہلے نماز پڑھنا جائز ہے اس لیے کہ ملازم کو ڈیوٹی کے اوقات میں فرائض کے علاوہ دیگر امور میں مشغول رہنا صحیح نہیں ہے۔

وفى الهندية: وفى الفتاوى الفضلى رحمه الله:۔ اذا استاجر رجلاً يوماً يعمل كذا فعليه ان يعمل ذلك العمل الى تمام المدة ولا يشتغل بشئ آخر سوى المكتوبة

؎ قال العلامة ابو البركات النسفى رحمه الله:۔ والخاص يستحق الاجر بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة او لرعى الغنم۔

(كنز الدقائق ص۳۶۷ كتاب الاجارات۔ باب ضمان الاجير)

ومِثْلُهٗ فى الجوهرة النيرة ج۱ ص۳۲۳ كتاب الاجارة۔

وفی فتاوی اهل سمرقند قد قال بعض مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ ان له یؤدی السنة ایضاً واتفقوا انهٗ لایؤدی نفلاً وعلیه الفتویٰ کذا فی الذخیرة ۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۱۶ کتاب الاجارة۔ الباب الثالث فی الاوقات التی یقع علیها عقد الاجارة) ؎۱

مال چوری ہونے کی صورت میں اجیرِ خاص پر ضمان کا حکم

سوال:۔ زید ایک دوکان کا مالک ہے اور دوکان کا کاروبار چلانے کیلئے اس نے ایک منشی رکھا ہوا ہے، منشی سے کسی نے دھوکہ سے مال چوری کر لیا تو کیا منشی چوری ہونے والے مال کا ضامن ہوگا یا کہ زید یہ نقصان برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ اجیرِ خاص کے ہاتھوں میں مال بحکمِ امانت ہے اور چوری کی صورت میں امین پر ضمان نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں چوری ہونے والا مال کا منشی ضامن نہیں ہے بلکہ سارا بوجھ زید پر ہے۔ تاہم اگر اس چوری میں منشی ملوث ہو تو ضمان لیا جائے گا۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ:۔ والاجیر الخاص امین حتیٰ انهٗ لایضمن المال الذی تلف فی یده بغیر صنعه وکذا لایضمن المال الذی تلف بعمله بلا تعد ایضاً ۔

(مجلة الاحکام، مادة ۶۱۰ ص۳۲۹ الفصل الثالث فی ضمان الاجیر) ؎۲

؎۱ قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله ولیس للخاص ان یعمل لغیره) بل ولا ان یصلی النافلة قال فی التتارخانیة وفی فتاوی الفضلی واذا استاجر رجلا یوماً یعمل کذا فعلیه ان یعمل ذلك العمل الی تمام المدة ولا یشتغل بشئ اٰخر سوی المکتوبة وفی فتاوی سمرقند وقد قال بعض مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ لهٗ ان یؤدی السنة ایضاً و اتفقوا انه لا یؤدی نفلاً وعلیه الفتویٰ ۔ (رد المحتار ج۶ ص۷۰ باب ضمان الاجیر، مطلب لیس للاجیر الخاص ان یصلی النافلة)

وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام مادة ۴۲۶ ص۱۲۰ کتاب الاجارة فی بیان مایدخل فی البیع بدون ذکر صریح ومالا یدخل ۔

؎۲ قال العلامة ابن عابدینؒ:۔ قال فی جامع الفصولین استوجر رجل لحفظ خان او حوانیت فضاع منها شئ قیل ضمن عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ لو ضاع من خارج الحجرة لانهٗ اجیر مشترك وقیل لا فی الصحیح وبه یفتیٰ لانهٗ اجیر خاص ۔

(رد المحتار ج۶ ص۷۱ باب ضمان الاجیر، مطلب فی الحارس والخاناتی)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۳۱۰ کتاب الاجارات، باب ضمان الاجیر ۔

ٹیوب ویل کا پانی اجارہ پر دینے کا حکم

سوال:۔ اگر ٹیوب ویل کے مالک اور مالکِ زمین کے درمیان اس شرط پر عقد ہو جائے کہ مالکِ زمین اپنی زمین کے لیے پانی کے عوض ٹیوب ویل کے مالک کو پچاس روپے فی گھنٹہ دے گا، تو کیا ایسا عقد شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مدت اور اُجرت دونوں متعین ہے اور جب اجرت اور مدت متعین ہو تو ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لہٰذا ایسا معاملہ کرنا درست ہے۔

قال العلامة ابن بزاز الکردریؒ: ولا یجوز عقدھا حتی یعلم البدل والمنفعة وبیان المنفعة باحد ثلاث بیان الوقت وھو الاجل وبیان العمل والمکان فالاجر یبیان النقد وھو علی غالب نقد البلد۔ (الفتاوی البزازیة علی ھامش الھندیة ج۵ ص۱۱ کتاب الاجارات الاول فی المقدمة) [1]

دینی مدارس کے لیے کمیشن پر چندہ کرنا جائز نہیں

سوال:۔ بعض دینی مدارس کے مہتممین حضرات کسی شخص کو چندہ کے لیے بھیجدیتے ہیں جبکہ ان کے درمیان یہ طے ہوتا ہے کہ جمع ہونے والے چندہ میں سے تیسرا حصہ اس سفیر کو ملے گا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عقدِ اجارہ میں یہ ضروری ہے کہ اُجرت متعین ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ کے عقدِ اجارہ میں اُجرت متعین نہیں اس لیے یہ عقد فاسد ہے، البتہ سفیر کو مدرسہ میں ملازم رکھ کر اس کی تنخواہ مقرر کی جائے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: تفسد الاجارة بالشروط المخالفة

---

[1] قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: فی شرح الطحاوی عقد الاجارة لایجوز الا ان یبین البدل من الجانبین جمیعاً اما بیان المنفعة فباحدی معان ثلاثة بیان الوقت وھو الاجل وبیان العمل وبیان المکان اما الاجر ان کان دراھم او دنانیر فالشرط بیان القدر۔

(خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۰۳ کتاب الاجارات، اما الاول فی المقدمة ... الخ)

ومثلہ فی مجلة الاحکام، مادة ۴۵۰ ص۲۵۴ الفصل الثالث فی شروط صحة الاجارة۔

لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع) مما مر (یفسدها کجہالۃ ماجور او اجرۃ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۶ باب الاجارۃ الفاسدۃ) ؎۱

مدرسین دینی وعصری مدارس کیلئے چھٹیوں کی تنخواہ لینا جائز ہے

سوال: مدارس میں ایک معروف طریقہ ہے کہ مدرسین حضرات شعبان کے شروع سے لے کر شوال کے آخر تک چھٹیوں پر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ سال کے درمیان میں بھی کبھی تو باجازتِ مہتمم اور کبھی بغیر اجازت کے چھٹی کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود مہتممین حضرات ان کو باقاعدہ تنخواہ دیتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: ایامِ تعطیلات ایامِ عمل کے تابع ہوتے ہیں اس لیے چھٹیوں کی تنخواہ لینا ناجائز نہیں ہے، جب مدرسہ کے مہتمم اور معطین کے درمیان شرائط طے شدہ ہوں تو دونوں ان شرائط کے پابند ہوں گے لیکن اس میں معطین چندہ کی اجازت قولاً یا حالاً ضروری ہے اس لیے کہ مہتممین حضرات ان معطین کے وکیل ہوتے ہیں، اور اگر معطین کی اجازت ورضا نہ ہو تو مہتمم اپنے گھر سے تنخواہ دے گا۔ البتہ بیماری، عیدین اور دوسری ضروریات کی چھٹیوں کے بارے میں اگر مدرسہ کا کوئی مدوّن قانون ہو تو اس پر عمل درآمد ہوگا ورنہ جو عمل اور رویہ اہلِ مدارس کے نزدیک معروف ہو اُس پر عمل ہوگا اور معروف یہ ہے اساتذہ سے چھٹیوں کی تنخواہ نہیں کاٹی جاتی، تاہم جانبین پر لازم ہے کہ تنخواہ دیتے اور لیتے وقت اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ومنھا البطالۃ فی المدارس کایام الاعیاد ویوم عاشوراء

؎۱ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وقد ضبطہ الشیخ ابوالحسن الکرخیؒ فی مختصرہ فقال اذا کان ماوقع علیہ عقد الاجارۃ مجہولاً فی نفسہ او فی اجرۃ او فی مدۃ الاجارۃ او فی العمل المستاجر علیہ فالاجارۃ فاسدۃ وکل جہالۃ تدخل فی البیع فتفسدہ من جہۃ الجہالۃ فکذلک ھی فی الاجارۃ۔ اھ

(البحر الرائق ج ۷ ص۳۱۲ باب الاجارۃ الفاسدۃ)

ومِثلُہٗ فی فتاویٰ کاملیۃ ص۱۹۲ کتاب الاجارۃ۔

وشهر رمضان فی درس الفقه لما رها صریحة فی کلامهم والمسئلة فیها علیٰ وجهین فان کانت مشروطة لم یسقط من المعلوم شیء والا فینبغی ان یلحق ببطالة القاضی و قد اختلفوا فی اخذ القاضی ما رتب من بیت المال فی یوم بطالته ۔

(الاشباہ والنظائر ص۹۵) ۱؎

مسلمان کا کفّار کے ساتھ نوکری کرنے کا حکم

سوال:۔ آجکل اکثر مسلمان امریکہ، برطانیہ اور جاپان وغیرہ ممالک میں نوکری کی غرض سے جاتے ہیں اور وہاں کافروں کے ساتھ نوکری کرتے ہیں، کیا کسی مسلمان کو کفّار کے ساتھ نوکری کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے ایک مسلمان کی عزّت وعظمت کا بہت خیال رکھا ہے اس لیے مسلمانوں کو بھی اپنی عزّتِ نفس کا خیال رکھنا چاہیئے، اس بناء پر جس نوکری میں ایک مسلمان کی تذلیل وتنقیص ہوتی ہو تو وہ اس کو نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر ایک مسلمان کو کسی کافر کے ہاں کوئی ایسی نوکری ملتی ہو جس میں اس کی اہانت اور ذلّت نہ ہوتی ہو تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں اگرچہ خلافِ اولیٰ ضرور ہے۔

قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ :۔ ولو استأجر ذمی مسلما لیخدمه ذکر فی الاصل انه یجوز واکره للمسلم خدمة الذمی اما الکراهة فلان الاستخدام استذلال فکان اجارة المسلم نفسه منه اذلالا لنفسه ولیس للمسلم ان یذل نفسه خصوصاً بخدمة الکافر۔ (بدائع الصنائع ج۴ ص۱۸۹ فصل واما شرائط الرکن) ۲؎

۱؎ قال العلامة ابن عابدینؒ: حیث کانت البطالة فی یوم الثلاثاء والجمعة وفی رمضان والعیدین یحل الاخذ وکذا لو بطل فی یوم غیر معتاد لتحریر درس الا اذا نص الواقف علی تقیید الدفع بالیوم الذی یدرس فیه ۔ قال الفقیه ابو اللیث من یأخذ الاجر من طلبة العلم فی یوم لا درس فیه ارجو ان یکون جائزاً۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۴۱۲ کتاب الوقف)

ومثله فی شرح المجلة لرستم باز۔ المادة ۴۹۵ ص۲۷۲ الفصل الرابع فی اجارة الآدمی)

۲؎ قال العلامة قاضیخانؒ: مسلم آجر نفسه من نصرانی ان استأجره لعمل غیر الخدمة جاز وان آجر نفسه للخدمة قال الشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل لا یجوز، وذکر القدوری انه یجوز ویکره له خدمة الکافر۔ (الفتاوی قاضی خان ج۳ ص۱۸ کتاب الاجارات)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارات، الفصل العاشر فی الحظر والاباحة۔

ریڈیو کی مرمت پر اُجرت لینے کا حکم

سوال:۔ ریڈیو جو کہ عموماً گانے بجانے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بسا اوقات اس میں قرآن مجید کی تلاوت، دینی تقاریر اور خبریں بھی نشر کی جاتی ہیں، اگر وہ خراب ہو جائے تو کیا اس کی درستگی پر مکینک کو اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ریڈیو اپنے اصل کے لحاظ سے ناجائز نہیں ہے اس کو اصلاحی، سائنسی، معلوماتی اور تربیتی مقاصد کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور جو چیز فی نفسہٖ برائی کے لیے نہ ہو مگر لوگ اس کو برائی کے لیے استعمال کرتے ہوں تو فقہاء نے اس کی خرید و فروخت اور اس پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، ہاں اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اس کو (ریڈیو کو) گانے بجانے اور خرافات کیلئے استعمال کرتا ہے تو اس کی مرمت بھی ناجائز ہے اور اس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے۔

قال العلامۃ ابن بزاز الکردریؒ: ولا تجوز الاجارۃ علی الغناء والنوح ولو عمل لا اجر لہٗ۔ (البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ ج۵ ص۳۷ نوع فی المتفرقات وفیہ الاجارۃ علی المعاصی) [1]

بیل کی گائے سے جفتی کرانے پر اُجرت لینا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں بعض لوگ گائے کی جفتی کرنے کے لیے بیل پالتے ہیں اور اس پر متعین اُجرت لیتے ہیں، کیا یہ اُجرت لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ اُجرت کے جواز کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہو وہ اس شخص کی ملکیت ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں گائے کا حمل ٹھہرانا کسی کے بس کی بات نہیں اس لیے اس پر اُجرت لینا ناجائز ہے، اس کے علاوہ احادیث مبارکہ میں بھی اس سے منع کیا گیا ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ:۔ یعنی لا یجوز اخذ اُجرۃ عساب التیس لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا تصح الاجارۃ لعسب التیس) وھو نزوۃ علی الاناث (و) لا (لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاھی) ولو اخذ بلا شرط یباح۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۳۸ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی)

ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج۴ ص۱۸۹ کتاب الاجارۃ۔

ان من السحت عسب التيس ومهر البغي ولانهٗ عمل لا يقدر عليه وهو الاحبال فلا يجوز اخذ الأجرة عليه ولا اخذ المال بمقابلة العار وهو نجس لا قيمة له فلا يجوز والمراد هنا استيجار التيس لينذو على الغنم و يحبلها يا جرة.

(البحر الرائق ج ۸ ص۱۹ باب الاجارة الفاسدة) ؎۱

فوٹوگرافی پر اجرت لینا

سوال :- فوٹوگرافی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کو ذریعۂ معاش بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- کسی بھی جاندار کی تصویر بنانا یا بنوانا سخت گناہ کا کام ہے، البتہ اشد ضرورت (یعنی عمرہ یا حج کے لیے پاسپورٹ وغیرہ بنوانے کے لیے) کے موقع پر رخصت ہے مگر پھر بھی اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے ۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله :- ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنوح وكذا سائر الملاهي لانهٗ استيجار على المعصية والمعصية لا تستحق بالعقد ۔

(الهداية ج ۳ ص۳۰۳ كتاب الاجارات) ؎۲

قلنگ وصول کرنا

سوال :- بعض علاقوں میں مال مویشی والے لوگ کسی کے پہاڑ یا زمین پر جاکر قیام کرتے ہیں اور اپنے مویشیوں کو چراتے ہیں جبکہ گاؤں والے یا مالکانِ اراضی "قلنگ" کے نام سے کچھ رقم ان سے وصول کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر قلنگ خودرو گھاس کا معاوضہ ہے تو پھر جائز نہیں کیونکہ اس میں مالک کی محنت کو کوئی دخل نہیں، اور اگر مملوکہ زمین یا پہاڑ پر رہائش اور قیام کرنے کا معاوضہ ہو تو باقاعدہ عقدِ اجارہ کی صورت میں یہ مال جائز رہے گا ۔

؎۱ قال العلامة ابن عابدينؒ : (قوله لا تصح الاجارة لعسب التيس) لانه عمل لا يقدر عليه وهو الاحبال ۔ (ردالمحتار ج ۶ ص۵۵ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی)

ومثلهٗ فی الهداية ج ۳ ص۳۰۳ کتاب الاجارات۔

؎۲ قال العلامة ابوالبركات النسفيؒ ، ولا يجوز على الغناء والنوح والملاهي ۔

(كنز الدقائق ص۳۶۴ كتاب الاجارات)

ومثلهٗ فی ردالمحتار ج ۶ ص۵۵ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وتصح اجارة ارض لبناء وغرس وسائر الانتفاعات کطبخ آجر وخزف ومقیل ومراح والمقیل مکان القیلولة والمراح بالضم مأوی الماشیة حتی تلزم الاُجرة بالتسلیم امکن زراعتها ام لا۔ (ردالمحتار ج۶ ص۳۰ باب ما یجوز من الاجارة وما یکون خلافاً فیها) [1]

بینک کی چوکیداری کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا بینک کی چوکیداری کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بینکوں کا موجودہ نظام اگرچہ سودی نظام ہے جو شرعاً ممنوع ہے، مگر چوکیداری کا تعلق چونکہ براہِ راست بینک کے سودی معاملات سے نہیں ہے، اس لیے بینک کی چوکیداری میں کوئی حرج نہیں تاہم اگر ہو سکے تو اجتناب ہی کیا جائے۔

وفی الهندیة: مسلم آجر من مجوسی لیوقد النار لا بأس به کذا فی الخلاصة۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۵۰ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا کان المستاجر…الخ) [2]

بینک کی ملازمت کرنا

سوال:۔ کیا بینک کی ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ آجکل اکثر بینکوں میں سودی کاروبار کا طریقہ رائج ہے جبکہ قرآن وسنت میں سود کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں اور سودی معاملات کے لکھنے، لکھوانے اور شہادت دینے والوں کو بھی سود خوروں کے برابر قرار دیا ہے، اس بناء پر بینک کا ملازم یا تو کاتبین میں سے ہوگا یا شاہدوں میں سے ہوگا جو کہ لعنت کے زمرے میں

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ رحمه الله: فاذا عرفت ذلک ظهر لک صحة الاجارات الواقعة فی زماننا من ان یستأجر الارض مقیلاً ومراحاً قاصداً بذلک الزام الاجر لتمکن منها مطلقاً سواء شملها الماء وامکن زراعتها ام لا۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۱ باب ما یجوز من الاجارة وما یکون خلافاً فیها)

وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام، تحت المادة ۴۸۲ ص۲۷۱ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بمدة الاجارة۔

[2] قال العلامة سراج الدینؒ: آجر نفسه من مجوسی لیوقد له النار لا بأس۔ (فتاوی سراجیة علی هامش قاضیخان ص۱۲۱ کتاب الاجارة۔ باب ما یکره من الاجارة وما لا یکره)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۲۹ کتاب الاجارة الفصل العاشر فی الحصر والاباحة۔

داخل ہے، اس لیے بینک کی ملازمت سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔

لما ورد فی الحدیث: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا ومؤکلہ قال قلت وکاتبہ وشاھدیہ قال انما نحدث بما سمعنا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۲۷ باب الربٰوا) [1]

خلافِ شرع کام کرنے کی اُجرت لینا

سوال:۔ کیا حجامت کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس میں داڑھی کو مونڈنے اور انگریزی طرز کے بال بنانے پڑتے ہیں اور اس پر اجرت بھی لی جاتی ہے۔ اس مسئلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ حجامت کا پیشہ اختیار کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، البتہ سر کے بال خلافِ شرع بنانا اور داڑھی منڈھانا گناہ ہے اور گناہ کے کام پر کمائی حرام ہے، لہٰذا اس قسم کے ناجائز کاموں سے پرہیز ہی کیا جائے۔

قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولا یجوز الاستیجار علی شیء من الغناء والنوح والمزامیر۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج ۳ ص۱۱۶ کتاب الاجارات جنس اٰخر فی المتفرقات) [2]

تعویذ پر اُجرت لینا جائز ہے

سوال:۔ اگر برکت، بیماری سے شفا یا کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے قرآنِ مجید کی کوئی آیت لکھ کر تعویذ بنا دیا جائے تو کیا اس پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہاء کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ تعویذات پر اُجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ تعویذ خلافِ شرع امور کے لیے نہ ہو۔

---

[1] لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ قال قلت وکاتبہ وشاھدیہ قال انما نحدث بما سمعنا وقال ھم سواء۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص۲۴۴ باب الربٰوا)
وَمِثْلُہٗ فی الصحیح البخاری ج ۲ ص۸۸۱ کتاب اللباس، باب من لعن المصور۔

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاھی لانہ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق بالعقد۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۳۰۱ باب الاجارۃ الفاسدۃ)
وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج ۶ ص۵۵ باب الاجارۃ الفاسدۃ۔

قال العلامة ابن عابدینؒ :لان المتقدمین المانعین الاستیجار مطلقاً جوز والرقیة بالاجرة ولو بالقرآن کما ذکرہ الطحاوی لانها لیست عبادة محضة بل من التداوی۔
(رد المحتار ج۶ ص۵۵ باب الاجارة الفاسدة۔مطلب تحریر مہم فی عدم جواز الاستیجار..الخ) [۱]

دلالی کی اجرت لینا جائز ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل کاروباری حلقوں میں دلالی کا رواج بہت زیادہ ہے اور اس پر اُجرت بھی لی جاتی ہے، تو کیا دلالی کی اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دلالی پر اُجرت لینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک مختلف فیہ ہے مگر مجبوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قولِ جواز پر فتویٰ دیا گیا ہے بشرطیکہ اُجرت معیّن ہو اور دیگر مفاسد سے خالی ہو۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : وفی الدلال والسمسار یجب اجرالمثل وما تواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا فذاك حرام علیهم۔وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن اُجرة السمسار فقال ارجوا انه لا بأس به وان کان فی الاصل فاسدا لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس الیه کدخول الحمام۔ (ردالمحتار ج۶ ص۶۳ باب الاجارة الفاسدة۔مطلب فی اُجرة الدلال)۔ [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله :۔ واما حدیث الرهط الذین رقوا لدیغا بالفاتحة واخذ والجعلا فسألوا النبی صلی الله علیه وسلم فقال احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب الله فمعناه اذا رقیتم به کما نقله العینی فی شرح البخاری عن بعض اصحابنا وقال ان الرقیة بالقرآن لیست بقربة ای لان المقصود بها الاستشفاء دون الثواب۔
(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۳۹ کتاب الاجارة)
وَمِثْلُهٗ فی صحیح البخاری ج۲ ص۸۵۴ باب الرقی بالقرآن والمعوذات)

[۲] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : وفی الاصل اجرة السمسار والمغاری والحمامی والصکاك ومالا تقدیر فیه للوقت ولا مقدار لما یستحق بالعقد لکن للناس فیه حاجة جاز وان کان فی الاصل فاسداً۔ (خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۱۶ کتاب الاجارات۔جنس اٰخر فی المتفرقات)
وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۳ کتاب الاجارات۔

ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے

سوال:۔ سکولوں کے اساتذہ نے حکومت کو اپنے کچھ مطالبات پیش کئے لیکن حکومت نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کردیا، بار بار کی یاددہانی کے باوجود بھی حکومت نے نہ مانا تو اساتذہ نے مجبور ہو کر ہڑتال کردی اور طالب علموں کو پڑھانا چھوڑ دیا لیکن خود سکولوں میں باقاعدگی سے حاضری دیتے رہے، تو کیا ان ہڑتالی اساتذہ کے لیے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ چونکہ جمہوری حکومتوں میں ملازمین کو ہڑتال کرنے کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان ہڑتالی اساتذہ کے لیے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے، نیز اساتذہ چونکہ اجیرِ خاص کے حکم میں ہوتے ہیں اور اجیر صرف حاضری دینے سے بھی تنخواہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ : لو استوجر استاذ لتعليم علم او صنعة وسميت الاجرة فان ذكرت مدة انعقدت الاجارة صحيحة على المدة حتى ان الاستاذ يستحق الاجرة بوجوده حاضراً مهيئا للتعليم تعلم التلميذ او لم يتعلم۔ (مجلة الاحكام، مادة ۵۶۲ ص۳۰۵ كتاب الاجارة ۔ الفصل الرابع فى اجارة الآدمى) [1]

مریض کی تشخیص کرنے پر ڈاکٹروں کی فیس کا حکم

سوال:۔ آجکل پرائیویٹ ہسپتالوں کی بہتات ہے جہاں ڈاکٹر حضرات مریض کی صرف تشخیص کی بھاری فیس لیتے ہیں، کیا مریض کی تشخیص پر ڈاکٹروں کا بھاری فیس لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ مریض کی تشخیص پر ڈاکٹروں کا فیس لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة خير الدين الرملیؒ : سئل فى رجل داء فى انفه اتفق مع طبيب على

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : وهو الموافق لتصريح المتون بانه يستحق الاجر بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۷۰ باب ضمان الاجير۔ مطلب ليس للاجير الخاص ان يصلى النافلة)

ومِثلُهٗ فى الفتاوى الكاملية ص۱۹۵ كتاب الاجارة۔ مطلب فى الاجير الخاص۔

من اواته وجعل لهٗ اجرة ولم يضرب لذلك مدة ودا واه فما الحكم (الجواب) للطبيب اجرة مثله وما انفق فی ثمن الادوية لفساد الاجارة علی الوجه المذكور۔
(فتاوٰی خیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۲ کتاب الاجارة)[1]

اجارہ پر لی ہوئی زمین میں افیون کاشت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو اپنی زمین اجارہ پر دیدی، مستاجر نے اس میں افیون کاشت کر دی، تو کیا اس پر اجرت لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کے مطابق اس طرح زمین پر اجرت لینا حرام نہیں ہے، جیسا کہ فقہاء کی عبارات سے واضح ہے، کیونکہ مالکِ زمین نے ارتکابِ معصیت کے لیے زمین تو نہیں دی ہے جبکہ افیون کی ایک خاص مقدار کا ادویات میں استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

قال العلامة قاضی خانؒ: ولا بأس لمسلم ان یواجر داره من ذمی لیسکنها وان شرب فیه الخمر او عبد فیه الصلیب او ادخل فیه الخنازیر فذلک لا یلحق المسلم۔ (فتاوٰی قاضی خان مع سراجیة ج۳ ص۱۸ کتاب الاجارات، باب الاجارة الفاسدة)[2]

عذر کی صورت میں اجارہ فسخ کرنا

سوال:۔ مستاجر یا موجر میں سے اگر کوئی اجارہ فسخ کرنا چاہے تو شرعاً اس کی کیا تفصیل ہے؟

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: سئل فی رجل به داء فی ظهره اتفق مع طبیب علی مداواته وجعل اجرة ولم یضرب له مدة و داواه ویرید الطبیب اجرة مثله وما انفقه فی ثمن الادوية فهل له ذلك (الجواب) نعم والمسئلة فی الخیریة من الاجارة۔
(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵۲،۱۸۲ کتاب الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۸۰ باب فسخ الاجارة۔ مطلب فسق المستاجر لیس عذرًا فی الفسخ۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: واذا استاجر الذمی من المسلم دارًا لیسکنها فلا بأس به وان شرب الخمر او عبد فیه الصلیب لم یلحق المسلم شئ کما لو اجر داره من فاسق یعصی الله فیها۔ (خلاصة الفتاوٰی ج۳ ص۱۵ کتاب الاجارات۔ الفصل العاشر فی الحظر والاباحة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۴ ص۴۵ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا کان المستاجر۔ الخ

الجواب: مؤجر یا مستاجر میں سے کسی ایک کو بھی اگر واقعتاً عذر پیش آئے تو وہ یکطرفہ طور پر اجارہ فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے بار برداری کے لیے جانور کرایہ پر لیا تھا پھر اس کی آنکھیں ضائع ہوگئیں جس کی وجہ سے وہ جانور بیکار ہوگیا تو اس صورت میں بھی مستاجر اجارہ فسخ کرسکتا ہے۔

وفی الهندیة: واذا تحقق العذر ومست الحاجة الی النقض هل ینفرد صاحب العذر بالنقض او یحتاج الی القضاء او الرضاء اختلفت الروایات فیه والصحیح ان العذر اذا کان ظاهراً ینفرد وان کان مشتبهاً لا ینفرد کذا فی فتاوی قاضی خان۔
(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۵۸ کتاب الاجارة۔ الباب التاسع عشر فی فسخ الاجارة بالعذر) [1]

نااہلی اجارہ فسخ کرنے کیلئے عذر ہے

سوال: کسی مدرسہ کا مہتمم اپنے ایک مدرس کو تعلیمی سال کے درمیان میں اس وجہ سے فارغ کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری پڑھائی سے طلباء مطمئن نہیں ہیں، جبکہ مدرس کا کہنا ہے کہ مہتمم خود یا دوسرے مدرسین میرے درس میں آکر دیکھیں، اگر واقعتاً وہ میری تدریس میں نقص محسوس کریں تو بے شک مہتمم صاحب مجھے تدریس سے فارغ کردیں، ورنہ بصورتِ دیگر میری بے عزتی سے باز رہیں، اس قضیہ میں شرعی فیصلہ سے مستفید فرمائیں، مہربانی ہوگی؟

الجواب: اگر مدرس واقعی تدریس کرنے کا اہل نہ ہو تو مہتمم مدرسہ کو اجارہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے تاہم اس میں صرف مہتمم کے بیان کا اعتبار نہیں ہے کہ مدرس تدریس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس میں مدرس کی بات معقول نظر آتی ہے کہ خود مہتمم صاحب میری اہلیت کا جائزہ لیں یا کسی دوسرے مدرس سے فیصلہ کروائیں، عام مدارس کے قواعد وضوابط کی روشنی میں کسی مدرس کو دورانِ سال فارغ کرنا مروت کے خلاف ہے۔

وفی الهندیة: اذا استاجر استاذ لیعلمه هذا العمل فی هذه السنة فمضی نصف السنة فلم

---

[1] قال العلامة ابن نجیم: الاجارة عقد لازم لا تنفسخ بغیر عذر الا اذا وقعت علی استهلاک عین کالاستکتاب فلصاحب الورق فسخها بلا عذر۔ (الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۱۱ کتاب الاجارة)
ومثله فی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۲ ص۳۵۲ کتاب الاجارة۔ فصل فیما تنقض به الاجارة وما لا تنقض بها۔

يعلمه شيئاً فللمستاجران يفسخ - (الفتاوی الهندیہ ج۴ ص۴۶۰ کتاب الاجارة - فی الباب التاسع عشر فی فسخ الاجارة بالعذر) ۱؎

اجارہ پر دی ہوئی چیز کی بیع موقوف ہے

سوال :- زید نے ایک دوکان جو کہ دو بھائیوں کی ملکیت ہے، دس سال کیلئے اجارہ پر لی ہے اور سارا کرایہ پیشگی ادا کر دیا ہے اور فریقین کے مابین یہ شرط طے پائی ہے کہ ان دس سالوں کے درمیان مالکِ دوکان نہ تو دوکان فروخت کریں گے اور نہ ہی رہن پر دیں گے، لیکن پانچ سال کے بعد ایک بھائی نے اپنا نصف حصہ زید کے ہاتھ فروخت کر دیا، اب زید یہ دعویٰ کرتا ہے کہ چونکہ طے شدہ دس سال کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اب نئے سرے سے دوبارہ معاہدہ ہوگا اور مجھے آٹھ ہزار ماہانہ کرایہ دو گے، تو کیا اس طرح زید کو معاہدۂ اول فسخ کرنے اور کرایہ بڑھانے کا شرعاً حق پہنچتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ کے مطابق مالکِ دوکان کی بیع نافذ ہے لیکن دس سال ختم ہونے سے پہلے نہ تو مشتری اس پر قبضہ کرسکتا ہے اور نہ ہی مالکِ دوکان کرایہ دار کو نکال سکتا ہے اسی طرح ازسرِ نو کرایہ بڑھانے کا معاہدہ کرنا بھی بے جا ہے۔ البتہ دس سال پورا ہونے کے بعد بیع بھی نافذ العمل ہوگی اور کرایہ بھی بڑھایا جا سکے گا۔

قال العلامة خالد الاتاسیؒ : لو باع الآجر الماجور بدون اذن المستاجر كان البيع نافذاً بين البائع والمشتري وان لم يكن نافذ بحق المستاجر حتى انه بعد انقضاء مدة الاجارة يلزم البيع فى حق المشتري وليس له الامتناع عن اخذ المبيع الا ان يطلب تسليمه له من البائع قبل انقضاء مدة الاجارة الخ - (مجلة الاحكام، ماده ۵۹۰ ص۳۱۵ الفصل الثانى فى تصرف العاقدين فى الماجور بعد العقد) ۲؎

۱؎ قال العلامة ابن بزازؒ : استاجر معلماً لتعليم ولده القرآن والحرفة فى سنة فمضت ستة اشهر ولم يعلم شيئاً له فسخ الاجارة - (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۵ ص۳۹ كتاب الاجارة - نوع فى تعليم القرآن والحرف)

وَمِثْلُهُ فى الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۳۹ كتاب الاجارة -

۲؎ قال العلامة محمد كامل الطرابلسيؒ : سئلت عن استاجر داراً ثم باعها الآخر حتى تبطل الاجارة بهذا البيع فالجواب انه رفع للخير الرملى عن مثل هذا السوال فاجاب بما نصه لا يبطل الاجارة بهذا البيع بالاجماع وحكم البيع انه موقوف يصح ولا ينفذ وليس لغير المشترى فسخه والمشترى بالخيار علم اولم يعلم فى الاصح - وفى الخانية يتوقف على الاجارة المستاجر فى اصح الروايات -

(فتاوى كامليه ص۱۹۴ كتاب الاجارة، مطلب استاجر داراً ثم باعها كان البيع موقوفاً)

وَمِثْلُهُ فى خلاصة الفتاوى ج۳ ص۱۴۳ كتاب الاجارات -

میوزک سنٹر کے لیے دوکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال :۔ آجکل اکثر مارکیٹوں میں میوزک سنٹروں کے لیے مخصوص دوکانیں بنائی جاتی ہیں اور پھر کرایہ پر دی جاتی ہیں، کیا یہ کرایہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ معاصی کے امور کے لیے مکان یا دوکان کرایہ پر دینے میں چونکہ گناہ میں اجیر بذاتِ شریک نہیں اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مکان یا دوکان کے اجارہ لینے میں کوئی قباحت نہیں جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک یہ اجارہ قبیح ہے تاہم چونکہ اس میں تعاون علی الاثم کا ایک گونا ہونا موجود ہے اس لیے اس قسم کے افعالِ قبیحہ کے لیے مکان یا دوکان کو اجارہ (کرایہ) پر دینا کراہت سے خالی نہیں۔

وفی الهندية : واذا استاجر الذمی من المسلم دارًا يسكنها فلا بأس بذلك وان شرب فيها الخمر او عبد فيها الصليب او ادخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم فی ذلك بأس لان المسلم لا يؤاجرها لذلك انما آجرها للسكنى كذا فی المحيط۔ (الفتاوى الهندية ج۴ ص۴۵۰ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا كان المستاجر مشغولاً بغيره)[1]

پگڑی دے کر دوکان یا مکان کرایہ پر لینے کا حکم

سوال :۔ آجکل کاروباری لوگوں میں یہ رواج عام ہوگیا ہے کہ ایک بھاری رقم (جس کو عرف میں پگڑی کہا جاتا ہے) دے کر دوکان کرایہ پر لیا جاتا ہے۔ کیا پگڑی دے کر دوکان کرایہ پر لینا جائز ہے ؟

الجواب :۔ دوکانات یا دیگر کاروباری مکانات پر پگڑی دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں:
(۱) پگڑی اگر دوکاندار کو بصورتِ رشوت یا رہن دی جاتی ہو تو مالکِ دوکان اور کرایہ دار دونوں

---

[1] قال العلامة سراج الدين رحمه الله : آجر بيتًا ليتخذ فيه بيت نار او بيعة او كنيسة او يباع فيه الخمر لا بأس به عند ابی حنيفة خلافًا لهما۔ (فتاوى سراجية على هامش قاضيخان ج۲ ص۱۰۲ كتاب الاجارة۔ باب ما يكره من الاجارة وما لا يكره) ومثله فی خلاصة الفتاوى ج۳ ص۱۴۹ كتاب الاجارات۔ الفصل العاشر فی الحضر والاباحة۔

کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ (۲) اور اگر اجرت معجلہ کی صورت میں ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة محمد خالد اتاسی رحمہ اللہ: تلزم الاجرة بالتعجیل یعنی لو سلم المستاجر الاجرة نقداً ملکہا الآجر ولیس للمستاجر استردادھا سواء کانت الاجارة منجزة او مضافة۔ (الی اخرہ)۔ (مجلة الاحکام مادة ۴۶۷ ص ۲۶۱ الفصل الثانی فی بیان المسائل المتعلقة بسبب لزوم الاجرة وکیفیة استحقاق الاجرة) لہ

آفات کی وجہ سے اجرت ساقط ہوتی ہے

سوال: ایک شخص نے دس کنال زمین اجارہ پر لے کر اس میں گندم کاشت کی، اس کے بعد حکومت نے قریبی قصبہ کو سیلاب سے بچانے کے لیے اس زمین سے بہت ساری مٹی اٹھالی جس سے زمین کو بہت نقصان پہنچا اور فصل بالکل تباہ ہوگئی، تو اس صورت میں اجارہ کی رقم مؤجر کو دینا پڑے گی یا کہ نہیں؟

الجواب: حکومت کے مٹی اٹھانے کی وجہ سے اگر یہ زمین ناقابل کاشت ہو گئی ہو تو ناقابلِ کاشت ہونے کے بعد والی مدت کی اجرت ساقط ہو جائے گی اور ناقابلِ کاشت ہونے سے قبل کی اُجر ساقط نہ ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: فاد استاجرھا للزراعة فاصطلم الزرع آفة وجب منھا قبل الاصطلام وسقط ما بعدہ۔ (ردّ المحتار ج ۶ ص ۷۷ باب ضمان الاجیر۔ مبحث اختلاف المؤجر والمستاجر) ۲ے

لہ قال العلامة ابن نجیمؒ: فی شرح الطحاوی الاجرة لا تخلو اما ان تکون معجلة او مؤجلة او منجمة او مسکوتا عنھا فان کانت معجلة فان لہ تملکھا ولہ ان یطالب بھا وان کانت مؤجلة فلیس لہ ان یطالب الا بعد الاجل وان کانت منجمة فلہ ان یطالب عند کل نجم۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۵ کتاب الاجارات)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۳ ص ۱۰۱ کتاب الاجارة۔

۲ے قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: استاجر ارضا للزراعة فزرعھا واصاب الزرع آفة او غرق الارض فعلیہ الاجر علی الکمال ولو غرق قبل الزرع فلا اجر علیہ قال فی المحیط والفتوی علی انہ اذا بقی بعد ھلاک الزرع مدة لا یتمکن من اعادة الزراعة لا یجب الزراعة الاجر علی المستاجر والا یجب اذا تمکن من زراعة مثل الاول۔

(البزازیة علی ھامش الھندیة ج ۵ ص ۵۹ الباب الثالث فی الضیاع والعقار)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج ۴ ص ۴۶۱ الباب السابع عشر فی فسخ الاجارة بالعذر۔

جن شروط سے بیع فاسد ہوتی ہے انہی شروط سے عقدِ اجارہ بھی فاسد ہوتا ہے

سوال:- ایک آدمی نے کسی دوسرے آدمی سے بیس ہزار روپے سالانہ اجارہ پر زمین لے کر پانچ ہزار روپے پیشگی دیئے اور یہ شرط لگائی کہ اگر مستاجر میعاد پوری ہونے سے قبل زمین چھوڑنا چاہے تو بھی مالکِ زمین کو پانچ ہزار روپے پورے دینے پڑیں گے، تو کیا ایسا اجارہ شرعاً درست ہے؟

الجواب:- یہ اجارہ شروطِ فاسدہ کی وجہ سے درست نہیں ہے کیونکہ اس میں تعیینِ مدت نہیں ہے، ہاں اگر اقالہ کا وعدہ صلبِ عقد میں ہوا ہے تو ناجائز نہیں ہے لیکن بقدرِ مدت کے رقم ملے گی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما افسد البيع (مما مر) يفسدها) كجهالة ماجور او اجرة او مدة او عمل وكشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمة الدار او مغارمها وعشرا وخراج او مؤنة۔ (ردّ المحتار ج ۶ ص۴۶ باب الاجارة الفاسدة) [1]

گودام سے چوری ہونے والے مال میں چوکیدار پر ضمان نہیں

سوال: گودام جہاں مختلف لوگوں کا غلہ اور دیگر سامان رکھا ہوتا ہے وہاں سے اگر کسی کا سامان گم ہو جائے تو ضمان کس پر ہے جبکہ گودام کی حفاظت کے لیے چوکیدار بھی موجود ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں گودام کے چوکیدار پر ضمان نہیں ہے اور نہ ہی مستاجر ضامن ہے۔

قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: قال في جامع الفصولين استوجر

---

[1] قال العلامة محمد كامل الطرابلسيؒ: ففي التنوير وشرحه للعلائي تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما افسد البيع يفسدها كجهالة ماجور واجرة او مدة او عمل الخ (فتاوى كاملية ص۱۹۲ كتاب الاجارة۔ مطلب تفسد الاجارة باشتراط الترميم ونحوه)

ومثله في البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ كتاب الاجارة۔ باب الاجارة الفاسدة۔

رجل لحفظ خان او حوانیت فضاع شئ قیل یضمن عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ لوضاع من خارج الحجرة لانه اجیر مشترك وقیل لا فی الصحیح وبه یفتی لانه اجیر خاص الا یری انه لو اراد ان یشغل نفسه فی صنع آخر لم یکن له ذلك ولو ضاع من داخلها بان نقب اللص فلا یضمن ۔

(شرح مجلة الاحکام مادۃ ۶۱۰ ص ۳۲۹ الفصل الثالث فی ضمان) [1]

کسی سفارتخانے سے ویزہ کے نکلوانے پر رقم لینا جائز نہیں

سوال: ایک شخص کسی غیر ملکی سفارت خانہ سے ویزہ لینا چاہتا ہے جس پر کل دس ہزار روپے خرچ آتا ہے، لیکن چند وجوہات کی بناء پر وہ ویزہ لینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اب ایک دوسرا آدمی اُسے یہ کہتا ہے کہ اگر تم مجھے تیس ہزار روپے دے دو تو میں تمہارے لیے ویزے کا انتظام کر سکتا ہوں، اور دونوں کے درمیان تیس ہزار روپے پر معاہدہ ہوگیا، تو کیا اس صورت میں یہ رقم لینا اور دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر ویزہ اس شخص کا حق بنتا ہو مگر بغیر رشوت کے حاصل نہیں کرسکتا ہو تو پھر دینے والے کے لیے رشوت حرام نہیں ہے البتہ لینے والے کے لیے حرام ہے ہاں اگر اس آدمی کو باقاعدہ طور پر ایک یا دو دنوں کے لیے اجیر بنا دیا جائے تو پھر لینے اور دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله :- اهل بلدة ثقلت علیهم المؤنات فاستاجروا رجالاً باجر معلوم لیذهب الی السلطان ویرفع القصة لیخفف عنهم السلطان نوع تخفیف واخذ الاجر من عامة اهل البلدة من الاغنیاء والفقراء قالوا ان کان بحال لوذهب الی بلدة السلطان یتهیأ له اصلاح الامر فی یوم او یومین

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: نقب حانوت رجل واخذ متاعه لا یضمن حارس الحوانیت علی ما علیه الفتوی لان الامتعة محروسة بابوابها وحیطانها والحارس یحرس الابواب

(البزازیة علی هامش الهندیة ج ۵ ص ۹۲ نوع المتفرقات)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۲ ص ۱۱۶ کتاب الاجارة۔

جازت الاجارة وأن كان بحال لا يحصل المقصود فی یوم او یومین وانما یحصل فی مدة فان وقتوا الاجارة وقتاً جازت الاجارة وله کل المسمّٰی وان لم یوقتوا افسدت الاجارة وکان له اجر المثل علی اهل البلدة علی قدر مؤنتهم ومنافعهم۔ [1]
(فتاوی قاضی خان ج۳ ص۱۸ باب الاجارة الفاسدة)

مسئلہ قفیز الطحان کا حکم

جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقے میں آٹا پیسنے والی مشینیں عام ہیں، لوگ آٹا پسوانے کے لیے گندم وغیرہ لاتے ہیں اور مالکِ مشین نقد کی بجائے بیسواں یا تیسواں حصہ آٹا پیسنے کے عوض اجرت کے طور پر لیتے ہیں، کیا ایسا اجارہ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ صورت قبیلہ قفیز الطحان سے ہے یعنی کسی ایسی چیز کو اُجرت میں متعین کرنا ہے جو اجیر کے عمل سے وجود میں آتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے اجارہ سے منع فرمایا ہے، اس کے صحیح یا ناجائز ہونے پر بہت سی صورتیں موقوف ہیں، ہاں اگر بغیر تعین کے اسی جنس سے پہلے یا بعد میں اُجرت دی جائے تو بالاتفاق جائز ہے۔ مشائخ بلخ نے اپنے علاقہ میں ابتلاءِ عوام وخواص کی بناء پر روٹی کے بارے میں جواز کا فتوٰی دیا ہے جیساکہ فتاوٰی عالمگیری میں اس کا ذکر ہے۔ لیکن آجکل چونکہ اکثر بلاد میں یہ طریقہ مروج ہے، مگر قفیز الطحان کا مسئلہ جوں کا توں رہے گا، عرف کی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

---

[1] وفی الهندية: فی الکبرٰی اهل بلدة ثقلت علیهم مؤنات العمل فاستاجروا رجلاً باجرة معلومة لیذهب ویرفع امرهم الی السلطان الاعظم لیخفف عنهم بعض الحیف واخذ الاجرة من عامتهم غنیهم وفقیرهم ذکر ههنا انه ان کان بحال لوذهب الی باب السلطان تهیأ له اصلاح الامر یوماً او یومین جازت الاجارة وان کان بحال لا یحصل ذلک الا بمدة فان وقتوا للاجارة وقتاً معلوماً فالاجارة جائزة والاجر کله له وانه لو لم یوقتوا فهی فاسدة وله اجر مثله۔

(الفتاوی الهندية ج۴ ص۵۲۶ الباب الثانی والثلاثون فی المتفرقات۔

ومثله فی شرح مجلة الاحکام لسلیم رستم مادة ۵۰۰ ص۳۰۶ الفصل الرابع فی اجارة الآدمی۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ومن دفع الى حائك غزلاً لينسجه بالنصف فله اجر مثله وكذا اذا استاجر حماراً يحمل عليه طعاماً بقفيز منه فالاجارة فاسدة لانه جعل الاجر بعض ما يخرج من عمله فيصير في معنى قفيز الطحان وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عنه۔

(الهداية ج۳ ص۳۰۵ باب الاجارة الفاسدة كتاب الاجارات) [1]

شامی کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال: جناب مفتی صاحب! شامی کی مندرجہ ذیل عبارت کی وضاحت مطلوب ہے :۔عن المحیط ما اخذته الزانیة ان کان بعقد الاجارة فحلال عند ابی حنیفة لان اجر المثل فی الاجارة الفاسدة طیب۔ کیا واقعی امام صاحبؒ زنا پر اجرت کو حلال سمجھتے تھے؟

الجواب: اولاً تو امام صاحبؒ کی طرف اس کی نسبت ہی صحیح نہیں، اس لیے کہ امام صاحبؒ جیسی متقی اور پاکباز شخصیت یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے کہ زنا جیسے قبیح عمل پر اجرت لینا حلال ہے۔

قال العلامة الرافعیؒ: لم ار فیه وبعید عن الامام المعروف بالورع۔ (التقریرات ج۴ ص۲۶۳ باب الاجارة الفاسدة) البتہ بصورت صحت توجیہ یہ ممکن ہے کہ اجارہ میں اصل معقود علیہ زنا نہیں بلکہ ایک امر مباح مثلاً گھر کا کام کاج ہے مگر اس کے ساتھ زنا بطور شرط ٹھہرائی جائے جیسے اجارہ فاسدہ ہو جاتا ہے لیکن اصل عقد کی وجہ سے اجرت حلال ہے اگرچہ اس کے ضمن میں زنا بھی ہوتا رہے۔

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمۃ اللہ: ولو دفع غزلاً لآخر لینسجه له بنصفه ای بنصف الغزل او استاجر بغلاً لیحمل طعامه ببعضه او ثوراً لیطحن بره ببعض دقیقه فسدت فی الکل لانه استاجره بجزء من عمله والاصل فی ذلک نهیه صلی اللہ علیه وسلم عن قفیز الطحان وقدمناه فی بیع الوفاء والحیلة ان یفرز الاجر اولاً او یسمی قفیزاً بلا تعیین ثم یعطیه قفیزاً منه فیجوز۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۵۶ باب الاجارة الفاسدة)

ومثله فی الهندیة ج۴ ص۴۴۴ الفصل الثالث فی قفیز الطحان۔

اجارہ پر جانور پالنے کا طریقہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل یہ رواج عام ہے کہ مالدار آدمی کسی تنگدست کے لیے جانور خریدتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تم اسے پالو اس کا جو بچہ ہوگا وہ دونوں کا مشترکہ ہوگا۔ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اور اس کے جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔صورتِ مسئولہ میں چونکہ اُجرت مجہول ہے اس لیے یہ معاملہ درست نہیں، البتہ اس کے جواز کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مالدار آدمی جانور لے کر اس کی قیمت لگا دے اور پھر نصف نصف کرے اور چرانے والا اس کو قبول کر کے نصف قیمت ادا کرنے لگے تو اُسے نصف قیمت کی ادائیگی سے بری کر دے اور پھر اس سے کہے کہ تم اس کی پرورش کرو اور اس سے ہونے والا بچہ ہم دونوں کا مشترکہ ہوگا، اگر وہ منظور کرے تب تو دونوں اس جانور کے بچے میں برابر کے شریک ہوسکتے ہیں ورنہ نہیں۔

مشروط میعاد سے قبل دوکان خالی کرنے پر کل میعاد کے کرایہ کا حکم

سوال: کسی شخص نے ایک دوکان تین سال کے لیے کرایہ پر لی، مالکِ دوکان نے کرایہ دار سے یہ طے کیا کہ چاہے تم اس میں پورے تین سال تک کاروبار کرو یا کم، کرایہ تین سال کا ہی ادا کرو گے، کرایہ دار نے یہ شرط قبول کرکے کاروبار شروع کر دیا، ایک سال کے اندر اندر دو مرتبہ دوکان سے چوری ہوگئی، کرایہ دار مالکِ دوکان اور اس کے بیٹوں پر شک کرتا ہے جبکہ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں کہ دعویٰ کو ثابت کرسکے۔ اور اب وہ اس عذر کی بناء پر دوکان خالی کرنا چاہتا ہے مگر مالکِ دوکان پورے تین سال کا کرایہ لینے پر مصر ہے، یاد رہے کہ مقررہ میعاد پوری ہونے پر دو سال باقی ہیں۔ تو کیا مالکِ دکان بقیہ میعاد کے کرایہ کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔حسبِ معاہدہ اگرچہ دوکان کا مالک جملہ میعاد کے کرایہ کا حقدار ہے مگر عذرِ شرعی کی بناء پر دوکان خالی کرنے کے بعد والی میعاد کا کرایہ وصول نہیں کرسکتا اور نہ اس کو یہ حق حاصل ہے۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: یہ خالی کرنا اگر کسی عذر سے ہے تو کل کرایہ وصول نہ کیا جاوے گا ورنہ وصول کیا جاوے گا۔

۔ (امداد الفتاویٰ ج۳ ص۳۸۷ کتاب الاجارہ)

رشوت کے ذریعے حاصل کیے ہوئے ٹھیکہ کی کمائی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے رشوت دے کر کسی کام کا ٹھیکہ حاصل کیا، پھر شرعی حدود کی خلاف کیے بغیر وہ کام پورا کرکے کچھ کمایا، تو کیا یہ کمائی اس شخص کے لیے حلال اور جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رشوت یا دیگر غیر شرعی طریقوں سے حاصل کیا ہوا ٹھیکہ یا کوئی بھی کام فی نفسہٖ جائز نہیں، اور پھر شرعی حدود کی خلاف ورزی کیے بغیر وہ عمل کرکے کچھ کمانا اس عامل کیلئے قابلِ اعتراض نہیں، اگرچہ رشوت دینا اور لینا حرام ہے۔

وفی الھندیۃ: سئل محمد بن مقاتل رحمہ اللہ تعالیٰ عن رجل سرق مالاً واساله الیٰ ارضه وکرمه فأجاب انه یطیب له ماخرج بمنزلة رجل غصب شعیرًا ونبتًا وسمن به دابة فانه یجب علیه مثل ما غصب وما زاد فی الدابة طیب له۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۳۷۴، ۳۷۵ کتاب الکراھیۃ، الباب الثلاثون فی المتفرقات)

کمیشن لینے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! عصرِ حاضر میں کمیشن کا بہت رواج ہے، مثلاً ایک کاریگر کسی شخص کے لیے دوکان سے سامان لینے جاتا ہے، وہ شخص کاریگر پر اعتماد کرتا ہے کہ میرے لیے عمدہ سامان کم قیمت پر خریدے گا۔ جبکہ بائع (دکاندار) کاریگر کو کمیشن دے کر کم قیمت کا سامان اس پر مہنگے داموں فروخت کرتا ہے، شرعاً اس کمیشن کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ دوکاندار (بائع) طرف سے اس خریدار (کاریگر) کو کوئی رقم وغیرہ دینا ناجائز نہیں ہے، تجار کی طرف سے یہ اکرام تجارت کو فروغ دینے کیلئے کیا جاتا ہے اور یہ اصولِ تجارت میں شمار ہے البتہ اس کاریگر کے لیے یہ رقم لینا اُس وقت جائز ہے جبکہ وہ باقاعدہ تگ و دو سے وہ چیز خریدے اور پہلے سے کمیشن لینے کی شرط نہ لگائے اور طمع سے دل کو خالی کرے، یعنی دل میں یہ فیصلہ کرے کہ اگر یہ دوکاندار مجھے کمیشن نہ بھی دے تو میں سوائے طبعی بوجھ کے دیگر اثر سے متاثر نہ ہوں گا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولو قضی حاجته بلا شرط ولا طمع فاھدی الیه بعد ذٰلك فھو حلال لا بأس به۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۲ فی اقسام الرشوۃ)

وَلما قال العلامة الكاسانیؒ: والقیاس فی استئجار الظئر بطعامها وکسوتها انه لا یجوز وهو قول ابی یوسف ومحمد لجهالة الاجرة وهی الطعام والکسوة الا ان اباحنیفةؒ استحسن الجواز بالنص وهو قوله عزوجل وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن بالمعروف من غیر فصل بین ما اذا کانت الوالدة منکوحة او مطلقة وقوله عزوجل وعلی الوارث مثل ذلک ای الرزق والکسوة وذلک یکون بعد موت المولود...... وقولهما الاجرة مجهولة مسلم لکن الجهالة لا تمنع صحة العقد لعینها بل لافضائها الی المنازعة وجهالة الاجرة فی هذا الباب لا تفضی الی المنازعة لان العادة جرت بالمسامحة مع الاظار والتوسیع علیهن شفقة علی الاولاد فاشبهت جهالة القفیز من الصبرة۔

(بدائع الصنائع ج۴ ص۱۹۳ کتاب الاجارة، مطلب فیما یرجع الی المعقود علیه)

کام میں رکاوٹ پیدا ہونے کے خوف سے ٹھیکیدار کا افسرانِ بالا کو رشوت دینا

سوال: جناب مفتی صاحب! درج ذیل مسئلہ کے متعلق قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(۱) ایک آدمی سرکاری ٹھیکہ لیتا ہے تو سرکاری آفیسر اس سے بارہ یا پندرہ فیصد ضرور کمیشن لیتے ہیں اور اگر کوئی ٹھیکیدار کمیشن نہ دے تو اس کے کام میں رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں نیز سرکاری آفیسر اس کمیشن کو اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس کام کی نگرانی کرتے ہیں، اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ٹھیکیدار بامر مجبوری مذکورہ کمیشن دیتا ہے کیونکہ اس کا ذریعۂ معاش یہی ہے۔ تو کیا ٹھیکیدار کے لیے اس طرح ٹھیکہ لینا جائز ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں؟

(۲) روزہ کی خاطر اگر کوئی عورت ایسی گولی استعمال کرے کہ اس کا حیض رک جائے تو کیا روزہ کی خاطر حیض روکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: (۱) ٹھیکہ دینے کے بدلے جو افسران ٹھیکیدار سے کمیشن کے نام پر پیسے لیتے ہیں وہ رشوت میں داخل ہے، کام کی نگرانی کرنا ان کا فریضۂ منصبی ہے، اس کے بدلے وہ حکومت سے تنخواہ لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر ٹھیکیدار ٹھیکہ لینے کا حقدار ہو اور بغیر رشوت کے اسے ٹھیکہ نہ دیا جاتا ہو تو بحالتِ مجبوری اس کو تو رشوت دینا رخص ہے مگر افسرانِ بالا کیلئے لینا ہرگز حلال نہیں۔ ٹھیکیداری کرنا ایک مباح کام ہے اصول اور دیانتداری سے کرنا چاہیئے۔

(۲) حیض بند کرنے کے لیے گولیاں استعمال کرنا کوئی ممنوع عمل نہیں اور نہ اس سے روزے پر کوئی فرق پڑتا ہے تاہم اگر طبی لحاظ سے ایسا کرنا مُضر ہو تو اس سے اجتناب کرنا بہتر مناسب ہے۔

امام مسجد کا حق امامت سے زیادہ چھٹیاں کرنا

سوال:۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب مہینے میں دس دن غائب رہتے ہیں اور بیس دن حاضر، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ اتنی غیر حاضری کیوں کرتے ہیں؟ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ میں تمہارا امام ہوں یہ میرا حق ہے، تمہیں مجھ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ تو کیا اتنی زیادہ غیر حاضریاں کرنا واقعی شرعاً امام کا حق ہے، اگر ہے تو کتنے دن تک امام غیر حاضری کر سکتا ہے؟ تفصیلی جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب:۔ تنخواہ دار شخص کی تعطیلات کا دارومدار عرف پر مبنی ہے عرف میں جتنے ایام اس کی تعطیل کے ہوں گے اتنے دن چھٹی کرنا اس کا حق ہے، باقی عرف سے زیادہ چھٹیاں کرنا قابلِ گرفت ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ کے نزدیک سال بھر میں پندرہ دن تک کی چھٹی قابلِ معافی ہے۔ لہٰذا مذکورہ امام مسجد اگر سال یا مہینہ میں عرف (طے شدہ معاہدہ) کے مطابق غیر حاضر رہتا ہو تو اس کا مواخذہ کرنا درست نہیں اور اگر عرف سے زیادہ غیر حاضر رہتا ہو تو قابلِ گرفت ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: اما يترك الامامة لزيادة...... في الرساتيق اسبوعاً او نحوه او لمصيبة او لاستراحة فلا بأس به ومثله عفو في العادة والشرع۔ (رد المحتار بحوالہ عزیز الفتاوی ج۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

نمازِ جنازہ پڑھانے کی اُجرت لینا

سوال:۔ بعض علاقوں میں رواج ہے کہ جب کوئی امام مسجد کسی میت کا جنازہ پڑھائے تو میت کے ورثاء اس کو ایک جوڑا کپڑے اور کچھ نقدی بھی دیتے ہیں، اُمراء کے علاوہ فقراء اور نادار لوگ بھی اس رسم کو پورا کرنے پر مجبور ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی مسلمان کی نمازِ جنازہ پڑھنا یا پڑھانا فرضِ کفایہ ہے اور اس کا حکم

---

[1] قال العلامة مفتی عزیز الرحمنؒ: اس کا حاصل یہ ہے کہ امام کو اپنی ضروریات یا راحت کیلئے ایک ہفتہ یا اس کے قریب یعنی پندرہ دن سے کم تک غیر حاضری عرفاً و شرعاً جائز ہے۔ پھر آگے تصریح کی ہے کہ ظاہراً مراد یہ ہے کہ اگر سال بھر میں ہفتہ دو ہفتے غیر حاضری ہو تو معاف ہے۔
(عزیز الفتاوی (فتاوی دار العلوم دیوبند) جلد ۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

تلاوتِ قرآن پر اُجرت لینے کی طرح ہے، جس طرح عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں ہے اسی طرح نمازِ جنازہ بھی چونکہ عبادات میں شمار ہے اس لیے اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ تاہم اگر میت کے ورثاء اپنی خوشی سے جنازہ پڑھانے والے کو بلا تعین اور بلا معروف اور مروج ہونے کے کچھ دینا چاہتے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دینے اور لینے والے دونوں کی نیت بھی درست ہو۔ اور ورثاء میں کوئی نابالغ نہ ہو۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ ، قال تاج الشریعة فی شرح الهدایة ان القراٰن بالاجرة لایستحق الثواب للمیت ولا للقاری...... لولا اجرة ما قرأ احد لاحد فی هٰذا الزمان۔ (رد المحتار ج ۵ ص۳۵ کتاب الاجارة مطلب فی الاستیجار علی الطاعات) [1]

گولڈن ہینڈ شیک سکیم کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل بعض سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے اپنے ملازمین میں ایک سکیم متعارف کرائی ہے کہ جو افراد مقررہ مدت سے پہلے نوکری چھوڑ دیں تو ادارہ ان کو بقیہ مدت کا معاوضہ اور دیگر مراعات دے گا۔ تو کیا نوکری چھوڑنے کے عوض یہ معاوضہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حقِ وظیفہ کا شمار حقوقِ مجردہ میں ہوتا ہے جس کے عوض مالی معاوضہ یا کسی قسم کی مراعات لینا حرام و ناجائز ہے، مگر موجودہ ملکی قوانین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا

---

[1] لما قال العلامة المفتی عزیز الرحمٰنؒ : (الجواب) نماز جنازہ پڑھانے کی وجہ سے روپیہ پیسہ لینا درست نہیں ہے کہ نماز جنازہ فرض کفایہ و عبادت ہے اور عبادت پر روپیہ پیسہ لینا جائز نہیں جیسا کہ تلاوتِ قرآن مجید پر روپیہ پیسہ لینا درست نہیں ہے، اور دینے والا اور لینے والا اگرچہ معاوضہ اور اُجرت کا نام نہ لیویں لیکن بحکم المعروف کالمشروط جب کہ یہ لینا دینا بعد نماز جنازہ و تلاوتِ کلام اللہ معروف ہو گیا ہے اور نماز جنازہ پڑھنے پڑھانے والے اور قرآن شریف پڑھنے والے اسی خیال اور نیت سے پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ ہم کو روپیہ پیسہ ملے گا لہٰذا یہ لینا دینا ناجائز ہے۔ (عزیز الفتاویٰ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند) جلد ۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

ہے کہ اس قسم کی مراعات ملازمین کے ایسے حقوق ہیں کہ بغیر کسی ملازم کی اجازت و رضامندی کے کوئی اور ان مراعات کو حاصل نہیں کر سکتا، نیز قانونی تحفظ کی وجہ سے یہ حقوق ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اس لیے متاخرین فقہاء کرام نے اس قسم کے (حق النزول) حقوق سے دستبردار ہو کر مالی معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے، حکومت کی گولڈن ہینڈ شیک سکیم کی حیثیت بھی انہی حقوق کی طرح ہے، اس لیے ملازمین کا اپنی مدتِ ملازمت ختم ہونے سے قبل استعفاء دینے کے عوض سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے پیسے لینا جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: قوله ويفتى بجواز النزول عن الوظائف بمال) قال العلامة العينيؒ: في فتاوه ليس للنزول شيء يعتمد عليه ولكن العلماء والحكام مشوا ذلك للضرورة واشترطوا امضاء الناظر مثلاً يقع فيه نزاع...... في باب القسم بين الزوجات انه سمع من بعض شيوخه الكبار انه يمكن ان يحكم بصحة النزول عن الوظائف الدينية قياساً على ترك المرأة قسمها لصاحبتها لان كلا منهما مجرد اسقاط..... واستدل بعضهم للجواز بنزول سيدنا الحسن بن علي رضي الله عنه عن الخلافة لمعاوية رضي الله تعالى عنه على عوض وهو ظاهر ايضاً وهذا اولى مما قدمناه في الوقف عن الخيرية من عدم الجواز ومن ان للمفروغ له الرجوع بالبدل بناء على ان المذهب عدم اعتبار العرف الخاص وانه لا يجوز الاعتياض عن مجرد الحق لما علمت من ان الجواز ليس مبنيا على اعتبار العرف الخاص بل على ما ذكرنا من نظائره الدالة عليه وأن عدم جواز الاعتياض عن الحق ليس على اطلاقه ورأيت بخط بعض العلماء عن المفتي ابي السعود انه افتى بجواز اخذ العوض في حق القرار والتصرف وعدم صحة الرجوع وبالجملة فالمسئلة ظنية والنظائر متشابهة للبحث فيها مجال۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۱۰۹ کتاب البیوع مطلب فی النزول عن الوظائف بمال)

---

[1] لما قال العلامة خالد اتاسیؒ، اقول وعلى ما ذكروه من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغي ان يجوز الاعتياض عن حق التعلي وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال لان هذه الحقوق لم تثبت لاصحابها لاجل دفع الضرر عنهم بل تثبت لهم ابتداء بحق شرعي..... فاذا نزل عنه لغيره بمال معلوم ينبغي ان يجوز ذلك على وجه الفراغ والصلح لا على وجه البيع كما جاز النزول عن الوظائف۔

(شرح المجلة لخالد اتاسی ج ۲ ص ۱۲ کتاب البیوع قبل الفصل الثالث)

نائی (حجام) کو دوکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال :- کیا کسی نائی (حجام) کو دوکان وغیرہ کرایہ پر دینا جائز ہے ؟ جبکہ یہ لوگوں کے داڑھی مونڈتے اور بال یہودیوں کی طرح بناتے ہیں، حالانکہ ارشاد قرآنی ہے: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ الخ (یعنی گناہ کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو) اس لحاظ سے کسی نائی (حجام) کو دوکان وغیرہ کرایہ پر دینے والا تعاون علی المعصیت کا مرتکب تو نہیں ہوگا؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :- حجامت کا پیشہ ایک ضروری عمل ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن اس میں شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اگر اس میں خلاف شرع عمل کیا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی نا جائز ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح اس کام (حجامت وغیرہ) کے لیے دوکان یا مکان کرایہ پر دینا بھی تعاون علی المعصیت ہے جو بنص قرآنی حرام ہے لہٰذا خلاف شرع حجامت بنانے والے نائی (حجام) کو مکان یا دوکان کرایہ پر دینا صحیح نہیں اور نہ اس کی آمدنی درست ہے ۔

اجارہ فاسدہ کے جواز کی صورت

سوال :- ایک شخص نے اپنی ٹیکسی کسی ڈرائیور کو اس شرط پر دی کہ تم اس کو چلاؤ جو منافع ہوگا اس میں سے ۶۰ فیصد میرا ہوگا اور ۴۰ فیصد آپ کا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ اجارہ درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اجارہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ مقدار اجرت اور مدت وغیرہ متعین ہو اگر کہیں اجرت یا مدت میں جہالت آجائے تو اجارہ فاسد ہو جائے گا اسلئے کہ جہالت مفضی الی النزاع ہوتی ہے اور عموماً جھگڑا اور فساد پیدا کرتی ہے۔ صورت مسئولہ میں اجرت اگرچہ مجہول ہے جسکی وجہ سے اجارہ فاسد ہونا چاہیئے، مگر آجکل چونکہ اس طرح کے معاملات بکثرت ہوتے ہیں اور لوگ ایسے معاملہ کو مفضی الی النزاع نہیں بناتے، اسلئے مذکورہ معاملہ بھی درست ہے کیونکہ فساد نہ ہونے کی صورت میں معاملہ فی ذاتہٖ درست اور صحیح ہوتا ہے البتہ کسی فاسد وصف کی وجہ سے اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے اور جب اس فساد کی علت ختم ہو جائے تو وہ معاملہ اپنے حال پر باقی رہتا ہے۔ فقہی ذخائر میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں اور ویسے بھی عموم بلویٰ کی وجہ سے احکام تبدیل ہوتے ہی رہتے ہیں ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: الفاسد من العقود ما کان مشروعاً باصله دون وصفه ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۵ باب الاجارة الفاسدة)

بداخلاقی کی بناء پر مدرسے سے خارج کیے گئے مدرس کیلئے پورے سال کی تنخواہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:۔

(۱) کسی بھی دینی مدرسہ میں ایک مدرس سال بھر کا اجیر ہوتا ہے، کیا اس کا وظیفہ سالانہ اُجرت کی بنیاد پر ہوتا ہے یا ماہانہ اُجرت کی بنیاد پر، اس کی وضاحت فرمائیں؟

(۲) یہ کہ ایک مدرسہ کے مدرس کو مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ نے اخلاقی جرائم میں ملوث ہونے اور دیگر غیر اخلاقی حرکات کی وجہ سے مدرسہ سے نکال دیا ہے، تو کیا ایسا مدرس سال کے باقی دنوں کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دینی مدارس کے مدرس کی حیثیت اجیرِ خاص کی ہے اور وہ اُجرت کا تب مستحق ہوتا ہے جب وہ مدرسہ کے عمل کے لیے اپنے آپ کو مدرسہ کے حوالے کر دے اور ساتھ ہی اس میں مدرسہ کی طرف سے تفویض کردہ کام کرنے کی صلاحیت بھی ہو، اگر کسی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت مفقود ہو جائے اور وہ نااہل ثابت ہو جائے اور مدرسہ کی انتظامیہ اس کو نااہلیت کی بناء پر ذمہ داری (ملازمت) سے سبکدوش کر دے تو وہ سال کے بقیہ دنوں کی تنخواہ کا حقدار نہ ہوگا اور اگر مدرسہ کی انتظامیہ بلاضرورت اور بغیر کسی معقول عذر کے اس کو قبل از وقتِ مقررہ سبکدوش کر دے تو وہ سال کے باقی دنوں یا مہینوں کی تنخواہ کا حقدار ہے۔

(۲) لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر مدرس کو اخلاقی جرائم اور دیگر ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے مدرسہ سے نکالا گیا ہو تو اس کو سال کے باقی دنوں یا مہینوں کی تنخواہ کا مستحق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ دینی مدارس میں عرف کی بناء پر ایک مدرس اپنی پوری صلاحیت اور اہلیت کے ساتھ سال بھر کا اجیر ہوتا ہے اور اگر مدرسہ کی انتظامیہ اس کو بلاضرورت و بلاعذر کے نکالنا چاہے تو اس مدرس کو بقیہ ایام کی تنخواہ دی جائے گی۔

لمافی مجلة الاحكام: الاجير يستحق الاجرة اذا كان فی مدة الاجارة حاضرًا للعمل ولا يشترط عمله بالفعل ولكن ليس له ان يمتنع عن العمل واذا امتنع لا يستحق الاجرة۔ (درر الحكام فی شرح مجلة الاحكام ج۱ ص۴۵۸)

لما فی احسن الفتاوی: اگر مدرس کو واقعۃً نااہلیت کی بناء پر معزول کیا گیا ہے تو وہ شعبان تک کی تنخواہ کا مستحق نہیں۔ (احسن الفتاوی ج۷ ص۲۸۶)

وفی احسن الفتاویٰ : طلباء کم ہونے کا عذر قابل قبول نہیں، اگر مہتمم نے بلاضرورت مدرس رکھا ہے تو پورے سال کی تنخواہ اپنے پاس سے دے کیونکہ عقد تدریس مسانہہ ہے۔
(احسن الفتاویٰ ج ۷ ص ۲۹۵)

وھکذا فی احسن الفتاویٰ : مدرسین سے عقد مسانہہ ہے لہٰذا بہر صورت ابتداء شوال سے انتہاء رمضان تک پوری تنخواہ دی جائے گی۔ (احسن الفتاویٰ ج ۷ ص ۲۸۲)

یہاں یہ یاد رہے کہ احسن الفتاویٰ سے مؤخر الذکر حوالجات کا مقصد یہ ہے کہ مدرس میں صلاحیت اور اہلیت ہونے کے باوجود اہل اہتمام اس کو بلا وجہ شرعی معزول کریں تو مابعد کے مہینوں کی تنخواہ کا مدرس حقدار ہے، ورنہ نااہلیت کی وجہ سے برطرفی کی صورت میں مابعد کے مہینوں کی تنخواہ نہیں۔

ایام تعطیل کی تنخواہ کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ دینی مدرسہ کے ایک مدرس نے مدرسہ کی سالانہ تعطیلات کے بعد مدرسہ کی انتظامیہ کو اپنا استعفا پیش کر دیا۔ تو کیا عند الشرع اور قوانین مدارس دینیہ کی رُو سے یہ مدرس ایام تعطیل کی تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرس ایام تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہے، مگر اس کے لیے فقہاء کی عبارتوں سے چند شرائط بھی معلوم ہوتی ہیں :

(۱) ایک یہ کہ مدرس کے ساتھ پہلے سے یہ طے نہیں کیا گیا ہو کہ آپ کو ایام تعطیل کی تنخواہ نہیں ملے گی، جو کچھ تنخواہ تمہارے لیے مقرر ہے وہ صرف ایام تدریس ہی میں تمہیں دی جایا کرے گی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مدرس ایام تعطیل کے بعد بھی کام کرنے (تدریس) کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی طرف سے کام کو چھوڑے بھی نہیں۔

تو جب یہ دو شرطیں موجود ہوں تو پھر مدرس ایام تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہے، کیونکہ یہ تعطیلات بھی ایک طرح سے تدریس ہی کے حکم میں ہیں کہ ان میں آئندہ تدریس کے لیے مدرس کو آرام اور استراحت ملتی ہے جو آئندہ کام کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر تقرری کے وقت ہی مدرس سے یہ طے کر لیا جائے کہ آپ کو صرف تدریس کے دنوں کی تنخواہ

ملے گی ایام تعطیل کی نہیں، تو اس صورت میں مدرس ایام تعطیل کی تنخواہ کا حقدار نہیں ہوگا ،
شرعی قانون یہ ہے کہ الشرط املک ـــ اسی طرح اگر عرف وہاں منتظمین مدارس کا یہ
ہو کہ عام مدرسین اور ملازمین کو تعطیلات کے دنوں کی تنخواہ نہ ملا کرتی ہو تو اس صورت میں بھی
ایام تعطیل کی تنخواہ نہیں ملے گی کہ المعروف کالمشروط اور العادۃ محکمۃ ۔

نیز اگر کوئی مدرس مزید کام کرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوئے خود استعفا پیش کر کے کام کرنا چھوڑ
دے تو پھر بھی وہ تنخواہ کا مستحق اس بنا پر نہیں ہے کہ نہ تو تدریس کا کام اس نے کیا ہے نہ تعطیلات
آئندہ کے لیے کام کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوسکتی ہیں ۔

درمختار (جلد ۳ ص۵۲۵) میں ہے : وھل یأخذ المدرس ایام البطالۃ کعید و
رمضان ؟ لم أرہ وینبغی الحاقہ ببطالۃ القاضی واختلفوا فیھا والاصح انہ یأخذ لانھا
للاستراحۃ (اشباہ عن قاعدۃ العادۃ محکمۃ اھ)

علامہ شامیؒ اس عبارت کے تحت لکھتے ہیں : قال فی الاشباہ وقد اختلفوا فی اخذ القاضی ما
فی بیت المال فی یوم البطالۃ فقال فی المحیط انہ یاخذ لانہ یستریح للیوم الثانی
وقیل لا اھ وفی المنیۃ القاضی یستحق الکفایۃ من بیت المال فی یوم البطالۃ فی الاصح
وفی الوھبانیۃ انہ الاظھر فینبغی ان یکون کذلک فی المدرس لان یوم البطالۃ للاستراحۃ
وفی الحقیقۃ تکون للمطالعۃ والتحریر عند ذوی الھمۃ ۔اھ (الدرالمختار جلد ۳ ص۵۲۵)

ان عبارتوں میں استحقاق کے لیے علت استراحت بیان کی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا
ہے کہ یہ استحقاق اس وقت ہوتا ہے جب آئندہ کام کرنے کا ارادہ ہو اور کام کو خود نہ چھوڑے
تو تعطیل کا حکم چونکہ تدریس کا ہوگا اور حکماً یہ سمجھا جائے گا کہ مدرس تعطیل کے ایام میں برسرکار ہے
اور گویا وہ تدریس ہی میں مشغول ہے اس لیے وہ تنخواہ کا بھی مستحق ہوگا ۔

صورت مسئولہ میں چونکہ مدرس نے خود استعفا دے کر آئندہ کام نہ کرنے کا ارادہ ظاہر
کیا ہے اس لیے تعطیل کے ایام اس کے حق میں آئندہ تدریس کے لیے ممد و معاون ثابت نہیں
ہوسکتے ہیں اور حقیقتاً تدریس میں مشغول بھی نہیں ہے اس لیے ایام تعطیل کی تنخواہ کا بھی مستحق
نہیں رہے گا ۔

داخلہ و ماہانہ فیس کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ آجکل بعض دینی مدارس میں بھی
سالانہ یا ماہانہ فیس لی جاتی ہے ۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے جبکہ فیس کی رقم ے

طلبا کی بود و باش اور مدرسہ کے مدرسین اور دیگر ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام کیا جاتا ہے

الجواب :۔ یہ کوئی جبری معاملہ نہیں بلکہ داخلہ لینے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس شرط کو منظور کر کے داخلہ لے یا شرط نا منظور کر کے داخلہ نہ لے ۔ اور نہ یہ اجرت ہے بلکہ اس کی حیثیت چندہ کی ہے اور چندہ میں شرط لگانا جائز ہے۔ کما فی امداد الاحکام ۳/۶۰۲ - الجواب :۔ جائز ہے کیونکہ یہ اُجرت نہیں اور چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے کیونکہ اس پر جبر لازم نہیں آتا ۔ جس کو منظور نہ ہوگی اس کو عدم داخلہ کا اختیار ہوگا ۔

اُجرت الدلال پر اشکال کا جواب

سوال :۔ جناب مفتی صاحب : فتاویٰ حقانیہ ۶/۲۰۰ میں دلالی پر اجرت لینے کو جائز لکھا گیا ہے ۔ اس پر مجھے اشکال پیدا ہوا ہے کہ دلالی پر اُجرت قفیز الطحان کی طرح ہے اس لئے کہ ایک تو دلال جزا من العمل لے رہا ہے ، اور دوم دلال قادر بقدرۃ الغیر ہے کیونکہ جب تک اس چیز کو دوسرا شخص خریدتا نہیں دلال فروخت کرنے پر قادر نہ ہوگا ۔ براہ کرم میری اس اشکال کو حل فرمائیں ۔

الجواب :۔ دراصل دلالی کی اُجرت کے جواز کا فتویٰ خلاف القیاس ہے ، اور یہ فتویٰ عوام کی سہولت اور حاجت کی وجہ سے دیا گیا ہے لما قال ابن عابدین (قولہ اومدۃ) الا فیما استثنیٰ قال فی البزازیہ اجارۃ السمسار والمنادی والحمامی والصکاکی ما لا یعقد فیہ الوقت ولا قدر العمل تجوز لما کان للناس بہ حاجۃ ویطیب الاجر الماخوذ لو قدر اجر المثل (رد المحتار ۵/۴۲ کتاب الاجارۃ)

سفارش پر اجرت لینے کا حکم

سوال :۔ اگر ایک شخص اپنے کسی جائز کام کے لیے کسی سے افسران بالا کے ہاں سفارش کرائے تاکہ وہ اس کا کام کر دیں ، تو کیا سفارش کرنے والا شخص اپنے اس عمل (سفارش) پر اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب : کسی کے جائز کام کی سفارش کرنا کار ثواب ہے ، اس کے علاوہ مال غیر متقوم بھی ہے ، اس لیے ان دونوں وجوہ کی بناء پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ : (الجواب) وجہ منع صرف اجرت علی الطاعۃ میں منحصر نہیں ، یہ بھی احد الوجوہ ہے ، دوسری وجہ منع کی اس عمل کا غیر متقوم عند الشرع ہونا ہے جیسا کہ فقہاء نے اجارہ اشجار التجفیف الثیاب کو منع کہا ہے ، پس شفاعت بھی غیر متقوم ہے ۔۔۔ الخ (امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۳۴۲ کتاب الاجارہ)

زمین اجارہ پر دینے کی ایک قسم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لوگ اپنی زمین کاشتکاروں کو اس شرط پر دیتے ہیں کہ مثلاً دس کنال زمین پر ہر چھ ماہ بعد فی کنال پانچ من گندم اور پانچ من مکئی کاشتکار مالکِ زمین کو دے گا اور فصل کی کاشت پر اٹھنے والے اخراجات کاشتکار کے ذمہ ہوں گے اور اسے مکمل اختیار حاصل ہوگا کہ وہ جو فصل چاہے کاشت کرے، مگر مالکِ زمین کو وہ فصلانہ کے طور پر گندم اور مکئی ہی دے گا۔ تو کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں بیان کردہ صورت مزارعت کی نہیں بلکہ اجارہ کی ہے اور اجارہ میں ہر وہ چیز اجرت بن سکتی ہے جس کا تجارت میں ثمن بننا صحیح ہو، چونکہ گندم اور مکئی دونوں مالِ متقوم ہیں اسلئے ان کو اجرت قرار دینا صحیح ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني: وما يصلح ثمناً يصلح اجرة۔ (الهداية ج۳ كتاب الاجارة)

اور اسی طرح زمین کو اجارہ پر دینا بھی شرعاً درست ہے اس لیے کہ اجارہ کا مقصد کسی چیز سے فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ یہاں موجود ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني: ايضاً: ويجوز استيجار الارض للزراعة لانها منفعة مقصودة وللمستاجر الشرب والطريق - (الهداية ج ص كتاب الاجارة)

مگر اس معاملہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ:۔

(۱) مدت اجارہ کا تعین ہو۔

(۲) جو چیز کاشت کرنی ہو وہ بیان کر دی جائے یا کاشتکار کو مکمل اختیار دیا جائے جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں درج ہے۔

(۳) اجرت میں گندم یا مکئی کے ساتھ اسی زمین کی پیداوار کی قید نہ لگائی جائے اور نہ اس زمین کے کسی خاص حصے کی پیداوار کی شرط لگائے البتہ جو گندم یا مکئی اجرت کے طور پر لینی ہو اس کی صفت اعلیٰ، ادنیٰ اور متوسط کا پہلے سے تعین کر لیا جائے تاکہ عقد اجارہ میں کوئی نامناسب حالات پیدا نہ ہو جائیں۔ (فقط واللہ اعلم)

كتاب الشفعة

جار الدار أحق بالدار من غيره

کتاب الشّفعۃ
(شفعہ کے احکام ومسائل)

شُفعہ کے حقدار

سوال:۔ از روئے شرع شُفعہ کرنے کا حق کس کو حاصل ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے سب سے پہلے شریک فی نفس المبیعہ کو شُفعہ کا حقدار قرار دیا ہے، اس کے بعد شریک فی حقوق المبیع کو جبکہ آخر میں جار (ہمسایہ) کو شُفعہ کا حقدار ٹھہرایا ہے۔

لما قال الشیخ ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: الشُّفعۃ واجبۃٌ للخلیط فی نفس المبیع ثمّ للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثمّ للجار۔

(مُختصر القدوری ص۱۲۰ کتاب الشُّفعۃ) [1]

تبادلہ میں حقِ شفعہ کا اثبات

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی زمین کے کسی قطعہ کا دوسرے شخص کی زمین سے تبادلہ کرے تو کیا اس تبادلہ سے حقِ شفعہ ثابت ہوگا یا نہیں؟ اگر شفیع زمین کو لینا چاہے تو اس کے ذمہ زمین کی ادائیگی لازم ہوگی یا قیمت دینا ہوگی؟

الجواب:۔ جہاں تک شفعہ کے اثبات کا مسئلہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ عقار کے تبادلہ میں ہر ایک کو شفعہ کا حق حاصل رہتا ہے، اس لیے کہ حقِ شفعہ کے تمامتر وجوہات یہاں بھی موجود ہو سکتے ہیں، تاہم زمین ذوات القیم ہونے کی وجہ سے زمین کی جگہ قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لما قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: ومن اشتریٰ دارًا بعوض

---

[1] قال العلامۃ ابوالبرکات محمود النسفیؒ: وتجب للخلیط فی نفس المبیع ثم فی حق المبیع کالشرب والطریق ان کان خاصًا ثمّ للجار الملاصق۔

(کنز الدقائق ص۴۰۲ کتاب الشّفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۶ ص۲۱۹، ۲۲۰ کتاب الشفعۃ۔

اخذها الشفيع بقيمته لانہ من ذوات القيم...... وان باع عقاراً بعقار اخذ الشفيع كل واحد منهما بقيمة الآخر لانه بدله وهو من ذوات القيم فيأخذه بقيمته ۔ (الهداية ج۴ ص۳۹۶ كتاب الشفعة) [۱]

حقِ شفعہ کو فروخت کرنا

سوال:۔ اگر شفیع مشتری سے حقِ شفعہ کے عوض مال طلب کر کے اپنا حقِ شفعہ چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کرے تو شفیع کے لیے مشتری سے ایسی رقم لینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ کے ساقط کرنے کے عوض رقم لینا حرام اور واجب الرد ہے کیونکہ یہ حق مجرد ہے جس کے ذریعے خود سے صرف ضرر دور کرنا مقصود ہے حصول منفعت نہیں، تاہم اگر شفیع ایسی حرمت پر اقدام کرے تو اس سے حقِ شفعہ ساقط ہو کر مشتری کی ملکیت خریدی ہوئی جائیداد میں مؤکد ہو جاتی ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ: وان صالح من شفعته على عوض بطلت شفعته ورد العوض ۔ (الهداية ج۴ ص۴۰۴ كتاب الشُّفعة) [۲]

قبل البیع مصالحت سے حقِ شُفعہ ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر باقاعدہ خرید و فروخت سے قبل ہی شفیع نے مشتری سے معاہدہ کر کے مصالحت کی ہو تو کیا بیع کے بعد دوبارہ شفیع کو دعویٰ شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ کا ثبوت بیع پر مرتب ہوتا ہے، قبل البیع چونکہ اس کی

---

[۱] قال الشيخ ابو بكر بن على الحدادالیمنی ؒ: ومن اشترى داراً بعوض اخذ الشفيع بقيمته لانه من ذوات القيم وان اشتراها بمكيل او موزون اخذها بمثله لانهٗ من ذوات الامثال ۔ (الجوهرة النيرة ج۱ ص۳۴۱ كتاب الشُّفعة)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار على صدر ردالمحتار ج۶ ص۲۳۱ كتاب الشُّفعة ۔

[۲] قال العلامة ابوالبركات محمود النسفی ؒ: وتبطل بالصلح عن شفعته على عوض وعليه رده ۔ (كنز الدقائق ص۴۰۵ كتاب الشفعة)

وَمِثْلُہٗ فی الهندية ج۵ ص۱۸۴ الباب التاسع فيما يبطل به حق الشُّفعة ۔

کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے اس لیے خرید فروخت سے قبل ایسی مصالحت اسقاطِ شفعہ پر مؤثر نہیں بلکہ بیع کے بعد شفیع کو بدستور حقِ شفعہ حاصل رہے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين ابو بکر الکاسانیؒ: ولا يصح تسليم الشفعة قبل البيع لانه اسقاط الحق واسقاط الحق قبل وجوبه ووجود سبب وجوبه محال۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۱۹ کتاب الشفعة) ۱؎

متعدد شفعاء میں سے بعض کے اسقاط سے دوسرے متاثر نہیں ہوتے

سوال: اگر متعدد افراد شفعہ کا حق رکھتے ہوں اور ان میں سے بعض اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں تو کیا اس سے دوسرے شرکاء پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب: حقِ شفعہ میں ہر حقدار کا استحقاق مستقل ہوتا ہے، ان میں سے کسی ایک کے اپنے حق سے دستبردار ہونے سے دوسرے حقدار کا حق زائل نہیں ہوتا بلکہ قبل القضاء کسی ایک شریک کا اسقاط کرنے سے دیگر تمام شرکاء کو فائدہ ہوگا جس کی رو سے دوسرے شرکاء اس کے جملہ حقِ شفعہ کے حقدار ہوں گے۔

لما قال العلامة فخر الدين عثمان بن علی الزيلعیؒ: ولو اسقط بعضهم حقه قبل القضاء لهم كان لمن بقی ان یأخذ الكل لان السبب لاستحقاق الكل قد وجد.... بخلاف ما اذا اسقط حقه بعد القضاء حيث لا يكون له ان يأخذ نصيب التارك لانه بالقضاء قطع حق كل واحد منهم فی نصيب الآخر۔

(تبیین الحقائق ج۵ ص۲۴۱ کتاب الشفعة) ۲؎

۱؎ وذکر فی الهندية: تسليم الشفعة قبل البيع لا يصح وبعده صحيح۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فيما يبطل به الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة لشيخ سليم رستم باز مادة ۵۲۳ ۔

۲؎ قال العلامة علاؤ الدين الحصكفیؒ: (اسقط بعضهم حقه) من الشفعة (بعد القضاء) فلو قبله فلمن بقی اخذ الكل لزوال المزاحمة (ليس لمن بقی اخذ نصيب التارك) لانه بالقضاء قطع حق كل واحد منهم فی نصيب الآخر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۲۰/۲۲۱ کتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج۸ ص۱۲۸ کتاب الشفعة۔

دھوکہ دہی سے حقِ شفعہ متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ بسا اوقات بائع اور مشتری باہم کسی ایک رقم پر اتفاق کر کے شفیع پر اتنی بڑی رقم ظاہر کرتے ہیں جس کی وجہ سے مبیعہ کا لینا شفیع کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس صورت میں اگر شفیع ناقابلِ تحمل قیمت کی وجہ سے شفعہ چھوڑ دے اور بعد میں کسی معتبر ذریعہ سے ان کا دھوکہ ظاہر ہو کر اصل قیمت معلوم ہو جائے تو کیا سابقہ اسقاط کے بعد بھی شفیع اپنا حقِ شفعہ استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسے دھوکے سے حقِ شفعہ کے اسقاط پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جب بھی شفیع پر بائع اور مشتری کے دھوکہ کی حقیقت ظاہر ہو تو سابقہ اسقاط کا اعتبار نہیں رہتا اب بھی شفیع اپنا حق استعمال کر کے مشتری سے مبیعہ لے سکتا ہے۔

لما قال الامام ابوالحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: واذا بلغ الشفیع انها بیعت بالف فسلم الشفعة ثم علم انها بیعت باقل من ذٰلك او بحنطة او شعیر قیمتها الف او اکثر فتسلیمه باطل وله الشفعة۔ (مختصر القدوری ص۱۶۴ کتاب الشفعة) لہ

مشترکہ زمین کا کچھ حصّہ خریدنے سے حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک زمین جو کہ چند اشخاص کے مابین مشترکہ ہے، ان میں سے ایک نے دوسرے ساتھی کا حصّہ خرید لیا تو باقی شرکاء نے اس پر حقِ شفعہ کا دعویٰ کر دیا، تو کیا ازروئے شرع یہ مشتری اپنے دیگر شرکاء کے ساتھ حقِ شفعہ میں شریک ہوگا یا بسببِ شراء اس کا حق ساقط متصور ہوگا؟

الجواب:۔ مشترکہ زمین میں کسی شراکت دار کا حصہ خریدنا کوئی ایسا فعل نہیں جس سے مشتری کی بیزاری سمجھی جائے، بلکہ بسا اوقات کسی زمین یا گھر کی خریداری سے حقِ شفعہ کا اثبات مقصود ہوتا ہے اس لیے خریدار دوسرے شفعاء کے ساتھ شفعہ

لہ لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا بلغ الشفیع انها بیعت بالف درهم فسلم ثم علم انها بیعت باقل او بحنطة او شعیر قیمتها الف او اکثر فتسلیمه باطل وله الشفعة۔ (الهدایة ج۴ ص۴۰۵ کتاب الشفعة)

ومثلهٗ فی کنز الدقائق ص۴۰۵ کتاب الشفعة۔

میں شریک رہے گا۔

لما قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: واذا اجتمع الشفعاء فالشفعۃ بینھم علی عدد رؤسھم ولا یعتبر اختلاف الاملاک۔

(الھدایۃ ج۴ ص۳۸۹ کتاب الشفعۃ) [1]

وقف شدہ زمین پر کسی کو شفعہ کا حق نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی جائداد جزوی یا کلی طور پر کسی مسجد یا مدرسہ کے لیے باقاعدہ وقف کر دے تو کیا اس سے اس کے شرکاء یا ہمسایہ کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حق شفعہ کے ثبوت کے لیے مالی معاوضہ کا ہونا بنیادی شرائط میں سے ہے، وقف میں یہ حقیقت مفقود ہوتی ہے اس میں واقف کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لیے مسجد، مدرسہ یا کسی دوسرے رفاہی ادارہ کے لیے وقف کی ہوئی چیز پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ شمس الدین محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: الشفعۃ تملیک البقعۃ جبرعلی المشتری بما قام علیہ۔۔۔۔۔۔۔۔ ولا شفعۃ فی الوقف۔

(تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۱۶، ص۲۲۳ کتاب الشفعۃ) [2]

برساتی نالے سے حق شفعہ ثابت نہیں ہوتا

سوال:۔ کیا وہ خشک نالہ جس میں صرف بارش کا پانی بہتا ہو سے حق شفعہ ثابت

---

[1] قال الشیخ ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: واذا اجتمع الشفعاء فالشفعۃ بینھم علی عدد رؤسھم ولا یعتبر باختلاف الاملاک۔ (مختصر القدوری ص۱۲۴ کتاب الشفعۃ)

ومثلہ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم بازؒ ص۵۶۶ مادۃ ۱۰۱۳۔

[2] لما قال الشیخ سلیم رستم بازؒ: الشفعۃ ھی تملیک الملک المشتری لما قام علی المشتری من الثمن۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادہ ۹۵۰ ص۵۳۷)

وقال ایضاً: ولا تجری الشفعۃ فی السفینۃ وسائر المنقولات وعقار الوقف والاراضی الامیریہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۱۰۱۷ ص۵۶۸)

ومثلہ فی کنز الدقائق ص۴۰۳ وتنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۱۸۲ کتاب الشفعۃ۔

ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے جہاں کسی کو شریک فی حقوق المبیع میں شفعہ کا حق دیا ہے وہاں اس میں یہ شرط بھی رکھی ہے کہ حقوقِ خاص انہی کا منتفاع ہو۔ چونکہ خشک نالے میں یہ شرط مفقود ہے اس لیے اس سے حق شفعہ ثابت نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة ابوالبرکات احمد بن محمود النسفیؒ: تجب للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ان کان خاصًا۔ (کنز الدقائق ص۳۸ کتاب الشفعة) [۱]

تاخیر سے حق شفعہ کا بطلان

سوال: طلب مواثبت واشہاد کی جملہ ذمہ داریوں کے نباہنے کے بعد طلب خصومت میں کتنی مدت تک تاخیر سے ایسے حق پر اثر نہیں پڑتا؟

الجواب: مفتی بہ قول کی رو سے بغیر کسی معقول عذر کے ایک مہینہ تک تاخیر کرنا قابلِ تحمل ہے، اتنی مدت میں اپنے حق کے حصول سے غفلت اختیار کرنا حق چھوڑنے کے مترادف ہے، نیز بلاوجہ اتنی تاخیر کرنا بسا اوقات مشتری کی ایذاءرسانی کا باعث بنتی ہے۔

لما قال العلامة فخرالدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: قال شیخ الاسلام الفتوٰی الیوم علٰی أنه اذا أخر شهرًا اسقطت الشفعة لتغیر احوال الناس فی قصد الاضرار بالغیر۔ (تبیین الحقائق ج۵ ص۲۴۲ کتاب الشفعة) [۲]

---

[۱] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: والثانی ان یکون خلیطًا فی حق المبیع کالاشتراک فی حق الشرب الخاص والطریق الخاص۔

(شرح مجلة الاحکام مادة ۱۰۰۸ ص۵۶۳)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علٰی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۲ کتاب الشفعة۔

[۲] وذکر فی الهندیة: عن محمدؒ وزفرؒ رحمهما الله وهو روایة عن ابی یوسفؒ ان أسهل وترك المخاصمة شهرًا من غیر عذر تبطل شفعته والفتوٰی علٰی قولهما۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۵ ص۱۸۳ الباب التاسع فیما یبطل به الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۴ کتاب الشفعة۔

غیر مسلم کو حقِ شفعہ حاصل ہے

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک عیسائی صاحب جائیداد ہے اس کے قریب ایک مسلمان نے اپنی زمین کسی دوسرے مسلمان پر فروخت کی، اب اس غیر مسلم عیسائی نے اس زمین پر شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے، تو کیا کسی غیر مسلم کو مسلمان کی زمین پر شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اسلام نے جس طرح ایک مسلمان کو شفعہ کا حق دیا ہے تو اسی طرح کافر (غیر مسلم) کو بھی شراکت یا جوار کی وجہ سے بیعہ پر شفعہ کا حقدار قرار دیا ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس عیسائی کا دعویٰ شفعہ درست ہے۔

قال العلامة الكاساني رحمه الله: أما اسلام الشفيع فليس بشرط لوجوب الشفعة فتجب لاهل الذمة فيما بينهم وللذمي على المسلم لان هذا حق التملك على المشتري بمنزلة الشراء منه والكافر والمسلم في ذلك سواء لانه من الامور الدنيوية۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۶ فصل شرائط الشفعة)[1]

حمل کو بھی حقِ شفعہ حاصل ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آج سے تقریباً ۱۴، ۱۵ سال پہلے میں نے ایک قطعہ زمین خریدا تھا، اب اس پر ایک نوجوان (جس کی عمر بھی ۱۴، ۱۵ سال کے لگ بھگ ہے) شفعہ کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اور میرا غالب گمان یہ ہے کہ جس وقت میں نے زمین خریدی تھی یہ لڑکا اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا، کیا اس لڑکے کو حقِ شفعہ حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ آپ کی خریداری کے وقت اگر یہ لڑکا پیدا ہو چکا تھا تو اس کو بالغ ہونے تک شفعہ کا حق حاصل ہے، اور اگر پیدا نہیں ہوا تھا لیکن ماں کے پیٹ میں تھا پھر بھی شریعتِ اسلامی اس کو شفعہ کا حق دار قرار دیتی ہے بشرطیکہ آپ کے زمین خریدنے

---

[1] قال الشيخ وهبة الزحيلي: وتثبت الشفعة عند المالكية والشافعية والظاهرية للذمي الكافر على المسلم كما قال الحنفية..... واتفق الفقهاء على ان الشفعة تثبت للذمي على الذمي۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج۵ ص۸۰۳ المبحث الثالث الشفيع)

ومثله في اللباب شرح الكتاب (الميداني) ج۲ ص۱۱۴ كتاب الشفعة۔

اور بچے کی ولادت میں کم از کم چھ ماہ کی مدت ہو اور اگر اس سے زیادہ ہو تو پھر حقِ شفعہ باطل ہے ۔

وفی الهندیة : والحمل فی استحقاق الشفعة والکبیر سواء فان وضعت لاقل من ستة اشهر منذ وقع الشراء فله الشفعة وان جاءت به لستة اشهر فصاعدا منذ وقع الشراء فانه لاشفعة له لانه لم یثبت وجوده وقت البیع ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۱۹۱ الباب الثانی عشر فی شفعة الصبی) [1]

حقِ شفعہ سنِ بلوغ تک موقوف ہوگا

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! میری صغرسنی میں میری زمین کے قریب کچھ زمین فروخت ہوئی تھی، اُس زمانے میں میرا کوئی ولی نہیں تھا اور اب میں بالغ ہو چکا ہوں تو کیا اس زمین پر مجھے شرعاً حقِ شفعہ حاصل ہے یا نہیں ؟ جبکہ ایک صاحب نے مجھے کہا ہے کہ مدتِ طویلہ گذر جانے کی وجہ سے آپ کا حقِ شفعہ باطل ہو چکا ہے مہربانی فرما کر شریعت کے مطابق میری راہنمائی فرمائیں ؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامی میں یہ ہے کہ جب شفیع نابالغ ہو تو اُس کے باپ دادا کو شفیع کے لیے حقِ شفعہ کا مطالبہ کرنا چاہیئے لیکن جس کا کوئی بھی ولی نہ ہو تو تو یہ حق اُس کے سنِ بلوغ تک باقی رہے گا۔ اسی طرح اگر حقیقتاً اُس وقت آپ کا کوئی ولی نہیں تھا اور آپ اب بالغ ہوئے ہیں تو آپ کو شفعہ کا حق حاصل ہے، ایسی صورت میں مدتِ طویلہ کا گذرنا آپ کے حقِ شفعہ کو باطل نہیں کرتا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : الجواب نعم وفی الاصل الوصی یطلب الشفعة للصغیر ویقوم مقامه فی لوازمها کالاب والجد...... فان لم یکن له احد من هؤلاء فهو علی شفعته اذا ادرک فاذا ادرک وقد

---

[1] قال العلامة محمد الشهیر الطوری رحمه الله : صح تسلیمهم الشفعة من الاب والوصی والوکیل یعنی ان الحمل والصغیر فی استحقاق الشفعة کالکبیر لاستوائهما فی سببه فیقوم بالطلب والاخذ والتسلیم من یقوم مقامهما الخ
(البحر الرائق ج ۸ ص۱۴۶ فی اخر کتاب الشفعة)

ثبت له خيار البلوغ والشفعة۔اھ (تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۱۸۴ کتاب الشفعۃ)[1]

بیع فاسد پر شفعہ کرنا

سوال:۔کیا بیع فاسد میں شفیع کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔شفعہ کے لیے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت سے کلی طور پر نکل چکا ہو، بیع فاسد میں مبیعہ چونکہ بائع کی ملکیت میں حق فسخ کے اسقاط تک باقی رہتا ہے اس لیے حق فسخ یا مبیعہ کو واپسی کے اسقاط تک شفیع کو شفعہ کرنے کا شرعاً اختیار نہیں۔

لما فی مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۰۲۶ : يشترط ان يزول ملك البائع عن المبيع بناء عليه لا تجرى الشفعة فى البيع الفاسد مالم يسقط استرداد البائع۔

(درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۸۴ الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعۃ)[2]

شفعہ کا ہبہ صحیح نہیں

سوال:۔کیا کوئی شخص اپنا حق شفعہ کسی پر فروخت یا بلاعوض ہبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔شفعہ ایک ایسا حق ہے جو نہ تو فروخت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بطور ہبہ کسی کو دیا جاسکتا ہے، اگر کسی نے ایسی کر دیا تو اس کا حق شفعہ اس سے ساقط ہوجائے گا۔

قال العلامة علاؤالدين الحصكفى رحمه الله : ويبطلها صلحه منها على عوض...ويبطلها

---

[1] قال العلامة على بن محمد الجاعىؒ: ذكر فى الخانية ان الخصم هو الصغار فى طلب الشفعة لهم وعليهم الاباء والاجداد ...على الترتيب السالف فى فصل البيع وفى الاصل الوصى يطلب الشفعة لليتيم ويقوم بلوازمها كالاب والجد وان لم يكن واحد منهم فهو على شفعته اذا ادرك ......وقال محمدؒ لا تبطل الشفعة ويقدر على الاخذ بعد البلوغ فاذا بلغ وقد ثبت له خيار البلوغ۔ (آداب الاوصياء على هامش جامع الفصولين ج۲ ص۲۲۱ فصل فى الشفعة)

[2] قال الشيخ وهبة الزحيلى : الشرط الثالث ان يكون العقد صحيحاً اتفق الفقهاء على هذا الشرط لان المطلوب هو زوال حق البائع فى المبيع فلا تثبت الشفعة فى المشترى شراء فاسداً۔

(الفقه الاسلامى وادلته ج۵ ص۸۲۱ المبحث الخامس شروط الشفعة)

ومثله فى الهندية ج۵ ص۱۶۱ كتاب الشفعة۔ الباب الاول۔

بیع شفعتہ لمال۔ قال ابن عابدینؒ لانها لیست بحق متقرر فی المحل بل مجرد حق التملك فلا یصح الاعتیاض عنه۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۲۴۲ کتاب الشفعة۔ باب ما یبطلها) [1]

بیع وفاء پر شفعہ کا حکم سوال:۔ کیا بیع الوفاء میں شفیع مبیعہ پر شفعہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شفعہ کے لیے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت سے مکمل طور پر نکل جائے، چونکہ بیع الوفاء میں مبیعہ ابھی تک بائع کی ملکیت میں ہے اس لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ بیع الوفاء میں شفیع کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

قال الشیخ وهبة الزحیلیؒ: الشرط الاول: خروج العقار عن ملك صاحبه خروجاً باتاً یجب ان یزول ملك البائع عن العقار المبیع من طریق البات النهائی۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۵ ص ۸۱۸ المبحث الخامس شروط الشفعة) [2]

اموالِ منقولہ پر شفعہ صحیح نہیں سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا اموالِ منقولہ میں حقِ شفعہ ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شفعہ وہ حق ہے جو ایک شخص کو اموالِ غیر منقولہ میں خریداری یا تبادلہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے لہٰذا اموالِ منقولہ میں حقِ شفعہ ثابت نہیں اس لیے کہ حقِ شفعہ کی مشروعیت جس فلسفہ ضرر کی وجہ سے ہوتی ہے وہ یہاں مفقود ہے۔

وفی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۱۷: یشترط ان یکون المشفوع ملکاً عقاریاً

---

[1] قال العلامة المیدانی رحمه الله: وان صالح من حق شفعته علی عوض اخذه اوباعه ایاه بطلت الشفعة لوجود الاعراض ویرد العوض لبطلان الصلح والبیع لانها مجرد حق التملك فلا یصح الاعتیاض عنه لانه رشوة۔

(اللباب شرح الکتاب (الشهیر بمیدانی) ج ۲ ص ۴۷ کتاب الشفعة)

[2] وفی الهندیة: ومنها زوال ملك البائع عن المبیع فاذا زال فلا تجب الشفعة کما فی البیع بشرط الخیار۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۱۶۰ کتاب الشفعة۔ الباب الاول)

بناءً علیہ لاتجزی الشفعة فی السفینة وسائر المنقولات وعقار الوقف والاراضی الامیریة۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۶۷۶ الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعة) [1]

قتلِ عمد کے عوض لی گئی زمین پر شفعہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی آدمی کو قتل کر دیا، علاقائی جرگہ نے راضی نامہ کرتے ہوئے قاتل کی طرف سے کچھ زمین اور ایک لاکھ روپے نقد مع سوڑہ مقتول کی اولاد کو دینے کا فیصلہ کیا۔ اب اس زمین کے قریب ایک مال دار آدمی کی زمین ہے اور اس نے عدالت میں شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے اور کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے اس زمین کی قیمت ۶۰ ہزار روپے ظاہر کی جبکہ حقیقت میں وہ زمین تین چار لاکھ روپے کی ہے۔ تو کیا اس طرح قتلِ عمد پر صلح کے عوض لی گئی زمین پر کسی کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ثبوتِ شفعہ کے لیے چونکہ مشفوع زمین کے عوض معاوضہ کا ہونا ضروری ہے جو صورتِ مسئولہ میں مفقود ہے، اس بناء پر فقہاء کرام نے قتلِ عمد کی صلح میں دی ہوئی زمین پر حقِ شفعہ کو معدوم قرار دیا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی اس زمین پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة علی حیدر رحمه الله: والصلح عن دم العمد فلاتثبت الشفعة لانه لو تثبت الشفعة فیه للزم ان یأخذه الشفیع اما بقیمته او مجاناً ولا یمکن الاخذ بالقیمة لأن المالك لذلك العقار لم یملکه بقیمته

---

[1] قال الشیخ وهبة الزحیلی: اتفق المسلمون علی ان الشفعة حق فی العقار من دور وارضین وبساتین وبئر وما یتبعها من بناء وشجر واختلفوا فیما عداها فقررت المذاهب الاربعة انه لاشفعة فی منقول کالحیوان والثیاب والعروض التجاریة اھ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۷۹۵ المبحث الثانی، محل الشفعة)

ومثله فی اللباب شرح الکتاب ج۲ ص۴۴ کتاب الشفعة۔

حتى يستطيع الشفيع اخذه بالقيمة ۔ (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۲ ص۷۷۲ المادة ۱۰۲۱، الفصل الثاني في بيان شرائط الشفعة) ؎۱

حق مہر میں دی گئی زمین پر شفعہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص بوقتِ نکاح اپنی بیوی کو حق مہر میں کچھ زمین دیدے تو کیا اس زمین پر کسی کو حق شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حق شفعہ کے ثبوت کے لیے معاوضۂ مالی ہونا ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے اس لیے احناف کے ہاں حق مہر میں دی گئی زمین پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

قال العلامة ابوالحسن القدوري رحمه الله: ولا شفعة في الدار التي يتزوج الرجل عليها او يخالع المرأة بها۔ (الكتاب الشهير بمختصر القدوري على صدر اللباب ج۲ ص۴۵ كتاب الشفعة) ؎۲

صلح میں دی گئی جائیداد پر شفعہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی آدمی پر ایک لاکھ روپے کا دعویٰ کیا جبکہ مدعا علیہ اس سے منکر ہے، لیکن مدعی کچھ زور آور ہے، اس پر علاقائی جرگہ نے دونوں کے

؎۱ قال الشيخ وهبة الزحيلي: لكن اختلفوا في التملك بعوض غير مالي فالمهر وبدل الخلع او اجر طبيب او حمام مثلاً او اجرة دار او عوض في الصلح عن دم عمد فقال الحنفية والحنابلة يشترط ان يكون عقد المعاوضة مال بمال فلا شفعة اذا كان العوض غير مال كما في هذه الاحوال لان الشئ في المعاوضة غير المالية يشبه الموهوب والموروث۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج۵ ص۸۲۰ المبحث الخامس شروط الشفعة)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج۵ ص۱۶۰ كتاب الشفعة۔ الباب الاوّل۔

؎۲ وفي الهندية: ولا تجب الشفعة في دار جعلت مهر امرأة او اجرة او عوض عتق ام۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۱۶۱ كتاب الشفعة۔ الباب الاوّل۔

وَمِثْلُهٗ في الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۲۳۶ كتاب الشفعة۔ باب ما تثبت هي فيه او لا تثبت۔

درمیان اس طرح فیصلہ کیا کہ مدعا علیہ مُدعی کو پانچ کنال زمین دے گا، جو کہ مدعا علیہ نے مدعی کو دیدی ہے۔ اب ایک تیسرا آدمی اس زمین پر شفعہ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ کے ثبوت کے لیے اموال غیر منقولہ کا باہمی معاملہ مال کے عوض ہونا ضروری ہے، صورتِ مسئولہ میں معاملہ مالی ہے اگرچہ ایسا مصالحتاً ہی ہُوا ہے لیکن اس کے باوجود تیسرے شخص کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها عقد المعاوضة وھو البیع او ما ھو فی معناہ فلا تجب الشفعة فیما لیس ببیع ولا بمعنی البیع حتی لا تجب بالھبة والصدقة والمیراث والوصیة...... وتجب الشفعة فی الدار التی ھی بدل الصلح سواء کان الصلح علی الدار عن اقرار او انکار او سکوت لوجود معنی المعاوضة۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱، کتاب الشفعة وجوب الشفعة)[1]

طلب اشہاد کے وقت حدود اربعہ بیان کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص طلب اشہاد گواہوں کے سامنے کر رہا ہو تو کیا اس کو مبیعہ پر حقِ شفعہ کے اثبات کی وجہ اور مبیعہ کا حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ جب شفیع طلبِ مواثبت کے بعد گواہوں کے سامنے طلبِ اشہاد کر رہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مبیعہ کا حدودِ اربعہ اور اپنا تعلق بیان کرے تاکہ بات میں کوئی پوشیدگی باقی نہ رہے۔

قال العلامة عبد الرحمٰن شیخ زادہؒ: او یشھد علی المشتری ولو غیر ذی ید بان یقول له اطلب منك الشفعة فی دار اشتریتھا من فلان حدودھا کذا او انا شفیعھا بالشرکة فی الدار او الطریق لہ یا لجوار بدار حدودھا کذا فسلّمھا

---

[1] وفی الھندیة: منھا عقد المعاوضة وھو البیع او ما ھو بمعناہ فلا تجب الشفعة بما لیس ببیع ولا بمعنی البیع...... وکذا تجب فی الدار المصالح عنھا عن اقرار۔
(الفتاوی الھندیة ج۵ ص۱۶۱ کتاب الشفعة۔ الباب الاوّل)

لی فلا بد ان یبین حدود الدارین مع کل واحدۃ من مراتب الثبوت۔
(مجمع الانہر ج ۲ ص۴۷۴ کتاب الشفعۃ) لـه

طلبِ اشہاد میں تعدادِ شہداء کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا طلبِ اشہاد کے لیے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا نہیں، اور کیا اس میں بھی دیگر معاملات کی طرح تعدادِ شہداء و دیگر شرائط کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طلبِ مواثبت کے بعد شفیع کے لیے ضروری ہے کہ وہ گواہوں کے سامنے مبیعہ کے پاس یا بائع و مشتری میں سے کسی کے سامنے اپنے شفعہ کو طلب کرے مگر گواہوں کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ ۲ دو شرطوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے، (۱) یا تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہے۔(۲) یا پھر عدالت کی شرط لازمی ہے۔

اور صاحبینؒ کے نزدیک کوئی شرط ضروری نہیں، متاخرین نے امام صاحبؒ کی رائے کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ویشترط فی ھذا الطلب ان یکون علیٰ فور الطلب الاول والاشھاد علیہ بان یشھد الشفیع علیٰ رغبتہ بالشفعۃ رجلین او رجل وامرأتین۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص۸۲۹ مراحل طلب الشفعۃ) ۲ـه

لـه قال العلامۃ علی حیدرؒ: او یقول خطاباً للمشتری سواء کان المشتری قابضاً المشفوع ام کان غیر قابض فی حضور نصاب الشہادۃ من الشھود انک اشتریت العقار المحدود بالحدود الفلانیۃ وبما انی خلیط فی حق المبیع مثلاً فانا شفیعھا وقد طلبت المواثبۃ وانی اطلبھا الآن ایضاً وانتم ایھا الشاھد ان اشھدا۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۹۶ تحت المادۃ ۱۰۲۳ الفصل الثالث)

۲ـه قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: ھل تشترط فیہ العدد والعدالۃ اختلف اصحابنا فقال ابو حنیفۃؒ یشترط احد ھٰذین اما العدد فی المخبر رجلان او رجل وامرأتان واما العدالۃ۔ وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ لا یشترط فیہ العدد ولا العدالۃ۔
(بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۷ فصل بیان ما یتأکد بہ حق الشفعۃ)
ومثلہ فی مجموعۃ قوانین اسلام ج ۷ ص۲۲۲۴ کتاب الشفعۃ۔

حقِ شفعہ میں شریک فی الشرب مقدم ہے

سوال :- ایک جگہ زمین کا ایک ٹکڑا فروخت ہوا، اس پر دو آدمیوں نے حقِ شفعہ دائر کر دیا ہے مگر دونوں کے اسباب مختلف ہیں، ان میں سے ایک آدمی بائع کے ساتھ راستے میں شریک ہے اور دوسرا پانی میں شرکت کا دعویٰ کرتا ہے۔ تو ان دونوں میں سے کس کو شفعہ کا صحیح حقدار سمجھا جائے گا؟

الجواب :- شفعہ کے ثبوت کے لیے اگرچہ دونوں اسباب مساوی ہیں لیکن باعتبارِ ضرر راستے کا شریک زیادہ مقدم ہے۔ اس لیے علماء نے شریک فی حق الشرب کو راستے کے حق میں شریک پر مقدم کیا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں پانی کا شریک حقِ شفعہ میں دوسرے پر مقدم ہے۔

فی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۱۶: حق الشرب مقدم علیٰ حق الطریق۔
قال العلامة علی حیدرؒ: تحتها یعنی حق الشرب وحق الطریق وان کانا متساوبین من حیث کونهما من اسباب الشفعة لکن فی حال اجتماعها یقدم حق الشرب علیٰ حق الطریق۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۲ ص ۷۶۶ قبل الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعة) [1]

مہرِ مسمّٰی کے عوض میں ملنے والی زمین شفعہ کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! نے شادی کے وقت بیوی کو حقِ مہر میں پچاس ہزار روپیہ لکھوا دیا، اب عورت نے حقِ مہر کا مطالبہ کیا ہے تو شوہر نے نقدی نہ ہونے کی وجہ سے بیوی کو کچھ زمین دے دی، اس پر اس کے شوہر کے بھائی نے جو اس کے ساتھ اس زمین میں شریک ہے حقِ شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے، تو کیا اس کو شرعاً شفعہ کا حق حاصل ہے؟

---

[1] قال العلامة ابراهیم الحلبی رحمه الله : لو شارکه احد فی الشرب وآخر فی الطریق فصاحب الشرب اولیٰ من صاحب الطریق۔
(الدر المنتقی علی هامش مجمع الانهر ج ۲ ص ۴۷۲ کتاب الشفعة)
ومِثلُهٗ فی شرح المجلة لخالد الاتاسی ص ۸۵۲ المادة ۱۰۱۶ قبل الفصل الثانی۔

الجواب:۔ حق مہر میں بیوی کو جو زمین دے دی جائے اگرچہ شرعاً اس پر شفعہ ثابت نہیں ہوتا، مگر صورتِ مسئولہ میں معاملہ الگ ہے، یہ زمین عورت کو اُس پچاس ہزار روپے نقد حق مہر کے عوض دی گئی ہے جو کہ ایک مالی معاملہ ہے، اس لیے شوہر کے بھائی کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔

وفی الهندية: ولو تزوجها علی مهر مسمّی ثمّ باعها بذلك المهر دارًا تجب للشفيع فيها الشفعة وكذلك اذا تزوجها علی غير مهر وفرض لها القاضی مهرا ثمّ باعها بذلك المفروض تجب للشفيع فيها الشفعة۔

(الفتاوی الهندية ج ۵ ص۱۶۲ كتاب الشفعة۔ الباب الاوّل) [1]

تحفہ کے عوض میں ملنے والی زمین پر شفعہ کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص اپنے دوست کیلئے تحفۃً امریکہ کا ویزہ لایا تو دوست نے شکریہ کے طور پر اپنی جائیداد میں سے کچھ اس کے نام ہبہ کر دی، واہب کے بھائی کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے اِس پر شفعہ کر دیا، تو کیا واہب کے بھائی کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ کی ہوئی زمین پر اگرچہ شفعہ صحیح نہیں مگر صورتِ مسئولہ میں چونکہ معاملہ مالی ہے اس لیے فقہاءِ کرام نے شفعاء کو حقِ شفعہ کے ثبوت کی تصریح کی ہے بشرطیکہ جانبین نے اپنے اپنے موہوبہ پر قبضہ کر لیا ہو۔

قال العلامة الكاسانیؒ: لاتجب بالهبة والصدقة والميراث والوصية ...... وان كانت الهبة بشرط العوض فان تقابضا وجبت الشفعة لوجود معنی المعاوضة عند التقابض۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱ فصل شرائط وجوب الشفعة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: اذ لو جعلت بدل مهر المثل او المسمّی عند العقد او بعده تثبت فيه الشفعة لأنه مبادلة مال بمال لانه بدل عما فی ذمته من المهر۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۲۳۷ كتاب الشفعة۔ باب ما تثبت هی فيه اولا تثبت)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۲ كتاب الشفعة، فصل فی شرائط وجوب الشفعة۔

[2] وفی مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۲۲: الهبة بشرط العوض فی حكم البيع بناء عليه لو ذهب وسلم احد داره المملوكة لآخر بشرط العوض يكون جار الملاصق شفيعا۔

(درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج ۲ ص۷۲۴ الفصل الثانی فی شرائط الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۲ ص۷۲۴ الفصل الثانی فی شرائط الشفعة۔

زمین کا تبادلہ کرنے پر حقِ شفعہ ثابت ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! دو آدمیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زمینوں کا تبادلہ کیا اور دونوں کے شفعاء بھی موجود ہیں، اب ان دونوں میں سے کس زمین پر شفعہ کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ چونکہ دونوں بدلین اموالِ غیر منقولہ ہیں اور معاملہ بھی مالی ہے اس لیے دونوں کی زمین قابلِ شفعہ ہے لہٰذا دونوں کے شفعاء کو حقِ شفعہ حاصل ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: منها معاوضة المال بالمال فلا تجب فی معاوضة المال بغیر المال ...... ومنها معاوضة عین المال بالمال فلا تجب فی معاوضة عین المال بمالیس بعین المال۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲ فصل شرائط وجوب الشفعة) [۱]

بحیثیت کرایہ دار کسی کا حقِ شفعہ ثابت نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنا مکان کسی ایسے شخص پر فروخت کرے جو بداخلاق اور بدکردار ہو تو کیا اس کا پڑوسی جو کہ اس کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہتا ہو اس پر شفعہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہ حنفی میں شفعہ کے استحقاق کے لیے شفیع کا اپنے ذریعہ شفعہ کا مالک کا مالک ہونا ضروری ہے۔ صورتِ مسئولہ میں شفیع چونکہ مکان کا اصلی مالک نہیں بلکہ کرایہ دار ہے اس لیے اس کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ملک الشفیع وقت الشراء فی الدار التی یاخذها بالشفعة لأن سبب الاستحقاق جوار الملک والسبب انما ینعقد سبباً عند وجود الشرط۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴ فصل شرائط وجوب الشفعة) [۲]

---

[۱] قال الشیخ وهبة الزحیلی: وان بیع عقار بعقار (مقایضة) وکان شفیعهما واحداً اخذ الشفیع کل واحد من العقارین بقیمة الآخر لانه بدل وهو من ذوات القیم فیاخذه بقیمته وان اختلف شفیعهما یاخذ شفیع کل منهما ماله فیه الشفعة بقیمة الآخر۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۱۱ المبحث الرابع فی احکام الشفعة)

[۲] قال الشیخ وهبة الزحیلی: اتفق الفقهاء علی شرط کون الشفیع مالکاً مایشفع به قبل البیع واختلفوا فی استمرار الملک حتی القضاء بالشفعة علی رائین فقال الحنفیة یشترط استمرار ملک الشفیع حتی یقضی له بالشفعة اھ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۲۲ المبحث الخامس شروط الشفعة الشرط الرابع)

رجسٹری یا انتقال نہ ہونے کی صورت میں شفعہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی دوسرے پر اپنی دس کنال زمین فروخت کی لیکن ابھی تک قانونی طور پر باضابطہ رجسٹری نہیں ہوسکی، تو کیا شفعہ کا حق دار اس زمین پر شفعہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی نقطہ نظر سے بیع ایجاب وقبول سے تام ہوجاتی ہے، مروجہ قانون کے مطابق رجسٹری یا انتقال کی ضرورت نہیں، شفعہ کے لیے نفس ایجاب وقبول ہی کافی ہے۔

وفی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۲۱: الشفعة لاتثبت الّا بعقد البیع البات الصحیح۔
(درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۷۲۲ الفصل الثانی فی شرائط الشفعة) [1]

مشتری کے مرنے سے شفیع کا حق شفعہ باطل نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک آدمی مثلاً زید نے عمرو کے متصل کچھ زمین خریدی مگر عمرو کو اس کی خبر نہ ہوئی اور اس دوران میں زید کا انتقال ہوگیا، ایک ہفتہ بعد عمرو کو زمین خریدنے کی خبر ہوئی، اب عمرو شفعہ کرنا چاہتا ہے تو کیا وہ میت پر شفعہ کرے یا اس کے وارثوں پر؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ مشتری (خریدنے والے) کے مرنے سے شفیع کا حق شفعہ باطل نہیں ہوتا بلکہ شفعہ کا دعویٰ کرنا بدستور باقی ہے، البتہ مشتری کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء سے حق شفعہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔

قال الامام القدوریؒ: واذا مات المشتری لم تسقط الشفعة۔
(مختصر القدوری ص۹۲ کتاب الشفعة) [2]

---

[1] قال الشیخ وهبة الزحیلی: الشرط الاوّل خروج العقار عن ملک صاحبه خروجاً باتاً یجب ان یزول ملک البائع عن العقار المبیع من طریق البیع البات النهائی اللازم الذی لاخیار فیه۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۱۸ المبحث الخامس شروط الشفعة)

[2] وفی الهندیة: ولاتبطل بموت المشتری وللشفیع ان یأخذ من ورثته۔ الخ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فیما یبطل به حق الشفعة بعد ثبوته ومالا یبطل)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۰۲ کتاب الشفعة، باب ماتبطل به الشفعة۔

شفیع برابر ہوں تو دونوں شفعہ کا حق رکھتے ہیں

سوال:۔ ایک گھر دو گھروں کے درمیان واقع ہے تینوں گھروں کی پشت اور دروازے بھی ایک طرف ہیں اور راستہ بھی سب کا ایک ہے، اب درمیان والا گھر ایک پڑوسی نے خرید لیا ہے تو کیا دوسرا پڑوسی شفعہ کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں دوسرے پڑوسی کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے اور شفعہ کرنے کے بعد یہ خریدا ہوا گھر دونوں پڑوسیوں کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا جائے گا۔

وفی الهندية: ولو ان رجلاً اشترى داراً وهو شفيعها ثم جاء شفيع مثله قضى القاضي بنصفها وان جاء له شفيع اخر اولى منه فان القاضي يقضى له بجميع الدار وان جاء شفيع دونه فلا شفعة له۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۱۷۸ الباب السادس فی الدار اذا بیعت ولها شفعاء)

کسی کے حق شفعہ کو ختم کرنے کے لیے اصل رقم سے زائد لکھوانا

سوال:۔ آجکل مکان یا زمین کی خرید و فروخت میں یہ بات عام ہے کہ مشتری بیعہ پر کسی کے شفعہ کرنے کے خوف سے بائع سے اصل رقم سے کئی گنا زائد رقم مثلاً دو لاکھ کی بجائے چار لاکھ روپے لکھوالیتا ہے اور بائع بھی اس پر راضی ہوتا ہے۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں مشتری کا ایسا کرنا شفیع کے حق شفعہ کو دھوکہ اور فریب سے ساقط کرنے کے مترادف ہے اس لیے اس کا یہ عمل موجب گناہ ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: اس طرح کرنا جائز نہیں ہے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۱۶۳)

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: وكذا لو كان الشريك غائباً فطلب الحاضر يقضى له بالشفعة) كلها (ثم اذا حضر وطلب قضى له بها) فلو مثل الاول قضى له بنصفه ولو فوقه فبكله ولو دونه منعه الخ ـ قال العلامة ابن عابدينؒ: تحت قوله (فلو مثل الاول) اى لو كان الذى حضر مثل الاول كشريكين او جارين الخ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار جلد ۶ ص۲۲۲ کتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوى ج۴ ص۲۵۵ کتاب الشفعة، الفصل الثانی فی المقدمة۔

مسوّدۂ قانونِ شُفعہ پر مجلسِ شوریٰ میں کی گئی تقریر

قانونِ شفعہ کا مسودہ ایوان میں پیش ہونے پر ۱۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو دن بھر اس مسئلہ پر گرما گرم بحث ہوئی کہ اس مسودہ کو عوام کی رائے سے حاصل کرنے کے لیے مشتہر کیا جائے اور آئندہ کسی موقعہ پر اسے زیرِ غور لایا جائے۔ مولانا سمیع الحق صاحب نے اس ضمن میں ایوان میں مختصر مگر پُرمغز اور مدلل تقریر کی جسے قانونِ شفعہ کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

مُرتّب

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق

مولانا سمیع الحق | یہ ایک اسلامی قانون کا مسودہ ہے اور یہ پہلا اسلامی قانون ہے جو اس ایوان میں آیا ہے، اصولی طور پر مجلسِ شوریٰ کا اہم مقصد اس ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنا ہے، اور اس سمت میں یہ ایک اہم آئٹم ہے۔ مجلسِ شوریٰ کے لیے جو رہنما اصول مقرر کیے گئے ہیں ان میں یہ ہے کہ ہم نے اسلامی نظام کے نفاذ کو تیز کرنے میں مدد دینا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کے علاوہ بھی دو اور اسلامی قانون قاضیوں کے کورٹ اور دیت و قصاص کے متعلق تھے وہ بھی سٹینڈنگ کمیٹی کی نظرِ کرم سے مؤخر کر دیئے گئے ہیں۔ اور اگر اب اس مسودہ کی تاخیر اور التواء کے لیے بھی آج تحاریک پیش کی جا رہی ہیں، تو اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو یہ افسوسناک معاملہ ہوگا اور اس کا بڑا خراب اثر پڑے گا۔ ہماری حالت تو اسلامی نظام کے نفاذ کے بارہ میں یہ ہوگئی ہے کہ ؎

عُمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

یہاں کچھ حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس مسودہ کو عوام کی استصوابِ رائے کے لیے مشتہر کیا جائے، اگرچہ یہ مقصد پہلے بھی حاصل ہو چکا ہے، لیکن اس سلسلے میں میں عرض کرتا ہوں کہ کیا اسلام ہمیں یہ حق دیتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے عوام سے

اجازت لی جائے اور اس کے بارے میں عوام سے استصواب کریں؟ خدا اور رسولؐ کے طے شدہ قوانین اور احکام کے بارے میں اسلام ہمیں ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس کے بارے میں عوام سے پوچھیں۔ ہمارے عوام بہت اچھے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ عوام نے استصواب کے نتیجے میں کسی اسلامی قانون کو مسترد کر دیا، تو کیا یہاں حاکمیت عوام کی ہے یا حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، یہ عوام والی بات کے دور سے تو ہم گذر چکے ہیں اور اس کا خمیازہ بھی ہم نے بہت بھگت لیا ہے۔ یہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ تو اس لحاظ سے میری گذارش یہ ہے کہ اسے اہم ترین مسئلہ سمجھا جائے۔ یہاں ایک بزرگ نے کہا تھا کہ یہ اسلام کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں جان و مال اور جائیداد کے حقوق کے تحفظ اور دوسروں کے ظلم و تعدی اور زیادتی سے بچنے کا سوال ہے۔ اسلام کی نگاہ میں مال اور جائیداد کا تحفظ اور کسی کے ظلم و زیادتی سے بچانا اور بچنا یہ ایک اہم ترین سوال ہے۔ تو اس لحاظ سے میں تمام معزز ممبران سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ دینی جذبہ اور پوری گرمجوشی کے ساتھ اس مسودے کا خیر مقدم کریں اور اس پر بحث کریں۔ یہ پہلا مسودہ ہے جو عرصۂ دراز کے بعد اسلامی قوانین پر مبنی یہاں آیا ہے۔ آپ سب خوش قسمت ہیں کہ آپ کے سامنے ایسا مسودہ آیا ہے، اس میں اگر کچھ خامیاں، خرابیاں اور اختلافات ہیں بھی تو وہ تراہیم کی شکل میں پیش کی گئی ہیں یا پیش کی جائیں گی اور ان کا ازالہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان معروضات کے ساتھ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(رپورٹنگ وفاقی کونسل سیکرٹریٹ)

> ۱۲ر اپریل ۱۹۸۲ء کی شام کی نشست میں مولانا سمیع الحق نے شفعہ کے مسودہ پر تقریر کی، وفاقی کونسل کے سیکرٹریٹ کی قلمبند شدہ تقریر حسب ذیل ہے۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

جناب چیئرمین! میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، کافی حضرات اس موضوع پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ شفعہ کے اس قانون کے بارے میں کچھ بنیادی نکتے اٹھائے گئے ہیں میں ان کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے فاضل مقرر کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ قرآن مجید میں

شفعہ کے بارے میں احکام نہیں ہیں، تو یہ ایک بنیادی غلط فہمی ہے کہ شریعت اسلامیہ کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے، حالانکہ شریعت کا بنیادی ماخذ جس طرح قرآن کریم ہے اسی طرح سنت نبوی بھی ہے۔ اگر ہم ہر چیز کو قرآن میں تلاش کریں گے تو ہمیں پانچ وقت کی نمازوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ قرآن کی کسی آیت میں یہ تفصیل نہیں ہے کہ مغرب کے تین رکعت فرض ہیں اور کسی آیت میں یہ نہیں کہ فجر کے دو فرض ہیں اور عصر کے چار ہیں نہ ان مخصوص اوقات کا تفصیلات کے ساتھ ذکر ہے ۔ اسی طرح زکوٰۃ کی تفصیلات بھی قرآن کریم میں نہیں ہیں لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی ہے اور مقادیر بیان کئے ہیں۔

تو جناب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چھوٹی سی چھوٹی بات جو حضورؐ نے فرمائی اور ہمیں مستند طریقہ سے پہنچ گئی اسے ہم قرآن کریم اور دین ہی کا حکم سمجھیں گے۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے ایک صحابی سے کسی خاتون نے دریافت کیا کہ جسم کو کھرچ کھرچ کر اس میں رنگ بھرنے کا مسئلہ کیسا ہے؟ صحابی نے کہا کہ یہ سختی سے منع ہے، قرآن میں اس کا حکم موجود ہے، خاتون نے کہا میں الحمد سے لیکر والناس تک قرآن کریم پڑھتی ہوں اس میں تو اس چھوٹے سے مسئلہ کا کہیں ذکر نہیں ہے، صحابی نے کہا کہ لوقرأتیہ لوجدتیہ اگر تم نے قرآن کو غور سے پڑھا ہوتا تو اس حکم کو وہاں پایا ہوتا۔ صحابی نے فرمایا قرآن کریم میں ہے، مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا کہ جو حکم تمہیں رسول نے دیا اس پر سختی سے عمل کرو اور جن باتوں سے آپؐ نے منع کیا ان سے منع ہو جاؤ۔ یہ ایک اصول ہمیں قرآن نے دیا ہے۔ اب اس مسئلہ میں حضورؐ نے جو راہنمائی دی ہے وہ بھی گویا قرآن ہی کا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الحمدللہ قرآن کے ساتھ سنت کو بھی ہمارے آئین میں بنیادی ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد چونکہ کچھ ارکان نے شفعہ کے سلسلہ میں واضح احادیث کا مطالبہ کیا ہے تو اوان کے سامنے بھی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے الفاظ لانا چاہتا ہوں جن میں ان افراد کی تفصیل موجود ہے جنہیں شفعہ کا حق دیا گیا ہے۔

مولانا سمیع الحق : جناب والا! جائیداد میں شریک خلیط کا سب سے پہلا درجہ ہے، اس کے بعد جو حقوق میں شریک ہے اس کا درجہ ہے، تیسرے نمبر پر جار ہے یعنی پڑوسی۔ تو یہاں سب سے پہلے میں شریک کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد گرامی حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف سے نقل کرتا ہوں، یہ امام مسلم کی کتاب ہے اور صحیح بخاری کی طرح اس کا درجہ ہے۔

عن جابرؓ قال قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالشفعة فی کل شرکة لم تقسم ربعة او حائطاً لا یصلح ان یبیع حتی یؤذن شریکه فان شاء اخذ وان شاء ترك فاذا باع ولم

یؤذنه فهو احق به۔ (الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ۔ حدیث ص ۸۸۸ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے فیصلہ دیا شفعہ میں مشترک حصہ میں جب تک وہ تقسیم نہ ہوا ہو خواہ وہ مکان ہو یا باغ تو اس میں شفعہ کا حق ہوگا شریک کو جو ملکیت میں شریک ہو"۔ پھر اس میں قضی رسول اللہ کا لفظ ہے کہ صرف فرمایا نہیں بلکہ فیصلہ دیا حضورؐ نے، قضی کا مطلب فیصلہ دینا ہے جس کا ایک فاضل رکن نے مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح امام بخاریؒ نے بھی ایک روایت نقل کی ہے۔

لقوله علیه السلام: بالشفعة فی کل مالم یقسم فاذا وقعت الحدود و صرفت الطرق فلا شفعة۔ (الہدایۃ ج ۴ ص ۳۸۷ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعہ کا ہر اس چیز میں فیصلہ کیا جو ہنوز تقسیم نہ کی گئی ہو اور شرکت باقی ہو لیکن جب اس کی حدود متعین اور راستے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں تو اب (بر بنائے شرکت) شفعہ نہیں رہا"۔

شفعہ ان تمام جائیدادوں میں ہے جب تک وہ تقسیم نہ ہوئی ہوں۔ آگے حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا، فاذا وقعة الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة۔ مثلاً اگر چار بھائیوں کی مشترکہ زمین ہے اور انہوں نے اسے تقسیم کر لیا اور اس کی حد بندی کر دی یا حقوق میں اشتراک ہے اور راستے الگ کر دیئے گئے تو پھر اس پر شفعہ کا کوئی حق نہیں۔۔۔ اس سے ایک دوسری بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ دو بھائیوں میں زمین مشترک تھی، اب اس ملکیت میں شراکت کی وجہ سے ان کو شفعہ کا حق تھا لیکن جب زمین تقسیم ہو گئی تو ان کا حق شفعہ نہیں رہا اب اگر رشتہ داری کی وجہ سے بھی ان کو شفعہ کا حق مل سکتا ہوتا تو حضورؐ یہ نہ فرماتے کہ اب حق شفعہ نہیں رہا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دو سگے بھائیوں میں یا باپ اور بیٹے میں بھی اگر زمین تقسیم ہو گئی تو پھر (بر بنائے شراکت) شفعہ کا حق نہیں ہوگا کیونکہ ملکیت میں اب شراکت نہیں ہے، پھر جوار (پڑوسی) کی وجہ سے اگر وہ چاہے گا تو حق جوار کی وجہ سے اس کو شفعہ کا حق حاصل ہوگا جس میں اجنبی اور رشتہ دار سب برابر ہیں۔ یہ تو شریک کے بارے میں حدیث ہے، اسی طرح جار (پڑوسی) کے حق شفعہ کو دیکھئے۔ امام ابو داؤدؒ کی کتاب (سنن ابی داؤد) صحیح اور مستند ہے تمام مسلمانوں کے نزدیک، اس میں حضورؐ سے روایت ہے کہ جار الدار احق بدار الجار والارض جو مکان کا پڑوسی ہے یا جو زمین کا پڑوسی ہے وہ اس پڑوسی ہونے کی وجہ سے حقدار ہے اگرچہ شریک فی الملک نہ ہو اور شریک فی الحقوق بھی نہ ہو مگر اس کا حق ہوگا۔ اب ترتیب کیا ہے تینوں کی؟ وہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعین فرما دی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الشریك احق من الخلیط

و الخليط احق من الشفيع۔ راو کما قال)۔ (الھدایۃ ج۴ ص۳۸۸ کتاب الشفعۃ)

یہاں اجتہاد کی باتیں ہو رہی ہیں مگر یہ اجتہاد کی باتیں نہیں، اجتہاد تو وہاں ہوگا جہاں حضور اکرمؐ سے پوری راہنمائی نہ حاصل ہوتی ہو۔ تو حضورؐ نے تو سب کچھ فرمادیا، حقدار اور ان کی ترتیب بھی متعین کردی کہ ملکیت میں شراکت دار جو ہوگا اس کا پہلا نمبر ہے خلیط سے، خلیط وہ ہے جس کے صرف حقوق ہوں۔

پھر فرمایا کہ الخلیط احق من الشفیع، جب خلیط اور پڑوسی کا مقابلہ آئے گا تو جو حقوق میں شریک ہے، جو ملکیت میں شریک ہے ان کا حق پہلے ہوگا، اس کے بعد جو جار والا ہے اس کا حق ہے۔

اسی طرح سنن اربعہ ابوداؤد و ترمذی وغیرہ حدیث کی کتابوں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مذکور ہے:۔

عن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجار احق بشفعۃ جارہ ینتظر بہا وان کان غائبا اذا کان طریقہما واحدا۔ (ابوداؤد، مسند احمد، ابن ماجہ، ترمذی، دارمی)۔ (الدرایۃ فی تخریج احادیث، رقم حدیث ۸۸۹ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے، اگر وہ غائب (غیر موجود) ہو تو شفعہ کے لیے اس کا انتظار کیا جائے مگر یہ شفعہ اس وقت ہوگا جبکہ دونوں ہمسایوں کا راستہ ایک ہو۔"

جو پڑوسی ہے اور اس کا تیسرے نمبر پر حق بنتا ہے تو اب وہ حقدار ہوگا اجنبی لوگوں سے، رشتہ داروں سے اور مختلف طبقہ کے لوگوں سے اس کا انتظار کیا جائے اگر وہ موجود نہ ہو۔ ینتظر بہا وان کان غائبا۔ آگے یہ بھی فرمایا کہ جب راستہ ایک ہے تو اُسے ترجیح دی جائے گی۔

دوسری روایت حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی ہے جو کہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

عن ابی رافع مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول الجار احق بسقبہ قیل یا رسول اللہ ماسقبہ قال شفعتہ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۳۸۷ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "یعنی پڑوسی اس زمین کا قرب اور نزدیک ہونے کی وجہ سے زیادہ حقدار ہے، صحابہؓ نے سقب کے بارہ میں دریافت کیا تو فرمایا کہ اس سے مراد شفعہ میں اس کا استحقاق ہے، وہ قرب کی وجہ سے زیادہ حق دار ہے۔

اسی طرح ترمذی میں روایت ہے الجار احق بشفعتہ ـــــــ یہ میں نے مختصراً حضورؐ کی چند روایات پیش کی ہیں کہ حضورؐ نے ان تین شفعاء ہی میں حق شفعہ کو مخصوص، محدود اور محصور کیا ہے۔ اب یہاں ایک سوال اٹھایا گیا کہ جس وقت یہ مسودہ عوام میں مشتہر کیا گیا تھا کہ ان تینوں میں ہم کیوں محدود کریں جبکہ اوروں کی صریح مخالفت تو نہیں۔

جناب والا! یہاں مختلف حضرات تقریریں کرتے ہیں، ان کی تمہید عجیب جوش و خروش کی ہوتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری تائید کی طرف آرہے ہیں، دلائل ہمارے حق میں دیتے ہیں اور آخر میں یکدم پلٹ جاتے ہیں، ان کی تقریروں میں تضادات ہوتے ہیں، آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ شفعہ کے اس مسئلے میں کوئی ابہام یا کوئی پریشانی ہے ہی نہیں، کبھی وہ کہتے ہیں کہ یہ ان تین سے بھی زیادہ کو دیا جائے، کچھ حضرات کہتے ہیں کہ ان تین میں سے بھی کم کر کے ان کو محدود کیا جائے، تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ ابہام اور پریشانیاں کس چیز سے پیدا ہوگئی ہیں؟ اب کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ چونکہ حضورؐ نے اوروں کی نفی تو نہیں کی اور انما کا کلمہ نہیں آیا۔ حالانکہ یہ ایک علمی اصطلاح ہے اور قواعدِ لغت کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ کلمہ حصر نہیں ہے، یعنی حضور اقدسؐ نے یہ تو نہیں فرمایا انما الشفعۃ للشریك الخ کہ شفعہ ان تین تک محدود ہے کیونکہ انما حصر کا ہے اور وہ کلمہ نہیں اوروں کو بھی ملنا چاہیئے۔ اور دلیل ان لوگوں نے یہ پیش کی ہے کہ آیتِ زکوٰۃ میں ہے کہ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ. مصارفِ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے اِنَّمَا کے کلمہ سے مخصوص کر دیئے ہیں، اب جو آٹھ مصارف ہیں ان میں ہم نویں اور دسویں مصرف کا اضافہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے، ایک چیز کو محصور کرنے کے لیے انما کا حرف اور حصر کے کلمات ضروری نہیں ہوتے، الف لام اختصاص وہ بھی تخصیص کے لیے آتا ہے، جیسے الحمد للہ ہے، اب اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حمد اور تعریف و ستائش ساری اللہ کے لیے ہے کسی اور کو ہم حمد میں شریک نہیں کر سکتے ورنہ وہ کفر ہو جائے گا حالانکہ یہاں انما تو نہیں۔ اب الحمد میں "ل" اختصاص کے لیے ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایک جملہ کا مقام مؤخر ہو جاتا ہے اور اس کو مقدم کر لیا جاتا ہے وہ بھی حصر کا فائدہ دیتا ہے اور تخصیص ثابت کرتا ہے، مثلاً نعبد ایاك ہونا چاہیئے تھا نماز میں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، مگر وہاں یہ کہا کہ ایاك نعبد ہم خاص تیری عبادت کرتے ہیں کسی اور کی نہیں کر سکتے۔ یہ حصر کس چیز سے ثابت ہوا؟ کسی جملہ کا حق دوسری جگہ تھا لیکن وہاں سے پہلے آیا اور اس کو پہلے کر دیا۔ یہ تقدیم ما حقہ التاخیر کہلاتی ہے۔ اسی طرح اگر میں یہ کہوں کہ نہیں آیا اس ایوان میں مگر زید، تو یہ استثناء بھی حصر کے لیے مفید ہو گیا۔ ما جاءنی من القوم الا زید۔ اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضور اقدسؐ کے

زمانہ میں جب سارے حالات آپ کے سامنے تھے، حضورؐ اور صحابہؓ کے رشتہ دار بھی تھے اور مختلف طبقے موجود تھے، آپ کو پتہ تھا کہ تکلیف لاحق ہو سکتی ہے، مگر شفعہ کا حق ان لوگوں کو نہ دیا۔ آج کہا جاتا ہے کہ شفعہ کی وجہ یہ ہے کہ دوسروں کو نقصان سے بچایا جائے یعنی دفع ضرر مقصود ہے مگر یہ بھی ایک علمی اصطلاح ہے اسے حکمت کہتے ہیں علت نہیں کہتے، دفع ضرر حکمت ہے اور علت اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ حکمت کے طور پر ایک چیز پیش کر دے مگر وہ علت نہیں ہوتی حکمت و مصلحت ہوتی ہے، علت ہوتی تو ہم دفع ضرر کو عام کر دیتے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں کہا گیا کہ ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کی گواہی کے برابر ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وجہ بھی بیان کر دی کہ شاید ایک خاتون بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا سکتی ہے۔ فتذکر احداھما الاخریٰ مقصد بھول سے بچنا ہے، وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اب اگر ایک خاتون بہت بڑی عالمہ ہے، اس کا حافظہ مسلّم ہے ہمیں پتہ ہے کہ وہ نہیں بھولتی تو اس قانون کو بدل تو نہیں سکتے کہ اس ایک کی شہادت مرد کے برابر ہو جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو حکمت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نماز پڑھو تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میں نماز نہیں پڑھتا اس لیے کہ میں متقی نہیں بن سکتا لہٰذا نماز ہی چھوڑ دوں۔ نماز کی علت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہ خطرات ادروں نے ظاہر کئے ہوں گے لیکن حضور اکرمؐ نے کسی کو یہ حق نہیں دیا۔ حضورؐ کی نظر بڑی وسیع تھی اور شفقت بھی سب سے بڑھ کر تھی۔

اب اگر ہم اس موضوع کو لیں کہ ضرر سے بچانا مقصود ہے تو پھر میرے خیال میں شفعہ کے جو قوانین انگریزی دور کے جاری ہیں اُن کے تحت ایک دوکاندار اور کرایہ دار کو بھی حق ملنا چاہیئے کیونکہ اس کو بھی ضرر ہے، اگر وہ دُکان خالی کرتا ہے تو اس کو ضرر پہنچے گا۔ تو کیوں نہ اس کو شفعہ کا حق دیا جائے، یا اگر کوئی کرایہ دار ہے اور وہ مکان خالی کرتا ہے تو اس کو بھی ضرر پہنچ سکتا ہے۔ آپ ایک ملازم رکھتے ہیں اور پھر کسی وجہ سے اپنا کاروبار چھوڑ دیتے ہیں تو نظریہ دفع ضرر کے تحت اس ملازم کو بھی شفعہ کا حق ہو گا؟ اسی طرح میں نے زمین بیچی تھی آج اس کا دوسرا شخص مالک ہے اس نے تیسرے کو بیچ دی، تو پہلا مالک یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا بھی حق ہونا چاہیئے کیونکہ میں بھی کسی وقت اس زمین کا مالک تھا۔ اس طرح یہ سلسلہ بڑا طویل ہو جائے گا، اسلئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر مزارعین کو حق دینے کا مسئلہ ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح فرض کر لیا گیا کہ اگر میں نے زمین بیچ دی تو اس سے مزارع کو نقصان پہنچے گا اور مشتری لازماً مزارع کو بے دخل کر دے گا، اگر مزارع محنت کرتا ہے، دیانتدار اور با اصول ہے تو جس طرح میں نے اُسے رکھا تھا اسی طرح دوسرا خریدار بھی اسکی ایمانداری کی وجہ سے اُسے رکھ

ے گا۔ محنتی اور ایماندار ملازم کی تلاش تو ہر وقت رہتی ہے، لیکن اگر وہ محنت نہیں کرتا تو پھر تو مالک کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے نکال سکتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مالک کو بھی ضرر سے بچانا ضروری ہے اور ملازم کو بھی بچانا ضروری ہے، ضرر سے سب کو بچانا مقصود ہے کسی ایک طبقہ کو نہیں، قانون میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی خاص فرد کا کیا ہو گا، کسی ایک طبقے کا کیا بنے گا، مفادِ عامہ کو دیکھا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ ایک مجرم کو ۱۴ سال قید کی سزا دیتے ہیں اور اسے جیل میں ڈال دیتے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اہل و عیال پر کیا گذرے گی، وہ بھوکے پیاسے رہیں گے، ان کا کوئی کفیل نہیں ہو گا، پھر آپ کو یہ حق کہاں ہے کہ آپ اس کو جیل میں ڈالیں۔

ایک شخص قتل کرتا ہے اور عدالت کی طرف سے اُسے قصاص میں قتل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، تو آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس کے خاندان کا کیا بنے گا؟ اور انہیں کتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا؟ مفادِ عامہ کو دیکھا جاتا ہے، پھر تو آپ چور کے ہاتھ بھی نہیں کاٹ سکتے، اس لیے کہ اس کے اہل و عیال بھوکے رہیں گے اور اس کی ساری زندگی تکلیف میں گذرے گی، تو قانون مفادِ عامہ کے لیے بنایا جاتا ہے۔

یہاں اس ایوان میں مزارع اور غیر مزارع، رشتہ دار اور فلاں اور فلاں یہ ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے کہ گویا شریعت نے اس معاملہ میں کوئی راہنمائی کی نہیں! حالانکہ فقہ میں تمام تفصیلات موجود ہیں، خلافتِ راشدہ اور خلافتِ عباسیہ میں کئی کئی منزلہ مکانات اور عمارتیں موجود تھیں، یہ کوئی مسئلہ نہیں کہ آج اٹھایا جائے۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ یہ تین طبقے تو ہر دور میں شفعہ کے حقدار رہے ہیں، حضور اکرم ﷺ سے لے کر انگریزی دور کے آخر تک کسی قانون میں، کسی دورِ حکومت میں، خلافتِ عباسیہ، خلافتِ عثمانیہ اور ہندوستان میں خلافتِ مغلیہ میں کسی اور کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ جو حق حضورؐ نے دیا اس پر تمام صحابہ کرامؓ اور ائمہ کرامؒ نے اتفاق کیا، اسے کہتے ہیں تعاملِ اُمت۔ اب اگر ایک امام نے جار کے حق کی مخالفت کر بھی لی لیکن دوسرے تو متفق ہیں۔ اس کو اصطلاح میں اجماعِ مرکب کہتے ہیں کہ ان تین سے زیادہ پر کسی کا اختلاف نہیں۔ پھر صحابہ کرامؓ کا دور آیا، ائمہ کرامؒ کا دور آیا، اہلِ بیت کا دور آیا لیکن کسی اور کو یہ حق نہیں دیا گیا۔

بہر حال میں اپنی باتیں سمیٹ کر عرض کروں گا کہ یہاں حاجی سیف اللہ صاحب نے ایک بات کہی اور مجھے افسوس ہے کہ انہیں ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ اگر ہر مسئلہ میں شریعت اور قانون میں فرقہ وارانہ اختلافات

کو ابھارا جائے گا تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا، توجیہات اور تشریحات میں اختلافات ہوسکتے ہیں۔ یہ تو آپ کے قانون دان اور وکلاء حضرات بھی ایک مقدمہ میں متفق نہیں ہوسکتے، جج صاحبان کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں تو ہر ایک کا فیصلہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر تو آپ اس سارے نظام عدل کو دریا میں ڈال دیں، پھر تو آپ عدالتی نظام چلا ہی نہیں سکتے، تو اصول میں کبھی اختلاف نہیں رہا۔

ہمارے پاس اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ آئی ہے، اس کونسل میں شیعہ علماء، بریلوی اور دیوبندی علماء، جج، وکلاء اور جدید عالم موجود تھے، ان سب نے متفقہ طور پر یہ رپورٹ پیش کی، شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مجھ سے خود شیعہ عالم علامہ رضی نے کہا کہ ہمارے ایسا کوئی اختلافی جملہ نہیں کہا۔ ہم سنی تو ان باتوں میں بڑے وسیع النظر ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے اسلامی فقہ کی عظیم کتاب **ھدایہ** ہے جس کا انگریزی ترجمہ یورپ میں پڑھایا جاتا ہے، اس میں تمام تفصیلات موجود ہیں کہ حق شفعہ کس کو ہے کس کو نہیں ہے، منقولہ جائیداد میں ہے یا غیر منقولہ میں ہے، پانی کی صورت کیا ہوگی، لفٹوں کا نظام کیا ہوگا، اور ساری وضاحتیں اس میں موجود ہیں، مثلاً تین منزلہ عمارت کی صورت میں ایک شخص نچلی منزل پر رہتا ہے، اوپر والی منزل کا راستہ تیسری منزل پر ہے، اس کی سیڑھیاں تیسری منزل والے پر آتی ہیں اور دوسری منزل والے کی سیڑھیاں الگ راستہ پر ہوں تو شفعہ کا حق وہ کہتے ہیں کہ پہلے والے کو ہوگا، اگر نیچے والے نے بیچ دیا تو پہلے والے کو ہوگا، اور اگر اوپر والے نے بیچ دیا تو نیچے والے کو ہوگا، درمیان والا متصل ہے، لیکن وہ چونکہ جار ہے، پڑوسی ہے تو حقوق میں شریک نہیں ہے اس کا نمبر تیسرا ہے — تو یہاں ایک جملہ اختلافات کا کہا گیا۔ اسلام کے قوانین کی نظروں میں فروعی اختلافات اور فرقے نہیں ہوتے، یہاں تک کہ مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی نہیں کی جاتی۔ میرے سامنے **ھدایہ** کی کتاب ہے میں اس کتاب سے ایک جملہ پڑھ کر سناتا ہوں:۔

والمسلم والذمی فی الشفعۃ سواء "یعنی مسلمان اور غیر مسلم شفعہ کے تمام حقوق میں برابر ہیں" — اگر ایک عیسائی ہمارے پڑوس میں ہے اور جار کی ساری سہولتیں اسے حاصل ہیں اور دوسرا جو کہ مسلمان ہے اور ایک ڈگری درجہ اس کو بعد میں رہا ہے تو اس کو شفعہ کا حق نہیں ہوگا عیسائی کا درجہ پہلے ہوگا، کیونکہ احکام عام ہیں، سبب جو شفعہ کا ہے اس میں مسلمان اور غیر مسلم برابر ہیں —

صاحب ہدایہ کا قول ہے، للعمومات ولا نهما يستويان فی السبب والحكمة فيستويان فی الاستحقاق، اس لیے استحقاق میں دونوں برابر ہیں — اس سے قبل ایک دوست نے

اسلام میں غلامی کی بات چھیڑ دی تھی ، یہ عجیب بات ہے، کیا یہ غلامی اسلام کے لیے ایک دھبہ ہے ؟ بات شفعہ کی ہوتی ہے تو مسئلہ غلامی کا چھیڑ دیا جاتا ہے ، کل کوئی یہ کہے گا کہ اس زمانے میں حرمتِ خمر کی بات ؟ کوئی یہ کہے گا کہ اس زمانے میں مخلوط ڈانس کی بات ؟ (زور دار تالیاں) بھائی! اسلام نے تو غلاموں کو آسمان تک پہنچا دیا ہے ، اسلام نے غلامی کو ختم کیا۔ اس شفعہ کے مسئلہ ہی کو لیجئے، اسی ھدایہ کا ایک اور جملہ شفعہ کے سلسلہ میں آتا ہے کہ ، ولھذا یستوی فیہ الذّکَرُ وَ الاُنثیٰ والصغیر والکبیر والباغی والعادل والحر والعبد اذا کان ماذونا او مکاتبًا ۔ اور چھوٹا اور بڑا اس کے حق میں برابر ہیں، اور سننے کی بات آگے ہے کہ آزاد انسان اور غلام انسان بھی اس میں بالکل برابر ہیں۔ یعنی اسلام نے تو غلام کو بھی ان تمام قوانین میں آزاد کے برابر حق دیا ہے ۔

تو جناب! میں ان گذارشات کے ساتھ ، چونکہ کافی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، اپنی تقریر ختم کرتا ہوں ۔

مسوّدہ شفعہ آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دارالعلوم حقانیہ کی سفارشات وترامیم

حکومتِ پاکستان نے نمبر ۳ (۲) (۲۲)/۸۰ آر، سی، آئی آئی مجریہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء کے تحت شفعہ آرڈیننس ۱۹۸۰ء کا مسوّدۂ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا، اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دارالعلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحی ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا غلام الرحمٰن صاحب نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کی راہنمائی، مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر از روئے فقہ وشریعت نظرثانی کی اور جہاں جہاں قابلِ اصلاح چیز نظر آئی اس کی اصلاح کرکے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانونِ شفعہ آرڈیننس میں کل ۱۳ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کے مرسلہ مسودہ شفعہ آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء کی بعض دفعات کے متعلق چند اہم تجاویز اسلامی نقطہ نظر سے ارسالِ خدمت ہیں، لیکن واضح ہو کہ یہ تجاویز صرف اُن دفعات کے متعلق ہیں جو مفصل اور غیر مخدوش ہیں، ورنہ جو دفعات ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھیں ان کے متعلق ہم جواب دینے اور رائے ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔

مثال کے طور پر صؔ پر دفعہ ۲ کی شق (۳) اور ایسے ہی ص۹ دفعہ ۲ میں شق ۲ محذوش اور مبہم ہیں جو ہمارے لیے قابلِ فہم نہیں ہیں اس لیے ان کے متعلق ہم رائے نہیں دے سکتے ، نیز اُن دفعات کے متعلق بھی ہم رائے نہیں دے سکتے جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً ہے اور تفصیلی حوالہ تعزیراتِ پاکستان پر دیا گیا ہے ۔ جیسا کہ ص۱۲ پر دفعہ ۳ کا مجموعہ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ کا ایکٹ ۴۲ ۔ اور اسی صفحہ کی دفعہ ۳۱ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ ایکٹ ۵ ۔ صفحہ ۱۲ پر دفعہ ۳۳ میں قانون میعاد سماعت ۱۹۰۸ کے ایکٹ ۹ میں شامل امور ۔ اور ص۱۳ کی دفعہ ۳۶ کی شق الف اور شق ۳ ۔ ان دفعات سے تعلق رکھتی ہیں جن کے مجمل ہونے کی وجہ سے ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ سے رائے دینے سے قاصر ہیں اس لیے کہ تعزیرات پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں ۔ اس کے علاوہ دیگر غیر مبہم اور تفصیلی دفعات کے متعلق تجاویز پیشِ خدمت ہیں ۔

(۱) اس مسودہ کے ص۲ پر دفعہ ۲ کی شق ۴ میں ہے کہ کسی جائیداد غیر منقولہ کے بہتر انتظام کی غرض سے یا جائز طریقے سے ذاتی استعمال میں لانے کے لیے تبادلہ کرنے کی صورت میں اگر تملیک و تملک کی حیثیت اور غرض سے ہو تو پھر اس صورت کو حقِ شفعہ سے مستثنیٰ کرنا ازروئے شرع درست نہیں بلکہ یہ بھی ان صورتوں میں سے ہونا چاہیئے جن میں حقِ شفعہ شفیع کے لیے ثابت ہے ۔

(۲) ص۲ پر دفعہ ۲ کی شق (د) کے آخر میں[1] یہ اضافہ بھی ضروری ہے کہ شُفعہ اُس جائیداد میں بھی واجب ہوگا جو کسی صلح کی صورت میں اقرار ، انکار یا سکوت میں دی جائے اور یا کسی جائیداد غیر منقولہ سے اقرار کی صورت میں صلح ہو جائے ، اس کے لیے حوالہ ملاحظہ ہو ۔

وتجب الشفعة فی الدار التی ھی بدل الصلح سواء کان الصلح عن الدار عن اقرار او انکار او سکوت وکذا تجب فی الدار المصالح ۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۵ ص۱۶۰ کتاب الشفعة ۔ الباب الاول)

(ترجمہ) "اور شفعہ اس جائیداد غیر منقولہ میں بھی واجب ہوگا جو کسی صلح کے بدل میں دی جائے خواہ یہ صلح اقرار ، انکار یا سکوت کی صورت میں ہو ، اور نیز شفعہ اس جائیداد میں بھی واجب ہو گا جس سے اقرار کی صورت میں صلح ہو جائے ۔"

---

[1] آرڈیننس کے مسودہ کی عبارت میں صلح کی وہ صورتیں جن میں شرعاً شُفعہ ثابت ہے مذکور نہیں ہیں ۔

(۳) صٓ دفعہ ۱۳ پر طلب مواثبت کی تعریف "مجلس" کے ساتھ یہ اضافہ بھی ضروری ہے۔
"اگرچہ اس مجلس میں یہ شفیع اکیلا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ طلب مواثبت شفیع کیلئے اس کے مطلع ہونے کے فوراً بعد ضروری ہے، اس طلب میں اس کے لیے کسی دوسرے لوگوں کے سامنے موجود ہونا ضروری نہیں۔"

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی القهستانی یجب الطلب وان لم یکن عندہ احد لئلا تسقط الشفعة دیانةً ولیتمکن من الحلف عند الحاجة کما فی النهایة۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۳ کتاب الشفعة)

(ترجمہ) "(اور یہ طلب مواثبت اس کے لیے) ضروری ہے اگرچہ اس کے ہاں کوئی بھی موجود نہ ہو تاکہ اس کا حقِ شفعہ دیانۃً ساقط نہ ہو جائے اور بوقتِ ضرورت قسم کھانے میں بھی سچا ہو کر قسم کھا سکے۔"

(۴) ایسا ہی مذکورہ صٓ کی دفعہ ۱۳ کی شق ۳ میں یہ تصریح کرنی بھی ضروری ہے کہ "طلب اشہاد شفیع کی ذات سے خاص نہیں ہے بلکہ یہ طلب اشہاد شفیع بذاتِ خود یا بوقتِ ضرورت رسالۃً یا وکالۃً بھی کر سکتا ہے۔"

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: اذا باع رجل وعلم بالشراء وهو فی طریق مکة فطلب طلب المواثبة وعجز عن طلب الاشهاد بنفسه یوکل آخر حتی یطلب الشفعه فلو لم یفعل ومضی المدة بطلت شفعته۔

(خلاصة الفتاوٰی ج ۴ ص ۲۵۶ کتاب الشفعة)

قال العلامة الحصکفیؒ: وهذا الطلب لا بد منه حتی لو تمکن ولو بکتاب او رسول ولم یشهد بطلت شفعته۔ (الدر المختار علی هامش رد المختار ج ۵ ص ۱۴۳ کتاب الشفعة)

(ترجمہ) "یہ طلب اشہاد شفیع کے لیے ضروری ہے یہاں تک کہ یہ طلب اشہاد کسی خط یا کسی آدمی کو بھیج کر بھی ممکن ہو اور شفیع طلب نہ کرے تو اس کا حقِ شفعہ باطل ہوگا۔"

اور نیز اس دفعہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلبِ اشہاد، بائع یا مشتری یا مبیعہ ہر تینوں میں سے کسی ایک کے ہاں جو بھی اس کو میسّر ہو کر سکتا ہے البتہ بائع کے ہاں اس وقت طلب اشہاد کرے گا جب تک مبیعہ اس کے ہاں موجود ہو، جبکہ مذکورہ دفعہ ۱۳ میں صرف مبیعہ (جائیداد غیر منقولہ) کے ہاں طلب اشہاد کی کفایت پر تصریح نہیں کی گئی ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ثم یشھد علی البائع لو عند العقار فی یدہ او علی المشتری وان لم یکن ذا ید لانہ مالک او عند العقار۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۵ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "اور پھر شفیع یہ طلب اشہاد بائع کے ہاں کرے گا اگر مبیعہ اس کی ملکیت میں ہو۔ اور یا مشتری کے ہاں کرے گا اگرچہ یہ مبیعہ اس کے ہاں موجود نہ ہو کیونکہ وہ مالک ہے۔ اور یا جائداد غیر منقولہ کے ہاں کرے گا۔"

(۵) **ایسا ہی اسی صفحہ ۷ کی دفعہ ۱۳ کے عنوان تشریح کی شق ۴ میں بھی یہ اضافہ ضروری ہے کہ "شفیع ہر دونوں کو طلب کرنے کے بعد جائیداد غیر منقولہ کے لینے کے لیے عدالت سے رجوع بغیر کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ کے اندر اندر ضرور کرے گا اور اگر بلا کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ میں دعوٰی دائر نہ کرے تو اس کا حق شفعہ اس ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی وجہ سے باطل ہوگا۔"**

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وفی الجامع الخانی الفتوی الیوم علی قول محمدؒ لتغیر احوال الناس فی قصد الاضرار۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۴ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "لوگوں کے اپنے حقوق کے مطالبہ میں اضرار کو مدنظر رکھتے ہوئے آجکل فتوٰی امام محمدؒ کے قول پر ہے کہ بغیر کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی وجہ سے حق شفعہ باطل ہو جاتا ہے۔"

تاہم بصورت کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی صورت میں بھی حق شفعہ باطل نہیں ہوگا جیسا کہ رد المحتار جلد ۵ ص ۱۴۴ کی مذکورہ بالا عبارت سے چند سطر پہلے علامہ ابن عابدینؒ رقمطراز ہیں:۔

فلو عذر او سفر او عدم قاض یری الشفعۃ بالجوار فی بلدہ لا تسقط اتفاقاً۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۴ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "اور بصورت واقعی عذر ہونے کے مثلاً بیماری یا سفر یا اس علاقہ میں قاضی کے نہ ہونے کی وجہ سے جو شفعہ بالجوار کر سکے، تو ان صورتوں میں مہینہ سے زائد مدت بقدر عذر تاخیر کرنے سے بالاتفاق حق شفعہ باطل نہیں ہوگا۔"

بناء بریں صورت ص ۱۳ کی دفعہ ۳۳ پر میعاد سماعت جو کہ ساٹھ دن مقرر کی گئی ہے، اگر اس میعاد سماعت سے مراد طلب خصومت یعنی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کا وقت مراد ہو تو پھر ساٹھ دن تک تاخیر کرنے کے باوجود حق شفعہ کا باطل نہ ہونا مفتی بہ قول کے مخالف ہے

ہے کیونکہ مفتی بہ قول صرف ایک ماہ تک ہے، اور اگر میعادِ سماعت سے مراد حاکم کے لیے فیصلہ کرنے کی مُدت مراد ہو تو پھر شریعت میں تحدید نہیں ہے بلکہ جتنا ممکن ہو سکے قاضی یا حاکم فیصلہ کر سکے گا۔[1]

(۶) صفحہ ۸ کی دفعہ ۱۶ کے آخر میں یہ اضافہ بھی ضروری ہے "گویا اسے برضائے بائع اور مشتری کے مابین معاہدۂ بیع کی صورت میں ملی ہے لہٰذا اس پر احکام بیع، خیارِ رؤیت، خیارِ عیب اور عند الاستحقاق شفیع کے لیے رجوع بالثمن کا حق بھی ثابت ہوگا البتہ ضمان غرور کا مطالبہ بصورتِ استحقاق شفیع نہیں کر سکتا۔" اس لیے ملاحظہ ہو فتاوٰی ہندیہ :-

واذا قضى القاضى او اسلم المشترى تثبت بينهما احكام البيع من خيار رؤيته وخيار عيب والرجوع بالثمن عند الاستحقاق الا ان الشفيع لا يرجع بضمان الغرور۔

(الفتاوٰى الهندية ج ۵ ص ۱۷۶ كتاب الشفعة الباب الخامس فى الحكم بالشفعة)

(ترجمہ) "اور جب قاضی یا حاکم شفیع کے حق میں فیصلہ کرے یا مشتری برضا خود مبیعہ شفیع کو چھوڑ دے تو اب شفیع اور بائع کے درمیان یہ ایک معاہدۂ بیع تسلیم ہوگا اور اس پر احکام بیع جاری ہونگے۔" جس کی رُو سے شفیع کے لیے خیارِ رویت، خیارِ عیب اور بصورتِ استحقاق رجوع بالثمن کا حق حاصل ہے، البتہ شفیع بائع پر بصورتِ استحقاق ضمانِ غرور کا حق رجوع نہیں رکھتا ہے یعنی شفیع بائع سے ضمانِ غرور کے مطالبہ کا مجاز نہیں ہے۔

(۷) صفحہ ۸ کی دفعہ ۷ میں شفیع کی موت کی صورت میں حقِ شفعہ شفیع کے قانونی ورثاء کو منتقل کرنا خلافِ فقہ حنفی ہے[3] بلکہ قاضی یا حاکم کا اس شفیع کے حق میں فیصلہ کرنے سے قبل اگر شفیع مر جائے تو اس کا حقِ شفعہ باطل ہو کر شفیع کے ورثاء کو منتقل نہیں ہوگا، البتہ مشتری کی موت سے حقِ شفعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ملاحظہ ہو فتاوٰی ہندیہ :-

واما الضرورى فنحو ان يموت الشفيع بعد الطلبين قبل الاخذ بالشفعة فتبطل شفعته

---

[1] سرکاری مسودہ میں سائٹھ دن کی میعادِ سماعت مقرر کی گئی ہے جبکہ یہ میعاد نہ تو قرآن کی کسی آیت میں ہے نہ حدیث میں، اور نہ ہی یہ کسی فقیہ کا قول ہے، شرعاً اس کی یہ تفصیل ہے جو تبصرہ میں ذکر کی گئی ہے۔

[2] مسودہ میں معاہدۂ بیع کو مطلق رکھا گیا ہے جبکہ شرعاً ضمانِ غرور اس سے مستثنیٰ ہے۔

[3] جس ملک کی ۹۰ فیصد سے زائد آبادی حنفی المسلک ہو وہاں اسکے خلاف قانون سازی کرنا یقیناً مذہبی مداخلت کے مترادف ہے۔

وهٰذا عندنا ولا تبطل بموت المشتری وللشفیع ان یاخذ من وارثہ ۔
(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۱۸۲ کتاب الشفعة الباب التاسع فیما یبطل به الخ) [1]

(ترجمہ) "اگر شفیع دونوں طلب (طلب مواثبت وطلب اشہاد) کر کے فیصلہ ہونے سے قبل فوت ہو جائے تو اس کی موت سے اس کا حق شفعہ باطل ہوگا اور اس کے قانونی ورثاء کو منتقل نہیں ہوگا، اور یہ ہمارا مذہب ہے، البتہ مشتری کی موت سے حق شفعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ شفیع مشتری کے ورثاء سے یہ جائیداد شفعہ کر کے لے سکتا ہے"

نیز مذکورہ آرڈر کے ص۹ کی دفعہ ۲ سے بھی یہ دفعہ متصادم ہے کیونکہ اس دفعہ میں وہاں پر تصریح ہے کہ حق شفعہ ناقابل انتقال اور ناقابل تقسیم ہے ۔

(۸) صفحہ ۹ کی دفعہ ۲۳ کی شق ۲ میں کسی قانون کے ساتھ شرعی قانون کا اضافہ ضروری ہے لہٰذا پھر اصل عبارت یوں ہوگی: "اور یا مقام مقدمہ نے کسی شرعی قانون کے تحت حاصل کر لی ہو اس پر شفعہ کا دعویٰ نہیں ہوگا"۔

(۹) صفحہ ۱۰ دفعہ ۲۴ میں مدعی سے زر شفعہ جمع کرانے کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور زر شفعہ جمع نہ کرانے کی صورت میں شفعہ کا دعویٰ خارج کرنا شریعت کے موافق نہیں ہے کیونکہ زر شفعہ شفیع سے جمع کرانا شریعت میں تو مطلوب نہیں اور برائے اعتماد عدالت استصواب رائے میں ممنوع نہیں ہے لیکن اعتماد کی صورت صرف زر شفعہ کے جمع کرنے سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر شفیع کسی اور طریقے سے عدالت کو مطمئن کر کے اسے صرف کفیل (ضامن) دیدے تو پھر بھی دعویٰ شفعہ صحیح ہوگا، قاضی یا حاکم اسکی باقاعدہ سماعت کر کے فیصلہ کر سکتا ہے اور زر شفعہ جمع نہ ہونے کی صورت میں دعویٰ خارج نہیں ہوگا تاہم شفیع کو عقار کا قبضہ بغیر زر شفعہ کی وصولی کے نہیں دیا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ الہندیہ)

ولا یلزم الشفیع احضار الثمن وقت الدعوىٰ بل یجوز المنازعة وان لم یحضر الثمن الى مجلس القاضی فاذا قضى له بالشفعة له احضار الثمن۔ ولو دفع الثمن بعد ما قال ادفع الثمن الیه لا تبطل بالاجماع۔ (الفتاوى الهندیة ج۵ ص۱۷۶ کتاب الشفعة۔ الباب الخامس الخ)

---

[1] قال العلامة الكاسانی رحمه الله: اما الضروری فنحو ان یموت الشفیع بعد الطلبین قبل الاخذ بالشفعة فتبطل شفعته ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲ کتاب الشفعة۔ فصل بیان ما یبطل به حق الشفعة)

(ترجمہ) "شفیع پر دعویٰ شفعہ کے وقت زرِ شفعہ قاضی یا حاکم کے ہاں جمع کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ بغیر زرِ شفعہ کے حاضر کرنے کے دعویٰ کی سماعت کر سکتا ہے، البتہ فیصلہ کے بعد شفیع پر زرِ شفعہ جمع کرنا ضروری ہے۔ (اور چند سطر کے بعد فرماتے ہیں) اور اگر شفیع وعدہ کر کے وقتی طور پر زرِ شفعہ جمع نہ کرائے تو پھر بالاتفاق اس کا حق شفعہ باطل نہیں ہوگا۔"

(۱۰) صفحہ ۱۲ کی دفعہ ۲۹ پر مذکورہ اداروں کو حق شفعہ کے اسقاط کا جو حق دیا گیا ہے اس میں چونکہ حق تلفی کا بہت قوی امکان ہے لہٰذا یہ اختیار مذکورہ اداروں کو نہیں دینا چاہیئے بلکہ صفحہ ۹ پر دفعہ ۲۲ کے تحت جو استثناء کیا گیا ہے اس پر ہی اکتفاء کرنا چاہیئے۔

(۱۱) صفحہ ۱۳ دفعہ ۳۴ کے مطابق اطلاع نامہ کی صورت میں صرف اطلاع عامہ کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اطلاعِ عامہ کے علاوہ رجسٹری منظور کرنے والا رجسٹرار یا انتقال کی تصدیق کرنے والا افسرِ مال اکنالجمنٹ (واپسی رسید) رجسٹری یا انتقال کی اطلاع شریک خلیط اور جار کو خصوصی طور پر رجسٹری یا ہرکارے کی وساطت سے دینا ضروری قرار دیا جائے کیونکہ صرف اطلاع عامہ کی صورت میں حق تلفی کا قوی امکان موجود ہے۔ نیز مذکورہ اطلاع کو ایک ہفتہ تک محدود رکھنا صرف عدالت کی رائے ہے ورنہ شریعت میں یہ تحدید نہیں ہے۔

(۱۲) صفحہ ۱۵ کی دفعہ ۳۶ کی شق ۶ میں اس آرڈیننس کے اجراء سے قبل کئے ہوئے معاہدۂ بیع کے قابلِ سماعت ہوتے کے لیے صرف ۶۰ دن مقرر کرنا بھی عدالت کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے، اس طرح غیر شرعی قانون کو شرعی قانون کا نام دینا بہت ہی خطرناک ہے۔

(۱۳) مذکورہ صفحہ ۱۵ کی دفعہ ۳۶ کی شق ۴ (۵) کے تحت اس قانون سے جن مقدمات کو مستثنیٰ کیا گیا ہے یہ بھی محض عدالت کی اپنی رائے ہو سکتی ہے ورنہ بہتر تو یہی ہے کہ تمام مقدمات کا فیصلہ شرعی لحاظ سے ہو جائے

كتاب
الشركة

فإن كانوا أكثر من ذلك فهم شركاء في الثلث

کتاب الشرکۃ

(شراکت کے احکام و مسائل)

موروثی جائیداد کے منافع کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ چند بھائی موروثی جائیداد بہت مشترکہ طور پر اس طرح محنت کر رہے ہیں کہ ان کی کمائی میں تمیز کرنا مشکل ہے، اب ان میں سے ایک بھائی دوسرے بھائیوں کی کمائی سے انکار کر رہا ہے اور ان کو رأس المال کے نفع سے محروم کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر تمام بھائی آپس میں ایسا کاروبار کر رہے ہوں کہ ان کی محنت میں تمیز نہ ہوتی ہو بلکہ مکمل طور پر مشترکہ ہو تو اس محنت کے ذریعے حاصل ہونے والے منافع میں تمام بھائی برابر کے حصہ دار ہوں گے کوئی بھی شریک پورے مال کا دعویدار نہیں ہو سکتا، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں کسی ایک بھائی کو شرعاً یہ حق حاصل حاصل نہیں کہ وہ اپنے دیگر بھائیوں کو ان کی محنت سے محروم کرے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: لو اجتمع اخوۃ یعملون فی ترکۃ ابیہم و نما المال فھو بینھم سویۃ ولو اختلفوا فی العمل والرأی۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکۃ۔ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)[1]

مشترکہ مال بذریعہ بولی خریدنے کا حکم

سوال:۔ چند آدمی مشترکہ طور پر کسی چیز کو خریدتے ہیں پھر آپس میں اس پر بولی کرتے ہیں کہ جو شریک زیادہ بولی دے گا تو وہ اس چیز کا مالک ہوگا، اس کے بعد زیادہ بولی دینے والا شریک دیگر شرکاء کو

---

[1] وقال العلامۃ سلیم رستم باز: فاذا کان سعیہم واحداً ولم یتمیز ما حصلہ کل واحد منہم بعملہ یکون ما جمعوہ مشترکاً بینہم بالسویۃ ان اختلفوا فی العمل والرأی۔

(شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۳۶۱ ص۴۲۵ الکتاب العاشر)

ومثلہ فی تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۹۵ کتاب الشرکۃ۔

اپنے اپنے حصہ کی رقم مع منافع کے واپس کرتا ہے، توکیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ صورت مذکورہ میں چونکہ تمام شرکا مشترکہ طور پر کوئی چیز خرید کر پھر آپس میں نیلام کرتے ہیں اور جو زیادہ بولی دیتا ہے مال اس کے حوالے کردیا جاتا ہے، لہٰذا اگر اس نیلام سے حاصل ہونے والی رقم کامیاب بولی دہندہ کے اپنے حصہ کے علاوہ دیگر شرکاء کے حصص کا عوض ہو تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہوگا اور اگر اپنا حصہ بھی بولی میں قیمتاً لینا پڑے تو پھر جائز نہ ہوگا۔

لما قال العلامة سليم رستم باز : الشريك مخير ان شاء باع حصته من شريكه و ان شاء باعها عن اجنبي بدون اذن شريكه راجع الى المادة ۲۱۵ الكن فى صو خلط الاموال واختلاطها التى بيناها فى الفصل الاول لايسوغ لاحد الشريكين الخ

(شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸ الكتاب العاشر) [1]

شریک کی موت سے شرکت کا ختم ہونا

سوال:۔ دو آدمی آپس میں مشترکہ کاروبار کرتے تھے کہ ان میں ایک کا انتقال ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا شریک کی موت سے شرکت ختم ہوجاتی ہے یا برقرار رہتی ہے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ شراکت کے دوران جب کسی ایک شریک کا انتقال ہوجائے تو شرکت خودبخود ختم ہوجاتی ہے اور دوسرا شریک فوت شدہ کے مال میں تصرف کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة فخرالدين عثمان بن على الزيلعيؒ : وتبطل الشركة بموت احدهما ولوحكماً...... ولا فرق بين ان يعلم موت صاحبه اولا يعلم لانه عزل حكمى۔

(تبيين الحقائق ج۳ ص۳۲۳ كتاب الشركة) [2]

---

[1] قال العلامة الحصكفيؒ : وكل من شركاء الملك اجنبى فى مال صاحبه فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلا اذن إلا فى صورة الخلط لماليهما كحنطة بشعير وبناء وثمر وزرع۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۳۰۰ كتاب الشركة)

ومثله : شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸ الكتاب العاشر۔

[2] وقال فى الهندية : وتبطل الشركة بموت احدهما علم به الشريك اولا۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۳۵ الباب الخامس فى الشركة الفاسدة)

ومثله فى الشلبى على تبيين الحقائق ج۳ ص۳۲۳ كتاب الشركة۔

مشترکہ کاروبار کے منافع کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ دو آدمیوں نے آپس میں مشترکہ کاروبار شروع کیا، دونوں نے اپنا اپنا راس المال جمع کیا، کاروبار شروع کرتے وقت ایک دوسرے کے ساتھ یہ شرط نہیں لگائی گئی کہ آپس میں منافع کس نسبت سے تقسیم ہوگا، جبکہ دورانِ کاروبار ایک شریک نے دوسرے کی نسبت کم مشقت برداشت کی، تو اس صورت میں مشترکہ کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع کی تقسیم شرعاً کس طرح ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ شرکتِ عنان کی صورت ہے اور یہ شرکت درست اور صحیح ہے اور چونکہ بوقتِ عقد کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے لہٰذا فقہاء کی تصریحات کے مطابق جب ایک شریک نے کام بھی نہیں کیا ہو اور ربح کے متعلق کسی کمی اور زیادتی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہو تو ربح (منافع) راس المال کے مطابق تقسیم ہوگا اور اگر راس المال دونوں کا برابر ہو تو منافع برابر ہوگا ورنہ راس المال کی کمی بیشی کی صورت میں منافع بھی کم وبیش ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: والربح بينهما على قدر رأس مالهما۔ (تنقيح الحامدية ج۱ ص۹۴ كتاب الشركة)[1]

مشترکہ زمین میں سے اپنا حصہ فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر دو آدمیوں کے مابین زمین مشترکہ ہو اور غیر منقسم ہو تو اگر ان میں سے ایک آدمی اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو کیا شرعاً اس کو اپنا حصہ فروخت کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسی زمین جو دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہو تو ان میں سے ہر ایک کو اپنے حصہ میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ہر ایک حصہ دار اپنا حصہ

---

[1] وقال فى الهندية: واما شرط جوازها تكون رأس المال عيناً حاضراً اوغائباً عن مجلس العقد لكن مشار اليه والمساواة فى رأس المال ليست بشرط ويجوز التفاضل فى الربح مع تساويهما فى رأس المال كذا فى محيط السرخسى۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۱۹ الباب الثالث فى شركة العنان)

ومثله فى رد المحتار ج۴ ص۳۱۲ كتاب الشركة۔

قبل از تقسیم فروخت کرسکتا ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز: یصح بیع حصۃ شائعۃ معلومۃ کالنصف والعشر من عقار مملوک قبل الاقرار۔ (شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۲۱۴ ص۱۰۳ الکتاب الاول) ؎۱

شرکاء کی غیر حاضری میں مشترکہ زمین پر کاشت کا حکم

سوال:۔ ایک زمین چند آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے اور ہر سال بعض لوگ اس میں مختلف فصلیں کاشت کرتے ہیں جبکہ ان شرکاء میں سے چند غائب ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ بعض شرکاء کے غائب ہونے کی صورت میں اس مشترکہ زمین میں کاشت کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ زمین شرعی ملک سے مشترکہ ہو تو غائبین کے حصص میں کاشت کرنا اُن کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہر ایک اپنے اپنے حصۂ ملکیت میں کاشت کرے گا، تاہم اگر دلالۃً غائب کی اجازت موجود ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وفی القنیۃ عن واقعات الناطفی ارض بینھما فغاب احدھما فللشریک ان یزرع نصفھا ولو اراد ذٰلک فی ذٰلک فی العام الثانی یزرع ما کان زرع۔ (تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص۹۱ کتاب الشرکۃ) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ محمود بن اسماعیل الشہیر بابن قاضی سماوۃؒ: اما بیعہ نصیبہ قبل القسمۃ او کل قسیم علی وجہین اما ان باع عن اجنبیٍ او من شریکہ فالوجہ الاول وھو البیع من اجنبیٍ علی صنفین واما ان کان الکل لہ فباع نصفہ او کان بین اثنین فباع احدھما نصیبہ فالبیع جائز فی المواضع کلھا۔ (جامع الفصولین ج ۲ ص۸۲ الفصل الحادی والثلاثون فی مسائل البیع واحکامہ)
وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص۲۷۶ کتاب البیوع باب الخیار۔

؎۲ وقال فی الھندیۃ: وفی الارض لہ ان یزرعھا کلھا علی المفتی بہ ان کان الزرع ینفعھا فاذا جاء شریکہ زرعھا مثل تلک المدۃ وان کان الزرع ینقصھا او الترک ینفعھا فلیس لہ ان یزرعھا۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۳۴۱ کتاب الشرکۃ۔ الباب السادس فی المتفرقات)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۱۶۱ کتاب الشرکۃ۔

مشترکہ مال کسی کو عاریۃً دینے کا حکم

سوال:۔ یہاں ہمارے علاقہ میں ایک عالمِ دین کا انتقال ہوگیا ہے اور ترکہ میں کچھ اموال رہ گئے ہیں، ورثاء میں اس کے چند بیٹے ہی ہیں، کیا ان میں سے کوئی ایک اپنے باپ کے متروکہ مال سے کسی کو عاریۃً کچھ دے سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کے دوسرے بھائی اِس وجہ سے اُس پر ناراض ہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں باپ کے متروکہ اموال چونکہ اس کے تمام بیٹوں کے مابین مشترکہ ہیں اس لیے کوئی بھی شریک مشترکہ اموال میں سے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر کوئی چیز کسی کو عاریۃً نہیں دے سکتا، کیونکہ شرکاء کے حصے ایک دوسرے کے ساتھ ودیعت (امانت) ہوتے ہیں۔

قال العلامة سليم رستم بازؒ: حصة احد الشريكين فى حكم الوديعة فى يد الآخر فاذا اودع احدهما المال المشترك عند اٰخر بدون اذن فتلف كان ضامناً حصة شريكه۔ (شرح مجلة الاحكام، تحت المادة ۱۰۸۷ ص۶۰۸ الكتاب العاشر)[1]

مُشترکہ جائیداد میں بلا اجازتِ شریک تصرّفات کرنے کا حکم

سوال: دو حقیقی بھائیوں کی کچھ مشترکہ زمین تھی، ان میں سے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی غیر موجودگی میں ساری زمین فروخت کردی، جب دوسرے بھائی کو پتہ چلا تو اس نے زمین فروخت کرنے سے انکار کردیا، تو کیا اس دوسرے بھائی کا انکار شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ جائیداد ان کی زرِخرید ہو یا اِرث کے ذریعہ انہیں ملی ہو تو اس میں کسی ایک بھائی کا تصرّف دوسرے کی اجازت کے بغیر درست نہیں، اس لیے یہ بیع ناراض بھائی کے حصہ کی اراضی میں نافذ العمل نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغينانيؒ: فشركة الاملاك العين يرثها رجلان او يشتريانها

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: نعم والسر فى ذٰلك ان الشريك حكمه فى حصة شريكه حكم المودع۔ (تنقيح الحامدية ج۱ ص۸۹ كتاب الشركة)
وَمِثْلُهٗ فى فتاوٰى الكاملية ص۸۵ كتاب الشركة۔

فلا یجوز لاحدهما ان یتصرف فی نصیب الآخر الا باذنه وکل واحد منهما فی نصیب صاحبه کالاجنبی۔ (الهدایۃ ج۳ ص۶۲۴ کتاب الشرکۃ) [1]

مشترکہ دیوار کی تعمیر کے اخراجات کا حکم

سوال: دو آدمیوں کے مابین ایک مشترکہ دیوار تھی جس کی مخدوش حالت کے پیشِ نظر اس کو گرادیا گیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کی دوبارہ تعمیر کا خرچہ مشترکہ ہوگا یا گرانے والے پر ہوگا؟

الجواب: قواعدِ فقہیہ کی رُو سے مشترکہ دیوار کی تعمیر کے جملہ اخراجات اور تاوان دونوں کے ذمہ ہوگا کوئی ایک فریق اس کے اخراجات کا ذمہ دار نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وفی جامع الفصولین حائط بینهما وخیف سقوطه فاراد احدهما نقضه وابی الآخر یجبر علی نقضه .... ونصف قیمۃ البناء لو انفق بلا امر القاضی ونقل هذا الحکم فی شرح الوهبانیۃ عن الذخیرۃ فی مسئلۃ انهدام السفل وقال انه الصحیح المختار للفتوٰی۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۳۳ کتاب الشرکۃ مطلب فیما اذا ... من العمارۃ) [2]

اقرار سے شرکت کا ثبوت

سوال: ایک آدمی کا کسی کے ساتھ زمین کا تنازعہ عدالت میں چل رہا تھا اُس نے اپنے ایک خاص آدمی سے کہا کہ تم بھی اس دعوٰی میں میرے ساتھ شریک ہو جاؤ اور جب میں مقدمہ جیت لوں گا

---

[1] وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ای وکل واحد من الشریکین ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبه لغیر الشریک الا باذنه لعدم تضمنها الوکالۃ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۷۶ کتاب الشرکۃ)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۸۶ کتاب الشرکۃ۔

[2] وقال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانی رحمہ اللہ: فلطالب البناء ان یبنی باذن الحاکم ویرجع علی شریکه بحصّۃ من نفقۃ البناء۔

(شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۳۱۸ ص۷۳۰ الکتاب العاشر)

وَمِثْلُهٗ فی جامع الفصولین ج۲ ص۲۱۴ الفصل الرابع والثلاثون فی الاحکام۔

تو اس میں تمہیں بھی حصہ دوں گا، اب جبکہ مقر نے مقدمہ جیت لیا ہے تو کیا مقر لہٗ اس کے ساتھ زمین میں شریک متصور ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :۔ واضح رہے کہ مذکورہ صورت میں اس شخص نے خود ہی اپنے مقابل کے لیے ان الفاظ سے اقرار کیا ہے کہ "تم بھی اس میں میرے ساتھ شریک ہو" لہٰذا اس اقرار کی وجہ سے اس کا شریک کردہ شخص مذکورہ قطعہ اراضی میں شریک متصور ہوگا۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ : واذا اقر الحر العاقل البالغ بحق لزمه اقراره مجهولاً کان ما اقر به اومعلوماً۔ (الهداية ج۳ ص۲۳۱ کتاب الاقرار)[1]

مشترکہ زمین میں کسی ایک شریک کا پھلدار درخت لگانا

سوال :۔ ایک شخص کے چند بیٹے تھے، ان میں سے ایک نے باپ کی وفات کے بعد مشترکہ زمین میں ایک باغ لگایا، اب یہ باغ لگانے والا اس میں دوسرے بھائیوں کا حصہ نہیں مانتا، تو کیا ازروئے شریعت اس باغ میں دوسرے بھائیوں کا حصہ بنتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :صورتِ مسئولہ میں باپ کی وفات کے بعد مشترکہ زمین میں جس بیٹے نے باغ اور درخت لگائے ہوں تو یہ باغ اور درخت وغیرہ اسی کی ملکیت سمجھے جائیں گے خواہ دوسرے بھائیوں کی اجازت سے لگایا ہو یا بغیر اجازت کے، کیونکہ اجازت کی صورت میں زمین کی تقسیم کے دوران اگر یہ پھلدار درخت کسی دوسرے بھائی کے حصہ میں آئیں تو اسے ان درختوں کی قیمت ادا کرنی پڑے گی ورنہ اکھاڑنا ہوں گے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : (بنی احدهما) ای احد الشریکین (بغیر إذن الآخر) فی عقار مشترك بینهما (فطلب شریکه رفع بنائه قسم) العقار (فان وقع البناء) فی نصیب الباقی فیها ونعمت (والا هدم) البناء

---

[1] وقال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ : المرأ مؤاخذ باقراره۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۷۹ ص۵۳ المقالة الاولی)

ومثلهٗ فی جامع الفصولین ج۲ ص۴۲ الفصل الثالث والعشرون۔

وحکم الغرس کذلک ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۶۸ کتاب القسمۃ) ؎۱

مشترکہ کتب شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی کو عاریۃً دینا جائز نہیں

سوال: ایک عالم دین کا انتقال ہوگیا اور اس نے ترکہ میں کافی کتابیں چھوڑیں، ورثاء میں بالغ اور نابالغ دونوں موجود ہیں، ان میں ایک بڑا بیٹا گھر کے اخراجات کا ذمہ دار ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کوئی کتاب مطالعہ کے لیے مانگے تو اس کے لیے مشترکہ ترکہ میں سے کوئی کتاب دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ ورثاء میں نابالغ اولاد بھی موجود ہے اور تمام ورثاء اس ترکہ کتب میں شریک ہیں جبکہ نابالغ اولاد کا مال باپ بھی کسی کو عاریۃً نہیں دے سکتا تو بڑا بھائی تو بطریقِ اولیٰ نہیں دے سکتا۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لیس للاب اعارۃ مال طفلہ لعدم البدل وکذا القاضی والوصی۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۸۳۲ ص۴۶۱ الکتاب السادس) ؎۲

مشترکہ ٹیوب ویل کے پانی سے کسی شریک کو روکنا جائز نہیں

سوال: چند آدمیوں نے مشترکہ ٹیوب ویل نصب کرنے کے لیے کچھ پیسے اکٹھے کئے لیکن بدقسمتی سے جو جگہ انہوں نے ٹیوب ویل کے لیے منتخب کی تھی وہاں پانی نہ نکلا، ان میں سے ایک آدمی نے دوسری جگہ ٹیوب ویل کے لیے منتخب کی تو وہاں سے پانی نکل آیا، اب یہ آدمی باقی شرکاء کو پانی سے منع کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ یہ جگہ وہ نہیں جس کا انتخاب باہمی مشورہ سے

؎۱ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: واذا بنی فی الارض المشترکۃ بغیر اذن الشریک لہٗ اَنْ یَّنْقُضَ بناءَہٗ۔ (تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۱۰۱ کتاب الشرکۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوی الکاملیۃ ج ص۵۳ کتاب الشرکۃ۔

؎۲ وقال العلامۃ محمد بن محمودؒ: ذکر فی النوازل لیس لوالد الصغیر ان یعیر متاع ولدہ الصّغیر۔ (احکام الصغار علیٰ ہامش جامع الفصولین ج۱ ص۱۷۱ فی مسائل العاریۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۴ ص۳۷۲ الکتاب التاسع المتفرقات کتاب العاریۃ۔

ہوا تھا تاہم اس کے جملہ اخراجات مشترکہ رقم سے ادا کیے گئے ہیں، تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال جب مشترکہ مال سے ٹیوب ویل لگایا گیا ہے تو جملہ شرکاء اس سے استفادہ کے حقدار رہیں گے جگہ کی تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما قال العلامة سليم رستم باز اللبنانی رحمہ اللہ:۔ لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الآخر لكن لا يجوز له ان يتصرف تصرفاً مضراً بالشريك۔ (شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۷۱ ص۵۱ الكتاب العاشر)[1]

مچھلی کا شکار کرنے میں شرکت کا حکم

سوال:۔ چند آدمی باہمی طور پر مچھلی کا شکار کرنے کے لیے معاہدہ کرتے ہیں، معاہدہ کے مطابق ضروری نہیں کہ جملہ شرکاء محنت کریں تاہم آلاتِ شکار کی خریداری مشترکہ مال سے ہوتی ہے اور ملازم کا ماہانہ خرچہ بھی مشترکہ طور پر برداشت کرتے ہیں، تو کیا شرکت کا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مچھلی پکڑنے کی شراکت اور استیجار شرعاً ناجائز معاملہ ہے، لہٰذا مذکورہ صورت کا معاملہ بھی جائز نہیں اور اس میں مچھلی اُس کا حق ہے جس نے پکڑی ہو، تاہم اگر وقتی طور پر چند افراد اکٹھے ہو کر مچھلی کا شکار کریں اور آخر میں باہمی طور پر تقسیم کریں تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال العلامة الشيخ البزاز رحمه الله: اشتركا فی الاصطياد و نصبا شبكة او ارسلا كلباً لهما فالصيد بينهما انصافاً۔

(فتاوی البزازية علی هامش الهندية ج۶ ص۲۲ كتاب الشركة)

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: لا تصح شركة فی احتطاب و

---

[1] وقال فی الهندية: ولا يجوز لاحدهما ان يتصرف فی نصيب الآخر الا بامره وكل واحد منهما كالاجنبی فی نصيب صاحبه۔

(الفتاوی الهندية ج۲ ص۳۰۱ كتاب الشركة۔ الباب الاول۔)

وَمِثْلُهٗ فی تنقيح الحامدية ج۱ ص۸۷ كتاب الشركة۔

احتشاش و اصطیاد و استقاء وسائر مباحات۔

(تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکۃ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)[1]

مشترکہ ایئر کنڈیشنر فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ چند ساتھیوں نے مشترکہ طور پر ایک ایئر کنڈیشنر خریدا اور تمام ساتھی ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے، اب ان میں سے کچھ ساتھی اس گھر کو چھوڑتے ہیں اور ایئر کنڈیشنر کو فروخت کرنا چاہتے ہیں، تو کیا اس کی اول قیمت معتبر ہوگی یا مستعمل کی؟ کیونکہ ایئر کنڈیشنر غیر قابلِ قسمت چیز ہے؟

الجواب:۔ چونکہ ایئر کنڈیشنر غیر قابلِ قسمت چیز ہے اور مشترکہ طور پر خریدا گیا ہے اس لیے یہ تمام ساتھیوں کے مابین مشترکہ ہوگا، کچھ مدت گذرنے کے بعد اب اگر چند ساتھی اس گھر کو چھوڑنا چاہتے ہوں تو انہیں مستعمل ایئر کنڈیشنر کی قیمت کے لحاظ سے حصہ دیا جائے گا۔

لما قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور الشہیر بقاضیخانؒ: والعبد الواحد والدابۃ الواحدۃ یباع ویقسم ثمنہا لانہا لا تحتمل القسمۃ۔

(فتاوٰی خانیۃ علی ہامش الہندیۃ ج۳ ص۱۵ کتاب القسمۃ)[2]

مشترکہ مال سے حج کرنے کا حکم

سوال:۔ زید اور عمرو دو بھائی ہیں اور مشترکہ گھر میں رہائش پذیر ہیں، جب ان پر حج فرض ہوا تو

---

[1] لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یجوز الشرکۃ فی الاحتطاب والاصطیاد واما اصطادہ کل واحد منہما او احتطبہ فہو لہ دون صاحبہ۔ (الہدایۃ ج۲ ص۶۹۵ کتاب الشرکۃ)
ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۰۹ کتاب الشرکۃ۔

[2] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وفی الجوہرۃ لا تقسم الکتب بین الورثۃ ولکن ینتفع کل بالمہایأۃ ولا تقسم بالاوراق ولو برضاہم وکذا لو کان کتاباً ذا مجلدات کثیرۃ ولو تراضیا ان تقوم الکتب ویأخذ کل بعضہا بالقیمۃ لو کان بالتراضی جاز والا لا۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۶۱ کتاب القسمۃ)
ومثلہ فی شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۱۴۲ ص۶۶۳ الکتاب الاشربۃ۔

زید چونکہ بڑا بھائی تھا اس لیے اس نے مشترکہ مال سے فریضۂ حج ادا کیا، بعد میں دونوں جُدا ہو گئے ہیں تو اب عمرو زید سے حج پر صرف شدہ رقم سے اپنے حصّے کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا عمرو کا یہ مطالبہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: مذکورہ صورت چونکہ شرکتِ ملک کی ایک صورت ہے لہٰذا اس کا حکم یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کے حصہ میں تصرّف کرنے میں اجنبی ہے اس لیے زید عمرو کا ضامن ہوگا اور اس کے ذمہ عمرو کا نصف دَین شرعاً لازم ہے، لہٰذا عمرو زید سے اپنے حصے کا شرعاً مطالبہ کر سکتا ہے، تاہم اگر اس کی اجازت سے حج کیا ہو تو تبرع ہونے کی صورت میں دوبارہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ان کل واحدٍ من الشریکین شرکة ملكٍ ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبه کغیر الشریك من الاجانب الا باذنه لعدم تضمنها الوکالة۔

(تنقیح الحامدیة ج ۱ صـ۸۸ کتاب الشرکة) [1]

مشترکہ زمین میں چشمہ کے پانی سے شریک کو منع کرنا جائز نہیں

سوال: زید اور عمرو کے مابین ایک زمین مشترکہ تھی جس میں سے کچھ زمین بنجر اور کچھ قابلِ کاشت تھی، کچھ وقت تک دونوں اس سے فائدہ حاصل کرتے رہے، نیز اس زمین میں پانی کا ایک چشمہ بھی تھا، حال ہی میں زید نے عمرو کو اس چشمہ کے پانی سے منع کر دیا ہے، تو کیا زید کا عمرو کو چشمہ کے پانی سے منع کرنا ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ زمین کا مشترکہ ہونا مبرہن اور مسلّم ہو تو زید کا عمرو کو چشمہ وغیرہ سے منع کرنا ازروئے شریعت جائز نہیں ہے کیونکہ اس چشمہ میں جس طرح زید کا حق بنتا ہے اسی طرح عمرو کا بھی حق بنتا ہے، لہٰذا زید کا عمرو کے ساتھ یہ رویّہ

---

[1] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الآخر لکن لا یجوز له ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریك۔ (شرح مجلة الاحکام، تحت المادة ۱۰۷۲ صـ۶۰۱ الکتاب العاشر)

ومثله فی الهدایة ج ۲ صـ۵۹۹ کتاب الشرکة۔

شرعاً درست نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: المسلمون شرکاء فی ثلاثٍ فی الماءِ والکلاءِ والنارِ۔
(سنن ابی داؤد ج۲ ص۱۳۶ کتاب البیوع۔ باب فی منع الماء) ؎۱

اموالِ مشترکہ میں سے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:۔ دو آدمیوں کے مابین مشترکہ کاروبار ہے، ان مشترکہ اموال میں سے زکوٰۃ دینے کا کیا طریقہ ہے؟ نیز اگر ایک شریک ان اموال میں سے جن میں زکوٰۃ واجب ہو زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو تو اس کا دوسرا ساتھی اس کے زکوٰۃ نہ دینے سے گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ جب دو آدمیوں کی آپس میں کاروباری شراکت ہو تو ہر ایک اپنے حصہ سے زکوٰۃ دینے کا ذمہ دار ہے کسی ایک کی ذمہ داری دوسرے پر عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی ایک شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ دینے کا مجاز ہے اور بلا اجازت شریک زکوٰۃ نکالنے کی صورت میں دوسرا شریک ضامن قرار دیا جائے گا، لہٰذا اگر دوسرا شریک زکوٰۃ ادا نہ بھی کرتا ہو تو کاروبار میں شریک رکھنے سے کوئی حرج لازم نہیں آتا تاہم اگر زکوٰۃ نہ دینے والے کی محفل و مجلس اور باہمی اشتراک سے اس کے اعمال و اخلاق متأثر ہوتے ہوں تو پھر ایسی حالت میں اس شخص کے ساتھ کاروبار میں شرکت کرنے سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (ولم یزک مال الآخر الا باذنه) ای احدهما لانه لیس من جنس التجارة فلا یکون وکیلاً عنه فی ادائها الا ان یأذن له۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۷ کتاب الشرکة) ؎۲

؎۱ قال العلامة سلیم رستم باز: الماء والکلاء والنار مباحة والناس فی هذه الاشیاء الثلاثة شرکاء۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۲۳۴ ص۶۷۹ الکتاب العاشر)
ومثله فی الهدایة ج۴ ص۴۸۵ کتاب الشرکة۔

؎۲ قال العلامة فخرالدین الزیلعیؒ: (ولم یزک مال الآخر) لایزکی کل واحد منهما نصیب صاحبه لانه لم یأذن له فیها لان الاذن بینهما وقع فی التجارة والزکوٰة لیست منها۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۳۲۳ کتاب الشرکة۔ فصل فی الشرکة الفاسدة)
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۳۳۶ کتاب الشرکة۔ الباب السادس فی المتفرقات۔

اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی فوت ہوگیا، اس کے دو بیٹے رہ گئے، ایک بالغ جبکہ دوسرا نابالغ ہے، تو کیا یہ بالغ اور بڑا بھائی اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کرنا شرعاً درست نہیں، البتہ اگر دیگر بھائی بالغ ہوں تو اُن کی اجازت سے مشترکہ اموال سے مہمان نوازی اور دیگر تبرعات کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ان کل واحد من الشریکین شرکة ملك ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبه کغیر الشریك من الاجانب الّا باذنه لعدم تضمنها الوکالة۔ (تنقیح الحامدیة ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکة)[1]

شریک کو شرکت ختم کرنے کا اختیار ہے

سوال:۔ چند آدمیوں نے مل کر مشترکہ کاروبار شروع کیا اور سامانِ تجارت کی خرید و فروخت کرتے رہے، ان میں سے اچانک ایک شریک نے شرکت سے انکار کر دیا کہ میں آپ کے ساتھ شرکت کا معاملہ جاری نہیں رکھ سکتا۔ تو کیا دیگر شرکاء کے مشورہ کے بغیر کسی شریک کے لیے شرکت کو فسخ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرکاء میں سے ہر کسی شریک کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسرے شرکاء کی اجازت اور مشورہ کے بغیر جب چاہے اپنی شرکت کو ختم کر دے، اس صورت میں اشیاءِ مشترکہ کی قیمت لگا کر اصل زر بقدرِ حصہ اور منافع بقدرِ شرح تقسیم کر لیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اشترکا واشتریا امتعة ثم قال احدهما لا اعمل

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الآخر لکن لا یجوز له ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریك۔ (شرح مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۷۱ ص۶۰۰ الکتاب العاشر)
ومثله فی الهدایة ج۲ ص۵۹۹ کتاب الشرکة۔

معك بالشركة وغاب فباع الحاضر الامتعة فالحاصل للبائع وعليه قيمة المتاع لان قوله لا اعمل معك فسخ للشركة معه واحدهما يملك فسخها وان كان المال عروضاً بخلاف المضاربة وهو المختار ۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۲۷ کتاب الشرکة) لـه

باپ اور بیٹے کی مشترکہ کمائی کا حکم

سوال :۔ایک شخص نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا اور اس میں کافی پیسے کمائے اب سوال یہ ہے کہ یہ پیسے باپ اور بیٹے کے مابین مساوی تقسیم ہوں گے یا صرف باپ کی ملکیت شمار ہوں گے ؟

الجواب :۔صورتِ مسئولہ میں باپ اور بیٹے نے مشترکہ کاروبار سے جو پیسے کمائے ہیں وہ باپ کی ملکیت شمار ہوں گے کیونکہ بیٹا باپ کا معین اور مددگار ہوتا ہے لہٰذا باپ اپنی زندگی میں اس میں جو بھی تصرف چاہے کر سکتا ہے، تاہم اگر رأس المال دونوں کا مشترکہ ہو اور معاہدہ بھی یہی ہُوا ہو تو منافع بھی دونوں میں مساوی تقسیم ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : الاب والابن يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للاب ان كان الابن فى عياله لكونه معينا له الا ترى انه لوغرس شجرة تكون للاب ۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکة ـ فصل فى الشركة الفاسدة) ۲ـه

لـه لما قال العلامة ابن نجيم المصرى رحمه الله : وصورته اشتركا واشتريا امتعة ثم قال احدهما لا اعمل معك بالشركة .... لان قوله لا اعمل معك فسخ للشركة معه احدهما يملك فسخها ۔

(البحر الرائق ج۵ ص۱۸۵ کتاب الشرکة)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۲ ص۳۳۵ کتاب الشرکة ۔

۲ـه وقال فى الهندية : أَبٌ وابن يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للاب اذا كان الابن فى عيال الاب لكونه معيناً له ۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۲۹ الباب التاسع فى شركة الوجوه)

وَمِثْلُهٗ فى فتاوى الكاملية ج۱ ص۵۱ کتاب الشرکة ۔

مشترکہ زمین میں بلا اجازت شریک کے باغ لگانا

سوال :- ایک زمین دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے جس میں ایک شریک نے دوسرے کی اجازت کے بغیر مالٹا کے پودے لگا دیئے، چند سال کے بعد جب پودے پھل دینے لگے تو شریکِ ثانی نے کہا کہ یہ پودے چونکہ مشترکہ زمین میں لگائے گئے ہیں اس لیے ان میں میرا بھی مکمل حصہ ہے لیکن شریک اوّل انکار کر رہا ہے، تو آیا اس کا یہ انکار شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- یہ زمین دونوں شرکاء کے مابین تقسیم کی جائے گی، پودے لگانے والے کے حصہ میں اس کے پودے برقرار رہیں گے اور دوسرے شریک کے حصہ میں پودے لگانے والا اپنے پودے اکھاڑے اور اگر زمین کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو پودے نہیں اکھاڑے جائیں گے اور دوسرا شریک پہلے والے کو ان پودوں کی قیمت ادا کرے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ : بنی احدهما ای احد الشریکین بغیر اذن الاٰخر فی عقار مشترك بینهما فطلب شریکه رفع بنائه قسم العقار فان وقع البناء فی نصیب البانی فبها ونعمت والاهدم البناء وحکم الغرس۔

{الدر المختار علی صدر رد المختار
ج ۶ ص۲۶۸ کتاب القسمة}

کسی کی گائے بطور شرکت پالنا

سوال :- ایک شخص نے گائے خرید کر کسی دوسرے شخص کو اس شرط پر پالنے کے لیے دے دی کہ دودھ سب تمہارا ہوگا اور اس سے جو بچے پیدا ہوں وہ میرے ہونگے، تو کیا اس قسم کی شرط لگانا اور ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

---

[1] وقال الشیخ محمد الکامل الطرابلسیؒ : ان الارض تقسم بینهما فما وقع فی نصیب غیر الباقی یرفع...... وافتٰی شیخ آفندی فی غرس الاشجار من احد الشریکین فی الارض المشترکة بمثل ذٰلك۔ (منہ)

(فتاوٰی کاملیة ج ۱ ص۵۳ کتاب الشرکة)

ومثلهٗ فی سنن ابی داؤد ج ۲ ص۱۲۷ باب فی زرع ارض قوم بغیر اذن صاحبها۔

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں گائے کا دودھ اور اس کے بچے سب مالک کے ہیں اور پالنے والے کو اُجرتِ مثل دی جائے گی کیونکہ یہ اجارہ فاسدہ ہے اور اجارۂ فاسد میں کام کرنے والے کو اجرِ مثل ملتا ہے۔

لما قال الشیخ محمد کامل الطرابلسی رحمہ اللہ: لا یصح ذٰلک وما حدث فھو لصاحب البقرۃ وللاٰخر مثل علفہ واجر مثلہ کما فی الرد۔

(فتاوٰی کاملیہ ص۵۵ کتاب الشرکۃ) ۱؎

مشترکہ زمین میں شرکاء کی اجازت کے بغیر مکان بنانا

سوال:۔ ایک غیر آباد قطعہ اراضی چند افراد میں مشترک ہے، ان میں سے ایک شریک نے بلا اجازت شرکاء کے اور تقسیم سے پہلے ہی اس میں ایک مکان تعمیر کیا، تو کیا اس شخص کا بغیر شرکاء کی اجازت کے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مشترکہ زمین میں کسی ایک شریک کا تصرف کرنا دیگر شرکاء کی اجازت پر موقوف ہے، اور صورتِ مذکورہ میں اس شخص نے چونکہ شرکاء کی اجازت کے بغیر اور قبل از تقسیم مکان بنایا ہے اس لیے اس کا یہ اقدام شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز: اذا بنی احد الشرکاء لنفسہ فی الملک المشترک القابل للقسمۃ بدون اذن الاٰخرین ثم طلب الاٰخرون القسمۃ تقسم فان خرج ذٰلک البناء فی نصیب بانیہ فبھا وان خرج فی نصیب الاٰخر فلہ ان یکلف بانیہ ھدمہ ورفعہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام المادۃ ۱۰۷۳ ص۶۲۴) ۲؎

۱؎ وقال فی الھندیۃ: وعلی ھٰذا اذا دفع البقرۃ الی انسان بالعلف لیکون الحادث بینھما نصفین فما حدث فھو لصاحب البقرۃ ولذٰلک الرجل مثل العلف الذی علفھا واجر مثلہ فیما قام علیھا۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۲ ص۳۳۵ الباب الخامس فی الشرکۃ الفاسدۃ)

وَمِثْلُہٗ حاشیۃ منحۃ الخالق علی ھامش البحر الرائق ج۵ ص۱۸۴ کتاب الشرکۃ۔

۲؎ وقال الشیخ محمد کامل الطرابلسی: واذا بنی فی الارض المشترکۃ بغیر اذن الشریک لہٗ ان ینقض بناءہٗ۔ (فتاوٰی کاملیہ ج ص۵۱ کتاب الشرکۃ)

وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکۃ۔

خودرو گھاس مشترک ہوتا ہے

سوال:۔ ایک مشترکہ زمین جو کسی کی خاص ملکیت نہیں، گاؤں والوں میں سے ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ اس مشترکہ زمین میں اُگے ہوئے خودرو گھاس کو رہن پر دے دے یا فروخت کرے تو کیا اس شخص کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خودرو گھاس خواہ مملوکہ زمین میں ہو یا غیر مملوکہ زمین میں، ہر حال میں وہ کسی کی ملک نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ بالا شخص کا یہ اقدام شرعاً درست نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: المسلمون شرکاء فی ثلٰث فی الماءِ والکلاءِ والنار۔

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۳۶ کتاب البیوع۔ باب فی منع الماء)

آمدن واخراجات میں شریک بھائیوں کی کمائی کا حکم

سوال:۔ دو بھائی آپس میں آمدنی اور گھر کے تمام اخراجات میں شریک تھے، ان میں سے ایک بھائی انگلینڈ چلا گیا وہاں اس نے کافی مال جمع کیا اور واپس آکر ایک مکان خریدا، اس بھائی کی عدم موجودگی میں دوسرا بھائی گاؤں میں ہی محنت مزدوری کرکے خود بھی کھاتا رہا اور اس کے اہل وعیال کو بھی کھلاتا رہا، لیکن جس بھائی نے مکان خریدا ہے اب وہ اس میں دوسرے بھائی کے حصّہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے، تو کیا شرعاً یہ دونوں بھائی اس مکان میں برابر کے شریک ہوں گے یا جس بھائی نے خریدا ہے اس کا ہی ہوگا؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں جو شرکت ہے وہ شرکتِ فاسدہ ہے، لہٰذا اگر دونوں بھائیوں کے اموال آپس میں غیر متمیز ہوں تو ان میں مساوی انداز میں تقسیم ہوں گے اور اگر دونوں کے اموال متمیز ہوں تو ہر ایک بھائی اپنے اپنے حصّے کا حقدار ہوگا، اور اس بھائی کے مکان میں دوسرے بھائی کو حصہ دینا کوئی شرعی امر نہیں بلکہ محض

---

[1] وقال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانی رحمہ اللہ: الماءُ والکلاءُ والنار مباحۃ والناس فی ھٰذہ الاشیاء الثلاثۃ شرکاء۔

(شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۳۴ ص ۶۷۹ الکتاب العاشر)

ومثلہ فی الھدایۃ ج ۴ ص ۴۸۵ کتاب احیاء الموات۔

رواجی امر ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: یؤخذ من ھذا ما افتی بہ فی الخیریة فی زوج امرأة وابنها اجتمعا فی دارٍ واحدة واخذ کل منهما یکتسب علی حدة ویجمعان معاً کسبهما ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمیز فاجاب بانہ بینهما سویة۔
(ردالمحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکة۔ فصل فی الشرکة الفاسدة)[1]

مشترکہ ندی سے انتفاع کا حکم

سوال:۔ایک ندی دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے، ان میں سے ایک شریک دوسرے کو منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ اس ندی سے نفع نہیں اٹھا سکتے اور میں آپ کا اس میں حق نہیں مانتا، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ شریک اپنے ساتھی کی اجازت کے بغیر اس ندی سے نفع حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔اگر مذکورہ ندی کا مشترک ہونا مبرہن اور مسلّم ہو تو ان شرکاء میں سے ہر ایک اپنے اپنے حصہ میں مستقل تصرف کرنے کا مالک ہے اور ملکِ مشترک میں دوسرے ساتھی کی اجازت سے تصرف کرنے کا مجاز ہے۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الآخر لکن لا یجوز لہ ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریك۔
(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۰۷۱ ص۶۰۱ الکتاب العاشر)[2]

---

[1] وقال الشیخ محمد کامل الطرابلسیؒ: فاذا کان سعیهم واحداً ولم یتمیز ما حصله کل واحدٍ منهم بعمله یکون ما جمعوه مشترکاً بینهم بالسویة وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصواباً کما افتی بہ فی الخیریة وما اشتراہ احدهم لنفسہ یکون لہ ویضمن حصة شرکائہ من ثمنہ اذ دفعہ من المال المشترك۔ (فتاوی کاملیة ج۱ ص۵ کتاب الشرکة)

وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۹۶ کتاب الشرکة۔

[2] وقال العلامة ابن عابدینؒ: ان کل واحد من الشریکین شرکة ملك ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبہ کغیرہ الشریك من الاجانب الا باذنہ لعدم تضمنها الوکالة۔

(تنقیح الحامدیة ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکة)

وَمِثْلُہٗ فی الهدایة ج۲ ص۵۹۹ کتاب الشرکة۔

مزدور جو کچھ کمائے وہ اسی کی ملکیتِ خاص ہوتا ہے

سوال:۔ ایک آدمی کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیرونِ ملک چلا گیا اور وہاں چند سال مزدوری کرنے کے بعد پھر اپنے وطن واپس آگیا اور کچھ مدت گزرنے کے بعد اپنے بھائیوں اور والدین سے جدا ہو گیا، اس موقع پر اس نے یہ کہا کہ جو کچھ میں نے کمایا ہے وہ خاص میری ملکیت ہے جبکہ اس کے بھائیوں نے یہ کہا کہ نہیں تمہاری کمائی میں ہمارا بھی حصہ بنتا ہے تو کیا اس کے دوسرے بھائیوں کا یہ کہنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت کی رو سے کسی مزدور کی کمائی ہوئی رقم اُسی کی ملکِ خاص ہوتی ہے اور اُس کی اِس کمائی میں کوئی بھی شریک نہیں، کیونکہ کمائی اور مزدوری کمانے والے کی ملکِ خاص ہوتی ہے، البتہ اُس پر مشترکہ مال سے جو کچھ خرچ کیا گیا ہو تو وہ واپس لیا جا سکتا ہے۔

لما قال الشیخ محمد کامل الطرابلسیؒ: وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرۃ وصواباً کما افتی به فی الخیریة وما اشتراہ احدهم لنفسه یکون له ویضمن حصة شرکائه من ثمنه اذا دفعه من المال المشترك۔ (فتاویٰ کاملیة ج۱ ص۵ کتاب الشرکة)[1]

اولاد اور باپ کی مشترکہ تجارت میں اولاد کا حصہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میری کپڑے کی دوکان ہے جس کا کل سرمایہ میرا اپنا ہے دوکان میں نے پچاس ہزار روپے کے سرمائے سے شروع کی اور اب دوکان کا سرمایہ دس لاکھ روپے تک بڑھ گیا ہے، اس کاروبار کو ترقی دینے میں میرے دو بیٹوں نے بھی میرا ساتھ دیا ہے، دونوں بیٹے اس وقت سے لے کر آج تک اکٹھے رہے ہیں، اب ان میں سے ایک بیٹا جدا ہونا چاہتا ہے اور مجھ سے اس دوکان میں حصہ داری کا مطالبہ کرتا ہے۔ آنجناب سے شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق آپ کے بیٹے کاروبار میں آپ کے معاون تھے نہ کہ شریک، اس لیے ان میں سے کسی ایک بیٹے کو بھی دوکان میں حصہ داری کے دعویٰ کا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: وما اشتراہ احدهم لنفسه یکون له ویضمن شرکائه من ثمنه اذا دفعه من المال المشترك وکل ما استدانه احدهم یطالب به وحده۔

(شرح مجلة الاحکام۔ المادۃ ۱۳۶۱ ص۷۲۵ الکتاب العاشر)

ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۹۲ کتاب الشرکة۔

شرعاً کوئی حق نہیں، اور اگر آپ اس بیٹے کو کچھ بھی نہ دیں تو شرعاً آپ پر کوئی گناہ نہیں تاہم بہتر یہ ہے کہ اس بیٹے کو بھی احساناً کچھ نہ کچھ دے دیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ابٌ وابنٌ یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیئ ثم اجتمع لهما مال یکون کله للاب اذا کان الابن فی عیاله واجاب خیرالرملی عن سوال آخر بقوله حیث کان من جملة عیاله والمعینین له فی اموره واحواله فجمیع ما حصله بکده وتعبه فهو ملك خاص لابیه لاشیئ له فیه حیث لم یکن له مال ولو اجتمع له بالکسب جملة اموال لانه فی ذلك لابیه معین۔ (فتاوی حامدیة ج۲ ص۱۸ کتاب الشرکة)[1]

اس صورت میں وہ سب باپ ہی کا خرچ ہوا اس سے زیادت کے رجوع کا حق کسی کو بھی نہیں۔ نیز اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنے کے لیے زید کو اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ اس سرمایہ کو ان میں تقسیم کرے بلکہ اولاد بالغین کو بدون کچھ سرمایہ دیئے بھی الگ کر سکتا ہے اور اگر ان کو کچھ سرمایہ دے کر الگ کرے تو یہ اچھا ہے اور اس صورت میں سب کو برابر سرمایہ دے اور نابالغوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے بلوغ سے پہلے ان کو الگ نہیں کر سکتا۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۳۱۶ کتاب الشرکة)

❄ ❄

---

[1] قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) زید نے جو اپنے لڑکوں کو کاروبار میں اپنے ساتھ شریک کیا ہے تو اسکی صورت کیا تھی؟ آیا زید نے ہر بیٹے کو کچھ رقم یا سرمایہ ہبۃً دیدیا تھا، پھر وہ رقم یا سرمایہ کاروبار میں لگا کر وہ کاشریکِ تجارت ہوا یا باپ نے کسی بیٹے کو کچھ رقم ہبۃً نہیں دی نہ سرمایہ دیا اور نہ بیٹوں کے پاس اپنی ذاتی رقم یا سرمایہ تھا جس کو ملا کر وہ کاروبار میں شریک ہوئے ہوں بلکہ بیٹے ویسے ہی بدون رقم دیئے کام کرنے لگے اور اس شرکت سے کام کو ترقی ہوئی۔ پس صورتِ اولیٰ میں تو یہ البتہ شرکت ہے اور ہر شخص اپنی رقم و سرمایہ کی نسبت سے اس وقت اصل و نفع میں مستحق ہوگا۔ اور صورتِ ثانی میں شرکت ہی نہیں بلکہ کل سرمایہ زید کی ملک ہے اور سب لڑکے اس کے معین شمار ہوں گے اور جس لڑکے پر زیادہ خرچ ہوا

كتاب المضاربة

كتاب المضاربة
(مضاربت کے احکام ومسائل)

مضاربت کی حقیقت

سوال: جناب مفتی صاحب! مضاربت کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب: مضاربت ربّ المال اور مضارب کے باہمی اشتراک کا وہ فائدہ مند معاملہ ہے جس میں ربّ المال کو اس کے مال کی وجہ سے اور مضارب کو محنت کی وجہ سے حصہ دیا جاتا ہے، ایسی حالت میں دونوں کے لیے اس معاہدہ کی پابندی ضروری ہوتی ہے جو شرعی قواعد وضوابط کی روشنی میں ان کے درمیان طے پایا ہو۔

قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: هی شرکة بمال من جانب والمضارب امین وبالتصرف وکیل وبالربح شریك وبالفساد اجیر وبالخلاف غاصب وباشتراط کل الربح له مستقرض وباشتراطه لرب المال مستبضع وانما تصح بما تصح به الشرکة۔

(کنز الدقائق ص۳۳۹ کتاب المضاربة) [1]

مضاربت میں منافع کی تعیین کرنا

سوال: عمرو نے بکر کو دس ہزار روپے تجارت کے لیے دیئے اور بکر پر شرط عائد کر دی کہ آپ مجھے سالانہ ایک ہزار روپے دیں گے بقایا منافع جتنا بھی ہوگا وہ آپ کا ہوگا، تو کیا ایسا عقد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مضارب یا ربّ المال کا کسی خاص مقدار میں منافع کا اپنے لیے متعین کرنا خواہ ماہانہ ہو یا سالانہ، مفسدِ عقد ہے اس لیے ایسی صورت میں مضاربت فاسد رہے گی۔

قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ: ومنها ان یکون المشروط لکل واحدٍ منهما

---

[1] قال العلامة القدوری رحمه الله: المضاربة عقد یقع علی الشرکة فی الربح بمال من احد الشریکین وعمل من الآخر ولا تصح المضاربة الا بالمال الذی بیّنا ان الشرکة تصح به۔ (مختصر القدوری، کتاب المضاربة)

ومثله فی الهدایة ج۳ ص۲۵۶ کتاب المضاربة۔

من المضارب وربّ المال من الربح جزأً شائعاً نصفاً او ثلثاً اوربعاً فان شرطا عدداً مقدراً بان شرطا ان یکون لاحدهما مائة درهم من الربح او اقل او اکثر والباقی للآخر لایجوز والمضاربة فاسدة۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص۸۵ فصل واما شرائط الرکن فبعضها یرجع الخ) لہ

عقدِ مضاربت میں رأس المال کا نقدی ہونا ضروری ہے

سوال:۔ زید نے عمرو کے ہاتھ بیس ہزار روپے کا مال فروخت کیا اور قیمت وصول نہیں کی بلکہ قرض رہنے دیا، بعد میں دونوں میں اس طرح کا عقد ہو گیا کہ زید نے عمرو سے کہا کہ اُن بیس ہزار روپوں کے ساتھ آپ تجارت کریں جو میرے آپ کے ذمے قرض ہے اور منافع کی صورت میں اولاً عمرو زید کو دو ہزار روپے ادا کرے گا اور بقایا رأس المال سے جو بھی نفع آئے گا وہ دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہو گا، کیا مضاربت کی یہ صورت شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ مضاربت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ عقدِ مضاربت میں مال کا نقد دینا ضروری ہے نہ کہ قرض کا مال، البتہ اس طرح کا عقد کرنا کہ رُب المال کا کسی آدمی کے ذمے قرض ہو اور مضارب کو اجازت دے دے کہ آپ اُس قرض کو وصول کر کے اُس سے تجارت کریں تو یہ صورت درست ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ:۔ واما المضاربة بدَینٍ فان علی المضارب لم یجز وان علی ثالث جاز وکرہ۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج ۵ ص۶۴۷ کتاب المضاربة) ٢ہ

لہ وفی الهندیة: ومنها ان یکون نصیب المضارب من الربح معلوماً علی وجه لاتنقطع به الشرکة فی الربح کذا فی المحیط۔ فان قال علی ان لك من الربح مائة درهم او شرط مع النصف او الثلث عشرة دراهم لاتصح المضاربة کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۲۸۷ کتاب المضاربة الباب الاول فی تفسیرها ورکنها وشرائطها)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص۲۶۴ کتاب المضاربة۔

٢ہ وفی الهندیة: (ومنها) ان یکون رأس المال عیناً لادیناً فالمضاربة بالدیون لاتجوز حتی ان من کان له علی آخر الف درهم فامرہ صاحب الدین ان یعمل بها مضاربة لاتجوز المضاربة کذا فی النهایة۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۲۸۶ کتاب المضاربة الباب الاول فی تفسیرها ورکنها وشرائطها) ۔ وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص۲۵۸ کتاب الصلوٰة۔

مضارب کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ دورانِ تجارت مضارب کی خوراک و پوشاک کا خرچہ کس کی ذمہ داری ہے؟

الجواب:۔ مضارب مال کی تجارت اپنے شہر میں کرے تو اُس کی خوراک وغیرہ کا خرچہ مالِ مضاربت سے نکالنا جائز نہیں، ہاں اگر اپنے شہر سے باہر تجارت کرے تو خوراک و پوشاک کا خرچہ اور دیگر ضروریاتِ زندگی مالِ مضاربت سے پورا کرنے کی اجازت ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ:۔ واما تفسیر النفقة التی فی مال المضاربة فالکسوة والطعام والادام والشراب واجر الاجیر وفراش ینام علیه وعلف دابته التی یرکبها فی سفره ویتصرف فی حوائجه وغسل ثیابه ودهن السراج والحطب ونحو ذلك ولاخلاف بین اصحابنا فی هٰذه الجملة لان المضارب لا بد له منها فکان الاذن ثابتًا من رب المال دلالة۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۱۰۶ فصل واما بیان حکم المضاربة) [1]

مضاربت میں خسارہ کی ذمہ داری کا مسئلہ

سوال:۔ مضارب کی محنت کے باوجود اگر معاملہ فائدہ مند نہ رہے اور مضارب کو آئے دن ناکامی کا سامنا کرتے ہوئے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہو جس کے نتیجے میں اصل رقم سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں تو ایسے حالات میں تاوان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

الجواب: مضاربت رب المال اور مضارب کے باہمی اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں رب المال کے ساتھ مضارب کی محنت شامل ہوتی ہے، نقصان کی صورت میں دونوں کا متاثر ہونا ظاہر ہے، اگر رب المال کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے تو مضارب کی بھی دن رات کی محنت ضائع ہوتی ہے، مالی نقصان کا بوجھ مضارب پر ڈالنا بے انصافی کے مترادف ہے اسی لیے مضارب پر مالی نقصان کی ذمہ داری کی شرط کرنا مفسد ہے، جو نقصان ہو وہ پہلے منافع

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: وفی الاصل المضارب مادام یعمل فی المصر فنفقته فی ماله وان کان المصر کبیرا او هو قائم فی جانب آخر للتجارة۔

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۸۹ الفصل الثالث فی نفقة المضارب ومؤنة)

ومِثلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام لرستم باز، مادة ۱۴۱۹ الفصل الثالث فی احکام المضاربة۔

سے منہا کیا جائے گا، اگر اس سے بھی متجاوز ہو تو پھر رأس المال سے منہا کیا جائے گا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وفی الجلالیۃ کل شرط یوجب جہالۃ فی الربح او یقطع الشرکۃ فیہ یفسدھا والا بطل الشرط کشرط الخسران علی المضارب۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص۶۴۸ کتاب المضاربۃ) [1]

مضاربت میں فریقین منافع کے حقدار کب بنتے ہیں

سوال: رب المال اور مضارب کے درمیان معاہدہ ہوا کہ مضارب دوسرے شہروں سے مال فروخت کرے گا اور منافع نصف نصف ہوگا، اب رب المال نے مضارب سے مال فروخت ہونے سے پہلے کہا کہ یہاں کے بھاؤ کے حساب سے درآمد کردہ مال میں بیس ہزار روپے منافع ہوتا ہے لہٰذا آپ مجھے دس ہزار روپے دے دیں، تو کیا رب المال کا ایسا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب:۔ جب تک منافع کا ظہور نہ ہو جائے رب المال کو ایسا مطالبہ کرنا جائز نہیں اور منافع مال بیچنے کے بعد ہوتا ہے، اور اگر فریقین کے مابین اس طرح کا معاہدہ ہو چکا ہو تو یہ مضاربت فاسد ہے اس کو فوراً توڑ دینا چاہیئے۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ: واشار المصنف الی ان للمضارب ان ینفق علی نفسہ من مال المضاربۃ فی السفر قبل الربح والی انہ لو لم یظہر الربح لاشئ علی المضارب۔

(البحر الرائق ج ۷، ص۲۶۷ کتاب المضاربۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ سلیم رستم بازرحمہ اللہ: الضرر والخسار یعود فی کل حال علی رب المال واذا شرط کونہ مشترکاً بینہ وبین المضارب فلا یعتبر ذلک المشرط۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۱۴۲۸ ص۷۵۷ الفصل الثالث فی بیان احکام المضاربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج ۳ ص۲۵۸ کتاب المضاربۃ۔

[2] قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: فاذا ظہر الربح فہو شریکہ بحصتہ من الربح۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربۃ۔ الفصل الاول فی المقدمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۵ ص۶۵۸ کتاب المضاربۃ۔

حکومتی جرمانہ رب المال پر آئے گا یا مضارب پر

سوال :- زید نے عمرو کو دس ہزار روپے افیون کی تجارت کے لیے دیئے، عمرو افیون خرید کر بڑی احتیاط کے ساتھ آرہا تھا کہ راستے میں پولیس نے اُسے گرفتار کر کے مال بھی ضبط کر لیا اور تین ہزار روپے جرمانہ بھی لے لیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ تین ہزار روپے رب المال (زید) کے ذمّے ہے یا مضارب (عمرو) کے ذمّے، جبکہ افیون کی تجارت حکومت کی طرف سے سخت جرم ہے؟

الجواب :- نقصانِ جرم کی اگر مالک نے ذمّہ داری قبول کر لی ہے تو مالک پر ضمان لازم ہے ورنہ مضارب پر آئے گا۔ البحرالرائق جلد ۲ صـ۲۶۲ میں ہے، ولا رُجُوع له فيما انفقه في الخصومة لتقاضي الدّين۔ جب دَین (قرض) کے مقدمے کا خرچ مالک پر نہیں آتا ہے تو جرم کا ضمان کس طرح مالک پر آئے گا۔

وفي الهندية: الاصل ان ما يفعله المضارب ثلاثة انواع نوع يملكه بمطلق المضاربة وهو ما يكون من باب المضاربة وتوابعها ومن جملته التوكيل بالبيع والشراء للحاجة والرهن والارتهان والاجارة والاستيجار والايداع والابضاع والمسافرة و نوع لا يملكه بمطلق العقد ويملكه اذا قيل له اعمل برأيك وهو ما يحتمل ان يلحق به فيلحق به عند وجود الدلالة وذلك مثل دفع المال مضاربة او شركة الى غيره وخلط مال المضاربة بماله او بمال غيره ونوع لا يملكه لا بمطلق العقد ولا بقوله اعمل برأيك الا ان ينص عليه رب المال وهو كالاستدانة۔ (الفتاوى الهندية ج۴ صـ۲۹۱ الباب الرابع فيما يملك المضارب من التصرفات ولا يملك) [1]

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: والاصل ان ما يفعله المضارب ثلاثة انواع نوع يملكه بمطلق المضاربة وهو ما يكون من باب المضاربة وتوابعها الخ (الى ان قال) ونوع لا يملكه لا بمطلق العقد ولا بقوله اعمل برأيك الا ان ينص عليه رب المال۔

(الهداية ج۳ صـ۲۲۵ فصل فيما يفعله المضارب)

وَمِثْلُهٗ في خلاصة الفتاوى ج۴ صـ۱۸۹ الفصل الثاني فيما يملك المضارب۔

دوکان کے اخراجات مضارب پر عائد کرنا

سوال:۔ رب المال اور مضارب کے درمیان ایسا معاہدہ کرنا کہ نفع نقصان میں باہم شریک ہوں یعنی ایک تہائی رب المال کا اور دو تہائی مضارب کا ہوگا، اس کے علاوہ دوکان کے اخراجات بھی مضارب کے ذمے ہوں گے، کیا ایسا معاہدہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ دوکان کے اخراجات رأس المال سے ادا کرنا جائز ہیں البتہ مضارب کو تاوان میں شریک کرنا ناجائز ہے اور مضارب پر تاوان کی ادائیگی مشروط کرنا بھی باطل ہے، تاوان کی صورت میں اگر مضارب قصوروار نہ ہو تو منافع سے منہا کیا جائے گا اور اگر منافع سے پوری ادائیگی ممکن نہ ہو تو رأس المال سے ادا کیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم باز: واذا تلف بعض مال المضاربة یحسب فی اول الامر من الربح ولا یسری الی رأس المال واذا تجاوز مقدار الربح وسری الی رأس المال فلا یضمنه المضارب سواء کانت المضاربة صحیحة او فاسدة۔

(شرح مجلة الاحکام۔المادة ۱۴۲۷ ص ۷۵۶/۵۷)[1]

مضاربت کے قواعد وضوابط پر عرف کا اثر

سوال:۔ مروجہ کرنسی نوٹ مضاربت کے لیے کافی ہیں یا سونا چاندی خرید کر دینا ضروری ہے؟

الجواب:۔ مروجہ کرنسی نوٹ چونکہ ثمن عرفی کے حکم میں ہیں اور معاشرہ میں ان سے خرید وفروخت کی جاتی ہے اس لیے مضاربت کے لیے ان کا دینا ہی کافی ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: المضاربة لا تجوز بغیر الدراهم والدنانیر مکیلاً کان او موزوناً او عروضاً فی قول ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله تعالیٰ وقال محمد رحمه الله تجوز بالفلوس الرائجة عدداً ولا

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: من مال المضاربة فهو من الربح دون رأس المال لان الربح تابع (الی ان قال) فان زاد الهالك علی الربح فلا ضمان علی المضارب لانه امین۔ (الهدایة ج۳ ص۲۶۴ فصل فی العزل والقسمة، کتاب المضاربة)
ومثله فی رد المحتار ج۵ ص۶۵۸ فصل فی المتفرقات، کتاب المضاربة۔

تجوز بالذهب والفضة اذا لم تکن مضروبة فی روایة الاصل)
(فتاوی خانیة علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص۱۶۱ کتاب المضاربة)[1]

حیوان کو مضاربت میں دینے کا حکم

سوال:۔ مضارب کا رب المال سے جانور لینا بایں شرط کہ میں اس کو پالوں گا اور اس کی نسل پیدا ہونے کی صورت میں موافق شرط تقسیم کریں گے، کیا مضاربت کی یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حیوان کو مضاربت پر دینا عقد فاسد ہے، ہاں اگر حیوان کو دیتے وقت یہ کہدے کہ اس جانور کو بیچ دو اور اس رقم پر عملِ مضاربت کرو تو یہ جائز ہے۔

قال العلامة سلیم رستم باز: یشترط ان یکون رأس المال مالا تصح به الشرکة فلا یجوز ان یکون العقار والعروض والدین فی ذمة رأس مال فی المضاربة لکن رب المال اذا اعطی شیئاً من العروض الی المضارب وقال بع هذا واعمل بثمنه مضاربة وقبل المضارب وقبض ذلك المال و باعه واتخذ نقود ثمنه رأس المال للتجارة کانت المضاربة صحیحة۔ (مجلة الاحکام، مادة ۱۴۰۹ ص۲۴۵ الفصل الثانی فی شروط المضاربة)[2]

مالِ مضاربت سے خریدی ہوئی بکری کے دودھ کا حکم

سوال:۔ مضارب نے باجازت رب المال بکری

---

[1] قال العلامة ابوبکر الحداد الیمنیؒ: (قوله ولا یصح المضاربة الا بالمال الذی بینا ان الشرکة تصح به) یعنی انها لا تصح الا بالدراهم والدنانیر فاما الفلوس فعلی الخلاف الذی بیناه فی الشرکة وهو عند محمد تجوز المضاربة بها وعندهما لا تجوز۔
(الجوهرة النیرة ج ۱ ص۳۵ کتاب المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی عینی شرح کنز ص۵۰۲ کتاب المضاربة۔

[2] وفی الهندیة: لو دفع الیه عرضاً او عبداً فقال بعه واقبض ثمنه واعمل به مضاربة فباعه بدراهم اودنانیر وتصرف فیها جازت المضاربة کذا فی محیط السرخسی۔
(الفتاوی الهندیة ج ۴ ص۲۶۸ کتاب المضاربة۔الباب الاول فی تفسیرها ورکنها وشرائطها وحکمها۔
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربة۔

خریدی اب اس کا دودھ مضارب کی ملکیت ہو گی یا کہ رب المال کی ؟

الجواب :۔ دودھ، اون وغیرہ تمام کے تمام مالِ مضاربت یا ربح میں داخل ہے، ان کا استعمال بغیر اجازت کے ممنوع ہے۔ ان چیزوں کی قیمت حسب ضابطۂ فقہاء کبھی تو رأس المال میں داخل ہوتی ہے اور کبھی ربح (منافع) ہیں۔

قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: المضارب امين فرأس المال في يده في حكم الوديعة اما من حيث تصرفه في رأس المال فهو وكيل رب المال واذا ربح كان شريكًا فيه ۔ (مجلة الاحكام. مادة ۱۴۱۳ ص ۷۴۸ الفصل الثاني في احكام المضاربة) [1]

مضارب کا معاہدہ کے خلاف کام کرنا

سوال :۔ زید نے بکر کو بیس ہزار روپے عقدِ مضاربت پر کپڑوں کی تجارت کے لیے دیئے، بکر نے خلافِ معاہدہ تیل کی تجارت شروع کر دی اور اس میں خسارہ اٹھانا پڑا، از روئے شرع شریف نقصان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ؟

الجواب :۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے پر نقصان کی تمام ذمہ داری بکر (مضارب) پر عائد ہوتی ہے لہٰذا بکر زید کو تمام رأس المال یعنی بیس ہزار روپے ادا کرے گا۔

وفي الهندية : ان خص له رب المال التصرف في بلد بعينه او في سلعة بعينها تتقيد بها و لم يجز له ان يتجاوز ذلك (الى ان قال) فان اخرج الى غير ذلك البلد فاشترى ضمن وكان ذلك له وله ربحه ۔ (الفتاوى الهندية ج ۴ ص ۲۹۷ الباب السادس فيما يشترط على المضارب من الشروط) [2]

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله ، فاذا ظهر الربح فهو شريكه بحصته من الربح۔ (خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۱۸۸ كتاب المضاربة)

وَمِثْلُهٗ في الجوهرة النيرة ج ا ص ۳۵ كتاب المضاربة ۔

[2] قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: اذا خالف المضارب رب المال بعد ما نهاه بقوله لا تذهب بمال المضاربة الى المحل الفلاني ولا تبع بالنسيئة فذهب بمال المضاربة الى ذلك المحل فتلف المال او باع بالنسيئة فهلك الثمن كان المضارب ضامنًا ۔

(مجلة الاحكام مادة ۱۴۲۳ ص ۵۵۹ الفصل الثالث في احكام المضاربة)

وَمِثْلُهٗ في الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۵ ص ۶۵۱ كتاب المضاربة ۔

مدرسے کا فنڈ چندہ دہندگان کی اجازت سے مضاربت پر دینا

سوال:- کیا مدرسے کا فنڈ بمشورہ متولیان و اراکین مدرسہ مضاربت پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مدرسے کا فنڈ ضروریات مدرسہ سے زائد ہو تو چندہ دہندگان کی اجازت اور متولیانِ مدرسہ کے مشورہ سے اس سے تجارت کرنا مرخّص ہے۔

وفی الهندیة: القیم اذا اشتریٰ من غلة المسجد حانوتاً او داراً ان یستغل ویباع عند الحاجة جاز ان کان ولایة الشراء۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ الباب الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم وغیره فی مال الوقف علیه) [1]

مال کی موجودگی میں مضاربت کو ختم کرنے کا حکم

سوال:- زید نے خالد کو مضاربت کے لیے ایک لاکھ روپے دیئے اب کچھ وقت گذرنے کے بعد زید اپنے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا ہے جبکہ خالد کے پاس ابھی کچھ مال باقی ہے، تو کیا مال کی موجودگی میں زید اپنی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر عاقدین مضاربت کو ختم کرنا چاہتے ہوں تو جب تک مالِ مضاربت ختم نہیں ہوتا اس وقت تک رب المال اپنے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ نہیں کر سکتا اور نہ مضارب کو معزول کرنے سے اس کے تصرفات ختم ہوں گے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واعلم المضارب بعزله والمال عروض فله ان یبیعها ولا یمنعه العزل من ذلك لأن حقه قد ثبت فی الربح انما یظهر بالقسمة وهی تبتنی علیٰ رأس المال وانما ینض بالبیع۔
(الهدایة ج۳ ص۲۶ کتاب المضاربة)

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: الفاضل عن وقف المسجد یشتری مستغلاً للمسجد حانوتاً او داراً۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۴۲۳ الفصل الرابع فی المسجد واوقافه ومسائله)
ومثله فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۳۱۳ فصل فی وقف المنقول۔

مضاربت ختم کرنے سے روکنے اور عقدِ مضاربت کیلئے تعین مدت کا حکم

سوال۔ جناب مفتی صاحب! ایک دو مسئلوں کی وضاحت مطلوب ہے، مہربانی فرماکر قرآن وسنت کی روسے جواب عنایت فرمائیں؟

(۱) دو آدمیوں نے مل کر مضاربت کے عنوان سے کاروبار شروع کیا، ان دونوں کا معاملہ چار سال تک جاری رہا، اب ایک ساتھی دوسرے سے جدا ہونا چاہتا ہے جبکہ دوسرے ساتھی کا یہ کہنا ہے کہ جب تک میں اجازت نہ دوں تم مجھ سے جدا نہیں ہوسکتے، کیا واقعی دوسرے ساتھی کو منع کرنے کا اختیار ہے؟

(۲) ان دونوں نے عقدِ مضاربت کرتے وقت چار سال کی مدت بھی مقرر کی تھی۔ تو کیا مضاربت میں مدت مقرر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ (۱) عقدِ مضاربت فریقین میں سے جو بھی چاہے اور جس وقت چاہے ختم کرسکتا ہے مگر عقد فسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے ساتھی کو اس سے مطلع کردیا جائے۔ لیکن اس فسخ کا اطلاق اس وقت صحیح ہوگا جب مال نقدی کی شکل میں موجود ہو، اگر مال اثاثہ (عروض) کی صورت میں ہو تو پھر مضارب کو اثاثہ فروخت کرنے کا موقع دیا جائے گا تاکہ اصل نفع متعین ہوجائے جس کیلئے عقد ہوا تھا۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: وأما صفة هذا العقد فهو أنه عقد غير لازم ولكل واحد منهما أعني رب المال والمضارب الفسخ لكن عند وجود شرطه وهو علم صاحبه وبشرط أيضاً أن يكون رأس المال عيناً وقت العقد دراهم أو دنانير حتى لو نهى رب المال المضارب عن التصرف ورأس المال عروض وقت النهي لم يصح نهيه وله أن يبيعها لأنه يحتاج إلى بيعها بالدراهم والدنانير ليظهر الربح فكان النهي والفسخ إبطالاً لحقه في التصرف فلا يملك ذلك وإن كان رأس المال دراهم أو دنانير وقت الفسخ والنهي صح الفسخ والنهي۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۱۰۹ كتاب المضاربة)

(۲) اسی طرح عقدِ مضاربت کیلئے احناف کے ہاں وقت متعین کرنا بھی صحیح ہے۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: ولنا أن المضاربة توكيل والتوكيل يحتمل التخصيص بوقت دون وقت۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۹۶ كتاب المضاربة)

لہٰذا اگر صورتِ مسئولہ میں عقدِ مضاربت کا وقت بھی مقرر ہو اور سرمایہ بھی نقدی کی شکل میں ہو تو پھر دوسرے ساتھی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ساتھی کو عقدِ مضاربت کے فسخ کرنے سے منع کرے یا روکے۔

كتاب الوكالة الحوالة

فتقبلها ربها بقبولٍ
حسن وانبتها نباتا
حسناً وكفلها زكريا

قال اجعلني خزائن
الارض اني حفيظ عليم

کتاب الوکالۃ والکفالۃ

(وکالت کے احکام ومسائل)

نابالغ کو وکیل بنانا

سوال:۔ مساجد، مدارس یا دوسرے رفاہی کاموں کے لیے چندہ کرتے وقت بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ گھروں سے عورتیں چھوٹے بچوں کو چندہ دے کر بھیجدیتی ہیں، تو کیا ایک نابالغ بچہ والدہ یا والد کی طرف سے کچھ رقم لے جاکر وکیل بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر بچہ سمجھدار ہو تو اس کو وکیل بنانے میں کوئی حرج نہیں تاہم مذکورہ صورت میں بچہ وکیل نہیں بلکہ صرف نمائندہ ہے جس کو فقہاء کرام رسول کے نام سے یاد کرتے ہیں اس لیے نابالغ بچوں کے ہاتھ خیرات وغیرہ بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغیناني: قال و یجوز ان یقبل فی الهدیة والاذن قول العبد والجاریة والصبي لان الهدایا تبعث عادة علی ایدی هٰؤلاء وکذا لا یمکنهم استصحاب الشهود علی الاذن عند الضرب فی الارض والمبایعة فی السوق فلو لم یقبل قولهم یؤدی الی الحرج۔ (الهدایة ج۴ ص۴۵۲ کتاب الکراهیة) [1]

وکالت میں علم ہونا ضروری ہے

سوال:۔ بعض علاقوں میں نکاح پڑھاتے وقت لڑکی سے باقاعدہ اجازت لینے کی بجائے کسی ایسے شخص کو وکیل مقرر کرکے ایجاب وقبول کرایا جاتا ہے کہ جس کے بارے میں لڑکی کو علم تک نہیں ہوتا ہے، کیا کسی ایسے شخص کے ایجاب وقبول کو اعتبار دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی کا وکیل بننے کے لیے مؤکل کی طرف سے باقاعدہ اجازت کا ہونا

---

[1] قال العلامة الحصکفي: ویقبل قول المملوک ولو انثی والصبي فی الهدیة سواء اخبر باهداء المولی غیره او نفسه والاذن سواء کان بالتجارة او بدخول الدار۔ قال ابن عابدین تحته قال فی المنح بان قال عبد او جاریة او صبي هٰذه هدیة اهداها الیک سیدی او ابي .... انما یقبل قول هٰؤلاء فیها لان الهدیة تبعث عادة علی ایدی هٰؤلاء۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۴۵ کتاب الکراهیة)

ضروری ہے، صورتِ مذکورہ میں ایسا نکاح نکاحِ فضولی کے حکم میں ہے، اگر لڑکی علم ہوجانے کے بعد اجازت دے دے تو نکاح منعقد ہے گا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واصل هٰذا ان تصرفات الفضولی التی لها مجیز حالة العقد منعقدة موقوفة علی اجازة المجیز من البیع والاجارة والنکاح والطلاق ونحوها فان اجاز ینفذ والا فیبطل۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۴۸ کتاب الوکالة۔ الفصل الثالث)[1]

نکاح میں نابالغ کی وکالت کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں رواج ہے کہ شادی کے وقت جب نکاح پڑھایا جاتا ہے تو لڑکی سے اجازت لینے کے لیے کسی نابالغ لڑکے کو بھیجا جاتا ہے اور پھر اس لڑکے کا والد یا کوئی دوسرا رشتہ دار وکیل بن کر ایجاب وقبول کر لیتا ہے، تو کیا ایسے وکالت از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً وکالت کے لیے وکیل کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے بنا بریں نابالغ لڑکے کی وکالت درست نہیں ہے، صورتِ مسئولہ میں نابالغ لڑکا چونکہ اخبار عن الوکالت کرتا ہے اس لیے لڑکے کا یہ اخبار عن الوکالت درست ہوتا ہے، اور اسی طرح یہ لڑکا رسول کے حکم میں ہے اور رسالت میں احکام مرسل کو راجع ہوتے ہیں نہ کہ رسول کو۔

قال العلامة محمد بن محمود الاستروشنیؒ: والحاصل ان الوکالة تثبت باخبار رجل واحد حرًا کان عبدًا عدلاً کان اوفاسقًا صبیًا او بالغاً۔ (جامع احکام الصغار علی هامش جامع الفصولین ج ۱ ص۲۸ مسئلة الوکالة)[2]

توکیل میں فریق مخالف کی رضامندی کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کرنا چاہے تو

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: وفی کل موضع لا ینفذ فعل الوکیل فالعقد موقوف علی اجازة الموکل۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۳۴۴ کتاب الکفالة)

[2] وقال العلامة سلیم رستم بازؒ: تعود حقوق العقد فی الرسالة الی المرسل ولا تتعلق بالرسول اصلاً۔ (شرح المجلة الاحکام۔ م ۱۴۶۲ ص۷۸۳ کتاب الوکالة)

کیا اس میں فریقِ مخالف کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وکیل مؤکل کا نمائندہ ہوتا ہے اور یہ اس کا ذاتی حق ہے، اس لیے توکیل کا جواز فریقِ مخالف کی رائے پر موقوف نہیں۔ تاہم امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وکیل کے ذریعہ کسی حق کے لزوم کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تقرری میں فریقِ مخالف کی رائے شامل ہو جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک اس کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ:۔ قال ابو حنیفہ رحمہ اللہ لا یجوز التوکیل بالخصومة من غیر رضاء الخصم الا ان یکون المؤکل مریضاً او غائباً مسیرة ثلاثة ایام فصاعداً وقالا یجوز التوکیل بغیر رضاء الخصم وھو قول الشافعی رحمہ اللہ ولا خلاف فی الجواز انما الخلاف فی اللزوم۔ (الھدایة ج ۳ ص۱۷۷ کتاب الوکالة) [1]

وکیل سے رقم ضائع ہونے کی صورت میں ذمہ دار کون ہوگا

سوال:۔ کسی چیز کی خریداری پر مقرر کردہ شخص سے اگر رقم گم ہو جائے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ کیا وکیل اس مال کا ضامن ہوگا یا سارا نقصان مؤکل کے ذمے آئے گا؟

الجواب:۔ کسی چیز کی خریداری پر مقرر کردہ شخص سے رقم اگر مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد گم ہو جائے اور بائع کو ابھی روپے نہ دیئے ہوں تو اس کی ذمہ داری مؤکل پر عائد ہوگی اور وہ وکیل پر رجوع کا حق نہیں رکھتا ہے، اور اگر مؤکل نے وہ چیز خریدنے کے بعد رقم وکیل کو دی ہو اور بائع کو دینے سے قبل وہ گم ہو جائے تو اس کی ذمہ داری وکیل پر عائد ہوگی۔

لما قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: اذا رفع الثمن الی انسان الف درھم فأمرہ ان یشتری بھا جاریةً فاشتری ثم ھلک ثمن قبل ان ینقص البائع یھلک من مال الآمر فان رفع الآمر الالف الی الوکیل بعد

---

[1] وقال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لکل من المدعی والمدعیٰ علیه ان یوکل من شاء بالخصومة ولا یشترط رضاء الآخر۔ (شرح المجلة الاحکام م۱۵۱۶ ص۸۲۰ الفصل الخامس فی الوکالة بالخصوم)
ومثلهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۴۲ الفصل الرابع فی الوکالة بالبیع۔

ما اشتری فہلک قبل ان ینقد البائع یہلک من مال الماموریہ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۱۵۹ الفصل الرابع فی الوکالۃ بالشراء) ؎۱

وکیل پر ضمان کا حکم

سوال:۔ وکیل کا مبیعہ خریدنے کے بعد اگر مبیعہ راستہ میں کہیں ضائع ہو جائے تو یہ کس کا نقصان متصور ہوگا؟ وکیل یا مؤکل کا؟

الجواب:۔ وکیل چونکہ مؤکل کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ تمام تر ذمہ داری مؤکل کے فائدے کے لیے اٹھاتا ہے اس لیے مبیعہ کی ہلاکت کا نقصان مؤکل کو اٹھانا پڑے گا۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: فان ھلک المبیع فی یدہ قبل حبسہ ھلک من مال المؤکل ولم یسقط الثمن لان یدہ کید المؤکل فاذا لم یحبسہ یصیر المؤکل قابضا بیدہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۸۱/۱۸۲ کتاب الوکالۃ بالبیع والشراء) ؎۲

وکیل کا مدعی پر اقرار کرنا

سوال:۔ اگر مدعیٰ علیہ کی طرف سے وکیل نے نمائندگی کرتے ہوئے مدعی کا حق تسلیم کر لیا لیکن مدعیٰ علیہ اب بھی اس سے انکار کر رہا ہے، تو کیا وکیل کا کسی کے حق پر اقرار کرنا مؤکل (مدعیٰ علیہ) کے حق میں لازم متصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ وکیل کا کسی کی نمائندگی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف مؤکل کے دنیاوی مفادات کا تحفظ کرے بلکہ شرعی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اسکے جائز حق کے بارے

؎۱ وقال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ، ولم یذکر المؤلف ھنا حکم ما اذا وکلہ بشراء شئ ودفع الثمن الیہ فہلک فی یدہ قال فی البزازیۃ وفی جامع الفصولین دفع الیہ الفا لیشتری بہ فاشتری وقبل ان ینقدہ للبائع ھلک فمن مال الآمر وان اشتری ثم نقد المؤکل فہلک الثمن قبل دفعہ الی البائع عند المؤکل یہلک من مال الوکیل۔

(البحر الرائق ج۷ ص۱۵۶ باب الوکالۃ بالبیع والشراء)

؎۲ وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: فلو ھلک فی یدہ قبل حبسہ ھلک من مال المؤکل ولم یسقط الثمن لان یدہ کید المؤکل فاذا لم یحبس یصیر المؤکل قابضا بیدہ۔

(البحر الرائق ج۷ ص۱۵۶ باب الوکالۃ بالبیع والشراء)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۱۵۸ الفصل الخامس فی الوکالۃ بالشراء۔

میں اقرار بھی کرسکتا ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں وکیل کا اقرار کرنا مدعیٰ علیہ کے حق میں لازم متصور ہوگا بشرطیکہ یہ اقرار قاضی کے حضور میں ہو لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ حکم عام ہے خواہ قاضی کے حضور میں ہو یا کسی دوسری محفل میں ہو۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا اقر الوکیل بالخصومة علی مؤکله عند القاضی جاز اقراره علیه ولا یجوز عند غیر القاضی عند ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله استحساناً الا انه یخرج من الوکالة وقال ابو یوسفؒ یجوز اقراره علیه وان اقر فی غیر مجلس القضاء۔ (الهدایة ج ۳ ص۱۹۵ باب الوکالة بالخصومة والقبض) [۱]

توکیل بالنکاح میں شہادت ضروری نہیں

سوال:۔ لڑکی کی طرف سے نکاح کے معاملہ میں وکیل مقرر کرنے کے لیے دو آدمی بھیجے جاتے ہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ فلاں عورت نے اس کو وکیل مقرر کیا ہے، ایسی حالت میں اگر ایک آدمی اجمالی گواہی پر اکتفاء کرے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ توکیل شہادت پر موقوف نہیں بلکہ وکیل کو جب بالاعتماد ذرائع سے وکالت کی خبر پہنچے تو وکیل مؤکل کے لیے تصرف کرسکتا ہے، صورت مذکورہ میں ایک وکیل کا بیان ہی کافی ہے تاہم اگر دونوں گواہی دیدیں تو مؤکل کو کسی وقت بھی انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واعلم انه لایشترط الشهادة

---

[۱] وقال العلامة ابن نجیمؒ: ولو اقر الوکیل بالخصومة عند القاضی صح والا لا، اقر علی مؤکله عند غیر القاضی لا یصح عندهما استحساناً وخرج به عن الوکالة وصحح ابو یوسفؒ اقراره مطلقاً وابطله زفر مطلقاً وهو القیاس لکونه مأموراً بالخصومة وهی منازعة والاقرار ضدها لانه مسالمة والامر بالشئ لایتناول ضده وجه الاستحسان ان التوکیل صحیح وصحته تتناول ما یملك وذلك مطلق الجواب دون احدهما عیناً فیصرف الیه تحریاً للصحة۔ (البحر الرائق ج۷ ص۱۸۱ باب الوکالة بالخصومة والقبض)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۰۱ کتاب الدعوی، الفصل الخامس۔

علی الوکالۃ بالنکاح ۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۳۵۲ کتاب النکاح، باب الاولیاء الخ)[1]

مروجہ وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنا

سوال:۔ موجودہ دور میں وکلاء ملکی قوانین کی رو سے مدعی اور مدعیٰ علیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے طرفین سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں، تو کیا وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ موجودہ ملکی قوانین میں سے جو قوانین شریعتِ اسلامیہ سے متصادم ہوں تو ان کے مطابق مقدمات کی پیروی کرنا اور فیصلہ کرنا اور ان پر معاوضات لینا تمام کے تمام غیر اسلامی ہیں، شریعتِ مقدسہ میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تاہم ان کے ذریعے سے اپنے جائز حقوق لینا اور ظالم کے ظلم سے نجات حاصل کرنا مرخص ہے اور جو قوانین شریعت سے متصادم نہ ہوں تو ان کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس پر وکیل کا معاوضات لینا مرخص ہے اور جوازِ اُجرت توکیل کے لیے یہ تاویل کافی ہے کہ واقعی وکیل جو اُجرت لیتا ہے وہ ایک خاص وقت اور خاص دن میں محبوس رہنے کی اُجرت لیتا ہے جو کہ فقہاء کرام نے جائز قرار دیا ہے۔

الحاصل یہ کہ پیشۂ وکالت فی نفسہٖ جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ وکیل جائز مقدمات کی پیروی کرتا ہو۔

لما قال الدکتور الشیخ وھبۃ الزحیلی : تصح الوکالۃ باجرٍ وبغیر اجرٍ لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یبعث عمالہ لقبض الصدقات ویجعل لہم عمولۃ فاذا تمت الوکالۃ باجرٍ لزم العقد یکون للوکیل حکم الاجیرای انہٗ یلزم الوکیل بتنفیذ العمل ولیس لہ التخلی عنہ بدون عذرٍ یبیح لہٗ ذٰلک واذا لم یذکر الاجر صراحۃً حکم العرف فان کانت ماجورۃً عادۃً کتوکیل المحامین وسماسرۃ البیع والشراء لزم اجر المثل ویدفعہٗ احد العاقدین بحسب العرف وان کانت غیر ماجورۃ عرفاً کانت

---

[1] وفی الھندیۃ : یصح التوکیل بالنکاح وان لم یحضرہ الشھود کذا فی التاتارخانیۃ ناقلاً عن خواھر زادہ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۹۴ الباب السادس فی الوکالۃ بالنکاح وغیرھا) ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص۱۳۷ کتاب النکاح، فصل فی بعض مسائل الوکیل والفضولی الخ

مجاناً او تبرعاً عملاً بالاصل فی الوکالات وھو ان تکون بغیر اجرٍ علی سبیل التعاون فی الخیر وھذا النوع لایلزم فیہ المضی فی العمل بل للوکیل التخلی عنہ فی ای وقت وھذا مذھب الحنفیۃ والمالکیۃ والحنابلۃ۔

وقال الشافعیۃ الوکالۃ ولو بجعل جائزۃ ای غیر لازمۃ من الجانبین۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۴ ص۱۵۱ تعریف الوکالۃ ومشروعیتھا)

وکیل کا دوسرے کو وکیل بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنا مال لاہور منڈی میں فروخت کرنے کے لیے کسی کو وکیل بنایا اور اس نے اپنی طرف سے ایک دوسرے شخص کو وکیل بنا کر مال فروخت کرنے کے لیے لاہور روانہ کر دیا، تو کیا وکیل اوّل کا دوسرے شخص کو وکیل بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مؤکل نے اس کو عمومی وکیل مقرر کیا ہو کہ میرا مال فروخت کرو چاہے تم خود جاؤ یا کسی اور کو بھیجو، تو اس صورت میں وکالتِ عمومی کی وجہ سے وکیل اوّل کا دوسرے کو وکیل بنانا درست ہے، اور اگر مؤکل کی طرف سے عمومی وکالت نہ ہو تو پھر وکیلِ اوّل کا یہ اقدام صحیح نہیں۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: فان کانت عامۃ یملک ان یؤکل غیرہ بالقبض لان الاصل فیما یخرج مخرج العموم اجراؤہٗ علی عمومہ وان کانت خاصۃ فلیس لہٗ ان یؤکل غیرہ بالقبض لان الوکیل یتصرف بتفویض الموکل فیملک قدر ما فوض الیہ۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۵ فصل فی حکم التوکیل) [۱]

---

[۱] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ان کانت الوکالۃ خاصۃ او مقیدۃ بان یعمل الوکیل بنفسہ لم یجز لہٗ توکیل غیرہ فیما وکل فیہ۔ وان کانت الوکالۃ مطلقۃ او عامۃ بان قال لہٗ اصنع ما شئت جاز لہٗ توکیل الغیر ویکون ھذا الغیر وکیلاً مع الاوّل عن الموکل۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۴ ص۱۶۰ ھل للوکیل توکیل غیرہ)

گارنٹی سے کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کا حکم

سوال:۔ایک شخص مثلاً زید عمارتی سازوسامان (ہارڈ ویئر) کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتا ہے اور بعض کمپنیاں اپنا مال اس پر گارنٹی سے فروخت کرتی ہیں مثلاً پانی کی ٹینکیاں، ٹونٹیاں، پانی کے پائپ، بیلچے، کدال وغیرہ۔ان میں سے بعض اشیاء کی گارنٹی پانچ سال، بعض کی دس سال اور بعض کی گارنٹی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔جب زید کسی پر مذکورہ چیزیں بیچتا ہے تو اسی گارنٹی سے بیچتا ہے، گارنٹی کی مدت میں اگر فروخت کردہ چیز خراب ہوجائے تو مشتری وہ چیز زید کو واپس کردیتا ہے اور زید وہ چیز کمپنی کو بھیج دیتا ہے اور کمپنی والے اس کے عوض میں یا تو نئی چیز دیدیتے ہیں یا اس کو ہی بالکل درست کردیتے۔اس طرح کرنے سے عام لوگ گارنٹی شدہ چیزیں خریدنے میں زیادہ رغبت ظاہر کرتے ہیں۔اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کی بیع ازروئے شرع درست ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہم نے ایک مولوی صاحب سے سنا ہے کہ یہ بیع مشروط ہونے کی بناء پر فاسد ہے۔لہٰذا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تفصیلاً وضاحت فرمائی جائے۔

الجواب:۔ دورِ حاضر میں بعض کمپنیاں اپنی مصنوعات کی خریداری پر گاہک کو سال دو سال یا لائف ٹائم کی گارنٹی دیتی ہیں، یہ گارنٹی صورت کے لحاظ سے کفالۃ بدرک ہے۔(درک کے معنیٰ حصول صاحب یعنی پانے کے ہیں۔یعنی اگر مشتری مبیعہ میں کوئی عیب پائے تو بائع اس کا کفیل ہوگا۔(مصباح اللغات ص۲۳۶)۔ جبکہ کفالہ بدرک بالاجماع صحیح ہے۔اسی طرح خود کفالہ میں بھی فقہاء کے ہاں توسع پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ کفالہ بلکہ اکثر معاملات کا تعلق عرف کے ساتھ ہے۔آجکل کوئی چیز فروخت کرتے وقت گارنٹی دینا کاروبار کا ایک اہم جزء بن گیا ہے، چونکہ آجکل دو نمبر (نقلی) چیزیں عام تیار ہوتی ہیں جس کی وجہ سے گارنٹی دینا اور لینا ناگزیر ہوگیا ہے، اور ویسے بھی عام طور پر عالمی اور ملکی منڈیوں میں ایک رواج سا بن گیا ہے کہ لوگ گارنٹی والی چیز بلاکسی حیل وحجت کے خرید لیتے ہیں، لہٰذا آجکل گارنٹی پر خرید وفروخت کرنا عرف اور عموم بلویٰ کی وجہ سے جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

کما فی البدائع الصنائع: ولان الکفالۃ جوازھا بالعرف۔ (جلد ۶ ص۳)
وکما فی الھدایۃ: واما الکفالۃ بالمال فجائزۃ معلوماً کالمکفول بہ الی ان قال اَوْ بما یدرکک فی ھذا البیع لان مبنی الکفالۃ علی التوسع فیتحمل فیھا الجھالۃ وعلی الکفالۃ بدرک اجماع۔ (جلد۳ ص۱۱۶) وکما فی العنایۃ: تکفلت عنہ بمالک

علیہ او بما یدرکک فی ھذا البیع یعنی من الضمان بعد ان کان دینًا صحیحًا لان مبنی الکفالۃ علی التوسع فانہا تبرع ــ وبعد اسطر: وعلی الکفالۃ بدرک بفتح الراء وسکونہا وھو التبعۃ دلیل علی جوازھا بالمجھول لا یصح۔ وفیہ اشارۃ الی نفی قول من یقول ان الضمان بالمجھول لا یصح لانہ التزام مال فلا یصح مجھولاً کالثمن فی البیع وقلنا الضمان بدرک صحیح بالاجماع وھو ضمان بالمجھول الخ (العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج ۶ ص ۲۹۸،۲۹۹) ــ وکما فی فتاوی قاضیخان: رجل باع دارًا وکفل رجل المشتری بما ادرکہ فیہا من درک فاخذ المشتری بذلک عنہ رھنًا ذکر فی الاصل اَنَّ الرّھن باطل ولا ضمان علی المرتھن والکفالۃ جائزۃ۔ (فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص ۶۴)

وکیل کا منصب وکالت کے خلاف کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہم نے ایک آدمی کو اپنی طرف سے گاڑی خریدنے کا وکیل بنایا تھا کہ ہمارے لیے گاڑی خرید لو، اس نے کسی اور سے ہمارے لیے گاڑی خریدنے کی بجائے اپنی ہی گاڑی ہم پر بیچ دی۔ تو کیا یہ وکیل اپنی چیز ہمارے اوپر فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمارے علم میں بھی نہ ہو اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے اپنی گاڑی آپ کو دی ہے اور ہم اس سے انکاری ہیں؟

الجواب:۔ وکالت ایک ایسا معاملہ ہے جس میں مؤکل اپنے وکیل پر اعتماد کر کے اپنی ذمہ داری اس کو سونپتا ہے، اس لیے وکیل کا اس معاملہ میں ایسا قدم اٹھانا جو منصب وکالت کے خلاف ہو اور اس میں دھوکہ دہی کا شبہ ہو جائز نہیں، لہٰذا اس میں جو معاملہ سامنے آجائے وہ منعقد نہیں ہوگا۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی دھوکہ دہی اور غرر کا عنصر موجود ہے اس لیے یہ معاملہ کالعدم ہے۔

لما فی الدر المختار: حیث لم یکن مخالفاً دفعاً للغرر۔ قال ابن عابدینؒ: تحت قولہ دفعاً للغرر...... وفیہ الوکیل بالبیع لا یملک شراءہ لنفسہ لان الواحد لا یکون مشتریًا وبائعًا فیبیعہ من غیرہ ثم اشتریہ منہ۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۴۵۰ کتاب الوکالۃ)

تاہم اگر مؤکل کی طرف سے کُلی اجازت ہو تو پھر ایسا کرنا جائز ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وان امرالمؤکل اَنہٗ یبیعہ من نفسہ او اولادہ الصغار او ممن لا تقبل شہادتہ فباع منہ جاز۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۴۵۰ کتاب الوکالۃ)

کتاب الحوالۃ

(حوالہ کے مسائل واحکام)

محیل کو قرض کی ادائیگی کے لیے دی ہوئی مہلت کا محتال علیہ میں اعتبار

سوال:۔ ایک شخص پر قرض کی ادائیگی کے لیے قرض دہندہ کی طرف سے ایک سال کی مہلت دی گئی تھی، قرض خواہ نے وہ رقم ایک دوسرے شخص کے حوالہ کی، لیکن اب دائن محتال علیہ (دوسرے شخص) سے فوری ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے، کیا اس کو یہ اختیار حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو مہلت اور وقت مدیون (قرض خواہ) کو قرض کی ادائیگی کے لیے دی گئی تھی اسی مہلت کا اعتبار ہوگا لہٰذا دائن (قرض دہندہ) کا قبل از وقت قرض کی ادائیگی کا محتال علیہ سے مطالبہ کرنا بلا جواز اور بے جا ہے۔

لما قال العلامة کمال الدین محمد بن عبد الواحدؒ: والمطلقة المؤجلة لہ علی رجلٍ الف الی سنةٍ فأحال الطالب علیہ الی سنةٍ کانت علیہ الی سنةٍ ولو حصلت الحوالة مبهمة لم یذکرہ محمد رحمہ الله وقالوا ینبغی ان تثبت مؤجلة کما فی الکفالة لانہ تحمل ما علی الاصیل بای صفة کان۔ (فتح القدیر ج ٦ ص ٣٥٥ کتاب الحوالة) [لہ]

حوالہ میں دائن کی رضامندی ضروری ہے

سوال:۔ کیا کسی دوسرے شخص کو قرض کی ادائیگی کے لیے حوالہ کرنے

[لہ] وقال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الفتح تنقسم الحوالة المطلقة الی حالة ومؤجلة فالحالة ان یحیل المطالب بالف هی علی المحیل حالة فتکون علی المحتال علیہ حالة لان الحوالة تحویل الدَّین فیتحول بصفة التی علی الاصیل والمؤجلة ان تکون الف الی سنة ولو ابهمها ما یذکر محمد وقالوا ینبغی ان تثبت مؤجلة کما فی الکفالة۔

(رد المحتار ج ٥ ص ٣٤٩ کتاب الحوالة)

ومثلہ فی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج ٦ ص ٢٤٨ کتاب الحوالة۔

میں دائن کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ قرض کی وصولی میں تمام لوگ یکساں نہیں ہوتے اس لیے مدیون کا دائن کو کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کرنے میں یہ ضروری ہے کہ اس کی رائے شامل ہو ایسا نہ ہو کہ کسی ایسے آدمی کو حوالہ کرے جس سے وصولی پر دائن قدرت نہیں رکھتا ہو جو اس کی رقم ضائع ہونے کے مترادف ہے ۔

لما قال العلامة المرغيناني: وتصح الحوالة برضاء المحيل والمحتال والمحتال عليه - (الهداية ج۳ ص۱۲۹ كتاب الحوالة) لـه

حوالہ کرنے کے بعد مدیون سے قرض کے مطالبہ کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنے قرض کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص پر ڈال دے، کچھ مدت تک تو وہ دائن کے مطالبہ سے بے فکر رہا لیکن جب اس کو احساس ہوا کہ متعلقہ شخص بھی ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے تو کیا دائن مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب دین کی ادائیگی کی ذمہ داری دائن کی رضامندی سے کسی دوسرے شخص پر ڈال دی جائے اور اس شخص نے یہ ذمہ داری قبول بھی کر لی ہو تو اب دائن مدیون سے قرض کے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا بلکہ محتال علیہ سے (جس نے ذمہ داری قبول کر لی ہے) قرض کا مطالبہ کرے گا اور مدیون بری الذمہ متصور ہو گا۔

لما قال العلامة المرغيناني: واذا تمت الحوالة برئ المحيل من الدّين بالقبول وقال زفرؒ لا يبرأ اعتبارًا بالكفالة اذ كل واحد منهما عقد توثق وقال ولا يرجع المحتال على المحيل الا ان يتوى حقه. (الهداية ج۳ ص۱۲۹ كتاب الحوالة) ـ۲ه

ـله وقال العلامة التمرتاشيؒ: وشرط لصحتها رضاء الكل بلا خلاف الا في الاول ـ (تنوير الابصار على هامش ردالمحتار ج۵ ص۳۴۱ كتاب الحوالة) ـــ ومِثْلُهٗ في تبيين الحقائق ج۴ ص۱۷۱ كتاب الحوالة ـ

ـ۲ه قال العلامة الزيلعيؒ: وبرئ المحيل بالقبول من الدّين وقال زفرؒ لا يبرأ لان المقصود بها التوثيق وقال ثم اختلفوا في البراءة فقال ابو يوسفؒ يبرأ عن المطالبة والدّين وقال محمدؒ يبرأ عن المطالبة لا عن الدّين ـ (تبيين الحقائق ج۴ ص۱۷۱ كتاب الحوالة)

ومِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج۶ ص۱۷ كتاب الحوالة ـ

مجہول چیز کی ذمہ داری لینا

سوال :۔ ایک شخص کسی دوکاندار سے قرض پر سودا خریدتا ہے لیکن دوکاندار کو اس پر اعتماد نہیں ہے ایک دوسرا شخص دوکاندار کو اعتماد دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس شخص کو قرض پر سودا دیدیا کرو، اس کی جتنی رقم ہوگی اُس کی ادائیگی کا میں ذمہ دار ہوں گا، تو کیا ایک مجہول چیز کی ذمہ داری اٹھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ کسی شخص کی طرف سے مال کی ذمہ داری لینا "کفالہ" ہے جس میں بنیادی محرک اور عمل ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے ایسے امور میں معمولی جہل قابلِ برداشت ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں دوسرے شخص کا پہلے کی ذمہ داری قبول کرنا درست ہے۔

لماقال العلامة المرغيناني ؒ: اما الكفالة بالمال فجائزة معلوماً كان المكفول به مجهولاً اذا كان دَيْناً صحيحاً مثل ان يقول تكفلت عنه بألف اوبمالك عليه اوبما يدركك في هذا البيع لان مبنى الكفالة على التوسع فيتحمل فيه الجهالة وعلى الكفالة بالدرك اجماعٌ وكفى به حُجّةً ۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۱۷ كتاب الكفالة) [1]

کفیل اور مکفول عنہ کے مابین ثمن میں اختلاف

سوال :۔ ایک شخص نے اپنے قرض دہندہ کو قرض کی ادائیگی کے لیے جو شخص کفیل مقرر کیا تھا اس کا مالک سے اس بات پر جھگڑا پیدا ہوا کہ مالک اُس سے دس ہزار روپے مانگتا ہے جبکہ کفیل پانچ ہزار روپے کی ادائیگی پر مقر ہے، کیا ایسی حالت میں مدیون کے دس ہزار روپے کے اقرار کرنے سے کفیل سے زیادہ رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ مدیون پر دس ہزار روپے کی رقم اگر شواہد سے ثابت ہو جائے اور کفیل نے تمام تر رقم کی ذمہ داری قبول ہو تو تمام رقم کی ادائیگی کفیل پر لازم ہوگی،

---

[1] وقال العلامة الكاساني ؒ: وكون المكفول به معلوم الذات في انواع الكفالات اومعلوم القدر في الدين ليس بشرط حتى لو كفل باحد شيئين غير عين بان كفل بنفس رجل اوبما عليه وهوالف جاز وعليه احدهما ايهما شاء لان هذه جهالة مقدور الدفع بالبيان فلا تمنع جواز الكفالة۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۹ كتاب الكفالة)

ومِثْلُهٗ في البحر الرائق ج ۶ ص ۲۰۶ كتاب الكفالة ۔

اور اگر گواہ نہ ہوں تو کفیل کے قول کو اعتبار دیا جائے گا، تاہم مکفول عنہ کا دعویٰ کفیل پر لازم نہیں بلکہ خود اس سے حسب اقرار رقم وصول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: فان قال تكفلت بما لك عليه فقامت البينة بالف عليه ضمنه الكفيل لان الثابت بالبينة كالثابت معاينة فيتحقق ما عليه فيصح الضمان به وان لم تقم البينة فالقول قول الكفيل مع يمينه في مقدار ما يعترف به لانه منكر للزيادة فان اعترف المكفول عنه باكثر من ذلك لم يصدق على كفيله لانه اقرار على الغير ولا ولاية له عليه ويصدق في حق نفسه لولايته عليها۔

(الهداية ج ۳ ص۱۱۸ كتاب الكفالة) له

محتال علیہ کی رضامندی کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا بھائی کچھ مقروض ہے اور اس نے قرض کی ادائیگی بغیر میری رضامندی کے میرے حوالے کر دی ہے، تو کیا دائن مجھ سے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حوالہ میں چونکہ محتال علیہ کی رضا ضروری ہے اس لیے بدون رضا اس پر قرض کے لیے رجوع کرنا درست نہیں لہٰذا یہ حوالہ صحیح نہیں اور دائن کا آپ سے قرض کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: شرط لصحتها رضا الكل بلا خلاف۔ قال ابن عابدين رحمه الله: قوله رضا الكل واما رضا الثالث وهو المحتال عليه فلانها الزام الدين ولا لزوم بلا التزام۔ (رد المحتار ج ۴ ص۳۲۲ كتاب الحوالة)

له وقال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: فان كفل بماله عليه فبرهن على الف لزمه لان الثابت بالبينة كالثابت عيانا ولا يكون قول الطالب حجة عليه كما لا يكون حجة على الاصيل لانه مدع ۔ ولا صدق الكفيل فيما اقر بحلفه ولا ينفذ قول المطلوب على الكفيل اى وان لم يبرهن فالقول للكفيل فيما يقر به مع يمينه على نفي العلم لا على البينات كما في الايضاح ولا يكون قول المطلوب حجة عليه لانه اقرار على الغير۔ (البحر الرائق ج ۶ ص۲۲۳ كتاب الكفالة)

وَمِثْلُهٗ في فتح القدير ج ۶ ص۳۰۳ كتاب الكفالة۔

كتاب الهبة

تهادوا تحابوا

کتاب الہبۃ

(ہبہ کے مسائل واحکام)

ہبہ میں عرف کا اعتبار ہے

سوال :- عمرو کے تین بیٹے ہیں اور تینوں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور تینوں مختلف شہروں میں ملازمت کے سلسلہ میں رہائش پذیر ہیں اور اپنی تنخواہوں میں سے ہر ماہ ایک مخصوص رقم اپنے والد کے نام بھیجدیتے ہیں اور والد اس رقم کو گھر کے مشترکہ کھانہ میں خرچ کرتے ہیں، تو بیٹوں کی یہ کمائی باپ (عمرو) کی ملکیت ہے یا کہ اس کے بیٹوں کی ملکیت تصوّر کی جائے گی ؟

الجواب :- اگر بیٹوں نے اپنی رقومات کے متعلق ہبہ وغیرہ کی تعیین نہ کی ہو تو قواعد کی رُو سے المعروف کالمشروط کے تحت چونکہ عموماً اسی طرح بیٹے والدین کو بطورِ ہبہ رقم دیا کرتے ہیں اس لیے یہ رقم والد کی ملکیت متصوّر ہوگی۔

قال العلامۃ خیرالدین الرملیؒ : سئل فیما یرسلہ الشخص الیٰ غیرہ فی الاعراس ونحوھا ھل یکون حکمہ حکم القرض فیلزم الوفاء بہ ام لا (اجاب) ان کان العرف قاضیًا بانھم ید فعونہ علیٰ وجہ البدل یلزم الوفاء بہ ان مثلیا فبمثلہ وان قیمیا فبقیمتہ وان کان العرف بخلاف ذٰلک بان کانو ید فعونہ علیٰ وجہ الھبۃ ولا ینظرون فی ذٰلک الیٰ اعطاء البدل فحکمہ حکم الھبۃ فی سائر احکامہ فلا رجوع فیہ بعد الھلاک والاستھلاک والاصل فیہ ان المعروف عرفًا کالمشروط شرطاً۔ واللہ اعلم (فتاویٰ خیریۃ علیٰ ہامش الفتاویٰ الحامدیۃ ج۲ ص۱۷۳ مطلب وھب ابنہ وابن ابنہ مودودًا) [1]

[1] قال العلامۃ محمد خالد الاتاسیؒ : وفی الفتاویٰ الخیریۃ مانصہ سئل فیما یرسلہ الشخص الیٰ غیرہ فی الاعراس ونحوھا ھل یکون حکمہ حکم القرض فیلزم الوفاء بہ ام لا اجاب ان کان العرف بانھم یدفعونہ علیٰ وجہ البدل یلزم الوفاء بہ ان مثلیا فبمثلہ ان قیمیا فبقیمتہ وان کان العرف بخلاف ذٰلک بان کانوا یدفعونہ علیٰ وجہ الھبۃ ولا ینظرون فی ذٰلک الیٰ اعطاء البدل فحکمہ حکم الھبۃ فی سائر احکامہ فلا رجوع فیہ بعد الھلاک والاستھلاک والاصل فیہ ان المعروف عرفًا کالمشروط شرطاً۔ (شرح مجلۃ الاحکام ج۳ ص۳۴۰ الباب الثالث فی بیان احکام الھبۃ)

ومِثلُہٗ فی فتاویٰ کاملیۃ ص۱۸۱ کتاب الھبۃ۔

تملیک بھی ہبہ کے مترادف ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص ہبہ کرتے وقت تملیک کا لفظ استعمال کرے تو کیا اس صورت میں ہبہ اور تملیک الگ الگ ہیں یا دونوں ایک ہیں ؟

الجواب:۔ لغت کے اعتبار سے تملیک عام ہے اور ہبہ خاص ہے لیکن موجودہ عرف میں تملیک اور ہبہ دونوں ایک دوسرے کے مترادف استعمال ہوتے ہیں اسلئے صرف لفظِ تملیک سے بھی ہبہ ہی متصور ہو گا۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: هي تمليك العين مجاناً اى بلا عوض۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار جلد ۵ ص۶۸۷ كتاب الهبة) [1]

ناقابلِ تقسیم اشیاء کے ہبہ کا حکم

جو اشیاء ناقابلِ تقسیم ہوں ان کا ہبہ کرنا کیسا ہے ؟ مثلاً ایک شخص نے اپنے جانور کو اس طرح ہبہ کیا کہ ایک حصہ اپنے لیے رکھا، تین حصے بیوی کو ہبہ کیے اور تین حصے بھائی کو ہبہ کئے، کیا اس شخص کا یہ ہبہ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اشیاء کی دو قسمیں ہیں ۱۔ ناقابلِ تقسیم ۲۔ قابلِ تقسیم ۔ اس لیے جو اشیاء قابلِ تقسیم ہیں ان کا ہبہ کرنا قبل التقسیم صحیح نہیں، البتہ جن اشیاء کی تقسیم ممکن نہ ہو ان کا ہبہ کرنا شرعاً جائز ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا ہبہ صحیح ہے۔

قال العلامه خوارزمیؒ: هبة المشاع فيما لا يقسم جائزة يعنى بما لا يحتمل القسمة اى لا يبقى منتفعاً بعد القسمة اصلاً كعبد واحد او دابة واحدة۔

(الكفاية فى ذيل فتح القدير ج ۷ ص۴۸۸ كتاب الهبة) [2]

---

[1] قال العلامة محمد اتاسیؒ: الهبة تمليك مال لآخر بلا عوض۔
(مجلة الاحكام مادة ۸۳۳ ص۴۶۲ الكتاب السابع فى الهبة)
وَمِثْلُهٗ فى كنز الدقائق ص۳۵۲ كتاب الهبة۔

[2] قال العلامة قاضى خانؒ: وفيما لا يقسم كالعبد والدابة والثوب والحمام يجوز هبة المشاع من الشريك وغيره فى قولهم۔ (الفتاوىٰ قاضيخان على هامش الهندية ج ۳ ص۲۶۷ كتاب الهبة فصل فى هبة المشاع)
وَمِثْلُهٗ فى الهداية ج ۳ ص۲۸۵ كتاب الهبة۔

قابلِ تقسیم اشیاء میں قبل از تقسیم ہبہ درست نہیں

سوال:۔ زید کے آٹھ بیٹے، تین بیٹیاں اور دو بیویاں ہیں، اس نے اپنی زندگی ہی میں بیویوں اور بیٹیوں کو کچھ دیئے بغیر اپنی کل جائیداد کا ۲/۳ حصہ پانچ بیٹوں کو اور ۱/۳ حصہ باقی لڑکوں کو ہبہ کردی جو کہ الگ الگ ماؤں کی اولاد ہیں، کیا اس کے ۱/۳ حصہ والے تین بیٹے دوبارہ بطریقِ شرعی میراث کی تقسیم کا حق رکھتے ہیں؟

الجواب:۔ چونکہ کسی شخص کا اپنی زندگی میں اپنی اولاد پر مال تقسیم کرنا ہبہ ہوتا ہے اور تمام فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ قابلِ تقسیم اشیاء میں قبل از تقسیم ہبہ درست نہیں، پس صورتِ مسئولہ میں اگر زید تے سب بیٹوں کا حصہ جدا کیا ہو اور قبضہ بھی دے دیا ہو تو یہ ہبہ درست اور نافذ ہے ورنہ مشترکہ جائیداد کا ۲/۳ حصہ پانچ بیٹوں کو اور ۱/۳ حصہ تین بیٹوں کو ہبہ کرنا درست نہیں لہٰذا زید کے مرنے کے بعد جملہ جائیداد دوبارہ تمام ورثاء پر تقسیم کی جائے گی جس میں بیٹیاں، بیٹے اور دونوں بیویاں بھی شریک ہوں گی۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله : وفي الاصل ومن شرائطها الهبة الافراز حتى لا يجوز هبة المشاع فيما يحتمل القسمة كالبيت والدار والارض ونحوها وان كان لا يحتمل القسمة يجوز كالبئر والحمام والرحى - (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۹۰ كتاب الهبة - الفصل الثالث فيما يكون خطياء وفيما لا يكون)[1]

اجارہ پر دی ہوئی زمین کا ہبہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی ایسی زمین بیٹے یا بیٹی کو ہبہ کی جس پر مدتوں سے مزارع (کاشتکار) خیمہ زن ہیں اور کاشتکار سے کیے ہوئے معاہدہ میں بھی ابھی کافی وقت باقی ہے، کیا ایسی صورت میں مَوْہُوب لَہٗ مزارع کو زمین سے بیدخل کرسکتا ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : وذكر قبله هبة المشاع فيما يقسم لا تفيد الملك عند ابي حنيفة وفي القهستاني لا تفيد الملك وهو المختار كما في المضمرات - (رد المحتار ج۵ ص۶۹۲ كتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۲۳ كتاب الهبة -

الجواب: کسی بالغ یا نابالغ بچے کو جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ ہبہ کرنا صحیح اور درست ہے اور ہبہ سے ان کی ملکیت میں بھی داخل ہوجائے گی، مگر اجارہ پر دی ہوئی زمین کے ساتھ مزارع (کاشتکار) کا حق متعلق ہونے کی وجہ سے زمین ناقابلِ تملیک ہوتی ہے جو کہ ہبہ کی صحت کے لیے بنیادی شرط ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس زمین کا ہبہ شرائط کے فقدان کی وجہ سے صحیح نہیں لہٰذا عدمِ صحت کی بناء پر موہوب لہٗ کاشتکار کو بیدخل نہیں کرسکتا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمه الله: سئلت عن رجل وهب لابنه الصغیر دارًا وفیها ساکن باجر هل تجوز هٰذه الهبة فالجواب انها لا تجوز قال فی الهندیة رجل وهب دارًا لابنه الصغیر وفیها ساکن باجر قال یعنی محمّد لاتجوز۔ (فتاوٰی کاملیة ص١٨١ کتاب الهبة) [1]

موہوبہ جائیداد کا سرکاری کاغذات میں انتقال کا حکم

سوال: زید نے اپنی ملکیتی دس کنال زمین بکر کو ہبہ کردی لیکن سرکاری کاغذات میں ابھی تک انتقال نہیں ہوا ہے، تو کیا بکر کو موہوبہ زمین کا مالک سمجھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: ہبہ کی صحت کے لیے تین امور کا ہونا ضروری ہے (١) ایجاب (٢) قبول (٣) قبض۔ لہٰذا اگر باقاعدہ طور پر ان تین امور کا لحاظ رکھتے ہوئے ہبہ ہوچکا ہو تو بلاشک وشبہ وہ زمین کا مالک ہے، سرکاری کاغذات میں انتقال ہونے یا نہ ہونے سے شرعاً ہبہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: تنعقد الهبة بالایجاب والقبول وتتم بالقبض۔
(مجلة الاحکام مادة ٨٣٧ ص٤٧٢ الفصل الاوّل فی بیان المسائل المتعلقة برکن الهبة وقبضها) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی المنتقی عند محمدؒ رجل وهب دارًا لابنه الصغیر وفیها ساکن باجر قال لا یجوز ولو کان بغیر اجر او کان فیها یعنی الواهب فالهبة جائزة کذا فی التتارخانیة۔
(منحة الخالق علی البحر الرائق ج ٧ ص٢٨٨ کتاب الهبة)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ٦ ص٢٣٨۔

[2] قال الامام قدوریؒ: الهبة تصح بالایجاب والقبول وتتم بالقبض۔ (مختصر القدوری ص١٤٣ کتاب الهبة)
وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص٣٥٢ کتاب الهبة۔

ہبۂ عمریٰ ناقابل رجوع ہے

سوال: تین بھائیوں نے بوقتِ تقسیم جائیداد اپنے حصہ سے اپنی والدہ کو ضروریات پوری کرنے کیلئے دو کنال زمین دی تھی، والدہ نے مذکورہ دو کنال زمین اپنے نواسے خالد کو ہبہ کر دی، اب والدہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے زمینِ مذکورہ خالد سے واپس لینا چاہتے ہیں، تو کیا ان کو ایسا کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ معاملہ ہبۂ عمریٰ کا ہے، معمرلہٗ (والدہ) مذکورہ دو کنال زمین کی خود مختار مالکہ بن گئی ہے لہٰذا نواسے کو اُن کا ہبہ کرنا جائز ہے اور بیٹوں کا رجوع کرنا مردود ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: (و اعمرتك هذا الشئ) لان العمریٰ تملیك للحال فتثبت الهبة ویبطل ما اقتضاه من شرط الرجوع وكذلك لو شرط الرجوع صریحًا یبطل شرطه ایضًا۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸۵ کتاب الهبة)[1]

موت اور عوض کی وجہ سے حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے

سوال: زید نے بکر کو اپنی زمین عوضاً ہبہ کر دی، بعد میں اس کی وفات ہو گئی، اب تیس سال بعد زید کے ورثاء بکر سے اس زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا ان کو شرعاً رجوع کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: عوض لینے یا متعاقدین میں سے کسی ایک کی موت کی وجہ سے حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے لہٰذا صورتِ مرقومہ میں زید کے ورثاء کو زمین واپس لینے کا حق نہیں پہنچتا بلکہ زمین بکر کی ملکیت رہے گی۔

قال العلامة ابو البركات النسفی رحمه الله: صح الرجوع فیها ومنع الرجوع دمع خزقه فالدال الزیادة المتصلة كالغرس والبناء والسمن

---

[1] قال العلامة ابو بكر ابن حداد الیمنی رحمه الله: والعمریٰ جائزة للمعمر فی حال حیاته ولورثته من بعد موته ومعناه ان یجعل داره له عمره واذا مات یردها علیه فیصح التملیك ویبطل الشرط والهبة لاتبطل بالشروط الفاسدة۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۱۸ کتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۲۸۴ کتاب الهبة۔

والميم موت احد المتعاقدين والعين العوض ۔

(کنز الدقائق ص۳۵۴ کتاب الهبة) [1]

متعدد آدمیوں کا کسی ایک شخص کو کوئی چیز ہبہ کرنا

سوال :۔ جاوید اور خالد کا ایک مشترکہ گھر ہے، دونوں بخوشی رضا عامر کے نام ہبہ کرنا چاہتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ مشترکہ جائیداد میں بوجہ اشتراک کسی ایک شریک کا اپنا حصہ بغیر تقسیم کے کسی کو ہبہ کرنا صحیح نہیں لیکن جب شیوع کی یہ صورت درمیان سے نکل جائے تو پھر مشترکہ جائیداد کو اتفاق رائے سے ہبہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ہبہ کرنا درست اور صحیح ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله :(وهب اثنان دارا لواحد صح) لعدم الشيوع ۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۵ ص۶۹۷ كتاب الهبة) [2]

ہبہ کے لیے ایجاب وقبول پر تلفظ ضروری نہیں بلکہ قرائن ہی کافی ہے

سوال :۔ زید کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سے تین بیٹوں عمر، بکر اور خالد کو حینِ حیات میں شادیاں کرا کے ہر ایک کو رہائش کے لیے الگ الگ گھر دے دیئے، زید کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ کسی کو دے دیتا ہے تو واپس نہیں لیتا ہے، زید کے مذکورہ تینوں بیٹوں کے پاس اُس کے کچھ زیورات بھی ہیں، جب عمر نے اپنے والد (زید) کو وہ زیور واپس کرنا چاہا تو اس نے یہ کہہ کر زیور عمر کو واپس کر دیا کہ یہ

---

[1] قال الامام القدوری رحمه الله : واذا وهب لاجنبي هبة فله الرجوع فيها الا ان يعوضه عنها او يزيد زيادة متصلة او يموت احد المتعاقدين ۔

(مختصر القدوری ص۱۴۴ کتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۶۹۹ کتاب الهبة ۔

[2] قال العلامة المرغيناني : واذا وهب اثنان من واحد دارًا جاز لانهما سلماها جملة وهو قد قبضها جملة فلا شيوع وان وهبا واحد من اثنين لا يجوز عند ابي حنيفة ۔ (الهداية ج۳ ص۲۸۸ کتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۴ کتاب الهبة ۔

زیور آپ کا ہی ہے اور جو زیور دوسرے بھائیوں کے پاس ہے وہ اُن کا ہے۔ اندریں صورت شرعی نقطہ نگاہ سے مذکورہ مکانات اور زیور وغیرہ پانچوں بھائیوں کے مشترکہ متصور ہوں گے یا صرف عمرو، بکر اور خالد کی ملکیت ہوگی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جبکہ زید نے اپنے تین بیٹوں (عمر، بکر اور خالد) کو علیحدہ علیحدہ مکانات دیدیئے ہیں تو اگرچہ زید نے صراحتاً ہبہ کا لفظ نہیں کہا ہے لیکن ظاہر قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ ہبہ ہے اور ہبہ میں تملیک قریبہ کے لیے کافی ہے لہٰذا یہ شرعاً ہبہ ہے اس لیے زید کی وفات کے بعد اس میں بقایا ترکہ کی طرح میراث جاری نہ ہوگی بلکہ یہ ان تینوں بھائیوں کی ملکیت ہوگی اور اپنے والد (زید) کے باقی ترکہ میں پانچوں بھائی برابر کے شریک ہوں گے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ :- قلتُ فقد افاد ان التلفظ بالایجاب والقبول لایشترط بل تکفی) لقرائن الدالۃ علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئاً وقبضہ و لم یتلفظ واحد منہما بشیٔ ۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۶۸۸ کتاب الھبۃ)[۱]

والدین کا اولاد کے مال کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے

سوال:- سلمٰی نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی تمام زمین اپنے دو بھائیوں کو ہبہ کر دی اور اپنی اکلوتی نابالغ لڑکی سکینہ کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، اب جبکہ سکینہ بالغ ہوگئی ہے تو وہ اپنے والد کے ترکہ میں سے اپنے حصۂ شرعی کا مطالبہ کرتی ہے، تو کیا سکینہ کا یہ مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کی ماں اپنے شوہر کی جملہ زمین ہبہ کر چکی ہے؟

الجواب:- ہبہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ موہوبہ چیز واہب کی ذاتی ملکیت ہو اس میں کسی اور کا حصہ نہ ہو، شرعاً کسی دوسرے کا حصہ بغیر اس کی اجازت کے ہبہ کرنے کا کسی کو اختیار

---

[۱] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ :- والاذن نوعان صریح ودلالۃ (الیٰ ان قال) و اما الدلالۃ فھی ان یقبض الموھوب لہٗ العین فی المجلس ولاینھاہ الواجب فیجوز قبضہ استحسانا۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۲۴ کتاب الھبۃ فصل واما الشرائط فانواع بعضھا یرجع الی نفس الرکن)

وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، مادہ ۸۴۲ ص ۴۶۴ کتاب الھبۃ ۔

حاصل نہیں اگرچہ وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو، بنا بریں صورت مسئولہ میں سلمیٰ اپنا حصہ میراث تو بھائیوں کو ہبہ کرسکتی ہے اپنی بیٹی (سکینہ) کا حصہ ہبہ نہیں کرسکتی، اس لیے سکینہ کا مطالبہ جائز اور صحیح ہے۔

قال العلامة قاضی خانؒ: ولا یجوز للاب ان یھب شیئًا من مال ولدہ الصغیر بعوض و غیر عوض لانھا تبرع ابتداءً۔ (فتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۸۰ فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ والعصبۃ للصغیر، کتاب الھبۃ) [1]

شروطِ فاسدہ سے ہبہ فاسد نہیں ہوتا

سوال:۔ بہن نے بھائیوں کو اپنی زمین بایں شرط ہبہ کرکے دیدی کہ اس موہوبہ زمین کے عوض بھائی اُسے کچھ زمین دیں گے، کیا یہ ہبہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عوض مجہول القدر ہے اور شرط فاسد ہے لہٰذا ہبہ درست ہے اور بھائیوں پر عوض میں بہن کو کوئی زمین دینا لازم نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (و) حکمھا انھا لا تبطل بالشروط الفاسدۃ) فھبۃ عبد علی ان یعتقہ تصح و یبطل الشرط۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۵ ص۶۸۸ کتاب الھبۃ) [2]

مشروط ہبہ کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر کو اس شرط پر زمین ہبۃً دیدی کہ وہ تاحیات زید کی خدمت کرے گا، لیکن بکر نے کچھ عرصہ کے بعد زید کی خدمت کرنا چھوڑ دی، تو کیا خدمت نہ کرنے کی وجہ سے زید کو موہوبہ زمین کے واپس

---

[1] قال العلامة ابن البزازؒ: لا یجوز الھبۃ لابنہ الصغیر ایضًا کما لا یجوز للبائع۔ (البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۲۳۸ کتاب الھبۃ الجنس الثالث فی ھبۃ الصغیر) وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار علی الدرالمختار ج۵ ص۶۸۵ کتاب الھبۃ)

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: والھبۃ لا تبطل بالشروط الفاسدۃ فدخل فیہ کل عقد لا یبطل بالشروط الفاسدۃ کالنکاح والخلع والصدقۃ والصلح عن دم العمد والعتق فیصح و یبطل الاستثناء۔ (البحرالرائق ج۷ ص۲۹۶ کتاب الھبۃ۔ فصل ومن وھب امۃ الا حملھا)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۱۷ کتاب الھبۃ۔

لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے نزدیک اگرچہ ہبہ میں رجوع کرنا جائز ہے مگر کراہت سے خالی نہیں لیکن جب ہبہ کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا گیا تو عدم شرط کی صورت میں رجوع کرنا بلاکراہت جائز ہے اگرچہ بالفاظ دیگر ہبہ منعقد ہی نہیں ہوا ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: والدليل على هذا ما ذكر في كتاب الحج اذا تركت المرأة مهرها على الزوج على ان يحج بها وقبل الزوج ذلك ولم يحج بها كان المهر عليه على حاله والفتوى على هذا القول. ^(١)

^(١)	فتاوى قاضی خان علی هامش الهندية ج٣ ص٢٨٢ كتاب الهبة فصل في هبة المرأة مهرها من الزوج ۔

ہبہ سے رجوع کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ کیا واہب موہوب لہ سے ہبہ کی ہوئی چیز کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب:۔ واہب اور موہوب لہ کی رضامندی سے یا حاکم واپسی کا حکم کرے اور دوسرے موانع بھی موجود نہ ہوں تو رجوع جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ورنہ بصورت دیگر رجوع کرنا حرام ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: (صح الرجوع فيها بعد القبض) اما قبله فلم تتم الهبة (مع انتفاع مانعه) الآتي (وان كره) الرجوع

---

^(١) قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: والهبة لا تصح بدون الرضا وعلى هذا لو قال وهبت مهري منك على ان لا تظلمني وعلى ان يحج بي او على ان يهب لي كذا وان لم يكن هذا شرطاً في الهبة لا يعود المهر۔ (خلاصة الفتاوى ج٤ ص٣٩٦ كتاب الهبة ۔ في الجنس الثاني)

ومثله في شرح المجلة للعلامة محمد خالد الاتاسي ج٣ ص٣٦٨ كتاب الهبة الفصل الاول في بيان المسائل المتعلقة بركن الهبة وقبضها۔

(تحریماً) وقیل تنزیہا نہا۔ (رد المحتار ج۵ ص۶۹۸ کتاب الھبۃ۔ باب الرجوع فی الھبۃ) ؎۱

موہوبہ زمین کے فروخت کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! کیا موہوب لہٗ موہوبہ زمین کو فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر باقاعدہ طور پر شرعی ہبہ ہوچکا ہے تو موہوب لہٗ اس کا خود مختار مالک ہے اور اس میں اس کو ہر قسم کے مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: واما اصل الحکم فھو ثبوت الملک للموھوب لہٗ فی الموھوب من غیر عوض۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۱۲۷ فصل واما حکم الھبۃ فالکلام فیہ فی ثلاث مواضع) ؎۲

رشتہ داروں کو ہبہ کرنے سے حق رجوع ساقط ہوجاتا ہے

سوال: والد نے اپنی کل جائیداد اپنے بیٹے کے نام ہبہ کردی ہے، تو کیا اب والد کو شرعاً رجوع کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی رشتہ دار کو اگرچہ ہبہ تملیک بلاعوض ہوچکا ہو تو اس صورت میں بھی رجوع جائز نہیں لہٰذا والد کو اپنی اولاد سے ہبہ واپس لینے کا حق حاصل نہیں۔

؎۱ قال العلامۃ محمد خالد الاتاسیؒ: للواھب ان یرجع عن الھبۃ والھدیۃ بعد القبض برضی الموھوب لہٗ وان لم یرض الموھوب لہ راجع الواھب الحاکم وللحاکم فسخ الھبۃ ان لم یکن ثمۃ مانع من موانع الرجوع۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۸۶۴ ص۴۷۵ الباب الثالث فی احکام الھبۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۷۵ فصل فی الرجوع فی الھبۃ۔

؎۲ قال العلامہ ابن عابدینؒ رحمہ اللہ: (ھی تملیک العین مجاناً) ای بلاعوض۔ (ردّ المحتار ج۵ ص۶۸۷ کتاب الھبۃ)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۲ کتاب الھبۃ۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: وان وھب ھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع فیھا لقولہ علیہ السلام اذا کانت الھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع فیھا رواہ البیہقی (الہدایۃ ج ۳ ص۲۸۷ کتاب الھبۃ۔ باب ما یصلح رجوعہ وما لا یصلح) [1]

اولاد کے ہبہ میں تفاضل کا حکم

سوال: کسی شخص کا اپنی اولاد کو ہبہ دینے میں کمی بیشی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں بحالتِ صحت و ہوش و حواس اپنی تمام جائیداد بعض اولاد کو ہبہ کر دی اور بعض کو محروم رکھا اور اس سے دوسروں کا اضرار اور ان کو بلا وجہ محروم کرنا مقصود ہو تو اگرچہ قضاءً یہ ہبہ نافذ رہے گا لیکن دیانتاً گنہگار ہوگا۔ اور اگر کسی شرعی عذر مثلاً ایذارسانی، ظلم و زیادتی اور نافرمانی کی وجہ سے محروم رکھا تو گنہگار نہ ہوگا بلکہ بقدرِ قوت سے زیادہ نہیں دینا چاہیئے تاکہ اعانت علی المعصیت لازم نہ آئے لیکن قضاءً ہر صورت میں ہبہ نافذ رہے گا، اور اگر کوئی وجہ تفاضل موجود نہ ہو تو مرد و زن کے درمیان تسویہ کرنا افضل ہے۔

قال العلامۃ ابن البزاز الکندیؒ: الافضل فی ھبۃ الابن والبنت التثلیث کالمیراث وعند الثانی التنصیف وھو المختار ولو وھب جمیع مالہ من ابنہ جاز وھو آثم نص علیہ محمدؒ ولو خص بعض اولادہ لزیادۃ رشدہ لا بأس بہ وان کانا سواء لا یفعلہ وان اراد ان یصرف مالہ الی الخیر وابنہ فاسق فالصرف الی الخیر افضل من ترکہ لہ لانہ اعانۃ علی المعصیۃ وکذا لو کان ابنہ فاسقاً لا یعطیہ اکثر من قوتہ۔ (البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ ج ۶ ص۲۳۷ الجنس الثالث فی ہبۃ الصغیر) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابو البرکات النسفیؒ: فلو وھب الذی رحم محرم منہ لا یرجع فیھا۔ (کنز الدقائق ص۳۵۵ کتاب الھبۃ)

وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، مادۃ ۸۶۶ ص۲۷۶ کتاب الھبۃ الباب الثالث فی احکام الھبۃ۔

[2] قال العلامۃ القاضی خانؒ: وروی المعلیؒ عن ابی یوسفؒ انہ لا بأس بہ اذا لم یقصد بہ الاضرار وان قصد بہ الاضرار سوی بینھم یعطی للابنۃ مثل ما یعطی للابن۔

(الفتاوی القاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۲۷۹ فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص۲۸۸ کتاب الھبۃ۔

ہبہ کے لیے واہب کی رضامندی ضروری ہے

سوال:۔ باپ نے اپنی بیٹی کو ہبہ میں کچھ سامان اور نقدی دیدی، بیٹی نے بقدرِ ضرورت اس میں سے لیا اور جو باقی بچا وہ باپ کو ہبہ کر دیا، کیا شرعاً یہ ہبہ صحیح ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ ہبہ بلا جبر و اکراہ کے اپنی خوشی اور رضامندی سے ہو تو شرعاً صحیح ہے کیونکہ مہرِ مسمّٰی معجل بعد القبض عورت کی ملک ہے اور اس میں اس کا تصرف نافذ ہے۔

قال العلامة محمد خالد اتاسی رحمه الله: یلزم فی الهبة رضا الواهب فلا تصح الهبة التی وقعت بالجبر والاکراه۔

(مجلة الاحکام، مادة ۸۶۰ ص۴۷۲ الباب الثانی فی شرائط الهبة)[۱]

مرض الموت میں کیا گیا ہبہ درست نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے مرض الموت میں اپنی کل جائیداد اپنی بیٹیوں اور بیوی کو دیئے بغیر اپنے چھ بیٹوں میں تقسیم کر دی جبکہ بیٹوں میں سے ایک بیٹا تقسیم جائیداد کے وقت نابالغ اور غیر موجود تھا، نابالغ لڑکا جو کہ اب بالغ ہوگیا ہے اس تقسیم سے راضی نہیں ہے۔ تو شریعت اس کو اجازت دیتی ہے کہ باقی بھائیوں سے جائیداد کی از سرِ نو تقسیم کرائے؟

الجواب:۔ یہ تقسیم میراث نہیں ہے بلکہ یہ ہبہ ہے اور مرض الموت میں کیا گیا ہبہ کالعدم ہے، جب تک کہ سب ورثاء اس پر راضی نہ ہوں۔ اور یہاں تو ایک دوسرا مانع بھی موجود ہے کہ ایک لڑکا ان میں سے نابالغ ہے اور نابالغ رضا کا

---

[۱] قال العلامة ابن البزاز الکردی رحمه الله: قال لها وهی لا تعلم العربیة قولی وهبت مهری منك فقالت وهبت لا تصح بخلاف الطلاق والعتاق لان الرضا شرط جواز الهبة۔ (البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۲۳۵ نوع فی هبة المهر وغیره)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۱ فصل فی هبة المرأة مهرها من الزوج۔

اہل نہیں ہے، اس لیے یہ تقسیم اور ہبہ درست نہیں ہے لہٰذا تمام وارثوں پر ترکہ از سرِ نو قاعدہ میراث سے تقسیم کیا جائے گا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: وهب في مرضه ولم يسلم حتى مات بطلت الهبة لانه وان كان وصية حتى اعتبر فيه الثلث فهو هبة حقيقة فيحتاج الى القبض۔ (رد المحتار على الدر المختار ج۵ ص۷۰۷ باب الرجوع في الهبة) [فروع] لہ

پوتے کو زمین ہبہ کرنے کے بعد خود اس پر قابض رہنے کا حکم

سوال:- میرے باپ کا میرے دادا کی زندگی میں ہی انتقال ہو گیا تو دادا نے ۱۰ کنال زمین میرے نام کر دی لیکن یہ زمین دادا کی وفات تک اُن کے قبضہ میں ہی رہی، تو کیا اب میں اپنے چچوں سے زمین کا مطالبہ کر سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:- ہبہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ واہب موہوبہ شئے کو موہوب لہ کے قبضہ میں دے دے، جب تک ہبہ شدہ چیز پر قبضہ نہ کر لیا جائے اس وقت ہبہ تام نہیں ہوتا، صورتِ مسئولہ میں چونکہ ہبہ تام نہیں ہوا ہے اسلئے دادا کی وفات کے بعد جملہ مال ان کے بیٹوں یعنی آپ کے چچوں کا ہے، آپ کو شرعاً رجوع کا حق حاصل نہیں۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وان وهب له اجنبي تتم بقبض وليه وهو احد اربعة الاب ثم وصيه ثم الجد ثم وصيه۔ وقال ايضاً وتتم الهبة بالقبض الكامل فيشترط القبض قبل الموت۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۵ ص۶۹۶،۶۹۵ كتاب الهبة) ؎۲

؎۱ قال العلامة محمد خالد اتاسي رحمه الله: واذا وهب واحد في مرض موته شيئاً لاحد ورثته وبعد وفاته لم يجز سائر الورثة لا تصح تلك الهبة۔
(شرح مجلة الاحكام - مادة ۸۷۹ ص۳۸۳ الفصل الثاني في هبة المريض)
ومثله في الهداية ج۴ ص۶۵۷ كتاب الوصايا۔

؎۲ قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: اس صورت میں ہبہ صحیح نہیں اور ورثاء میں تقسیم ہوگا۔
(عزیز الفتاوی الشہیر بفتاوی دار العلوم دیوبند ج۱ ص۶۷۸ کتاب الهبة)

چوری کا ہبہ شدہ مال اصل مالک کو لوٹانا واجب ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو چوری کا مال ہبہ کیا، کچھ مدت کے بعد اس مال کا اصلی مالک بھی آگیا اور اس نے موہوب لہٗ سے اپنے مال کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر اس نے یہ کہہ کر واپس کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ مال فلاں شخص نے مجھے ہبہ کیا ہے لہٰذا تم اسی سے مطالبہ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس شخص (اصلی مالک) کا موہوب لہٗ سے اپنے مال کا مطالبہ کرنا درست ہے اور کیا اس کے ذمے مال واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی نے چوری کا مال اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو ہبہ کیا ہو اور بعد میں اس کا اصلی مالک آجائے تو چوری کا موہوبہ مال اس کے اصلی مالک کو واپس کیا جائے گا اور اس کا دونوں سے مطالبہ کرنا درست ہے، البتہ جس کے پاس وہ مال موجود ہے اس پر واپس کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: (سوال) زید نے عمرو کی ایک چیز چرائی اور بکر کو ہبہ کر دی اور بکر نے خالد کو ہبہ کر دی، اب معلوم ہوا کہ زید نے چوری کی تھی، اس حالت میں شئے مسروقہ کا ادا کرنا کس کے ذمے واجب ہوگا؟

(الجواب) جس کے پاس اب ہے اس پر رد واجب ہے اور اگر اس کو خبر نہ ہو تو جس کو خبر ہو اس پر خبر کرنا واجب ہے اور اگر اس صاحب خبر کو ہبہ میں بھی دخل ہے تو اس پر استخلاص اور استرداد میں بھی سعی واجب ہے۔ (امداد الفتاویٰ جلد۳ ص۴۷۵ کتاب الھبہ)

قرائن بھی تکمیل ہبہ کے لیے کافی ہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے بڑے بھائی نے بیٹی کی شادی کے لیے مجھے کچھ رقم دی، میں نے وہ رقم بیٹی کی شادی پر خرچ کر دی، اس بات کو تقریباً بیس سال گذر چکے ہیں اور اس دوران بڑے بھائی نے رقم کی واپسی کا تقاضا نہیں کیا، یہاں یہ یاد رہے کہ جب بڑے بھائی نے مجھے رقم دی تھی تو اس نے قرض یا واپسی کی کوئی تصریح یا وضاحت وغیرہ نہیں کی تھی اور نہ اس کو واپسی کی کوئی امید تھی، اب ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد مجھ سے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تو کیا شرعاً بھائی کی اولاد کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ کی تکمیل کے لیے ایجاب و قبول یعنی ہبہ کی تصریح ضروری نہیں قرائن بھی تلفظ کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔ صورتِ مذکورہ کے مطابق بیس سال تک بھائی کا مطالبہ نہ کرنا،

اور رقم دے کر واپسی کی امید نہ رکھنا اور نہ ہی قرض کی تصریح کرنا، یہ سب چیزیں اس بات پر دال ہیں کہ آپ کو بڑے بھائی نے بیٹی کی شادی کے لیے جو رقم دی تھی وہ بطور ہبہ تھی، اس لیے اب اس کی اولاد کو رقم کی واپسی کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: قلت فقد افاد ان التلفظ بالایجاب والقبول لایشترط بل تکفی القرائن الدالة علی التملیك لکن دفع الی الفقیر شیئًا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما شیء۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۴ ص۵۰۸ کتاب الهبة)[۱]

بیوی کا ہبہ کردہ حقِ مہر میں رجوع کرنا

سوال:۔ ایک عورت نے اپنا حقِ مہر شوہر کو ہبہ کر دیا، چند سال کے بعد کسی گھریلو ناچاقی کی وجہ سے اب وہ عورت شوہر سے حقِ مہر کا مطالبہ کرتی ہے، تو کیا شرعاً اس کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زوجین کا رشتہ قرابت داری کا رشتہ ہے، ان میں سے جو بھی دوسرے کو ہبہ کر دے تو بعد میں اس کو رجوع کرنے اختیار نہیں۔ اسی طرح صورتِ مسئولہ میں بھی جب بیوی نے ایک بار اپنا حقِ مہر شوہر کو ہبہ کر دیا تو اب اس کو رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وکذلك ما وهب احد الزوجین للاٰخر لان المقصود فیها الصلة کما فی القرابة۔ (الهدایہ جلد۳ ص۲۹۴ کتاب الهبہ)[۲]

بچوں کے مال میں تصرف کرنا

سوال:۔ بعض یورپی ممالک مثلاً برطانیہ میں نابالغ بچوں کے لیے حکومت کی طرف سے کچھ وظیفہ مقرر ہوتا ہے جو صرف بچے کی تعلیم و تربیت پر خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے، اب اگر والدین اس پر

---

[۱] قال العلامة داماد آفندیؒ: قالوا لو وضع ماله فی طریق لیکون ملکاً لرافع جاز فلا یشترط التصریح بالهبة۔ (الدر المنتقی فی شرح الملتقی فی ذیل مجمع الانہر ج۳ ص۴۹ کتاب الهبة)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاویٰ ج۳ ص۴۶۶ کتاب الهبة۔

[۲] لما فی الهندیة: اذا وهب احد الزوجین لصاحبه لایرجع فی الهبة وان انقطع النکاح بینهما۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۳۸۶ کتاب الهبة، فصل رجوع فی الهبة)

قبضہ کرکے اس سے کوئی چیز خرید کر اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو تحفہ کے طور پر دیدیں تو کیا شرعاً والدین کو یہ حق ہے یا نہیں؟ اگر وہ اس طرح کریں تو کیا وہ ضامن ہوں گے یا نہیں؟

الجواب: جو وظیفہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے حکومت مقرر کرتی ہے وہ صرف بچوں ہی کا حق ہے، اس کو صرف بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم پر خرچ کیا جائے گا، وظیفہ کی یہ رقم والدین کے ہاتھوں میں امانت ہوتی ہے، والدین کے لیے جائز نہیں کہ بلا عذر شرعی اس کو اپنے اوپر خرچ کریں یا اپنے کسی رشتہ دار یا احباب کو تحفہ کے طور پر دیں، اگر وہ اس طرح کریں گے تو ضامن ہوں گے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولا یجوز ان یھب شیئاً من مال طفلہ ولو بعوض۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۵۶۲ کتاب الھبۃ قبل باب الرجوع فی الھبۃ) لـہ

بے اولاد شخص کا زندگی میں اپنا مال تقسیم کرنا

سوال: جناب مفتی صاحب! میں ایک بیمار اور عمر رسیدہ آدمی ہوں، میری کوئی اولاد نہیں صرف بوڑھی بیوی ہے، جبکہ میرے دو بھتیجے ہیں، ایک بڑے بھائی کا بیٹا ہے اور دوسرا چھوٹے بھائی کا بیٹا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہی اپنا سرمایہ ان میں تقسیم کر دوں۔ آپ سے استدعا ہے کہ شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اس بارے میں میری راہنمائی کریں؟

الجواب: اگر آپ اپنا سرمایہ اپنی زندگی میں ہی اپنے ورثاء میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو شرعاً آپ کو اس کا اختیار ہے کہ جتنا جتنا چاہیں ورثاء میں تقسیم کر سکتے ہیں، لیکن اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے کل مال کا ۱/۴ حصہ اپنی بیوی کے نام کر دیں اور باقی مال کے دو برابر حصے کر کے ہر ایک بھتیجے کو ایک ایک حصہ دیدیں، اور اگر اس مال سے اپنے لیے بھی کچھ رکھنا چاہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ دونوں بھتیجوں کا

لـہ لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: ماں باپ وغیرہ کو بچے کا مال کسی کو قرض دینا بھی صحیح نہیں بلکہ خود قرض لینا بھی صحیح نہیں۔ (بہشتی زیور ص۳۹۹ بچوں کو دینے کا بیان، کتاب الھبۃ والاجارۃ)

ان کے قبضہ میں دینا ضروری ہے ورنہ ہبہ تام نہ ہوگا۔

لما قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: ھی تملیك عین بلا عوض وتصح بایجاب و قبول وتتم بالقبض الکامل فان قبض فی المجلس بلا اذن صح وبعدہ لابد من الاذن۔ (ملتقی الابحر علیٰ صدر مجمع الانھر ج ۳ ص ۴۸۹ کتاب الھبۃ)

صرف انتقال کردینے سے ہبہ تام نہیں ہوتا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے سرکاری ملازمت کے دوران کچھ زمین خریدی تھی لیکن بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے انہیں اس زمین کا انتقال اپنے دو بیٹوں کے نام کرانا پڑا مگر آخری دم تک زمین ان کے قبضہ میں نہیں دی، موت تک خود متصرف رہے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد اب وہ دونوں بھائی اپنے نام انتقال شدہ زمین کو اپنی موہوبہ زمین سمجھتے ہیں اور دوسرے بہن بھائیوں کو اس میں سے حصہ دینے کو تیار نہیں۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا شرعاً واقعی یہ انتقال شدہ زمین ان کی موہوبہ زمین ہے اور اس میں کسی دوسرے وارث کا کوئی حق نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ میں جس طرح ایجاب وقبول ضروری ہے اسی طرح ہبہ تام ہونے کے لیے موہوبہ چیز پر قابض ہونا بھی لازمی عمل ہے، بغیر قبضہ کے صرف ایجاب وقبول یا کاغذی قانونی کاروائی سے ہبہ تام نہیں ہوسکتا۔ بعینہ اسی طرح آپ کے والد صاحب نے خریدی ہوئی زمین قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے مصلحتاً اپنے دو بیٹوں کے نام انتقال کرادی اور آخری دم تک ان کے قبضے میں نہیں دی اس لیے ہبہ تام نہیں ہوا، موصوف کی وفات کے بعد سب ورثاء حصہ شرعی کے مطابق برابر کے شریک ہیں، جن دو بھائیوں کے نام صرف زمین کا انتقال ہوچکا ہے وہ دیگر ورثاء (بہن بھائیوں) کو ان کے حق سے محروم کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: (الجواب) اس صورت میں عمرو نے محفوظیٔ جائیداد کے واسطے ایک حیلہ کیا ہے، پس زید کسی طرح اس جائیداد کا مالک نہیں ہوسکتا کیونکہ نہ تو استیلاءِ حاکم اس جائیداد پہ پایا گیا کہ یوں کہیں کہ حاکم کی طرف سے زید کی ملکیت ہوگی اور نہ قبضہ زید کا اس جائیداد پہ مالکانہ

پایا گیا۔ (امداد الفتاویٰ جلد ۳ ص۴۱۴ کتاب الدعویٰ) لے

صرف منافع کے حصول کیلئے دی ہوئی چیز کا ہبہ تام نہیں ہوتا

سوال:- زید کے باپ نے ایک ٹیکسی موٹر کار خرید کر اس شرط پر زید کے حوالے کی کہ تم اس کے ذریعے مزدوری کر کے اپنے اہل و عیال کے لیے نان و نفقہ پیدا کرو مگر گاڑی میری ہوگی، اس معاہدے پر گواہ بھی موجود ہیں، اب جبکہ زید کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے تو وہ گاڑی پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو اس کا اصلی مالک قرار دے رہا ہے اور دوسرے ورثاء کو حصہ دینے سے انکاری ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیان مذکورہ بالا کے مطابق کیا واقعی زید اس گاڑی کا واحد مالک ہے یا دوسرے ورثاء کا بھی اس میں حصہ شرعی ہے یا نہیں؟

الجواب:- بشرطِ صحتِ سوال زید اس گاڑی کا واحد مالک نہیں، والد کے انتقال کے بعد جملہ ورثاء اس میں برابر کے حصہ دار ہیں، اس لیے کہ والد نے ٹیکسی اس کو صرف منافع حاصل کرنے کے لیے خرید کر دی تھی، رأس المال کو اس کے قبضے میں نہیں دیا تھا کہ جس کی بناء پر زید کو گاڑی کا مالک تصور کیا جا سکے، لہٰذا زید کا والد کے انتقال کے بعد اپنے آپ کو گاڑی کا واحد مالک سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

لے لما قال المفتی عبد الرحیم: (الجواب) والد اگر کسی مصلحت سے اپنے کسی بیٹے کے نام مکان خریدے تو وہ بیٹا محض اس کے نام پر خریدنے کی وجہ سے شرعی طور پر اس مکان کا مالک شمار نہ ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد ۹ ص۲۸۶ کتاب الہبۃ)

كتاب الغصب والوديعة والعارية

ليس على المستعير غير المغل ضمان ولا على المستودع غير المغل ضمان

کتاب الغصب

(غصب کے مسائل واحکام)

غاصب کا قبضہ

سوال:۔ کیا غاصب کا قبضہ ازروئے شرع قبضہ سمجھا جائیگا؟

الجواب:۔ غاصب کے قبضے کا شریعت میں کچھ وزن نہیں اسی طرح جائیداد مغصوبہ میں غاصب کا تصرف کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ہاں جب مال مغصوبہ کا نام تبدیل ہو جائے یا اس کا اعظم منافع ختم کردیا جائے تو اس وقت وہ غاصب کا مال کہلائے گا جیسے کسی نے گندم چرائی اور اس سے روٹی پکائی، لیکن غاصب کو ضمان ادا کرنا پڑے گا اور ضمان ادا کرنے سے قبل مال مغصوبہ سے انتفاع لینا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله:۔ واذا تغيرت العين بفعل الغاصب حتى زال اسمها او اعظم منافعها زال ملك المغصوب منه عنها وملكها الغاصب وضمنها ولا يحل له الانتفاع بها حتى يؤدى بدلها۔

(الهداية ج ۳ ص۳۷۴ كتاب الغصب۔ فصل فيما يتغير بفعل الغاصب)[1]

مالک کو اطلاع کیے بغیر ادائ حق سے برأت کا حکم

سوال:۔ زید بکر کے ہاں محنت مزدوری کرتا ہے، اس دوران اُس نے بکر کی ایک قیمتی گھڑی چرالی، زید اب اپنے اس فعل پر نادم ہے اور بکر بھی زندہ

---

[1] قال العلامة خالد الاتاسى رحمه الله: اذا غير الغاصب المال المغصوب على بصورة يتبدل بها اسمه يكون ضامنًا ويبقى المال المغصوب له مثلاً لو كان المال المغصوب حنطة وجعلها الغاصب بالطحن دقيقًا فانه يضمن مثل الحنطة ويكون الدقيق له كما ان من غصب حنطة غيره وزرعها فى ارضه يكون ضامنًا للحنطة والمحصول له۔

(شرح مجلة الاحكام، مادة ۸۹۹ ص۲۹۵ ج۳ الباب الاول فى احكام الغصب)

ومثله فى الهندية ج ۵ ص۱۲۱ كتاب الغصب، الباب الثانى فى احكام المغصوب اذا تغير بفعل الغاصب اوغيره۔

ہے، لیکن واپس کرنے میں اگر بکر کو پتہ چل گیا تو زید کو خدشہ ہے کہ وہ میری بے عزتی کرے گا، اب زید کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ بے عزتی بھی نہ ہو اور آخرت کے مواخذہ سے بچ سکے؟

الجواب:۔ کسی مسلمان کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا یا اس کو چوری کرنا حرام اور ناجائز ہے اور اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، اس لیے زید کو ہر حال میں گھڑی واپس کردینی چاہیئے اور اگر ظاہراً واپس کرنے میں بے عزتی کا خطرہ ہو تو کسی خفیہ تدبیر سے پہنچا دی جائے، مالک کو اطلاع دینا ضروری نہیں۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ:۔ (قولہ ویبرأ برد ھا) ای ردّ العین المغصوبة الی المغصوب منہ۔ (رد المختار ج۶ ص۱۸۲ کتاب الغصب، مطلب فی ردّ المغصوب... الخ) لہ

بلا اذن دوسروں کے جانور ذبح کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر بوقت ضرورت کسی دوسرے شخص کے جانور کو بغیر اس کی اجازت کے ذبح کرلیا جائے اور بعد میں قیمت طے کرکے دے دی جائے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مالک کی اجازت کے بغیر ایسا کرنا شرعاً ناجائز اور غصب ہے، مالک کو اختیار ہے کہ وہ زندہ جانور کی قیمت لے اور مذبوح جانور ذابح کے حوالہ کرے یا مذبوح جانور کو لے کر ذبح کی وجہ سے اس کی قیمت میں جو کمی آئی ہے وہ غاصب سے پوری کرے۔ البتہ اگر اذنِ عرفی موجود ہو تو ایسا کرنا جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی العمادیة فی فصل ۳۲ ومن ذبح شاة غیرہ فمالکھا بالخیار ان شاء ضمنہ قیمتھا وسلمھا الیہ وان شاء اخذھا وغرمّھا النقصان۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۷۵ کتاب الغصب) ۲ہ

لہ قال العلامة قاضیخانؒ، غصب دراھم انسان من کیسہ ثم ردّھا فی کیسہ وھو لایعلم یبرأ۔ (فتاویٰ خانیہ علیٰ ہامش الہندیة ج۲ ص۱۷۹ جنس آخر فی المتفرقات) ۔۔۔ ومثلہٗ فی مجلة الاحکام لرستم باز، المادة ۸۹۲ ص۴۹۲۔

۲ہ قال العلامة قاضیخانؒ، رجل ذبح شاة انسان ظلماً فصاحبھا بالخیار ان شاء ترک المذبوح علیہ وضمنہ قیمتھا وان شاء اخذ المذبوح وضمنہ النقصان۔ (فتاویٰ خانیة علیٰ ہامش الہندیة ج۳ ص۲۴۵ کتاب الغصب) ومثلہٗ فی الھدایة ج۴ ص۳۷۸ کتاب الغصب۔

مغصوبہ زمین کی واپسی کے بعد حاصل کردہ منافع کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر کی زمین غصب کرلی اور اس سے دس سال تک پیداوار حاصل کرتا رہا جس کا ایک مخصوص حصہ مساجد اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کرتا رہا اور کچھ حصہ پیداوار کا اپنے استعمال میں لاتا رہا، کافی کوشش کے بعد بکر نے اپنی غصب کی ہوئی اپنی زمین زید سے واپس لے لی، تو کیا بکر زید سے رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً کسی کا مال غصب کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا حرام ہے، زمانۂ غصب میں جو کچھ بھی مغصوبہ سے حاصل ہوا ہو وہ مغصوب عنہ کا حق ہے۔ بنابرایں بکر اپنی مغصوبہ زمین کی جملہ پیداوار کا مطالبہ کرسکتا ہے، اسی طرح مغصوبہ زمین کی بازیابی کے بعد مساجد اور دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کرسکتا ہے مگر علاقے کے عرف کے مطابق غاصب کو اجرِ مزارعت دینا لازم ہوگا۔

وفی الهندية: وسئل شيخ الاسلام عطاء بن حمزة عمن زرع ارض انسان ببذر نفسه بغير اذن صاحب الارض هل لصاحب الارض ان يطالبه بحصة الارض قال نعم ان جرى العرف فى تلك القرية انهم يزرعون الارض بثلث الخارج اوربعه اونصفه او بشيء مقدر شائع يجب ذلك القدر الذى جرى به العرف۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۱۴۴ الباب العاشر فى زراعة الارض المغصوبة) [۱]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فالحاصل ان من زرع ارض غيره بلا اذنه ولو على وجه الغصب فان كانت الارض ملكاً واعدها ربها للزراعة اعتبر العرف فى الحصة ان كان ثمة عرف والا فان اعدها للايجار فالخارج كله للزارع وعليه اجر مثلها لربها والا فان انتقصت فعليه النقصان والا فلا شيء عليه۔

(تنقيح الحامدية ج۲ ص۱۷۲ كتاب الغصب)

وَمِثْلُهٗ فى الفتاوى الكاملية ص۲۰۹ كتاب الغصب۔

بغیر اجازت کے کسی کی زمین سے مٹی لانا

سوال:۔ زید کی مملوکہ زمین میں ایک ٹیلہ ہے لوگ اس سے مٹی لے آتے ہیں، زید کسی کو منع بھی نہیں کرتا، تو کیا زید کی اجازت کے بغیر اُس ٹیلے سے مٹی لانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اصول یہ ہے کہ کسی کی مملوکہ زمین سے مٹی وغیرہ لانا بغیر اس کی اجازت کے جائز نہیں، لیکن اجازت کے لیے صراحتًا کہنا ضروری نہیں قرینۂ اجازت بھی کافی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ زید اپنی زمین سے مٹی لینے سے کسی کو منع نہیں کرتا تو یہ اجازت پر دال ہے، اس لیے اُس سے اجازت لیے بغیر بھی مٹی لائی جا سکتی ہے۔

قال العلامة الحصكفیؒ: ولا سقی ارضه وشجره وزرعه ونصب دولاب و نحوها من نهر غیره وقناته وبئره الا باذنه لان الحق له فیتوقف علی اذنه۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۱ صفحہ ۴۳۹ فصل الشرب) [1]

بلا کرایہ سفر کرنے پر ذمہ سے فارغ ہونے کا طریقہ

سوال:۔ میں دو تین بار کراچی سے پشاور تک ریل میں بغیر ٹکٹ کے آیا ہوں، اُس وقت مجھے کوئی خیال نہیں تھا کہ میں یہ کام ناجائز کر رہا ہوں، اب میں چاہتا ہوں کہ اس حقِ غیر سے کسی طرح اپنا ذمہ فارغ کر سکوں، مہربانی فرما کر اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ بس یا ریل میں بغیر کرایہ ادا کیے سفر کرنا جائز نہیں، کرایہ کے پیسے ادا کرنا واجب ہے اور اگر کبھی بغیر کرایہ کے سفر کیا گیا تو اس کی ادائیگی اور ذمہ سے فارغ ہونے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس ادارے سے اتنی مسافت کا ٹکٹ خرید کر استعمال میں لائے بغیر اُسے ضائع کر دیا جائے تو اس سے حق ادا ہو جائے گا۔ جہاں تک آپ کے مسئلہ کا تعلق ہے تو آپ اس طرح کریں کہ جتنی بار آپ کراچی سے پشاور بغیر کرایہ ادا کیے آئے ہیں اتنی دفعہ کرایہ کا حساب کر کے اتنی مالیت کی ٹکٹ خرید کر اُسے ضائع کر دیں، اس طرح آپ کا ذمہ فارغ ہو

---

[1] لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: اس سے معلوم ہوا کہ بغیر اجازتِ مالک کے اپنے کھیت کو پانی دینا یا مٹی لانا جائز نہیں ہے۔ (امداد الفتاوی ج ۳ صفحہ ۴۵۲ کتاب الغصب)

جائے گا۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ : (الجواب) زید کو یہ دیکھنا چاہئے کہ میرے ذمہ کتنا کرایہ واجب ہے، اسی قدر داموں کا ایک ٹکٹ اسی ریلوے کا خرید کر اس ٹکٹ کو ضائع کرے اس سے کام نہ لے، حق واجب کمپنی کا ادا ہو جاوے گا۔ (امداد الفتاوٰی ج ۳ ص ۴۴۶ کتاب الغصب)

پرنالہ بند کرنے کا مسئلہ

سوال :۔ ایک صاحب کے مکان کے عقب (پچھواڑے) میں میری مملوکہ زمین ہے اب میں اس پر مکان بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس شخص کے مکان کا پرنالہ میری زمین کی طرف ہے میں نے اس کو پرنالہ بند کرنے کا کہا تو اس نے انکار کر دیا اور اصلاحی جرگہ میں میرے خلاف شکایت کر دی۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا مجھے شرعاً اس کا پرنالہ بند کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر یہ جگہ واقعی آپ کی ملکیت ہے اور پرنالے کا پانی آپ ہی کی مملوکہ زمین پر گرتا ہو تو آپ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ آپ اس پرنالہ کو بند کر دیں، اور اگر پرنالہ کا پانی گرنے کی جگہ صاحبِ مکان کی ملکیت ہو تو پھر آپ کو پرنالہ بند کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ : ومن اشترٰی بیتاً فی دارٍ ومنزلاً اومسکناً لم یکن لہٗ طریق الا ان یشتریہ بکل حق ھو لہ او بمرافقہ او بکل قلیل وکثیر وکذا الشرب والمسیل۔ (الہدایہ جلد ۳ ص ۸۸ کتاب البیوع، باب الحقوق) [۱]

❋

---

[۱] لما قال الشیخ مولانا اشرف علی التھانویؒ : مسیل یعنی پرنالہ و بدرو وغیرہ نکالنا حقوق ملک سے ہے جو شخص اس جگہ کا مالک ہے اس کو ہر طرح تصرف کا حق پہنچتا ہے، پس یہ شخص جو حقِ پرنالہ ہمسایہ کو زائل کرنا چاہتا ہے، اگر وہ پرنالہ گرنے کی جگہ اس شخص کی مملوک ہے اور اب تک بطور تبرع واحسان ورعایت ہمسایہ کو پانی ڈالنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اب زائل کرنا چاہتا ہے اور پرنالہ بند کرنا چاہتا ہے تو یہ جائز ہے، اپنی ملک کا اختیار ہے اور اگر یہ جگہ ہمسایہ کی مملوک ہے تو اس شخص کو اس کا پرنالہ بند کرنا جائز نہیں کہ یہ غصب ہے۔

(امداد الفتاوٰی جلد ۳ ص ۴۴۵ کتاب الغصب)

کتاب الودیعۃ والعاریۃ
(امانت اور عاریت کے مسائل واحکام)

امین کو امانت میں تصرف کا حق ہے

سوال:۔ کسی امین کو امانت میں تصرفات کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ امین پر امانت کی حفاظت لازمی ہے اس کی حفاظت کے لیے جو بھی تدبیر اختیار کرنا پڑے کر سکتا ہے مگر حفاظتی تدابیر کے علاوہ دیگر تصرفات کرنا جائز ہے بصورت ہلاکت ضامن ہوگا۔

وفی الھندیۃ: والودیعۃ لا تودع ولا تعار ولا توجر ولا ترھن وان فعل شیئاً منھا ضمن کذا فی البحر الرائق۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۳۳۸ کتاب الودیعۃ)[۱]

امانت ضائع ہو جانے پر ضمان کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو کو کچھ رقم کاروبار کے لیے دیدی، عمرو کاروبار کے سلسلے میں سفر پر چلا گیا، سفر کے دوران اُس نے رقم اپنے رفیق سفر کو دے دی جس سے کسی نے وہ رقم چوری کر لی، تو کیا زید اب عمرو سے ضمان کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ محمود سے یہ رقم برفاقت عمرو ضائع ہوگئی ہے لہٰذا ان دونوں میں سے کسی پر ضمان نہیں ہے، تاہم اگر عمرو محمود سے جُدا ہو چکا تھا تو ہلاکت کی صورت میں عمرو زید کا ضامن ہوگا۔

قال العلامۃ سلیم رستم باز: ثم اعلم ان المستودع الاول انما یضمن اذا اودع الودیعۃ وھلکت بعد ان فارقھا واما قبلہ فلا ضمان علی احد لان الثانی قبض المال من ید امین کما مر والاول لا یکون بالدفع ضمیناً مالم یفارق بحضوٍ

---

[۱] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: والودیعۃ لا تودع ولا تعار ولا توجر ولا ترھن وان فعل شیئاً منھا ضمن ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۲۹۱ کتاب العاریۃ) ــــ ومثلہ فی مجلۃ الاحکام، مادہ ۷۹۰ ص۴۲۷ الباب الاول فی عمومیۃ الامانات۔

رایة فاذا فارق فقد ترک الحفظ اللازم بالتزامه فیضمن بترکه. (مجمع الانهر)

(شرح مجلة الاحکام، مادة ۷۹۰ ص ۴۳۸) ۱؎

امانت پر اُجرت لینے کا حکم

سوال :- امانت کی حفاظت کرنے پر اُجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگر حفظِ ودیعت کو مودع پر شرط کرکے اجرت مقرر کردی جائے تو جائز ہے اور اس صورت میں اگر مودع سے شئے امانت کسی ایسے عمل سے ضائع ہوجائے جس سے بچنا ممکن تھا تو مودع ضامن ہے ورنہ ضامن نہیں۔

وفی مجلة الاحکام : الودیعة امانة فی ید الودیع فاذا هلکت بلا تعدٍ منه وبدون صنعه وتقصیره فی الحفظ لایضمن ولکن اذا کان الایداع بأجرة فهلکت او ضاعت بسبب یمکن التحرز عنه لزم المستودع ضمانها)

(شرح مجلة الاحکام۔ مادة ۷۷۷ ص ۴۳۱ فی احکام الودیعة وضمانها) ۲؎

مودع کی وفات پر ورثاء کو مطالبہ کا حق ہے

سوال :- زید کی امانت بکر کے پاس رکھی ہوئی تھی کہ اچانک زید کی وفات ہوگئی، اس کے پسماندگان میں بیوی بچے ہیں لیکن نا قابلِ اعتماد ہیں، تو بکر یہ امانت کس کے حوالے کرے؟

الجواب : بصورتِ مسئولہ میں زید کے ورثاء کے مطالبے پر امانت کی واپسی ضروری ہے

۱؎ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : فافاد ان المودع لا یودع فان اودع فهلکت عند الثانی ان لم یفارق الاول لاضمان علیٰ واحدٍ منهما وان فارقه ضمن الاول عند ابی حنیفة ولایضمن الثانی۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۲۷۴ کتاب الودیعة)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۴ ص ۳۰۳ کتاب الودیعة۔ الثانی فیما یکون اضاعة۔ الخ

۲؎ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله : وفی آخر کتاب الغصب من شرح الطحاوی المودع اذا شرط الاجر للمودع علیٰ حفظ الودیعة صح۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص ۲۸۹ الفصل السادس فی المتفرقات)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۴ ص ۳۷۳ الباب التاسع فی المتفرقات۔

لیکن اگر یہ یقین یا غالب ظن ہو کہ ورثاء اس مال کو ضائع کر دیں گے تو پچیس سال کی عمر تک نہ دیا جائے۔

وفی الھندیۃ: واذا مات رب الودیعۃ فالوارث خصم فی طلب الودیعۃ کذا فی المبسوط۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۳۵۴ الباب السابع فی رد الودیعۃ)[1]

امانت کے ضائع ہونے کے خدشہ کی صورت میں فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی امانت کے بارے میں اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اور مالک تک رسائی بھی مشکل ہو تو ایسی صورت میں امانت کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے؟ کیا اسے فروخت کر کے رقم مالک کو دی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ امانت میں بنیادی طور پر مالک کے حقوق کی رعایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امانت میں خیانت حرام اور ناجائز ہے، امانت مالک کو اصل حالت میں واپس کرنا مودع کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں امانت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں مالک سے رابطہ کر کے اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے اور اگر کسی وجہ سے مالک سے رابطہ ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں حاکم وقت کو اطلاع دے کر تحفظ امانت کی صورت تلاش کی جائے، اور اگر حاکم وقت سے بھی رابطہ کی صورت میسر نہ ہو تو پھر اہل رائے سے مشورہ کر کے امانت کو فروخت کر کے اس کی قیمت مالک کے لیے محفوظ رکھی جائے۔ تاہم ان تمام صورتوں میں مالک سے ہمدردی کا جذبہ محرک رہے گا اور اگر حتی المقدور کوشش کے باوجود امانت ضائع ہو گئی تو محافظ پر کوئی تاوان لازم نہیں۔

قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللہ:۔ اذا کان صاحب الودیعۃ غائبًا غیبۃ منقطعۃ بحیث لا یعلم موتہ ولا حیاتہ یحفظھا المستودع الی ان یعلم موت صاحبھا اما اذا کانت الودیعۃ مما یفسد بالمکث یبیعھا المستودع باذن الحاکم ویحفظ ثمنھا امانۃ عندہ لکن اذا لم

---

[1] قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللہ، واذا مات المودع تسلم الودیعۃ لوارثتہ (مجلۃ الاحکام مادۃ ۸۰۲ ص۴۴۶ الفصل الثانی۔ فی احکام الودیعۃ وضمانھا)

ومثلہ فی رد المحتار ج۵ ص۶۶۶ کتاب الودیعۃ۔

يبيعها ففسدت بالمكث لايضمن۔ (مجلة الاحكام، مادة ۷۸۹، ص۴۳۵ الفصل الثانی فی احکام الودیعۃ)[1]

عاریۃً دی ہوئی چیز کے واپس لینے کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو کو اپنی زمین پھلوں کی کاشت کے لیے عاریتاً دیدی اور عمرو نو سال تک اس زمین سے پیداوار حاصل کرتا رہا، لیکن اب زید پیداوار میں حصہ مانگتا ہے اور زمین بھی واپس لینا چاہتا ہے۔ کیا ازروئے شریعت زید کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی زمین واپس لے؟ اور کیا زید پیداوار میں حصہ لینے کا حق دار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ زید نے عمرو کو زمین عاریتاً دی ہے اس لیے زید کو اپنی زمین واپس لینے کا حق تو حاصل ہے لیکن اسکی پیداوار میں حصہ لینے کا حقدار نہیں ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (ولو اعار ارضاً للبناء والغرس صح) للعلم بالمنفعۃ (وله ان یرجع متی شاء۔ (ردالمحتار ج۵ ص۶۸۳ کتاب العاریۃ)[2]

معیر یا مستعیر کی موت سے اعارہ فسخ ہوتا ہے

سوال:۔ رشید خان فرید خان کی خدمت کرتا ہے، فرید خان نے خدمت کے عوض میں رشید خان کو دس کنال زمین دیدی، رشید خان زمین کی پیداوار سے فائدہ اٹھاتا رہا، اب جبکہ رشید خان بوڑھا ہو گیا ہے اور خدمت کرنے کے قابل نہیں رہا تو فرید خان نے مذکورہ زمین رشید خان سے لے کر اس کے بیٹے جاوید خان کو دے دی، کچھ وقت گذرنے کے بعد فرید خان کی جائیداد کسی وجہ سے حکومت نے

---

[1] وفی الهندیة: اذا کانت الودیعة شیئاً یخاف علیه الفساد وصاحب الودیعة غائب فان رفع الامر الی القاضی حتی یبیعه جاز وهو الاولیٰ وان لم یرفع حتی فسدت لاضمان علیه لانه حفظ الودیعة علی ما امر به کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۴۲ الباب الرابع، کتاب الودیعة)

ومثله فی فتاوی سراجیة علی هامش قاضی خان ج۴ ص۴۳۵ کتاب الودیعة۔

[2] قال العلامة المرغینانیؒ: واذا استعار ارضاً لیبنی فیها او لیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیها ویکلفه قلع البناء والغرس۔ (الهدایة ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریة)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹۳ کتاب العاریة۔

ضبط کرلی لیکن جاوید خان کی دس کنال زمین بدستور اس کے تصرف میں ہے۔ اب جاوید خان کا دوسرا بھائی سلیم خان دعویدار ہے کہ چونکہ یہ زمین ہمارے والد صاحب کی ملکیت ہے اس لیے میں بھی اس زمین میں حقدار ہوں۔ کیا ازروئے شرع سلیم خان کا اس زمین میں کچھ حق بنتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ معاملہ کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرید خان نے رشید خان کو جو زمین دی تھی وہ عاریتاً دی تھی نہ کہ بطورِ ملکیت، اس لیے کہ جب رشید خان بوڑھا ہو گیا تو زمین واپس لے کر اس کے لڑکے جاوید خان کو دے دی، لہٰذا معلوم ہو گیا کہ یہ دینا عاریتاً تھا نہ کہ بطور تملیکاً، اس لیے مذکورہ زمین اگر فرید خان زندہ ہو تو اس کی ملکیت ہے نہ کہ رشید خان اور بیٹوں کی، اور اگر فرید خان فوت ہو چکا ہے تو یہ زمین اس کے وارثوں کی ہے اور اعارہ بسبب اس کی وفات کے فسخ ہو چکا ہے۔

قال العلامة خالد اتاسی رحمه الله: تنفسخ الاعارة بموت المعیر او المستعیر۔
(مجلة الاحکام۔ مادة ۸۰۷ ص۴۴۸ الباب الثالث الفصل الاول) [1]

معیر اور مستعیر کا اجارہ اور عاریت میں اختلاف

سوال: زید نے بکر سے مکان کے لیے لکڑیاں حاصل کیں اور لکڑیاں واپس کرتے وقت بکر نے دعویٰ کیا کہ لکڑیاں اجارہ پر دی گئی تھیں نہ کہ عاریتاً، جبکہ زید کا کہنا ہے کہ لکڑیاں عاریتاً حاصل کی گئی تھیں، اب اس اختلاف کو حل کرنے میں ہماری راہنمائی فرمائیں ؟

الجواب:۔ اگر بکر گواہوں کے ذریعے سے یہ ثابت کر دے کہ زید نے لکڑیاں اجارہ پر حاصل کی تھیں تو زید اجرت دینے کا پابند ہو گا ورنہ عاریتاً پر محمول ہو گا اور کرایہ دینے سے بری ہو گا۔

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: واذا مات المستعیر او المعیر تبطل الاعارة کما تبطل الاجارة بموت احد المتعاقدین۔
(فتاویٰ خانیة علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۳۸۲ فصل فیما یضمن المستعیر)
ومثله فی سراجیة علیٰ هامش فتاویٰ قاضی خان ج۳ ص۸۲ کتاب العاریة۔

وفی الهندیة: واذا قال اعرتنی دابتك وهلكت وقال المالك غصبتها منی فلاضمان علیه ان لم یكن ركبها فان كان قد ركبها فهو ضامن وان قال اعرتنی وقال المالك اجرتكها وقد ركبها وهلكت من ركوبه فالقول قول الراكب ولاضمان علیه كذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۷۲ كتاب العاریة، الباب الثامن فی الاختلاف الواقع فی هذا الباب والشهادة فیه)[1]

امانت رکھنے والا واپس نہ آئے تو امانت کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کچھ رقم بطور امانت رکھے اور وہ امانت لینے کے لیے واپس نہ آئے تو امین اُس رقم کے ساتھ کیا کرے؟

الجواب:۔ امین کو اگر امانت رکھنے والے کا اتہ پتہ معلوم نہ ہو پھر بھی اسے چاہیئے کہ کسی نہ کسی ذریعے سے امانت پہنچانے کی کوشش کرے ورنہ اسکی موت کی صورت میں اس کے ورثاء کے حوالے کر دے، اور اگر کوشش کے باوجود اس کا یا اس کے ورثاء کا علم نہ ہو سکے تو خود اس مال کو امانت رکھنے والے کی طرف سے صدقہ کر دے یا صدقہ کی وصیت کر جائے، البتہ اگر امین فقیر ہو تو خود بھی کھا سکتا ہے، اور اگر صدقہ کرنے کے بعد مال کا مالک واپس آجائے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو امین سے اپنے مال کا مطالبہ کرے یا صدقہ رہنے دے۔

قال العلامة الحصكفی رحمه الله: فینتفع الرافع بها لو فقیرا والا تصدق بها علی فقیر ولو علی اصله وفرعه وعرسه.... فان جاء مالكها بعد التصدق خیر بین اجازة فعله ولو بعد هلاكها وله ثوابها او تضمینه۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۲۷۹-۲۸۰ كتاب اللقیط)

---

[1] قال العلامة خیر الدین الرملی: وان قال اعرتنی وقال المالك اجرتكها وهلكت من ركوبه فالقول قول الراكب ولاضمان علیه كذا ذكره كثیر من علمائنا۔
(فتاوی خیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۱ كتاب العاریة)
ومِثْلُهُ فی الهدایة ج۳ ص۳۱۴ كتاب الاجارات۔

مجبوری کے تحت امانت فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آج سے دو سال قبل ایک افغان مہاجر نے ہمارے پاس دو بوری گندم امانت رکھی تھی اور خود کہیں چلا گیا، اس کے بعد سے آج تک ہمارا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اور نہ ہمیں اس کے گھر بار کا کوئی علم ہے، جبکہ اس کی گندم پڑی پڑی خراب ہو رہی ہے۔ ان حالات میں شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے اس کا کوئی حل بتائیں؟ کیا ہم اس گندم کو فروخت کرکے اس کی قیمت بطورِ امانت محفوظ رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ بلا ضرورتِ شدیدہ کسی کی امانت میں تصرف کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا تاہم مجبوری کے تحت بہت سارے محظورات میں بھی گنجائش نکل آتی ہے۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی ضرورتِ شدیدہ ہے اس لیے شرعاً آپ عدالت سے اجازت لیکر اس گندم کو فروخت کرکے اس کی قیمت کو اپنے پاس بطورِ امانت محفوظ رکھیں لیکن اگر عدالت تک رسائی ممکن نہ ہو اور گندم کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو پھر چند مسلمانوں کے سامنے اسے فروخت کرکے رقم محفوظ رکھیں۔

لما فی الهندیة: وان کانت الودیعة شیئاً لایمکن ان یؤاجر فالقاضی یأمره بأن ینفق من ماله یوماً او یومین او ثلاثة رجاء ان یحضر المالك ولا یأمره بالانفاق زیادة علی ذلك بل یأمره بالبیع و امساك الثمن۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۲ کتاب الودیعة) [1]

❋

---

[1] وقال مولانا عبدالکریم: وفی العالمگیریة: وان کانت الودیعة شیئاً لایمکن ان یؤاجر فالقاضی یأمره بأن ینفق من ماله یوماً او یومین او ثلاثة رجاء ان یحضر المالك ولا یأمره بالانفاق زیادة علی ذلك بل یأمره بالبیع و امساك الثمن۔ اھ

وفی دیارنا لایمکن الرفع إلی القاضی فجماعة المسلمین قائمة مقامه۔

اس سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں بکرے کو فروخت کرکے اس کی قیمت امانت میں رکھنی چاہیئے، مگر خود تنہا فروخت نہ کرے بلکہ چند معتبر مسلمانوں کی رائے سے فروخت کرے۔ (امداد الاحکام ج ۳ ص۶۱۳ کتاب الودیعة)

كتاب
احياء الموات والمزارعة

من احيأ ارضا
ميتة فهي له

کتاب احیاء الموات

(بنجر زمین کو آباد کرنے کے احکام و مسائل)

ایسی زمین آباد کرنا جس کے مالکان لاپتہ ہوں

سوال:۔ ایک قطعۂ زمین قیامِ پاکستان سے قبل کا بیکار پڑا ہے، اس کے مالکان اسی وقت سے افغانستان چلے گئے تھے، اس کے بعد سے آج تک اس زمین کے ساتھ اُن کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب اگر کوئی اس زمین کو آباد کرے تو کیا وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر واقعی یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں اور عرصۂ دراز سے غیر آباد پڑی ہے اور قریب کے دیہات کے مصالح و منافع اس سے متعلق نہیں تو حکومت کی اجازت سے جو بھی آباد کرے گا مالک بن جائے گا۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضًا میتۃ فھی لہٗ۔

(سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات)[1]

اگر اذنِ امام نہ ہو تو احیاء موات میں ملکیت کے ثبوت کا حکم

سوال:۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احیاء موات میں اذنِ امام شرط ہے، سوال یہ ہے کہ جہاں امام نہ ہو وہاں احیاء موات سے ملکیت کیسے ثابت ہوگی؟

الجواب:۔ احیاء موات کے لیے امام صاحبؒ کے نزدیک حکومت کی اجازت ضروری ہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک اذنِ امام شرط نہیں، اگرچہ اس مسئلہ میں راجح قول امام صاحبؒ کا ہے لیکن جہاں امام نہ ہو تو صاحبینؒ کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے گا، یہ

---

[1] اخرجہ الامام ابوداؤدؒ: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضًا میتۃ فھی لہ ولیس لعرق ظالم حق۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۸ باب احیاء الموات)

وَمثلہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱ کتاب احیاء الموات۔

معاشرتی حالات کے زیادہ موافق ہوگا، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی اذنِ امام شرط نہیں، ظاہر حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

اخرجه الامام ترمذیؒ: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰی ارضاً میتۃ فھی لہٗ۔ (سنن ترمذی ج ا ص۲۵۶ باب احیاء الموات) ؎۱

احیاءِ موات میں راجح قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے

سوال:۔ ایک بنجر زمین کو چند افراد نے قابلِ کاشت بنایا ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ افراد اس زمین کے مالک نہیں بن سکتے کیونکہ انہوں نے حکومت سے باضابطہ اجازت نہیں لی ہے، سوال یہ ہے کہ حکومت کی اجازت کے بغیر احیاءِ موات سے ملکیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے بادشاہِ وقت کی اجازت ضروری ہے یا نہیں، اس میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کا اختلاف ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک بادشاہ کی اجازت ضروری ہے صاحبینؒ کے نزدیک ضروری نہیں لیکن امام صاحبؒ کا قول راجح ہے اور متونِ فقہ میں یہی قول مذکور ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وقول الامام ھو المختار ولذا قدمہ فی الخانیۃ والملتقی کعادتھما وبہ اخذ الطحاوی وعلیہ المتون۔

(رد المحتار ج ۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات) ؎۲

لیکن جہاں کہیں امام نہ ہو تو صاحبینؒ کے مذہب پر فتویٰ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

؎۱ قال العلامۃ الزیلعیؒ: وقالا یملکہ من احیاہ ولا یشترط فیہ اذن الامام علیہ الصلوٰۃ والسلام من عمر ارضاً لیست لاحد فھو احق بھا۔

(تبیین الحقائق ج ۶ ص۳۵ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۳ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔

؎۲ لما فی الھندیۃ: ومن احیاہ باذن الامام ملکہ وھذا عند ابی حنیفۃؒ و قالا یملکہ من احیاہ ولا یشترط فیہ اذن الامام .... والملک فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفۃؒ وعند ابی یوسفؒ ومحمدؒ یثبت بنفس الاحیاء۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔ الباب الاول۔

سوال:۔ آبادی سے دور ایک | **جنگل کو آپس میں تقسیم کرنے سے لوگ اس کے مالک نہیں بن سکتے**

درخت دار جنگل ہے، اگر لوگ اس کو آپس میں تقسیم کریں تو کیا وہ اس کے مالک بن سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا درخت دار جنگل جو کسی کی ملکیت نہ ہو تمام لوگوں کے لیے مباح ہوتا ہے، اس کے ساتھ تمام لوگوں کے منافع متعلق ہوتے ہیں، ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر کوئی اس کو قابلِ کاشت بنائے تو وہ اس زمین کا مالک نہیں بن سکتا۔

لما فی الهندية: وكذا ما كان خارج البلدة من مرافقها محتطباً لاهلها ومرعى لهم لايكون مواتاً۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۸۶ كتاب احياء الموات) [1]

ایسی زمین جس میں جنگل ہو موات میں داخل نہیں۔

سوال:۔ بعض لوگ کسی غیر آباد | **بنجر زمین پر محض نشانات لگانے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی**

زمین کو اپنی ملکیت میں لانے کے لیے اس کے اردگرد پتھروں کی دیوار بنا دیتے ہیں تو کیا ایسی زمین پر صرف نشانات لگانے یا دیوار بنا دینے سے کوئی اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بنجر اور غیر آباد زمین کی ملکیت اس وقت ثابت ہو گی جب اس کو قابلِ کاشت بنا لیا جائے، اس میں کھیتی باڑی کی جائے یا کسی قسم کی تعمیر کی جائے، کسی قسم کے نشانات لگانے یا پتھروں کی دیوار بنا کر حد بندی کرنے سے کوئی اس زمین کا مالک نہیں بن سکتا۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: ومن حجر ارضاً اى منع غيره منها بوضع

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: ولا يجوز احياء ما قرب من العامر بل يترك مرعى لهم ومطرحاً لحصائدهم لتعلق حقهم به فلم يكن مواتا وكذا لو كان محتطباً۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۵ ص۲۷۸ كتاب احياء الموات)

ومثله فى البدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ كتاب الاراضى

علامته من حجر او غیرہ ثم اھملھا ثلٰث سنین دفعت الی غیرہ فہلا ھو احق بھا وان لم یملکھا لانہ انما یملکھا بالاحیاء والتعمیر لا بمجرد التحجیر

(الدر المختار علی ھامش رد المختار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)[1]

غیر مملوکہ مشترکہ چراگاہ کی زمین آباد کرنے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی

سوال: ایک زمین دو گاؤں والوں کے مابین صدیوں سے مشترکہ چراگاہ کے طور پر چلی آرہی ہے اور یہ غیر آباد زمین کسی کی ملکیت بھی نہیں ہے، اس کا کچھ حصہ بعض لوگوں نے کافی عرصے سے آباد کرکے اُسے قابلِ کاشت بنایا ہوا ہے، اب اس مشترکہ زمین کی کل تقسیم ہو رہی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا آباد شدہ زمین آباد کرنے والوں کی ملکیت ہوگی یا کل تقسیم میں اس کی تقسیم بھی ہوگی ؟

الجواب :۔ اگر اس زمین سے دونوں گاؤں کے لوگوں کی ضروریات مثلاً چراگاہ یا محطبہ (جنگل) وغیرہ وابستہ ہوں تو یہ موات کے حکم میں نہیں، اُسے آباد کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں اور نہ ہی محض آباد کرنے سے کسی کی ملکیت ثابت ہوگی، لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں آباد شدہ زمین بھی کل تقسیم میں داخل ہوگی۔

لما فی الھندیۃ : وکذا ما کان خارج البلدۃ من مرافقھا محتطباً لاھلھا ومرعیٰ لھم لا یکون مواتاً حتی لا یملک الامام اقطاعھا۔ انتھٰی

(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء موات)[2]

---

[1] قال العلامۃ المرغینانی ؒ : لان التحجیر لیس باحیاء لیملکہ بہ لان الاحیاء انما ھو العمارۃ التحجیر للاعلام۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء موات)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔

[2] قال العلامۃ التمرتاشیؒ : ولا یجوز احیاء ما قرب من العامر بل یترک مرعیٰ لھم ومطرحاً لحصائدھم لتعلق حقھم بہ فلو یکن مواتاً وکذا لو کان محتطباً۔

(تنویر الابصار علی ھامش رد المختار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی البدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی۔

بنجر زمین کو آپس میں تقسیم کر کے آباد کرنا

سوال :۔ اگر کسی علاقہ کی زمین بنجر پڑی ہو اور وہاں کے سرکردہ افراد اس کو وہاں کے تمام افراد میں تقسیم کر دیں، اس کے بعد کچھ صاحب استطاعت اسے آباد کر لیں اور کچھ لوگ آباد نہ کر سکیں تو کیا آباد کنندگان کے لیے ان زمینوں کے حاصلات جائز ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ ایسی تقسیم کے بعد جو آدمی بھی اپنے حصہ کی زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اس کے حاصلات اس کے لیے جائز ہوں گے کیونکہ یہ زمین حقیقت میں غیر آباد ہے صرف برائے نام سب لوگ اس میں شریک ہیں کہ اس علاقہ کی زمین ہے ۔

واخرج الامام ابوداؤدؒ : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضاً میتۃً فھی لہٗ ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات) [1]

احیاء موات کا حق ہر ایک کو حاصل ہے

سوال :۔ موجودہ معاشرہ میں بعض لوگ حجام، لوہار، ترکھان، جولاہا وغیرہ کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو گھٹیا تصور کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ کسی غیر آباد زمین کو آباد کر لیں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا حق نہیں، کیا ایسا کرنا اور کہنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ احادیث اور کتب فقہ میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ جو کوئی بھی کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، کسی بھی فقیہ نے اس مسئلہ میں اس قسم کی تخصیص بیان نہیں کی ۔ احیاء موات کے حکم میں تعمیم ہے ۔ من احییٰ ارضاً میتۃً فھی لہٗ ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات) اس حدیث میں لفظ مَنْ عام ہے، اس عموم میں بلا دلیل تخصیص کرنا صحیح نہیں ۔ فقہاء کرام نے بھی لفظ مَنْ استعمال کیا ہے : ومن احیاء باذن الامام ملکہ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۳۵) بلکہ ذمی غیر مسلم بھی احیاء موات سے مالک بن سکتا ہے جبکہ حجام، جولاہا اور لوہار، ترکھان وغیرہ تو مسلمان ہیں ۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ ، ویملکہ الذمی بالاحیاء

---

[1] اخرجہ الامام ترمذی رحمہ اللہ : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضاً میتۃً فھی لہٗ ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء الموات ۔

کما یملکہ المسلم ۔ (الھدایۃ ج ۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء الموات) ؎۱

غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا بلاشرکت غیرے اس کا مالک ہوتا ہے

سوال:۔ ہم نے کچھ غیر آباد زمین کو سترہ سال قبل آباد کیا تھا، کیا شرعاً اس میں ہمارے ساتھ کوئی اور شریک ہو سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں تھی اور نہ اہلِ قریہ کے منافع اس کے ساتھ وابستہ تھے تو آپ بلاشرکت غیرے اس زمین کے مالک ہیں بشرطیکہ حکومت کی اجازت سے آباد کی ہو، کیونکہ مردہ زمین کو آباد کرنے والا ہی اس کا مالک ہوتا ہے کسی کا بھی ایسی زمین کے ساتھ حق متعلق نہیں ہوتا۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہٗ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب ما ذکر فی احیاء ارض الموات) ؎۲

(ترجمہ) "جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا یعنی قابلِ کاشت بنایا وہ زمین اسی کی ہے۔"

مفادِ عامہ سے خارج رقبے کو آباد کرنے والا مالک متصور ہوتا ہے

سوال:۔ اگر کسی علاقے میں پہاڑی اور غیر آباد بنجر زمین کو وہاں کے رہنے والے لوگ آباد کرلیں تو کیا وہ آباد کرنے سے اس کے مالک بن جاتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ علاقہ کے بعض بااثر لوگ ان کی ملکیت کے ثابت ہونے کی مخالفت کرتے ہیں؟

الجواب:۔ جو پہاڑ کسی کی ملکیت نہ ہوں اور ان کا تعلق علاقے کے مفادِ عامہ سے بھی نہ ہو تو اس کو باقاعدہ حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا شریعت کی رو سے

؎۱ لما فی الھندیۃ: عند ابی یوسفؒ و محمدؒ یثبت بنفس الاحیاء۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۰ کتاب احیاء الموات۔

؎۲ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہٗ ولیس لعرق ظالم حقٌ۔ (ابو داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات)
ومثلہٗ فی فتح الودود حاشیۃ ابی داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات۔

اس کا مالک متصور ہوگا۔

لما قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفیؒ: اذا احیا مسلم او ذمی ارضاً غیر منتفع بہا ولیست لمملوکۃ لمسلم ولا ذمی وھی بعیدۃ من القریۃ ملکہا واعتبر محمد عدم ارتفاق اھل القریۃ وبہ یفتی۔

(الدر المختار علی ھامش ردالمحتار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات) [1]

غیر مسلم کیلئے احیاء موات کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ہندو اور سکھ بھی رہتے ہیں، انہوں نے حکومت کی اجازت سے گاؤں کی بنجر زمین کو آباد کیا اور اب اس میں مختلف فصلیں کاشت کرتے ہیں، تو کیا یہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ موات کی احیاء کرنے والے کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں، اگر کوئی غیر مسلم بھی حکومتِ وقت کی اجازت سے علاقے کی بنجر زمین کو آباد کرے تو وہ اس کی ملکیت متصور ہوگی۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں بنجر زمین کو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والے ہندو اور سکھ اس کے مالک متصور ہوں گے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: اذا احیی مسلم او ذمی ارضا غیر منتفع بہا ولیست بمملوکۃ لمسلم ولا ذمی.......ملکہا ان اذن لہ الامام فی ذٰلک وقالا یملکہا بلا اذنہ وھٰذا لو مسلماً فلو ذمیا شرط الاذن اتفاقاً۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۷۷ کتاب احیاء الموات) [2]

---

[1] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہٗ۔

(سنن الترمذی ج۱ ص۲۵۶ باب ما ذکر فی احیاء ارض الموات)

وَمِثْلُہٗ فی البدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی۔

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ویملکہ الذمی بالاحیاء کما یملکہ المسلم لان الاحیاء سبب الملک الا ان عند ابی حنیفۃؒ اذن الامام من شرطہ فیستویان فیہ کما فی سائر اسباب الملک حتی الاستیلاء علی اصلنا۔

(الہدایۃ ج۴ ص۴۷۷ کتاب احیاء الموات)

موات کی تعریف

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! موات کسے کہتے ہیں، اور کون کون سی زمینیں اس میں داخل ہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ زمین جو گاؤں یا شہر سے باہر ہو اور اس پر کسی کی ملکیت نہ ہو اور نہ اس کے ساتھ کسی کا کوئی حق وابستہ ہو اور نہ وہ شہر یا گاؤں کے متعلقہ امور سے وابستہ ہو اس کو موات کہا جاتا ہے، لہٰذا جن زمینوں میں یہ شرائط پائی جائیں وہ موات میں داخل ہیں۔

قال العلامة الکاسانیؒ: فالارض الموات هی ارض خارج البلد لم تکن ملکا واحد ولا حقاله خاصًا فلا یکون داخل البلد مواتٌ اصلاً۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب احیاء الموات)[۱]

صرف قبضہ سببِ ملک نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص گاؤں کی بنجر زمین (شاملات) پر قبضہ کر کے سرکاری کاغذات میں اپنے نام انتقال کرائے لیکن اسے آباد نہ کرے بلکہ کئی سالوں سے اسی طرح بنجر رہنے دے تو کیا حاکمِ وقت یا اس کا نائب یعنی تحصیلدار وغیرہ وہی زمین کسی دوسرے شخص کو دے سکتا ہے یا نہیں تاکہ وہ اس کو آباد کرے؟

الجواب:۔ موات کی ملکیت کے لیے ضروری ہے کہ حاکمِ وقت یا اس کے نائب (تحصیلدار وغیرہ) کی اجازت سے بنجر زمین پر قبضہ کر کے اسے آباد کرے یعنی قابلِ کاشت بنائے صرف اس پر قبضہ کرنا سببِ ملک نہیں، اس لیے اگر حاکمِ وقت یا اس کا نائب وہ زمین کسی دوسرے شخص کو دینا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے تاہم

---

[۱] وفی الهندیة: فالارض الموات هی ارض خارج البلد لم تکن ملکا واحد ولا حقًا له خاصا فلا یکون داخل البلد موات اصلاً وکذا ما کان خارج البلدة من مرافقها محتطبا لاهلها ومرعیٰ لهم لا یکون مواتًا حتیٰ لایملك الامام اقطاعها وکذلك ارض الملح والقار ونحوها مما لایستغنی عنها المسلمون ارض موات حتیٰ لا یجوز للامام ان یقطعها لاحد۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۸۵ کتاب احیاء الموات)

حاکم کو تین سال تک انتظار کرنا ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ومن حجر الارض ای منع غیرہ منها بوضع علامة من حجر او غیرہ ثم اهملها ثلاث سنین دفعت الیٰ غیرہ وقبلها هو احق بها وان لم یملکها لانہ انما یملکها بالاحیاء والتعمیر لا بمجرد التحجیر۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج ۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)[1]

لیز موجبِ ملک نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض دفعہ حکومت کسی بنجر قطعہ زمین کو سو سال یا اس سے کم و بیش مدت کے لیے کسی شخص کو لیز یا پٹہ پر دے دیتی ہے اور اس شخص سے سالانہ یا جملہ مدتِ لیز کی رقم بصورتِ اجارہ وصول کرتی ہے، اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ اس مدت کے گذر جانے کے بعد یہ زمین حکومت کو واپس کر دی جائے گی۔ تو کیا لیز (پٹہ) پر زمین لینے والا آدمی اس زمین کا مالک بن جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اجارہ و لیز موجبِ ملک نہیں، یہ آدمی صرف اتنی مدت تک ہی اس زمین سے انتفاع حاصل کر سکتا ہے جتنی مدت تک زمین لیز وغیرہ پر حاصل کی گئی ہو، مدتِ اجارہ ختم ہونے کے بعد زمین حکومت کو واپس کی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ لیز یا اجارہ پر زمین لینے والا شخص اسے فروخت نہیں کر سکتا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: او ارضا بشرط ان یثنیها ان یحرثها او یکری انهارها العظام او یسرقنها لبقاء اثر هٰذہ الافعال لرب الارض فلو لم تبق لم تفسد۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قولہ (بشرط ان یثنیها) فان کان اثرہ یبقی بعد انتهاء العقد یفسد لان فیه منفعة لرب الارض والا فلا۔ (رد المحتار ج ۵ ص۴۱ کتاب الاجارة- باب الاجارة الفاسدة)

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ ومن حجر ارضا ولم یعمرها ثلاث سنین اخذها الامام ودفعها الیٰ غیرہ لان الدفع الی الاول کان لیعمرها فتحصل المنفعة للمسلمین من حیث العشر والخراج فاذا لم یحصل یدفعه الیٰ غیرہ تحصیلا للمقصود لان التحجیر لیس باحیاء لیملکه به۔

(الهدایة ج ۴ ص۴۷۴ کتاب احیاء الموات)

سرکاری شاملات زمین پر کسی کے قبضہ سے احیاء کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں کے قریب پرانی زمین ہے جو کہ ارضِ موات یعنی شاملاتِ دیہہ ہے، اب ایک آدمی نے جو کہ دوسرے علاقہ سے آیا ہے اس شاملات زمین کا کچھ حصہ اپنے نام پر انتقال کرالیا ہے، کیا اس شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شاملات زمین کا اپنے نام انتقال کرالے، واضح ہو کہ یہ زمین گاؤں سے تقریباً ۲ کلومیٹر دور ہے، اس بارے میں شرعی حکم صادر فرما کر ممنون فرمائیں؟

الجواب:۔ ایسی سرکاری شاملات جس سے اہلِ دیہہ کے مرافق متعلق ہوں اس کا احیاء درست نہیں ہے اور اسی وجہ سے ایسی زمین کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اسے تمام اہلِ دیہہ کے منافع اور مرافق کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور اگر اہلِ دیہہ کا اس سے مشترکہ مفاد وابستہ نہ ہو تو اس کا احیاء درست ہے مگر اس کے لیے اذنِ امام یعنی حاکمِ وقت کی اجازت شرط اور ضروری ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: اذا احيا مسلم او ذمي ارضاً غير منتفع بها وليست بمملوكة لمسلم ولا ذمي فلو مملوكة لم تكن مواتا فلو لم يعرف مالكها فهي لقطة يتصرف فيها الامام ـــ وهي بعيدة من القرية اذا صاح من باقصى العامر لا يسمع بها صوته ملكها عند ابي يوسف رح ان اذن له الامام في ذلك وهو المختار ان اذن له الامام في ذلك يملكها بلا اذنه الخ (الدر المختار على هامش ردّ المحتار ج ۵ ص ۳۰۶، ۳۰۷ كتاب احياء الموات) [۱]

---

[۱] وفي الهندية، قال القدوري فما كان عادياً الى قدم خرابه لا مالك له او كان مملوكاً في الاسلام لا يعرف له مالك بعينه وهو بعيدٌ عن القرية ـــــ وبعد اسطر قال وملك في الموات يثبت باحياءٍ باذن الامام الخ

{الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۳۸۶
كتاب احياء الموات}

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اندریں صورت کہ ۱۹۴۷ء میں علاقہ کشمیر پر مسلمانوں نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں کئی ہندو مارے گئے، کئی روپوشش ہو کر بھاگ گئے، بعدہٗ مسلمانوں نے ان کے مال و متاع پر قبضہ کر کے اپنے استعمال میں لائے اور ان کے مکانوں، مندروں اور گرجوں وغیرہ کی چادریں اکھیڑ کر اپنے ملک میں لائے اور یہاں مساجد کی تعمیر میں ان کو استعمال کیا۔ اب ایک مولوی صاحب نے کہا ہے کہ ہندوؤں کے متروکہ مکانوں اور مندروں وغیرہ کی چادریں مساجد کی تعمیر میں استعمال کرنا مسلمانوں کے لیے حرام ہے اور ایسی مساجد میں نماز باجماعت ادا کرنا ناجائز ہے، اور ان چادروں کو ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے خرید بھی نہیں۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ایسی چادریں اور اس طرح کا دیگر ساز و سامان مساجد کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور ایسی مساجد عند الشریعت مسجد کا حکم رکھتی ہیں یا نہیں؟ نیز مسلمانوں کے لیے ایسی چادروں اور دوسرے سامان کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ سب سے پہلے تو یہ بات تحقیق طلب اور قابلِ غور ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں نے کشمیر میں ہندوؤں پر جو حملے کیے ہیں اس کو شرعاً جہاد کہا جا سکتا ہے یا نہیں! ہمارے نزدیک تو کتبِ فقہ سے جہاد کے متعلق جو کچھ ثابت اور معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاد مقرر ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کا ہو جائے اور اسلام معزز ہو اور کفر کے تمام قواعد اور رسم و رواج نیست و نابود ہوں۔ بناء علیہ فقہاء کرام نے وجوبِ جہاد کے لیے چند شرائط لکھے ہیں: اوّل یہ کہ مسلمان اتنی تعداد میں ہوں کہ جس سے شان و شوکت پیدا ہو۔ دوم یہ کہ ان کا خرچ بھی مہیا ہو۔ سوم یہ کہ ان کے لیے امن و حفاظت کی جگہ بھی ہو کہ کفار کے شر سے نجات حاصل ہو اور عند الحاجت کام آوے۔ اور اگر مسلمانوں کو یقین ہو کہ غلبہ کفار کو ہو گا تو اس صورت میں جہاد فرض نہیں ہے "جامع الرموز" میں ہے: الجہاد فرض عین بشرط القدرۃ علی القتال والسلاح وانواد والرواحلۃ ..... انتہیٰ ـــــ اور فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: والثانی ان یرجوا الشوکۃ والقوۃ لاھل الاسلام وان کان لا یرجوا الشوکۃ للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ ....

اسی طرح درمختار، شامی اور فتح القدیر میں بھی مذکور ہے۔

اب اس تفصیل کی روشنی میں ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں پر مسلمانوں کے حملوں کو اگر جہاد کہا جاوے اور اس دوران جو کچھ املاکِ کفار یعنی ہندوؤں کے اموال میں سے مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے وہ مالِ غنیمت ہے اور اس کا ذاتی استعمال میں لانا، خرید و فروخت کرنا، اور مساجد کی تعمیر میں لگانا درست ہے اور وہ مساجد بہرحال شرعی مسجد ہوں گی اور ان میں نمازیں پڑھنا درست ہے۔ (فقط واللہ اعلم)

گاؤں یا شہر کے قریب بنجر زمین آباد کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے قریب ایک قطعہ اراضی بنجر پڑا ہے جس میں گاؤں کے لوگ اپنے جانور وغیرہ چراتے ہیں اور اپنے مویشیوں کے لیے چارہ وغیرہ لاتے ہیں، اب ایک شخص تحصیلدار کی اجازت سے اس کو آباد کرنا چاہتا ہے جبکہ ایسا کرنے میں گاؤں کے لوگوں کی اکثریت کا نقصان ہے۔ تو کیا شرعاً یہ قطعہ زمین آباد کرنا جائز ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب:۔ کسی بنجر زمین کو آباد کرنا اور اس کو کارآمد بنانا ایک اچھا عمل ہے مگر اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ گاؤں یا شہر والوں کا نقصان نہ ہو، اسی طرح وہ زمین گاؤں یا شہر کے قریب نہ ہو کہ لوگ اس سے اجتماعی طور پر فائدہ اٹھاتے ہوں صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ بنجر زمین چونکہ گاؤں کے قریب ہے اور گاؤں والے اس کو بطور چراگاہ استعمال کرتے ہیں اس لیے اس زمین کو تحصیلدار کی اجازت کے باوجود آباد کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں گاؤں والوں کا اجتماعی نقصان ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ: لا یجوز احیاء ما تقرب من العامر ویترك مرعیٰ لاهل القریة ومطرحاً لحصائدهم لتحقق حاجتهم الیها حقیقتها او دلیلها علیٰ ما بیناه فلا یکون مواتاً لتعلق حقهم بها بمنزلة الطریق والنهر۔الخ (الهدایة ج۴ ص۴۲۸ کتاب احیاء الموات)

تحدیدِ ملکیتِ زمین

انفرادی اور شخصی ملکیت

موجودہ دور میں معاشی اور اقتصادی بدحالی کی اصل وجہ اصولِ دین اور احکامِ اسلام سے بُعد ہے جب تک ہم اسلام کے ہمہ گیر بہترین اور ابدی اصولوں پر عمل پیرا رہیں گے من حیث قوم و ملک ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے۔ اسلام کے انہی زرین اصولوں سے دوری ہی کا نتیجہ ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں متمول اور سفید پوش طبقہ کے درمیان معاشی تفاوت کی وجہ سے اقتصادی زبوں حالی پیدا ہو چکی ہے اور پورا ملک اس وقت بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ ملک کی اکثر سیاسی جماعتوں اور حکمران طبقہ نے اپنے طور پر اس کا یہ حل نکالا کہ عارضی یا مستقل طور پر ملکیتِ زمین کی تحدید کر دی جائے اور اس کو قانونی شکل دینے کے لیے کوشش بھی کی گئی، جب پر علماء کرام نے حکومت کے اس موقف پر شرعی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی۔ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ نے بھی "تحدید ملکیتِ زمین کے دلائل کا ایک جائزہ" کے عنوان سے ایک جامع مضمون لکھا جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے "انفرادی اور شخصی ملکیت" کے عنوان سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔ ماہنامہ الحق نے ان ہر دو گرانقدر مضامین کو شائع کیا، جنہیں اب افادۂ عام کے لیے فتاویٰ کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

تحدید ملکیت زمین کے دلائل کا ایک جائزہ

اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں

ملک کے متمول اور فقراء کے درمیان معاشی تفاوت اور اقتصادی بدحالی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے مقرر کردہ اصول اور احکام سے بُعد ہوتا گیا۔ اموال کے حقوق ادا نہ ہوئے اور استحصال زر میں حلال وحرام کی تمیز نہ کی گئی، نتیجہ میں وہ شدید بحران رونما ہوا جس سے پورا ملک دوچار ہے۔ اس کا علاج زمینوں کی ملکیت کی حد تک اکثر سیاسی جماعتیں یہ تجویز کر رہی ہیں کہ زمین کی ملکیت کی ایک خاص حد مقرر کی جائے۔ یہاں تک کہ بعض مذہبی جماعتوں سے بھی اس سلسلہ میں بے احتیاطی ہوئی اور عارضی طور پر یا مستقلاً تحدید ملکیت زمین کو اپنے منشوروں میں جگہ دی حالانکہ معاشی بے اعتدالی اور بدحالی کے فساد کا علاج تحدید ملک سے نہیں ہو سکتا۔ عملی اور واقعاتی تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے۔ کہ اس علاج سے مرض تو زائل ہو نہیں سکتا۔ مگر دین میں بلا دلیل ایک گونہ تحریف و ترمیم کا ارتکاب ہو جائے گا۔ اور مسئلہ بھی اپنی جگہ لاینحل رہے گا۔

اگر زمینداروں کے پاس سو سوا سو ایکڑ زمین چھوڑ کر زائد اس سے لے لی جائے اور حکومت اس زائد زمین کو ملک کے تمام بے زمین افراد پر بمطابق ضرورت تقسیم کرے تو ملک کی آبادی کے تناسب سے یہ محدود زمین ہرگز سب افراد تک نہیں پہنچ سکتی۔ بعض کو دی جائے اور بعض محروم رہیں۔ تو فساد اپنی جگہ قائم رہا۔ پھر اس تحدید شریعت کے کئی احکام مثلاً میراث وغیرہ منسوخ اور معطل ہو جائیں گے۔ پھر جبکہ بسا اوقات ارباب اقتدار ایسے عارضی اور مصلحتی قوانین کو دائمی حیثیت دے دیتے ہیں تو قانون وراثت مستقل طور پر معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ ب۔ یہ تحدید سوشلزم

کیلئے سنگ بنیاد ہے، کیونکہ تحدید ہی کے دلائل سے سرے سے شخصی ملکیت میں نفی ہو سکتی ہے۔

(ج) جن نظائر اور شواہد کو کھینچ تان کر تحدید ملکیت کے لئے وجہ جواز بنایا جاتا ہے تاکہ روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے ٹھیک اسی طرح عزل، اسقاط حمل وغیرہ نظائر و شواہد کے بنا پر تحدید نسل (خاندانی منصوبہ بندی) کیلئے بھی وجہ جواز نکالی جا سکتی ہے تاکہ روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے۔ اگر وہ تحدید جائز نہیں تو یہ کیوں جائز ہے۔؟

نظائر اور شواہد کا جائزہ | بعض حضرات نے حاکم وقت کو اقتصادی بدحالی دور کرنے کے لئے تحدید ملکیت کے اصول بنانے کا اختیار دیا ہے ——— اور اسی ضمن میں کچھ دلائل پیش کئے ہیں۔ ہم اس کا بھی مختصراً جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

(الف) اس میں شک نہیں کہ فقراء اور مساکین کو اگر ضروریات زندگی میسر نہ ہوں اور ہلاکت کا خطرہ ہو تو حکومت ذخیرہ اندوزی کرنے والوں سے جبری طور پر غلہ وغیرہ لیکر فقراء کی حاجت برآری کر سکتی ہے اور فقراء بھی براہ راست اضطراری حالت میں بغیر رضاء مالک غلہ وغیرہ لیکر اپنی ضروریات میں خرچ کر سکتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں لازمی ہے کہ تنگی اور ضرورت ختم ہونے پر اس کے مالکوں کو معاوضہ دیا جائے۔ قال فی الدر المختار لو خاف الامام علی اهل بلد الهلاك اخذ الطعام من المحتكرين وفرق عليهم فاذا وجد واسعة ردوا مثله؛ ومن اضطر لمال غيره ويخاف الهلاك تناوله بلا رضاه ونقله الزيلعي عن الاختيار واقره۔ (الدر المختار ج ص)

اور علامہ ابن حزم ظاہری نے بھی المحلی ج ۵ ص۴۵۲ میں لکھا ہے کہ اغنیاء پر فرض ہے کہ فقراء کی ضروریات کو پورا کریں اور حاکم وقت کے لئے جائز ہے کہ اغنیاء کو اس بات پر مجبور کرے علامہ کی اصل عبارت یہ ہے۔

وفرض على الاغنياء من اهل كل بلد ان يقوموا بفقرائهم ويجبرهم السلطان على ذلك ان لم تقم الزكوة بهم ولا فى سائر اموال المسلمين بهم فيقام لهم بما يأكلون من القوت الذى لابد منه ومن اللباس للشتاء والصيف بمثل ذلك وبمسكن يكنهم من المطر والصيف والشمس وعيون المارة - انتهى۔

لیکن ابن حزم مالکان اموال کو معاوضہ دینے کا بھی قائل نہیں اور یہ اسکی تفردات میں سے ہے۔ الغرض ضرورت کے وقت اغنیاء کے اموال سے فقراء کی حاجت برآری فرض ہے۔ مگر اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ بادشاہ وقت زمین کے قانونی مالکوں سے زمین چھین کر

بے زمین لوگوں کو زمین بھی فراہم کرے گا۔

ب ۔ رہا ابو عبیدہ بن الجراح کا جہاد کے دستہ پر تین سو ساتھیوں کو اپنا اپنا تمام توشہ اکھٹا کرنے کا حکم دینا (بخاری ص۶۲۵) اور اس سے اپنا مدعیٰ ثابت کرنا تو اس سے بھی تحدید ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس واقعہ میں نہ تو یہ توشے ابو عبیدہؓ کی ملکیت بنائے گئے تھے اور نہ اوقاف کی طرح غیر مملوکہ تھے۔ بلکہ ان میں ملکیت شخصی بہر حال باقی تھی اور اباحت کی شکل میں ایک دوسرے کے راشن سے فائدہ اٹھانے کا کہا گیا تھا۔ غزوۂ خیبر میں ستو کا اکھٹا کرکے یکساں تقسیم کرنے کی بھی یہی حقیقت ہے۔

ج ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت بلالؓ کو دی گئی وادی عقیق کی زمین واپس لے لینے کو بھی تحدید ملکیت کیلئے پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ زمین غیر آباد (موات) تھی حضرت عمر نے صرف وہی حصہ اس سے واپس لیا جو انہوں نے آباد نہیں کیا اور جو آباد اور زیر کاشت لایا گیا تھا۔ اُسے واپس نہیں لیا (رواہ یحیٰ بن آدم عن عبداللہ بن ابی بکر کذا فی التعلیق علی الاموال ص۲۹۰) اور یہ اب بھی جائز ہے کہ جب ایک شخص تین سال کے اندر اندر ارض موات کو آباد نہ کرے تو حکومت وقت اس کو واپس لے سکتی ہے، کیونکہ ارض موات میں آباد کرانے سے قبل صرف قبضہ سے ملکیت ثابت ہی نہیں ہوتی، ہدایہ میں ہے:

فبقی غیر مملوک کما کان ھو الصحیح (ج ۴ ص۴۶۳)	ایسی زمین غیر آباد ہونے کی وجہ سے مملوک ہی نہیں ہوتی بلکہ غیر مملوک ہے۔

د ۔ اس میں شک نہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجاہدین کی خوشی اور طیب خاطر سے قبیلۂ ہوازن کے وفد کو ان کے قیدی واپس دے تھے۔ (بخاری ص۶۱۱) مگر اس سے بھی تحدید ملک کا جواز معلوم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اولاً تو یہ احتمال موجود ہے کہ یہ واپسی تقسیم سے قبل ہوئی ہو۔ جیسا کہ ابن کثیر کی رائے ہے کہ:

وظاھر سیاق حدیث عمرو بن شعیب الذی اوردہ محمد بن اسحٰق عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ردّ الی ھوازن سبیھم قبل القسمۃ۔ (تاریخ ابن کثیر ج۴ ص۳۵۵)	حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے بنو ہوازن کو ان کے قیدی تقسیم سے پہلے پہلے واپس کر دئے تھے۔

اس احتمال کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ ملکیت شخصی ثابت ہی نہیں ہوئی تھی، جبکہ تحدید ملکیت میں تو شخصی ملکیت کا ازالہ ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ واپسی تقسیم کے بعد ہوئی، جیسا کہ بخاری کی روایت وقد کنت استأنیت بکم سے مفہوم ہوتا ہے تو اس سے بھی حاکمانہ اور جبری طور پر ملکیت چھین لینے یا اسے محدود کر دینے کا جواز نہیں نکالا جا سکتا، اس لئے کہ یہاں واپسی طیب خاطر یعنی پوری رضا و رغبت سے ہوئی تھی اور اس طیب خاطر کی پوری رعایت اور تحقیق کر کے ایسا کیا گیا۔ اور ایسی واپسی اب بھی بالاجماع جائز ہے۔

پھر یہ بات بھی واضح رہے کہ اکثر مجاہدین نے قیدیوں کو مفت واپس کیا اور جن افراد مثلاً اقرع بن حابس اور عیینہ اور ان کی قوم نے مفت واپس کرنے سے انکار کیا (البدایۃ والنہایۃ ج۴ ص۳۵۳) اور انہیں معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا تو وہ عوض بھی قیمت اور ثمن نہیں تھا۔ کیونکہ اس وعدہ میں نہ ثمن کی مقدار معلوم تھی اور نہ اجل متعین تھا اور شریعت میں ایسی خرید و فروخت جائز ہی نہیں جس میں نہ قیمت معلوم ہو، نہ ادائیگی کی میعاد، یہاں تک کہ اس معاملہ میں تو ثمن کی ادائیگی اور اس کا تحقق بھی غیر یقینی تھا، جس پر بخاری کے یہ الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ کہ ومن احب منکم ان یکون علی حظہ حتی نعطیہ ایاہ من اول ما یفیئ اللہ علینا فلیفعل۔ (جو تم میں سے چاہے کہ اگر ہمیں اللہ نے مال غنیمت دی سے کچھ دیدیا تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔) ان الفاظ سے بھی یہی واضح ہو رہا ہے۔ پس اس حدیث سے بھی تحدید ملک یا تبدیل ملک کا استدلال غیر صحیح ہے۔

۵۔ پانچویں دلیل تحدید ملکیت کے لئے فقہاء کرام کے قاعدہ تحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام کو پیش کی گئی ہے، یعنی کسی عام ضرر کے ازالہ کی خاطر ضرر خاص برداشت کیا جائے، لیکن اس قاعدہ سے بھی تحدید ملکیت کے جواز کا استنباط درست نہیں، کیونکہ اس ملک میں ہر بے زمین شخص کو تو تکلیف اور مصیبت لاحق نہیں ہوتی، لاکھوں لوگ جو زمین کے مالک نہیں ہیں، مگر نہ ننگے ہیں نہ بھوکے بلکہ دیگر معاشی ذرائع کی وجہ سے آسودہ حال ہیں۔ ثانیاً کہ ضرر عام اگر موجود ہے تو دونوں طرف کو اور دونوں صورتوں میں ہے۔ البتہ طالبین تحدید عموماً وہ لوگ ہیں جو سوشلسٹ اقوام اور نظریات سے متاثر ہیں۔ اور عموماً ان کے دلوں میں حلال و حرام کی تمیز اور آخرت کا احساس نہیں، مذہب ان کے نزدیک ثانوی حیثیت کا حامل ہے، پیٹ

بقیہ : تحدید ملکیت زمین کے مسائل سے مذہب کو خاطر خواہ تعلق نہیں ثالثاً یہ کہ اس شر و فساد کے زمانہ میں جبکہ حکام و امراء عموماً بے دین خائن اور بد دیانت ہوتے ہیں ۔ مفاد پرستی ، رشوت ستانی ، سفارش اور اقرباء پروری ان کا شیوہ ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کو اراضی کی تحدید اور تصرف کی باگ ڈور سپرد کر دینا درحقیقت قوم اور ملک کی تباہی ہے ۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بیت المال اور اوقاف کے حکام پر خیانت کے اثرات ظاہر ہونے لگیں تو انہیں مسلمانوں کے اموال مصادرۃً لینے کا فتوی نہیں دیا جائے گا کیونکہ اس طرح کرنا حکام کو حرام خوری اور خیانت کا دروازہ کھول دینا ہے ۔ (درمختار مع ردمختار ج ۴ ص۲۸۵)

الغرض تحدید ملکیت کے جواز میں جبکہ دینی و علمی لحاظ سے بیشمار فتنوں اور اقتصادی و مالی لحاظ سے بیشمار حق تلفیوں اور بد دیانتیوں کا خطرہ ہے تو کیوں بے احتیاطی سے کام لیکر فتنوں کا دروازہ کھولا جائے ۔ لہذا تحدید ملکیت کے جواز یا حکومت کو اس کا حق دینے کا فتوی میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ اور میرا اس سے قطعاً اتفاق نہیں ۔۔۔

محمد فرید خادم دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ

❋

انفرادی اور شخصی ملکیت

جذبۂ نصح وخیر خواہی کی بنا پر "جماعت اسلامی" سے ایک گذارش کرنی ہے جو کسی قومی وملی موڑ پر حکمتِ عملی کا سہارا لے لیتی ہے۔ حالانکہ ان کے قائد مودودی صاحب کے الفاظ میں "کسی مقصد کی برتری کے لئے صرف مقصد کا اعلیٰ ہونا کافی نہیں بلکہ اس تک پہنچنے کے ذرائع اور خطوط بھی بے لاگ اور پاکیزہ ہونے چاہئیں"۔ مگر عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ مقصد برآری کی خاطر جماعت نہ صرف یہ کہ طریقِ کار کی صحت کا خیال نہیں رکھتی بلکہ دین کے ایک ایک اصول کو سیاست کے خراد پر چڑھا دیتی ہے۔ اس وقت جماعت اسلامی کا انتخابی منشور سامنے آچکا ہے۔ اس میں زراعت کے عنوان میں زمین کی ملکیت مغربی پاکستان میں سو اور دو سو ایکڑ کے درمیان اور مشرقی پاکستان میں ۱۰۰ ابیگھہ تک محدود کر دی گئی ہے اور تمہید میں کہا گیا ہے کہ

"غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں"۔ قطع نظر اس بات کے کہ شریعت کا مذکورہ قاعدہ کن حالات اور کن غیر معمولی تدابیر پر منطبق ہوتا ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے نہ تو زمین کے بارہ میں کسی قسم کی تحدید کی ہے اور نہ دیگر اموال واملاک میں انفرادی اور شخصی ملکیت کی کسی قسم کی حد بندی گوارا کی ہے۔ جائز اور حلال ذرائع سے جتنی بھی ملکیت حاصل کی جائے شریعت نہ صرف اسے جائز بلکہ اللہ تعالےٰ کی ایک نعمت قرار دیتی ہے۔ قرآن وحدیث ایسے نصوص و شواہد سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم نہ تو حالات کی نزاکت اور وقت کی رو میں بہہ کر ان کی تاویل کر سکتے ہیں اور نہ سوشلزم کا ہوّا کھڑا کر کے اس کے ڈر سے اسلام کے کسی مسئلہ میں تحریف اور تحدید کر سکتے ہیں۔ اسلام غیر محدود ملکیت سے نہیں روکتا، البتہ وہ مالک کو اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کا پابند بنا کر ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت

ملکیت کی تحدید کرتا جاتا ہے، یہ زکوٰۃ و عشر، یہ صدقات اور ہبات اور سب سے بڑھ کر اسلام کا قانونِ میراث تحدیدِ ملکیت نہیں تو اور کیا ہے مگر لامحدود کو محدود بنانے کا یہ منصوبہ قدرت کا بنایا ہوا ہے۔ ہم اس میں اضافہ کر سکتے ہیں نہ کمی، ہم مجرموں اور معاشرہ کی حق تلفی کرنے والوں کا ہاتھ توڑ سکتے ہیں، مگر انہیں کسی حلال کمائی کے ایک پیسہ سے نہیں روک سکتے۔

حکمتِ عملی کی پالیسی | ہمیں حالات کا مقابلہ اور خرابیوں کی اصلاح کرنی ہے۔ مگر یہ اصلاح ایسی نہیں کہ دین کے کسی اصول پر قینچی چلا کر فساد کا ایک اور دروازہ کھول بیٹھیں۔ دین کا مسئلہ بہرحال اپنی جگہ رہے گا۔ جماعت اسلامی اسے ہماری ناعاقبت اندیشی سمجھے یا کچھ اور ہم تو اس "حکمتِ عملی" کو بہرحال دین کے لئے زہرِ قاتل سمجھیں گے۔ اگر جماعت اسلامی غیر معمولی حالات کی وجہ سے ۲۰۰ ایکڑ تک زمین کی تحدید کو غیر معمولی تدبیر اور دین کے اصول سے غیر متصادم سمجھتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کل سوشلسٹ اور کمیونسٹ اسی دلیل سے ملکیتِ زمین کا حق قطعی طور پر چھین کر اسے "غیر معمولی تدبیر" اور دین کے اصول سے "غیر متصادم" قرار نہ دے بیٹھیں، اگر جماعت کی طرف سے دین کے اصول کی کوئی واضح تشریح بھی ہو جائے تو معاملہ صاف ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی چاہا اس نے کسی چیز کو اصول اور پھر جب چاہا تو "اسلام کے اصولوں سے غیر متصادم" کا فتویٰ لگا کر اسی اصول کو حکمتِ عملی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ آہ! اصولِ اسلام کی اس بے دردی سے پائمالی۔ جنگِ آزادی میں جمہوریت اور سیاسی نظام کو لات اور منات کہا گیا، مگر بعد میں یہی چیز اصل الاصول بن گئی۔ عورت کی امارت اور حکومت کو ہر حال میں اسلام سے متصادم کہا گیا، پھر یہی چیز وقت کا اہم ترین جہاد قرار پایا، انتخابی جدوجہد کو خلافِ شریعت کہا گیا، پھر یہی مشغلۂ روزگار بن گیا، مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کی تقدیس ہر حال میں قائم رکھنے پر زور دیا گیا، مگر پھر اس راہ کی ہر گری پڑی چیز کو گلے سے لگا کر رفیقِ جادۂ منزل بتایا گیا، اور اب مسئلہ ملکیت زمین میں گو د اسے

عارضی کہا گیا) ایک ایسا مؤقف اختیار کیا گیا جس کی مخالفت خود عمر بھر کا شیوہ بنا رہا تھا کا للتی نقضت غزلها من بعد قوۃ انکاثا معلوم نہیں جماعت کے عمائدین اس نئے اجتہاد اور حکمتِ عملی کی کیا توجیہہ کریں، تاویل جو بھی مگر یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ فلاں فلاں جماعتوں نے بھی ایسا کیا اور فلاں بزرگ نے بھی ایسا کہا ہے۔ اگر ایک چیز کا برائی ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے وزن میں اس بات سے کمی نہیں آسکتی کہ اور لوگ بھی ایسا کرتے ہیں، ایسی بات تو جرائم کی تاریخ میں بھی کسی نے نہیں کہی کہ میں اگرچہ مجرم ہوں مگر یہ تو ایک ایسا جرم ہے کہ ع در شہرِ شمار روز کنند۔ اور نہ کسی عدالت نے مجرم کے اس مؤقف کو قابلِ تسلیم قرار دیا ہے۔ تعدیل صحابہؓ، اور دیگر علمی و فقہی مسائل اور اب لاہوری مرزائیوں[1] کے بارہ میں جماعت کا یہی عذرِ گناہ سامنے آچکا ہے۔ مگر غلط بات غلط ہے خواہ اس کا کہنے والا کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اب رہا ملکیتِ شخصی کو سلب کرنا یا اسے محدود کرنا۔

شخصی ملکیت کے شواہد | تو جہاں تک اصل مسئلہ انفرادی اور شخصی ملکیت کا تعلق ہے، خواہ املاک منقولہ ہوں یا غیر منقولہ ہوں اسلام نے اسے انسان کا فطری حق بنایا ہے نہ تو اس کی تحدید کی جاسکتی ہے اور نہ عصرِ حاضر کے لادینی اقتصادی نظاموں کے علمبردار اس میں قطع برید کرسکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے آیت اولم یروا انا خلقنا لهم مما عملت ایدینا انعاما فهم لها مالکون میں انسان کی شخصی ملکیت پر مہرِ ثبت کردی ہے اور قرآن کی بے شمار آئتیں اس جملہ فهم لها مالکون (پس وہ اس کے مالک ہیں) کی تائید کرتی ہیں۔ جو لوگ ان الارض لله (زمین اللہ کی ہے) قسم کی آیات کو آگے پیچھے سے کاٹ

---

[1] مولانا مودودی نے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ لاہوری پارٹی کے مرزائی نہ مسلمان ہیں نہ کافر (س)

کر اپنے مدعی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہاں متصلاً اللہ نے خود یورثہا من یشاء (وہ
جسے چاہے زمین کا وارث بنا دے) یا اس کے ہم معنی الفاظ میں انفرادی ملکیت بیان
کر کے ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا ہے۔ قل اللھم مالک الملک کے ساتھ توتی الملک
من تشاء بھی ہے اور والذین یکنزون الذھب والفضۃ کے ساتھ ولا ینفقونھا
فی سبیل اللہ کی قید انسان کی انفرادی مالکیت کا اعلان کر رہی ہے۔ پھر وہ اسے اپنی ملکیت
میں ہر جائز تصرف کرنے اور اسے اپنی ملکیت سے منتقل کرنے کا حق بھی دیتا ہے۔ چنانچہ
بیع، شراء، ہبہ، تملیک، اعتاق، تدبیر، کتابت، اجارہ، اعارہ، مزارعت، وقف، رہن، قرض، صدقہ،
وصیت، میراث وغیرہ اس تصرف کے شواہد عدل ہیں۔ اسی طرح وہ کسی دوسرے مسلمان کے
مال و دولت میں ناجائز دست اندازی سے بچنے کو ایمان کی اولین علامت قرار دیتا ہے۔
ظلم و تعدی، چوری، ڈاکہ، خیانت، غصب، لوٹ کھسوٹ، جبر و استحصال کو حرام قرار دے کر
اسلام انسان کے شخصی ملکیت کا تحفظ کرنا چاہتا ہے۔ وہ یکساں طور پر سرمایہ دار اور غریب
دونوں کو ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل (ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ)
سے مخاطب کرتا ہے۔ الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ (الحدیث، (خبردار
کسی ایک کا مال دوسرے کو بغیر اس کی مرضی کے حلال نہیں) ارشاد نبوی ہے"

سوشلزم کی بنیاد ظلم و استحصال اور مادیت | پس جو لوگ سوشلزم کو تمام معاشی
خرابیوں کا مداوا سمجھتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اللہ بھیجے ہوئے عادلانہ نظام اسلام کے تمام
اصول و فروع کو تہس نہس کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ لوٹ کھسوٹ اور انسان کے تمام حقوق کی
پائمالی و بربادی کا ایک ایسا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف غریب اپنے رہے سہے
سکھ اور چین سے محروم ہو جائے بلکہ پوری قوم چند خونخوار درندوں کی جماعت کے رحم و کرم
پر رہ جاتی ہے، اسلام کے مذکورہ تمام اصول کو ایک طرف رکھ کر ایک لمحہ کے لئے فرض کریں
کہ سوشلزم آجاتا ہے اور وہ پوری قوم کو حق ملکیت سے محروم کر کے اللہ کی دی ہوئی تمام دولت

اور وسائلِ معاش کو ایک پارٹی کے حوالے کر دیتا ہے، تو کیا وہ پارٹی انسانیت کو اسکے تمام حقوق دلا دے گی۔ اور کیا وہ پارٹی موجودہ معاشرہ ہی سے ابھر کر سامنے آئی ہوگی یا آسمان سے فرشتوں کی شکل میں اترے گی۔ لیکن اگر اس کی اٹھان اس معاشرہ سے ہو جس کا مشت نمونہ خروار ۲۰۰ بدعنوان افسروں کی شکل میں سامنے آچکا ہے اور اس کا حل و عقد اس بیوروکریسی کے ہاتھوں میں ہو جو فائل کی سطح پر بڑے بڑے پراجیکٹ کھڑے کر کے پھر اُسے نذرِ سیلاب بھی کر دیتی ہے، اور اس طرح کروڑوں روپے ہضم کر کے فائل داخل دفتر کر دیتی ہے ——

تو خدارا ذرا سوچیئے کہ ایسے لوگوں کا لایا ہؤا سوشلزم یا کوئی بھی معاشی نظام انسان کے مال و جان اور اس کے حقوق میں مساوات قائم رکھ سکے گا —— ؟ ہرگز نہیں۔ سوشلزم کی بنیاد تاریخ کی مادی تعبیر پر ہے جس میں نہ خوفِ خدا کی گنجائش ہے، نہ محاسبۂ آخرت کی، اور نہ کسی تنقید اور نصیحت کی۔

مساوات یعنی مواسات استحصال نہیں احتساب | اس کے مقابلہ میں اسلام ہے جو ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جو ہر لمحہ اور ہر عمل میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، آخرت کا محاسبہ اس کے دل میں رچا بسا ہوتا ہے، ہر فرد کو دوسرے پر ظلم و غصب اور ہر برائی سے روکنے کا پورا حق ہے، اور وہ امیر کو بھی چاہے تو تلوار سے درست کر سکتا ہے، وہ اگر اسلامی قلمرو کے دوسرے سرے پر کسی کتے کے بھوک و پیاس سے مر جانے کی خبر سنتا ہے تو اللہ کے سامنے جواب دہی کے تصور سے تڑپنے لگتا ہے وہ ہر انسان کی بھوک و پیاس کو اپنی حاجت سمجھتا ہے اور جذبۂ ایثار سے خود فقیر رہ کر دوسروں کو اپنی متاع کا مالک بنا دیتا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل کی بنیاد مساوات پر نہیں بلکہ مؤاسات پر رکھی، وہ معاشی ناہمواری کو جبر سے نہیں بلکہ ایمان اور یقین کی بیداری سے حل کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے ایسا معاشرہ قائم کیا خلافتِ راشدہ اس کی واضح مثال ہے۔

سوشلزم اور گھر گھر کا بھیدی | دوسری طرف سوشلسٹوں کے طور طریقے تھے، اور جبر و ظلم کی

اساس پر ایک ایسی عمارت اٹھائی گئی جو نصف صدی میں دم توڑتی نظر آنے لگی ہے۔ "تاریخ کی اس مادی تعبیر" پر تازہ چانٹا حال ہی میں روس کے سیکرٹری جنرل برزنیف نے یہ کہہ کر رسید کیا کہ روس میں سوشلسٹ نظام عملاً ناکام ہو چکا ہے۔ اور اس طرح فشهد شاهدٌ من اهلها کا ایک نمونہ سامنے آگیا ـــــ الغرض ہمارے پاس معاشی اور معاشرتی یگانگت کے لئے اسلام جیسا نسخہ کیمیا موجود ہے، مگر افسوس اور صد افسوس کہ نہ تو ہم نے اسے سمجھا نہ پرکھا اور نہ کبھی آزمایا ومن لم یذق لم یدر۔ ؏

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سوشلزم عیار لیڈروں کا دام فریب | ہماری اس بے علمی اور حقیقت سے بیخبری سے موجودہ دور کے ابن الوقت سیاست دانوں نے خوب فائدہ اٹھایا بیچارے عوام اسے اپنی ساری بربادیوں کا تریاق سمجھ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگے اور اس حقیقت سے غافل ہو گئے کہ چور اپنی کمین گاہ تک پہنچا کر رہی سہی پونجی سے بھی ہمیں محروم کر دے گا۔ بات ناشائستہ سی ہے مگر مثال خوب چسپاں رہے گی کہ ہمارے علاقہ میں بچے کا ختنہ کراتے وقت عموماً بچے کو اِدھر اُدھر کی بھول بھلیوں میں بہلایا جاتا ہے اور ختنہ کا عین موقعہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں وہ دیکھو سونے کی چڑیا اڑ رہی ہے اور ابھی تیرے قدموں میں ہے۔ بچہ شوق سے نگاہ اٹھاتا ہے اور ادھر اپنے جسم کے ایک حصہ سے محروم۔ تو ہمارے ہاں سوشلزم کی مثال اُسی "سونے کی چڑیا" کی سی ہے جس سے عیار لیڈر خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں ـــــ (فروری ۱۹۷۴ء)

❄

کتاب المزارعت

(مزارعت کے احکام ومسائل)

مزارعت کی چند صورتیں

سوال :۔ ہمارے معاشرہ میں علاقائی سطح پر مزارعت کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں۔ بعض علاقوں میں مالکِ زمین کو تخم کھیتی باڑی یا دوسرے اخراجات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا شرعی نقطۂ نظر سے مالکِ زمین پر یہ ذمہ داری عائد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ مزارعت کا معاملہ ظاہر الروایۃ کی رُو سے تین صورتوں میں جائز ہے :۔

(۱) زمین اور تخم ایک طرف سے ہو اور بیل وعمل (محنت) دوسری طرف سے۔

(۲) زمین ایک طرف سے اور عمل وگائے وتخم دوسری طرف سے۔

(۳) زمین، بیل اور تخم ایک طرف سے اور عمل (محنت) دوسری طرف سے۔

ان جملہ تین صورتوں میں مزارعت کا معاملہ شرعاً جائز ہے۔

لما قال العلامة ابو الحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ : اذا کانت الارض والبذر لواحدٍ والعمل والبقر لواحدٍ جازت المزارعة وان کانت الارض لواحدٍ والعمل والبقر والبذر لآخر جازت المزارعة وان کانت الارض والبذر والبقر لواحدٍ والعمل لآخر جازت۔ (مختصر القدوری ص۲۰۸ کتاب المزارعة)[1]

فصل کی کٹائی کی ذمہ داری کا حکم

سوال :۔ بعض علاقوں میں مالکِ زمین کسان (مزارع) پر دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ فصل کے تیار ہونے پر کاٹ کر صفائی کرکے مالک کے گھر پہنچائے گا کیا

---

[1] قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمه الله : (وکذا) صحت (لو کان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للآخر) (او الارض له والباقی للآخر) (او العمل له والباقی للآخر) فهذه الثلاثة جائزة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۷۵ کتاب المزارعة)

ومثله فی الهدایة ج۴ ص۴۲۴ کتاب المزارعة۔

کسان (مزارعہ) کیلئے ان شرائط کی پابندی ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ظاہرالروایۃ میں گنجائش نہ ہونے کے باوجود متاخرین علماء نے عرف کو مدنظر رکھتے ہوئے قاضی ابویوسفؒ کی رائے کو اختیار کرکے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ کسان (مزارعہ) پر فصل کاٹنے اور تیار کرنے کی ذمہ داری ڈالنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم فصل کو مالکِ زمین کے گھر پہنچانے کی ذمہ داری کی نشاندہی عام کتابوں میں نہیں ملتی البتہ اگر کسان بطور احسان یہ فریضہ سرانجام دے تو ایسا عمل طرفین کے باہمی تعلقات پر اچھے اثرات مرتب ہونے کا باعث بنتا ہے۔

لما قال العلامة علاؤالدين الحصكفيؒ: (وصح اشتراط العمل) كحصاد و دياس ونصف على العامل وعند الثاني على العامل وهو الاصح) وعليه الفتوىٰ۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص ۲۸۲ كتاب المزارعة) [1]

کسان (مزارعہ) کا مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر فصل سے کچھ لینا

سوال:۔ مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر کسان فصل سے کوئی چیز لے سکتا ہے یا نہیں؟ ایسا ہی بعض چیزیں بوقتِ ضرورت گھر لے جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مزارعت سے مراد اگر بٹائی کا نظام (مزارعت بالنصف وغیرہ) ہو تو مالکِ زمین کاشتکار کے ساتھ شریک ہے اور شراکت میں بغیر اجازتِ شریک کے کوئی چیز بھی اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے تاہم کسی معمولی چیز (جس کی عرف میں اجازت ہو) استعمال کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، اور اگر مزارعت سے مراد اجارہ ہو تو تمام آمدنی کسان کی ہوتی ہے اس لیے مالکِ زمین سے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔

---

[1] لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله، (اقول) تلخص من هذا أن الصحيح صحة اشتراط العمل على العامل وبه صرح في متن التنوير والملتقى۔

(تنقيح الحامدية ج ۲ ص ۲۰۵ كتاب المزارعة)

وَمِثْلُهٗ في تبيين الحقائق ج ۵ ص ۲۸۳ كتاب المزارعة۔

لما رواه الامام علی بن عمر الدارقطنیؒ : عن عمرو بن یثربی قال شهدت رسول الله صلی الله علیه وسلم فی حجة الوداع بمنٰی فسمعته یقول لا یحل لامرء من مال اخیه شئ الا ما طابت به نفسه ۔ انتہی

(سنن الدار قطنی ج ۳ ص ۲۵ رقم ۸۹ کتاب البیوع) ؎۱

کاشتکار سے بطورِ ضمانت کچھ رقم رکھنا

سوال :۔ اگر مالک زمین کاشتکار سے کچھ رقم بطورِ زرِ ضمانت اپنے پاس رکھے تاکہ کاشتکار معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرسکے اور مالکِ زمین بے جا نقصان سے بچ سکے، شرعاً زمین کے مالک کے اس اقدام کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب :۔ مالکِ زمین کے لیے بطورِ اعتماد کوئی چیز رکھنے کے جواز کے نظائر موجود ہیں تاہم شرعی رُو سے یہ زمین رہن شمار ہوگی جس سے مرتہن (مالک) مرہونہ سے استفادہ کا حق نہیں رکھتا، عموماً کچھ رقم بطورِ ضمانت رکھ کر مالکِ زمین اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے جس کا اسے شرعاً حق نہیں ۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ : لو استاجر خیاطاً لیخیط له ثوباً واخذ من الخیاط رهناً بالخیاط جاز۔ انتہی (الفتاوٰی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۵۹۸ کتاب المزارعة) ؎۲

مزارعت پر موت کے اثرات

سوال :۔ مزارعہ کی وفات پر اگر اولاد عقدِ مزارعت کو باقی رکھنا چاہتی ہو لیکن مالک زمین اس پر راضی نہ ہو تو کیا اس صورت میں مزارعہ کے ورثاء کو منوانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

؎۱ لما ذکر الشیخ ولی الدین ابو عبد الله محمد بن عبد الله الخطیبؒ : وعن ابی حرة الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله صلی الله علیه الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منه۔ (مشکوٰة المصابیح ج ۱ ص ۲۵۵ باب الغصب والعاریة، الفصل الثانی)

وَمِثْلُهُ فی نصب الرایة ج ۴ ص ۱۶۹ کتاب الغصب۔

؎۲ وفی الهندیة : لو استاجر خیاطاً یخیط له ثوباً واخذ من الخیاط رهناً بالخیاط جاز۔

(الفتاوٰی الهندیة ج ۵ ص ۴۳۵ الفصل الثالث فیما یجوز الارتهان الخ)

وَمِثْلُهُ فی شرح مجلة الاحکام لشیخ سلیم رستم باز ص ۳۸۲ تحت مادة ۷۰۱

الجواب:۔ عاقدین میں سے کسی ایک کی وفات سے مزارعت کا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے، تاہم جو فصل زمین میں موجود ہو تو اس کے پکنے تک انتظار کرنا ہوگا، البتہ اگر مزارعہ کے ورثاء فصل کو چھوڑنا چاہتے ہوں یا چھوڑنا چاہتے ہوں تو ان کو اس کے خلاف پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: بخلاف مالو مات رب الارض والزرع بقل فان العمل فيه جميعًا على العامل أو ورثته لبقاء مدة العقد والعقد يوجب على العامل عملاً يحتاج اليه الى انتهاء الزرع كما مر ولو مات قبل البذر بطلت ولا شئ لكرب به كما مر۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص ۲۸۱، ص ۲۸۲ کتاب المزارعت) [1]

قدیم قبرستان میں زراعت کا حکم

سوال:۔ ایک قدیم قبرستان جس پر سو سال سے زائد مدت گذر گئی ہے اور اس میں قبریں بھی دکھائی نہیں دیتیں ہیں، تو کیا ایسے قبرستان سے دوسرے فوائد مثلاً زراعت وغیرہ لیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی قبرستان کی قدامت کے لیے مدت کا کوئی تعین نہیں ہے، تاہم فقہاء کرام کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب قبریں اتنی پرانی ہوں کہ مردوں کے ابدان بظاہر اس سے متاثر نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں ایسے قبرستان کا دوسرے

---

[1] لما قال العلامة فخر الدين عثمان بن على الزيلعي الحنفيؒ: (وتبطل بموت احدهما) لانها اجارة وهى تبطل بموت أحد المتعاقدين اذا عقدها لا نفسهما وقد بيناه فى الاجارة وهذا على اطلاقه هو جواب القياس وفى الاستحسان اذا مات أحدهما وقد نبت الزرع يبقى عقد الاجارة حتى يستحصد ذلك الزرع ثم تبطل فى الباقى لان فى ابقاء العقد حتى يستحصدها مراعاة الحقين فيعمل العامل أو ورثته على حاله فاذا حصد يقسم على ما شرطا ولا ضرورة فى الباقى فتبطل ولو مات رب الارض قبل المزارعة بعد ماكرب الارض وحفر الانهار انتقضت المزارعة لانه ليس فى ذلك اتلاف مال على المزارع ولا شئ للعمل بمقابلة العمل۔ انتهى (تبيين الحقائق ج ۵ ص ۲۸۲ کتاب المزارعة)۔
ومثله فى البحر الرائق ج ۸ ص ۱۶۲ کتاب المزارعة۔

مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز ہے، اگر دوبارہ اس میں مُردے دفن کئے جائیں تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبرستان ذاتی ہو تو اپنے حصے میں آبادی کرنا یا زراعت کے لیے استعمال کرنا بھی مرخص ہے۔

لما قال العلامة فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۴۶ کتاب المزارعۃ)[۱]

افیون کی کاشت کا حکم

سوال:۔ افیون کی کاشت کا شرعی نقطۂ نظر سے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ افیون ایک ایسی چیز ہے جس سے عصر حاضر میں خطرناک اور مہلک ترین منشیات (یعنی ہیروئن وغیرہ) تیار کی جاتی ہیں جس سے پوری دنیا تباہی اور بربادی کی لپیٹ میں ہے اور اس کے مضر محض ہونے پر پوری دنیا متفق ہے، اس لیے اس کی کاشت اور خرید و فروخت کے جواز کے کوئی خاص دلائل نہیں پائے جاتے بلکہ عام اقوال اس کی حرمت کے مؤید ہیں۔ تاہم اگر افیون کا استعمال دوائی تک محدود ہو یا تخمِ افیون (خشخاش) حاصل کرنا مقصود ہو تو پھر ان ضروریات کے مطابق محدود پیمانے پر اس کی کاشت کی گنجائش پائی جاتی ہے لیکن معاشرہ میں یہ نیت بہت کم پائی جاتی ہے۔

لما قال العلامة شمس الدین محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: ویحرم أکل الحشیشة والافیون لکن دون حرمة الخمر۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۵۸ کتاب الاشربۃ)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ کتاب المزارعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۱۶۷ کتاب المزارعۃ۔

[۲] لما قال العلامة شیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ: ولا یجوز اکل الحشیشة والافیون وذلک کلہ حرامٌ۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۷۰ کتاب الاشربۃ۔

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الکاملیة ص ۲۷۰ کتاب الاشربۃ۔

تمباکو کی کاشت جائز ہے

سوال: سگریٹ یا نسوار کے لیے جو تمباکو استعمال ہوتا ہے شرعی نقطہ نظر سے اس کی کاشت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بعض فوائد کے باوجود جدید تحقیق کی رو سے اگرچہ تمباکو نوشی کے مضرات پائے جاتے ہیں لیکن کسی نتیجہ پر پہنچنا تا حال ثابت نہیں جس کی وجہ سے اس کو مضر محض شمار کرکے محرمات کی فہرست میں شمار کیا جائے، اس لیے فقہاء کے اقوال سے اباحت کا حکم معلوم ہوتا ہے، دریں حال تمباکو کی کاشت اور خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (شرب الدخان) فانه لم یثبت اسکاره ولا تفتیره ولا اضراره بل ثبت له منافع فهو داخل تحت قاعدة الأصل فی الاشیاء الاباحة۔

(رد المحتار ج ۶ ص ۴۵۹ کتاب الاشربة) [1]

بھنگ کی کاشت کا حکم

سوال: بھنگ ایک نشہ آور بوٹی ہے جس کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، کیا اس کی کاشت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بھنگ چونکہ نشہ آور اشیاء کی فہرست میں شامل ہے اس لیے اس کی خرید و فروخت اور مزارعت شرعاً ناجائز ہے۔

لما قال العلامة شمس الدین محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون لکن دون حرمة الخمر۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۵۷ کتاب الاشربة) [2]

---

[1] قال العلامة المفتی محمد کامل بن مصطفیٰ الطرابلسیؒ: وقد حقق المتأخرون من اهل مذهبنا الحنفیة انه (شرب الدخان) لیس بحرام وانما فی تعاطیه الکراهة و قد منا ان احسن ما قیل فیه قول الامیر رحمه اللہ واختلف فی الدخان والورع ترکه۔ (الفتاوی الکاملیة ص ۲۸۶ کتاب الکراهیة۔ مطلب فی حکم شرب الدخان)

[2] قال العلامة شیخ الاسلام ابوبکر بن علی بن محمد الحدادی الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشة والافیون وذلك کله حرام۔

(الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۷ کتاب الاشربة)

ومثله فی الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۲۳۱ کتاب الاشربة۔

مزارع کی طرف سے تخم کے باوجود مالکِ زمین کا اس پر کھاد وغیرہ کے اشتراط سے مزارعت کا حکم

سوال:۔ اگر مالکِ زمین (رب الارض) کاشتکار (مزارع) پر کھاد وغیرہ امور کی اشتراط کرے جبکہ تخم (بیج) بھی کاشتکار کی طرف سے ہو تو کیا ان امور کے اشتراط کی وجہ سے مزارعت فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مزارعت میں جب تخم (بیج) مزارع کی طرف سے ہو تو کھاد جیسے امور کی اشتراط علی المزارع کی وجہ سے مزارعت فاسد نہیں ہوتی بلکہ متاخرین فقہاء کرام کے نزدیک صحیح ہوتی ہے اور فتویٰ بھی متاخرین فقہاء کے قول پر ہے۔

وفی الهندية: اذا شرط رب الارض والبذر من المزارع ان يسرقنها قبل تفسد المزارعة عند المتقدمين ولا تفسد عند المتاخرين والفتوىٰ على قول المتاخرين۔ كذا فی جواهر الاخلاطی۔

{الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۴۴ كتاب المزارعة
الباب الثالث فی الشروط فی المزارعة}

ھدایہ کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! ھدایہ کی اس عبارت "لا تجوز المزارعة والمساقات عند ابی حنیفۃ" کا کیا مطلب ہے؟ کیا واقعی امام ابوحنیفہؒ کے ہاں مزارعت کی جملہ انواع نا جائز ہیں؟ جبکہ احادیثِ مبارکہ مزارعت کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

الجواب:۔ مزارعت کے مسئلہ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف جتنے بھی اقوال منسوب ہیں اگر ان میں نظرِ عمیق سے غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ امام ابوحنیفہؒ کا ان اقوال سے مقصد مطلق عدمِ جواز کا نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ کوئی مالکِ زمین کاشتکاروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور ان کی محنت کو شیرِ مادر سمجھ کر ہڑپ نہ کر جائے، اسی طرح باہمی تنازعات اور جھگڑوں سے معاشرہ پاک وصاف ہو کیونکہ معاشرے میں جھگڑے عموماً اسی سے پیدا ہوتے ہیں، اور اسی طرح مالکِ زمین عزیمت پر عمل کر کے اپنی زمین کسی غریب آدمی کو کاشت کیلئے مفت دیدے ۔ اسلئے علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے حاوی القدسی کے حوالہ سے نقل کیا ہے: کرهها ابوحنيفةؒ ولعينه اشد النهی۔

(فیض الباری ج۳ ص۲۲۵ کتاب المزارعت)

چشمہ کے پانی سے منع کرنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں موضع بھکن ملکوٹ تحصیل و ضلع ایبٹ آباد میں پینے کے صاف پانی کی سخت قلت ہے ہماری خواتین کو چار کلومیٹر دور سے پانی لانا پڑتا ہے، جبکہ اتنے ہی فاصلے پر سرکاری جنگل میں پانی وافر مقدار میں نالے میں بہہ رہا ہے۔ ہم نے کوشش کر کے گورنمنٹ سے ایک سکیم منظور کرائی اور گاؤں کو پانی سپلائی کرنے کے لیے باقاعدہ ٹینکی تعمیر کر کے پائپ لائن بچھانے کا کام شروع کر دیا، ساتھ والے گاؤں کے لوگوں نے آکر ٹینکی توڑ دی اور پائپ لائن بھی اکھاڑ دی، ان کا موقف یہ ہے کہ اس جنگل پر ہمارے حقوق زیادہ ہیں اسلئے ہم اس کا پانی آپ لوگوں کو نہیں دیں گے۔ جبکہ پانی وافر مقدار میں ہے، دوسرے یہ کہ یہ پانی اس گاؤں والوں کے نہ تو پینے کے کام آتا ہے اور نہ ہی وہ اس اپنی زمینیں سیراب کرتے ہیں، یہ لوگ صرف اور صرف ضد پر قائم ہیں۔

جناب عالی! قرآن و حدیث کی روشنی میں فتویٰ صادر فرما کر ہمیں اس مشکل سے نکالیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے؟

الجواب:۔ پانی، آگ اور گھاس سب مشترکہ اموال ہیں، کوئی بھی شخص کسی کو ان سے منع نہیں کر سکتا، تاہم جو اس پانی کے قریب ہو اولاً اس کا حق ہے اور جو اس سے زائد ہو وہ دوسرے لوگ بغیر اس کی اجازت کے استعمال کر سکتے ہیں، کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کو اس کے استعمال سے منع کرے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق سرکاری جنگل کا پانی آپ سب لوگوں کا مشترکہ پانی ہے ساتھ والے گاؤں کے لوگوں کا اس سے منع کرنا بے انصافی اور ناجائز ہے، ان کو شرعاً یہ حق نہیں کہ وہ آپ لوگوں کو اس پانی کے استعمال سے منع کریں۔

لما فی الهندية: ماء البحار ولكل واحد من الناس فيها حق الشفعة وسقي الاراضي حتى ان من اراد ان يكرى نهرًا منها الى الارض لم يمنع من ذلك ...... والثاني ماء الاودية العظام لجيحون وسيحون ودجلة والفرات للناس فيه حق الشفعة على الاطلاق وحق سقي الاراضي بان احى واحد ارضًا ميتة وكرى منه نهرًا يسقيها ان كان لا يضر بالعامة ولا يكون نهرًا في ملك احد لانها مباحة في الاصل ـــــ والاصل فيه قوله عليه السلام الناس شركاء في ثلاث في الماء والكلاء والنار۔

(الهداية ج ۴ ص ۴۸۲ مسائل الشرب)

كتاب الذبائح والصيد

ولا تاكلوا مما لم يذكر
اسم الله عليه وانه لفسق

واذا حللتم
فاصطادوا

کتاب الذبائح

(ذبح کرنے کے احکام ومسائل)

ذبح کے لیے اللہ کا نام لینا ہی کافی ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص کوئی جانور ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرْ کہنے کی بجائے دوسرے ایسے کلمات ذکر کرے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں استعمال ہوتے ہوں تو کیا اس سے ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ ذبیحہ کی حلت کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا کافی ہے جس کی تخصیص مذکورہ بالا کلمات سے نہیں بلکہ ہر اُن کلمات سے ذبح کرنا جائز ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دال ہوں۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: (والشرط فی التسمیة هو الذکر الخالص عن شوب الدعاء وغیره (فلا یحل بقوله اللّٰهم اغفرلی) لانه دعاء وسوال (بخلاف الحمد لله وسبحان الله مریداً به التسمیة) فانه یحل۔ (تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار ج ۶ ص۳۰۱ کتاب الذبائح)[1]

معاونِ ذابح کے لیے تسمیہ کا حکم

سوال:۔ مذبوحہ کی حلت کے لیے اگرچہ ذابح کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص ذابح سے تعاون کر رہا ہو تو کیا اس کے لیے بھی ذابح کی طرح تسمیہ کہنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس کے تسمیہ ترک کرنے سے مذبوحہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ اگر معاون کی حیثیت اس درجہ کی ہو کہ ذابح کا کردار اس کے بغیر نامکمل ہو، یہاں تک کہ چھری ہاتھ میں لے کر ذبح کرنے میں دونوں شریک کار ہوں تو ہر ایک کے لیے تسمیہ کہنا ضروری ہے اور ہر ایک مستقل ذابح شمار ہوگا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: وفیها اراد التضحیة فوضع یده مع ید القصاب

---

[1] لما قال الشیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحدادی الیمنیؒ: وان قال بسم الله الرحمٰن الرحیم فهو حسن والشرط هو الذکر الخالص المجرد علی ما قال ابن مسعودؓ جردوا التسمیة...... ولو قال سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله یرید التسمیة اجزء لان المامور به ذکر الله علی وجه التعظیم۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص۲۷۰ کتاب الذبائح)

فی الذبح واعانه علی الذبح سمی کل وجوباً فلو ترکھا احدھما اوظن ان تسمیة احدھما تکفی حرمة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۴ کتاب الاضحیة) ؎۱

ذبح فوق العقدہ کا حکم

سوال:۔ شریعتِ مقدسہ میں ذبح فوق العقدہ کا کیا حکم ہے، اور اس سے جانور کی حلت وحرمت پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟

الجواب:۔ ذبح میں اصل چیز حلقوم، مری اور دو رگوں کا کاٹنا ضروری ہے جو عقدہ کے نیچے جمع ہوتے ہیں اس لیے تحت العقدہ ذبح کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تاہم اگر ماہرین ذبح یہ کہیں کہ یہ اعضاء عقدہ کے اوپر کٹ جاتے ہیں تو بلا شبہ جانور حلال ہے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ ذبح تحت العقدہ ہو۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: والذبح بین الحلق واللبة وفی الجامع الصغیر لا بأس بالذبح فی الحلق کله وسطه واعلاه واسفله۔

(الهداية ج۴ ص۴۳۵ کتاب الذبائح) ؎۲

کسی جانور کا حرکت کرنا یا خون نکلنا باعثِ حلت ہے

سوال:۔ اگر کسی جانور میں بظاہر زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے ہوں لیکن ذبح کرنے کے بعد اس سے خون نکل آئے یا وہ حرکت کرے تو کیا اس سے وہ جانور حلال تصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کسی جانور میں ظاہری علاماتِ حیات مفقود ہوں لیکن بوقتِ ذبح

؎۱ لما قال العلامة الفرغانی رحمه الله: رجلٌ اراد ان یضحی فوضع صاحب الشاة مع ید القصاب فی الذبح واعانهٗ علی الذبح حتی صار ذابحاً مع القصاب۔ قال الشیخ الامام رحمه الله تعالٰی یجب علی کل واحد منهما التسمیة حتی لو ترك احدهما التسمیة لا تحل الذبیحة۔ (الفتاوٰی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۵۵ کتاب الاضحیة۔ فصل فی مسائل متفرقة)

؎۲ قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: وذكاة (الاختیار ذبح بین الحلق واللبة بالفتح) المنحر من الصدر (وعروقه الحلقوم) كله وسطه او اعلاه او اسفله وهو مجرى النفس۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۴ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی العنایة علی هامش فتح القدیر ج۸ ص۴۱۲ کتاب الذبائح۔

حرکت کرے یا اِتنا خون نکل آئے جتنا کہ زندہ جانور سے نکلتا ہو تو اس کی زندگی کے لیے یہ علامت کافی ہے اور اس سے یہ جانور حلال سمجھا جائے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: ذبح شاة مریضة فتحرکت او خرج الدم حلت و الّا لا ان لم تدر حیاته۔ قال ابن عابدینؒ (قوله او خرج الدم) کما یخرج من الحی۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۰۸ کتاب الذبائح) [1]

بوقتِ ذبح جانور کا سر تن سے جدا کرنا مکروہ ہے

سوال:۔ ذبح کرتے وقت اگر ذابح سے جانور کا سر کٹ جائے تو کیا اس سے مذبوح پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ذبح کرتے وقت ذبیحہ کا سر کٹ جانے سے ذبح پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کا گوشت حلال اور کھانے کے قابل ہے، تاہم جانور کے ٹھنڈا ہونے سے قبل اس کا سر کاٹنا بوجہ غیر ضروری تعذیب کے کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال الامام ابوالحسین احمد بن محمد البغدادیؒ: و من بلغ بالسکین النخع و قطع الرأس کره له ذلک و تؤکل ذبیحته۔ (مختصر القدوری ص۲۷۶ کتاب الذبائح) [2]

بوجہِ حادثہ سر کٹنے کے بعد جانور کا حکم

سوال:۔ اگر کسی جانور کا سر کسی حادثہ میں تن سے جدا ہو جائے تو باقیماندہ بدن پر چھری پھیرنے سے وہ جانور حلال ہوگا یا نہیں؟

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: رجل ذبح شاة او بقرة و تحرکت بعد الذبح خرج منها دم مسفوح تحل و کذا ان تحرکت و لم یخرج الدم او خرج الدم و لم یتحرک ..... و فی شرح الطحاوی و خروج الدم لا یدل علی الحیٰوة الا اذا کان یخرج کما یخرج من الحی۔ (خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۳۰۶ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوٰی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۰۵ کتاب الذبائح۔

[2] لما قال الامام عبد الله بن محمود بن مودود الموصلی و یکره ان یبلغ بالسکین النخع او یقطع الرأس و تؤکل۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۱۲ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۶ کتاب الذبائح۔

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق سر کٹنے کے بعد وہ رگیں اگر باقی ہوں جن کو کاٹنے سے جانور حلال ہوتا ہو تو یہ جانور حلال ہوگا صرف چھری پھیرنا کافی نہیں۔

لما قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ : ولو انتزع الذئب رأس الشاة وبقیت حیة تحل بالذبح بین اللبة واللحیین، وفیہ..... شاة قطع الذئب اوداجها وهی حیة لا تذکی لفوات محل الذبح۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۰۸ کتاب الذبائح)[1]

دانت یا ناخن وغیرہ سے ذبیحہ کا حکم

سوال :۔ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ حلال جانور قریب المرگ ہو اور چھری وغیرہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے جانور کے مُردار ہونے کا خطرہ ہو تو کیا دانت، ناخن یا کسی تیز دھار پتھر سے جانور کا ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ کسی ہنگامی حالت میں چاقو یا چھری دستیاب نہ ہونے کی صورت میں ناخن، دانت یا تیز دھار پتھر وغیرہ سے جانور کا ذبح کرنا صحیح اور درست ہے بشرطیکہ ناخن اور دانت نکلے ہوئے ہوں ورنہ انگلیوں میں بڑھے ہوئے ناخن یا منہ کے دانتوں سے جانور ذبح کرنا جائز نہیں، لیکن انسان کے قابلِ احترام اجزاء ہونے کی وجہ سے نکلے ہوئے دانتوں یا ناخنوں سے جانور ذبح کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة ابو عبد اللہ محمد بن الحسن الشیبانیؒ : ظفر منزوعٌ اوقرن او عظم او سنٌّ منزوعة ذبح بها فانهر الدم وافری الاوداج لم یکن باکله بأسٌ واکره هذا الذبح، وان ذبح بظفر او بسن غیر منزوعة فهی میتةٌ۔ (الجامع الصغیر ص۳۸۶ کتاب الذبائح)[2]

---

[1] ذکر فی الهندیة : ولو انتزع الذئب رأس الشاة وهی حیة تحل بالذبح بین اللبة واللحیین..... شاة قطع الذئب اوداجها وهی لا تذکی لفوات محل الذبح۔

(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۹۱ کتاب الذبائح۔ الباب الثالث فی المتفرقات)

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ : ویجوز بالظفر والسن والقرن اذا کان منزوعًا حتی لا یکون باکله بأس الا ان یکره هذا الذبح..... بخلاف غیر المنزوع لانه یقتل بالثقل فیکون فی معنی المنخنقة۔ (الهدایة ج۴ ص۴۳۶ کتاب الذبائح)

ومِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۱ کتاب الذبائح۔

مشینی ذبیحہ کا حکم

سوال :- آجکل جدید سائنسی آلات سے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے، شریعت مقدسہ میں مشینی ذبیحہ کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :- کسی جانور کو ذبح کرنے کے لیے شریعت مقدسہ نے چند شرائط رکھی ہیں۔ (۱) ذبح کرنے والے کا مسلمان ہونا (۲) بوقت ذبح تسمیہ پڑھنا (۳) تحت العقد ذبح کرنا۔ لہٰذا اگر جدید سائنسی آلات سے ذبح کرنے میں مذکورہ شرائط موجود ہوں تو ذبیحہ حلال ہوگا اور اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں، بصورتِ دیگر ایسا ذبیحہ حلال نہیں اور نہ اس کا کھانا جائز ہے۔

لما قال الامام ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ : وذبیحة المسلم والکتابی حلال ولا تؤکل ذبیحة المرتد والمجوسی والوثنی والمحرم وان ترك التسمیة عمداً فالذبیحة میتة لا تؤکل وان ترکها ناسیاً أکل والذبح بین الحلق واللبة والعروق التی تقطع فی الزکاة اربعة الحلقوم والمری والودجان ۔
(مختصر القدوری ص۲۷۶ کتاب الذبائح) لـه

خاص مواقع کے ذبح کا حکم

سوال :- بعض دفعہ خاص اسباب کی موجودگی میں کوئی جانور ذبح کیا جاتا ہے، مثلاً بیمار کو جب صحتیابی ملے تو اس کے لیے جانور ذبح کیا جاتا ہے یا کسی اہم تقریب کے انعقاد پر مہمان نوازی کے لیے جانور ذبح کیا جاتا ہے، تو کیا ان خاص اسباب کی وجہ سے اس کی حلت پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- شریعتِ مقدسہ میں وہ ذبیحہ حرام ہے جو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا گیا ہو، مذکورہ بالا صورتوں میں غیر اللہ کا تقدس و تقرب نہیں بلکہ شکر الٰہی پیشِ نظر ہوتا ہے اس لیے اس ذبیحہ کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ۔

لـه قال الامام عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلیؒ : والذکاة الاختیاریة وھی الذبح فی الحلق واللبة والاضطراریة وھی الجرح فی ای موضع اتفق وشرطھما التسمیة وکون الذابح مسلماً اوکتابیاً ۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج ۵ ص۹ کتاب الذبائح)
ومثلهٗ فی کنزالدقائق ص۴۱۶ کتاب الذبائح ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (ولو ذبح للضیف یحرم) وعلی ھذا فالذبح عند وضع الجدار او عروض مرض او شفاء منه لا شك فی حله لان القصد منه التصدق۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۰۹ کتاب الذبائح)[1]

اہلِ کتاب کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔موجودہ دور کے عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔شریعتِ مقدسہ میں ذابح کا مسلمان یا اہلِ کتاب ہونا ضروری ہے، اسلیئے عیسائی اور یہودی اگر اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کی پیروی کے دعویدار ہوں تو ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ تاہم موجودہ دور کی جدت پسندی کو مدنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائی اور یہودی ایسے عقائد ونظریات پر عمل پیرا ہیں جو اُن کے مذہب کے بنیادی عقائد سے متصادم ہیں، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ ان کا ذبیحہ کھانے سے احتراز کیا جائے۔

لما قال العلامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفیؒ: حل ذبیحة مسلم و کتابی۔ الخ (کنز الدقائق ص۴۱۶ کتاب الذبائح)[2]

اہلِ تشیع کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔جناب مفتی صاحب! کیا اہلِ تشیع کے ذبیحہ کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔علماء محققین کے نزدیک موجودہ دور کے اہلِ تشیع تعصب اور بغض و عناد کی وجہ سے ایسے عقائد کے معتقد ہیں جو موجبِ کفر ہیں، ایسے کفریہ عقائد رکھنے

---

[1] قال العلامة المفتی محمد کامل بن مصطفیٰ الطرابلسیؒ: وعلی ھذا فالذبح عند وضع الجدار وعروض مرض وشفاء منه لا شك فی حله لان القصد منه التصدق۔ (الفتاوی الکاملیة ص۲۳۹ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر للحمویؒ ج۳ ص۲۳ کتاب الذبائح۔

[2] قال الشیخ ابوالحسین احمد بن محمد البغدادیؒ: وذبیحة المسلم والکتابی حلالٌ۔ (مختصر القدوری ص۲۷۵ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۹ کتاب الذبائح۔

کی وجہ سے ان کے ذبیحہ کا حکم مُرتدین کا ہو کر کھانے کے قابل نہیں ۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : الرافضی ان کان یسب الشیخین ویلعنهما فهو کافرٌ وان کان یفضل علیاً علی ابی بکر وعمر رضی الله عنهم لایکون کافرًا لکنهٗ مبتدعٌ ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۸۱ کتاب الکراهیة)[۱]

گائے کے گوشت کی حلّت کا حکم

سوال :- بعض واعظین سے اکثر ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں جو گائے کے گوشت سے نفرت دلاتی ہیں ، کیا گائے کا گوشت کھانا ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- ازروئے شرع گائے ان حیوانات کی فہرست میں داخل ہے جو چیر پھاڑ کر نہیں کھاتے ، اس لیے اس کی حلّت میں کوئی شک نہیں ، فقہاء کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گائے تو درکنار بلکہ اس کے پیٹ میں زندہ بچے کو اگر ذبح کیا جائے تو وہ بھی حلال ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : بقرة تعسّرت ولادتها فادخل ربها یده وذبح الولد حل وان جرحه فی غیر محل الذبح وان لم یقدر علی ذبحه حل وان قدر لا ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۰۳ کتاب الذبائح)[۲]

چوری کیے گئے جانور کے گوشت کا حکم

سوال : چوری کیے گئے یا کسی مغصوبہ جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں ؟

---

[۱] لما قال العلامة مُلا علی القاریؒ : قلتُ : وَهٰذا فی غیر حق الرافضة الخارجیة فی زماننا فانهم یعتقدون کفر اکثر الصحابة فضلاً عن سائر اهل السنة والجماعة فهم کفرة بالاجماع بلا نزاع ۔ (مرقاة شرح مشکوٰة ج۹ ص۱۳۷ کتاب الفتن)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الفقه الاکبر ص۱۲۷ الکبیرة لاتخرج المؤمن عن الایمان ۔

[۲] قال العلامة الاستاذ محمد الشهیر بالطوریؒ : لوان بقرة تعسر علیها الولادة فادخل صاحبها یده وذبح الولد حل أکله وان جرحها فی غیر موضع الذبح اذا کان لایقدر علی ذبحه یحل وان کان یقدر لایحل ۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۷۱ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۸۷ کتاب الذبائح ۔ الباب الاول ۔

الجواب :۔ حلال جانور کی حلت وحرمت کے احکام پر سرقہ اور غصب مؤثر نہیں ہوتے بشرطیکہ ذابح مسلمان ہو اور ذبح کے وقت ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تاہم سارق اور غاصب پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ : غصب شاة وضحی بہا ان اخذہا مالکہا وضمنہ النقصان لا یقع عن الاضحیة وان ضمنہ قیمتہا حیة وقعت عنہا لانہا صارت ملکاً من وقت الغصب ۔ (الفتاوی البزازیة علی ھامش الہندیة ج ۶ ص ۲۹۱ کتاب الاضحیة) لے

خرگوش حلال جانور ہے

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! خرگوش کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں ؟ جبکہ اہل تشیع اس کی حرمت کے قائل ہیں ؟

الجواب :۔ شریعت مقدسہ نے خرگوش کو حلال جانور قرار دیا ہے ۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ : (و) حل (غراب الزرع) الذی یاکل الحب (والارنب والعقعق) ۔ (تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار ج ۶ ص ۳۰۵ کتاب الذبائح) ۲ے

کوے کی حلت وحرمت کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! کوے کی حلت وحرمت کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ کوے کو عربی میں غراب کہا جاتا ہے ، فقہاء کرام کے اقوال سے

لے لما قال العلامة طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ : اذا غصب شاة وضحی بہا لا یجوز و صاحبہا بالخیار ان شاء اخذہا ناقصة ویضمنہ النقصان ولا یجوز عن الاضحیة وان شاء ضمنہ قیمتہا حیة فتصیر الشاة ملکاً للغاصب من وقت الغصب فیجوز عند الثلاثة رحمہم اللہ استحساناً ۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۳۱۶ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الہندیة ج ۵ ص ۳۰۳ الباب السابع فی التضحیة عن الغیر ۔

۲ے واخرجہ الامام ابو عیسی الترمذیؒ فی سننہ : عن ہشام بن زید قال سمعت انساً یقول انفجنا ارنباً بمر الظہران فسعی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفہا فادرکتہا فاخذتہا فاتیت بہا ابا طلحة فذبحہا بمروة فبعث معی بفخذہا او بورکہا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاکلہ قلت اکلہ قال قبلہ ۔ (الجامع الترمذی ج ۲ ص ۲ کتاب الاطعمة باب ما جاء فی اکل الارنب)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۷۲ کتاب الذبائح ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تین قسمیں ہیں (۱) بعض کوّے ایسے ہوتے ہیں جو صرف مردار اور اور نجس چیزیں کھاتے ہیں، غراب (کوّے) کی یہ قسم حرام ہے۔ (۲) دوسری قسم کے کوّے وہ ہیں جو کھانے میں صرف دانے (پاکیزہ چیزیں) استعمال کرتے ہیں، مُردار نہیں کھاتے، ان کا کھانا حلال ہے۔ (۳) کوّوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کی خوراک حرام اور حلال سے مرکب ہوتی ہے، یعنی مردار بھی کھالیتے ہیں اور پاکیزہ چیزیں بھی ـــ قاضی ابو یوسفؒ اگرچہ اس کی کراہت کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے اور فتویٰ آپؒ ہی کے قول پر ہے۔

لما قال العلامة فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ، والغراب ثلاثة انواع یأکل الجیف فحسب فانہ لا یؤکل ونوع یأکل الحب فقط فانہ یؤکل ونوع یخلط بینہم وھوایضاً یؤکل عند ابی حنیفةؒ وھوالعقعق لانہ کالدجاج وعن ابی یوسف رحمہ اللہ انہ یکرہ لان غالب ماکولہ الجیف والاول اصح ۔ انتہیٰ

(تبیین الحقائق ج ۵ ص۲۹۵ کتاب الذبائح) لہ

ہُدہُد کھانے کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ہُدہُد کا گوشت کھانا ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اسلام میں ہر اُس پرندے کا کھانا حرام ہے جو اپنی خوراک (شکار) چیر پھاڑ کر کھاتا ہو، ہُدہُد کا شمار چونکہ ایسے پرندوں میں نہیں ہوتا جو چیر پھاڑ کر کھاتے ہیں اس لیے اس کے کھانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، تاہم بعض فقہاء کرام نے اس کے کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے، اس لیے اجتناب ہی بہتر ہے۔

لہ لما قال العلامة الاستاذ محمد الشهیر بالطوری رحمہ اللہ: والغراب ثلاثة انواع نوعٌ یأکل الجیف فحسب فانہ لا یؤکل ونوعٌ یاکل الحب فحسب فانہ یؤکل ونوع یخلط بینہما وھوایضاً یؤکل عند الامام وھوالعقعق لانہ یاکل الدجاج وعن ابی یوسفؒ انہ یکرہ اکلہ لانہ غالب اکلہ الجیف والاوّل اصح۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۲ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی مجمع الانہر شرح الملتقی الابحر ج ۲ ص۵۱۴ کتاب الذبائح۔

لما قال الامام شیخ الاسلام ابوبکر بن علی بن محمد الحداد الیمنیؒ: ولکن لا بأس باکل العقعق والھدھد والحمام والعصافیر لان عامۃ اکلھا الحب والثمار (الجوھرۃ النیرۃ ج ۲ ص۲۷۹ کتاب الذبائح) [1]

وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ویکرہ الصرد والھدھد۔
(رد المحتار ج ۶ ص۳۰۶ کتاب الذبائح) [1]

موطوء جانور (چارپائے) کا شرعی حکم

سوال:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنے سے اس فعل کی قباحت اور حرمت سے قطع نظر اس کے گوشت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی حلال جانور سے ایسے مکروہ فعل کے کرنے سے اس کا گوشت یا دودھ حرام نہیں ہوتا ہے، تاہم ایسے حیوان کی موجودگی اس غیر فطری عمل کے تذکرا اور یاد دہانی کا ذریعہ ضرور ہے، اس لیے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ ایسے جانور کو ذبح کرکے اس کا گوشت جلا دیا جائے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ شناعت دائمی نہ رہے تاہم کسی دور دراز علاقہ میں لے جاکر فروخت کرنے سے بھی ایسے جانور کو دور کیا جاسکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن الھمامؒ: (والذی یروی انہ تذبح البھیمۃ وتحرق ذٰلک لقطع) امتداد (التحدث بہ) کلما رؤیت فیتاذی الفاعل بہ ولیس بواجب واذا ذبحت وھی مما لا تؤکل ضمن قیمتھا..... وان کانت مما تؤکل اکلت وضمن عند ابی حنیفۃؒ وعند ابی یوسفؒ لا تؤکل۔ (فتح القدیر شرح الھدایۃ ج ۵ ص۴۵ کتاب الذبائح) [2]

---

[1] قال الامام ابو اللیث السمرقندیؒ الفقیہ الکامل: ولا بأس باکل العقعق عند ابی حنیفۃؒ ولکن لا بأس بالھدھد۔ (الفتاوٰی النوازل ص۲۳۶ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص۲۹ کتاب الذبائح۔ الباب الثانی۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: والذی انھا تذبح البھیمۃ وتحریم فذٰلک لقطع التحدث بہ ولیس بواجب قالوا ان کانت الدابۃ مما لا تأکل لحمھا تذبح وتحرق لما ذکرنا وان کانت مما تؤکل تذبح وتؤکل عند ابی حنیفۃ وقالا تحرق ھذا ایضاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۷ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۲۶ کتاب الحدود، مطلب فی وط الدابۃ۔

یورپ کے ذبح شدہ جانوروں کے گوشت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بلادِ عرب میں نیوزی لینڈ، آسٹریلیا وغیرہ یورپی ممالک سے بند ڈبوں میں مرغی اور دیگر جانوروں کا گوشت آتا ہے اور ان ڈبوں پر یہ تحریر ہوتا ہے کہ حلال طریقے سے ذبح کیا گیا ہے، تو کیا ایسے گوشت کا استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ ایسے گوشت کے بارے میں اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس کے ذابحین مسلمان ہیں اور انہوں نے اسلامی طریقہ سے ذبح کیا ہے تو فتویٰ کی رُو سے اس کا استعمال کرنا مرخص ہے مگر تقویٰ کی رُو سے اس سلسلہ میں عصرِ حاضر کی دیگر بے احتیاطیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کے استعمال سے پرہیز ہی کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله : وزکوٰة الاختیار ذبح اطلق واللبة...... والمری والودجان..... وشرط کون الذابح مسلماً حلالاً خارج الحرم ..... والشرط فی التسمیة هو الذکر الخالص عن شوب الدعاء۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۶ کتاب الذبائح) [۱]

غیر فطری طریقہ کی پیداوار غیر ملکی گائے کا حکم

سوال:۔ بعض نسل کی گائیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی نسل کشی کے لیے خنزیر کا مادہ منویہ بذریعہ ٹیسٹ ٹیوب یا بذریعہ حقنی استعمال کیا جاتا ہے جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے، ایسی گائے کو جرمنی یا غیر ملکی گائے کہا جاتا ہے۔ ایسی گائے کے گوشت کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حیوانات کی نسل مادہ سے ثابت ہوتی ہے، نر کے مادۂ منویہ کا کوئی

---

[۱] وفی الهندية : الاختيارية فركنها الذبح فيما يذبح من الشاة .... والذبح هو فری الاوداج ومحله ما بين اللبة واللحيين ...... منها ان يكون مسلماً او كتابياً..... منها التسمية حالة الزكاة عندنا ...... منها ان يريد بها التسمية على الذبيحة..... منها قيام اصل الحياة فی المستأنس وقت الذبح ۔ (الفتاوی الهندية ج۵ ص۲۸۵، ۲۸۶ کتاب الذبائح ۔ الباب الاول)

ومِثْلُهٗ فی الهداية ج۴ ص۴۳۱ کتاب الذبائح ۔

اعتبار نہیں ہوتا، اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بکری کے ساتھ کوئی درندہ جفتی کرے تو بچہ ماں کے تابع ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ کے مطابق جرسی کی مذکورہ گائے کو ذبح کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا یعنی اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ : فان کان متولداً من الوحشی والانسی فالعبرۃ للام فان کانت اھلیۃ یجوز والافلا حتی ان البقرۃ الاھلیۃ اذا نزعھا ثور وحشی فولدت ولداً فانہ یجوز ان یضحی بہ وان کانت البقرۃ وحشیۃ والثور اھلیا لم یجز لان الاصل فی الولد الام لانہ ینفصل عن الام۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۶۹ کتاب الذبائح) [۱]

بوقتِ ذبح عمداً تسمیہ چھوڑنے کا حکم

سوال :- اگر کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت قصداً و عمداً بسم اللہ چھوڑ دے تو کیا یہ ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- احناف کے ہاں ذبح کرتے وقت بسم اللہ الخ قصداً و عمداً ترک کرنا ذبیحہ کے مردار ہونے کا سبب ہے لہٰذا بوقتِ ذبح عمداً بسم اللہ ترک کرنے سے ذبیحہ حرام ہوجاتا ہے جس سے کسی بھی قسم کا انتفاع جائز نہیں' نہ خود کھاسکتا ہے اور نہ دوسروں کو کھلاسکتا ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ : ان ترک التسمیۃ عمداً لایسع الاجتھاد ولو قضی القاضی بجواز بیعہ لاینفذ۔

(الھدایۃ علی صدر فتح القدیر ج۸ ص۵۷ کتاب الذبائح) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابوبکر الجصاص الرازیؒ : الاتری ان حمارۃ اھلیۃ لو ولدت من حمار وحشی لم یؤکل ولدھا ولو ولدت حمارۃ وحشیۃ من حمار اھلی اُکل ولدھا فکان الولد تابعاً لامہ دون ابیہ ۔ (احکام القرآن ج۵ ص۳ سورۃ النحل)

[۲] قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولا تحل ذبیحۃ من تعمد ترک التسمیۃ مسلماً اوکتابیا لنص القرآن ولانعقاد الاجماع ۔ (رد المحتار ج۶ ص۲۹۹ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۳۵ کتاب الذبائح۔

حلال جانور کے حرام اجزاء

سوال: حلال مذبوحہ کے بدن سے کون کون سے چیزیں کھانا حرام ہیں؟

الجواب: حلال جانور کا شرعی طریقہ سے ذبح ہونے کے باوجود اس کے سات مندرجہ ذیل اعضاء کا کھانا حرام ہے:۔ ۱ پتا ۲ مثانہ ۳ غدود ۴ فرج ۵ ذکر، ۶ خصیتین اور ۷ دم مسفوح۔

لما قال العلامة محمد بن حسن الشيبانيؒ: عن مجاهد قال كره رسول الله صلى الله عليه وسلم من الشاة سبعاً: المرار والمثانة والغدة والحياء والذكر والانثيين والدم۔ انتهى (كتاب الآثار ص۱۷۹ باب ما يكره من الشاة الدم وغيره)

جانور کو گولی مار کر ذبح کرنا

سوال: جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم لوگ بیلہ کہتے ہیں، گاؤں والے اس میں اپنے مال مویشی چھوڑ دیتے ہیں جس میں کبھی کبھی کوئی جانور وحشی بھی ہو جاتا ہے جو کسی طرح قابو میں نہیں آتا تو لوگ اس کو گولی مار کر گرا لیتے ہیں اور پھر اس کو ذبح کرتے ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: گولی مار کر گرانے کے بعد اگر جانور میں جان باقی ہو اور فوراً اس کو شرعی طریقہ سے ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہوگا ورنہ نہیں، البتہ کسی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بلاوجہ گولی مارنا ظلم و زیادتی اور موجب گناہ ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وحل المذبوح بقطع اى ثلاث منها اذ للاكثر حكم الكل۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۵ كتاب الذبائح)

---

۱ قال العلامة علاء الدين الكاسانيؒ: وأما بيان ما يحرم أكله من اجزاء الحيوان المأكول فالذى يحرم أكله منه سبعة الدم المسفوح والذكر والانثيان والقبل والغدة والمثانة والمرارة۔ (بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع ج۵ ص۶۱ كتاب الذبائح)

ومثله فى تنقيح الحامدية ج۲ ص۲۳۲ كتاب الذبائح۔

خنزیر کی حرمت میں فلسفہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! یہاں جاپان میں عموماً خنزیر کا گوشت کھایا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض مسلمان جو کہ عرصہ دراز سے یہاں مقیم ہیں وہ بھی استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گائے اور خنزیر کے گوشت میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا گوشت ایک ہی طرح کا ہوتا ہے بلکہ خنزیر کا گوشت گائے کے گوشت سے لذیذ ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ اسلام میں خنزیر کا گوشت حرام قرار دینے کا کیا فلسفہ ہے؟

الجواب:۔ اسلامی نقطہ نظر سے کسی چیز کی حلت اور حرمت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اللہ تعالیٰ جس چیز کو حلال فرمادیں وہ حلال ہوتی ہے اور جس کو حرام فرما دیں وہ حرام ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں کسی کو قیاس آرائی کی اجازت نہیں کہ وہ اِدھر اُدھر صغریٰ وکبریٰ مل کر کسی چیز پر حلال یا حرام ہونے کا حکم لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف حیوانات کی طرح گائے کو بھی حلال قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ مِّنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ۔۔۔۔ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ۔

(سورۃ الانعام پ۸ آیت ۔۔۔)

(ترجمہ)"آٹھ نر و مادہ یعنی بھیڑ میں دو قسم اور بکری میں دو قسم، آپؐ کہہ دیں کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو ۔۔۔۔۔ اور گائے میں دو قسم آپؐ کہہ دیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو۔"

مشہور مفسرِ قرآن علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

ثم بین اصناف الانعام الیٰ غنم۔۔۔۔۔۔۔ الابل ذکورھا واناثھا وبقر کذلک وانہٗ تعالیٰ لم یحرم شیئاً من ذلک ولا شیئاً من اولادھا بل کلھا مخلوقۃ لبنی آدم اکلا ورکوباً وحمولۃ وحلباً وغیر ذلک من وجوہ المنافع۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۸۳)

(ترجمہ)"پھر اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی اقسام کو بیان کیا ۔۔۔ حتیٰ کہ اونٹ اس کا نر و مادہ اور اسی طرح گائے بھی، بیشک اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اور ان کی اولاد میں سے کسی کو بھی حرام نہیں کیا بلکہ یہ سارے کے سارے بنی آدم کے کھانے، سواری، باربرداری اور دودھ وغیرہ منافع کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔"

اس لیے گائے کے حلال ہونے میں شک کرنا صحیح نہیں ـــــ اور خنزیر کو بعض دیگر حیوانات کی طرح حرام قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا۔ (سورة الانعام پ۸ آیت ۷)

(ترجمہ) "آپؐ فرمادیں کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں جو مجھ کو پہنچتی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سُور کا کہ وہ ناپاک اور ناجائز ہے"۔

اور اسی پر امت کا اجماع ہے، علامہ دمیریؒ فرماتے ہیں :-

"خنزیر نجس العین ہے اور اس کا کھانا حرام ہے اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں" (حیات الحیوان (اردو) ج ۲ ص۱۶ الخنزیر)

خنزیر کی حرمت پر قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، آثارِ صحابہ و تابعین اس کثرت سے دال ہیں کہ کسی بھی مسلمان کے لیے ان کے ہوتے ہوئے اس کا کھانا حلال نہیں۔

شریعت جس چیز کو حرام کرتی ہے اس میں اس حکم کے علاوہ دیگر مضرّات بھی ہوتے ہیں جو انسانی بدن یا اس کے اخلاق کے لیے صحیح نہیں ہوتے۔ چنانچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ خنزیر کی حرمت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

(۱) اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور، بے غیرت اور دیوث ہے، اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر (انسانی) بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہوگا کیونکہ یہ بات ثابت شدہ اور مُسلّم ہے کہ غذاؤں کا اثر بھی انسان کی روح پر ضرور ہوتا ہے پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بدجانور کے گوشت کا اثر بھی بد ہی ہوگا، جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصہ حیا کی قوت کو کم کر دیتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے، پس چونکہ یہ امر مُسلّم ہے کہ تغیّرِ بدن و تغیّرِ اخلاق کے اسباب میں سے زیادہ تر قوی سبب غذا ہے، لہٰذا ایسے جانور کا گوشت کھانے سے شریعتِ اسلامیہ نے منع فرما دیا۔

(۲) خنزیر یعنی خوک نجاست کی طرف بہت زیادہ مائل ہے خصوصاً انسان کا فُضلہ یعنی براز اس کی خوراک ہے، اس کا گوشت اسی نجاست سے پیدا ہوتا ہے، پس اس کا گوشت کھانا گویا

اپنی نجاست کھاتا ہے ۔

(۳) صاحب مخزن الادویہ فسادِ گوشت خوک اور اس کی حرمت کی تیرہ وجوہ ذیل میں تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس جانور کا گوشت فطرتِ انسانی کے برخلاف ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"گوشت خوک مواد خلط غلیظ است و مورث حرص شدید و صداع مزمن، دوادالفیل، واوجاع المفاصل وفسادِ عقل وزوال مروت وغیرت وحمیت و باعثِ فحش است واکثرے از فرق غیر اسلامی آں را می خورند وقبل از ظہور نورِ اسلام گوشت آں را در بازار ہامی فروختند وبعد ازاں در مذہب اسلام حرام و بیع آں ممنوع وموقوف گردید بسیار کثیف و بدہیئت است۔"

(احکام اسلام عقل کی نظر میں ص۲۰۰)

(۴) سور کا گوشت ایک بیماری کا باعث بنتا ہے جو کہ آنکھوں کی ایک بیماری ہے اور اس کا نام ٹرکن اوسس ہے جو کہ صحرائی آب وہوا میں بہت جلد اثر کرتی ہے ۔

باقی رہا مسئلہ گائے وغیرہ کا تو مولانا اشرف علی تھانوی اس بارے میں فرماتے ہیں :۔

(۱) یہ سارے جانور دراصل مزاجِ انسانی کے موافق اور ستھرے ومعتدل المزاج ہوتے ہیں اس لیے حلال ٹھہرائے گئے ہیں اور ان جانوروں کو خدا تعالیٰ نے بہیمۃ الانعام فرمایا ہے، اور اسی توافق واعتدال کے سبب دنیا میں زیادہ تر انہیں جانوروں کا گوشت بنی آدم استعمال کرتے ہیں، فطرتِ انسانی اس امر کی مقتضی ہے کہ جیسا کہ بنی آدم کی خوراک کا کچھ حصہ نباتات سے ہوتا ہے ایسا ہی کچھ حصہ اس کا حیوانات سے ہو، اور اس کی خوراک کے لیے حیوانات بھی وہ مقرر ہونے مناسب تھے جو اس کے مزاج کے موافق ہوں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا ۔

(۲) جبکہ انسان جامع جلال وجمال ہے تو اس کی خوراک میں بھی جلال وجمال دونوں کا ہونا مناسب تھا لہٰذا انسان کی خوراک کے لیے وہ جانور مقرر ہوئے جن میں جمالی و جلالی ہر دو صفات موجود ہیں ۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں ص۲۱۷)

مزید تفصیل کے لیے "حیات الحیوان" از علامہ دمیری رحمہ اللہ کی طرف مراجعت کریں، مسلمان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہی کافی ہے ۔ (وہو الموفق والمعین)

کچھوا کھانے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ دریائی جانور سب پاک ہیں اس لیے کچھوا کھانا بھی جائز ہے، جبکہ کچھ لوگوں کے نزدیک اس کا کھانا درست نہیں، شریعتِ مطہرہ کے احکامات کی روشنی میں بتائیں کہ کچھوا کھانا حلال ہے یا حرام؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک دریائی جانوروں میں سے فقط مچھلی حلال ہے، باقی سب حرام، لہٰذا کچھوا (شمشتی) کھانا بھی حرام ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: ولا یوکل من حیوان الماء الا السمك۔

(الهدایة ج۴ ص۴۴۰ کتاب الذبائح)

درندوں کی حرمت کا فلسفہ

سوال:۔ بعض اوقات میرے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ شریعتِ مقدسہ نے جو شیر، ریچھ، گیدڑ وغیرہ درندوں کو حرام قرار دیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے اور کس فلسفہ کے تحت یہ درندے حرام قرار دیئے گئے ہیں، ازراہ کرم تسلی بخش جواب دے کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ ایک مسلمان کے لیے کسی چیز کے بارے میں حلت و حرمت کا اعتقاد کسی فلسفے کے تحت نہیں ہونا چاہیئے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہوئے ماننا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کسی چیز کے بارے میں حلت و حرمت کا حکم بغیر کسی حکمت کے نہیں فرماتا۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "سارے درندے جانور جن کی سرشت و فطرت میں پنجوں سے چھیلنا اور صولت سے زخم پہنچانا اور جن میں سخت دلی ہے سب حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑیئے کے بارے میں فرمایا ہے: او یأکل احد یعنی کیا بھیڑیئے کو بھی کوئی انسان کھاتا ہے یعنی اس کو کوئی نہیں کھاتا۔ وجہ حرمت ظاہر ہے کہ ان جانوروں کے کھانے سے انسان میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی طبیعت اعتدال سے خارج ہوتی ہے اور ان کے دل میں رحم نہیں ہوتا، اسی واسطے ہر شکاری پرندے کے کھانے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا" (احکام اسلام عقل کی نظر میں ص۲۰۵ کتاب الاکل والشرب)

کتاب الصید

(شکار کرنے کے احکام و مسائل)

جال سے شکار کرنا جائز ہے

سوال: بعض علاقوں میں مچھلی یا پرندوں کے شکار کے لیے جال استعمال کیا جاتا ہے جس میں عموماً پرندوں کو سبز باغ دکھا کر پکڑا جاتا ہے، کیا یہ طریقہ دھوکہ دہی کے دائرہ میں ہو کر شکار پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب: شکار قرآن وحدیث کی رو سے مباح ہے ایسے مباح امر کے حصول کے لیے کسی حیلہ کا اختیار کرنا شرعاً ممنوع نہیں، جال سے شکار کرنا کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے فقہاء کی عام عبارتیں اس کے جواز پر دال ہیں۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ: رجل حفر فی ارضہ حفیرۃ فوقع فیھا صید اً فجاء رجل واخذہ قال الصید یکون للآخذ وان کان صاحب الارض اتخذ تلک الحفیرۃ لاجل الصید فھو احق بالصید۔ (الفتاویٰ قاضی خان علی ھامش الہندیۃ ج۳ ص۳۵۹ کتاب الصید والذبائح)[1]

بندوق سے شکار کرنے کا حکم

سوال: بندوق یا غلیل سے کیا ہوا شکار اگر ذبح نہ ہو سکے تو اس کے کھانے کا کیا حکم ہے؟ اگر بندوق یا غلیل کی گولی سے شکار زخمی ہو کر مر جائے تو کیا یہ جرح ذبح کے لیے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز خود جارح نہ ہو بلکہ زور

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: لمن نصب فسطاطاً بارض صید فی ارض رجل او انکسر رجلہ فیھا او وقع فیہ بحیث لا یقدر علی البراح فاخذہ انسان ونازعہ صاحب ان کان صاحب الارض بحیث لو مدّ یدہ یصل الیہ فھو لہ وان کان بعیداً لا یصل الیہ یدہ لو مدّہ فھو للآخذ۔ (الفتاویٰ البزازیۃ علی ھامش الہندیۃ ج۶ ص۳۰۱ الباب الخامس فی تملیک الصید) ومثلہ فی الہندیۃ ج۵ ص۴۱۸ الباب الثانی فی تملیک مابہ الصید الخ۔

سے شکار کو زخمی کرے اور وہ اس سے مر جائے تو یہ موقوذہ کے حکم میں ہو کر حلال نہیں، بندوق اور غلیل کی گولی خود جارح نہیں بلکہ عموماً جانور اس کے زور (پریشر) سے زخمی ہوتا ہے اس لیے اُس کی حلت کے لیے یہ جرح کافی نہیں، تاہم اگر حیوان میں کچھ حیات باقی ہو اور اس کو ذبح کر لیا جائے تو پھر کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ: ولا یحل صید البندقة والحجر والمعراض والعصا وما اشبه ذلك وان جرح ذلك۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۶۰ کتاب الصید والذبائح) ؎

مجروح شکار کا ذبح کرنا ضروری ہے

سوال: مجروح شکار اگر چند لمحے زندہ رہ سکتا ہو یا اضطراری موت سے محفوظ ہو جائے تو اس کی حلت کے لیے زخمی ہونا ہی کافی ہے یا اس کا ذبح کرنا ضروری ہے؟

الجواب: مجروح شکار جب کچھ دیر زندہ ہو یا کم از کم اضطراری موت سے بچ سکتا ہو تو شرعاً ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ جرح ذبح اختیاری کے حکم میں ہے اور یہ اس وقت کارآمد ہے جب تک ذبح اختیاری قابلِ عمل نہ ہو۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: وقال اصحابنا رحمهم الله لو جرحه السهم او الکلب فادرکه لکن لم یاخذه حتی مات فان کان فی وقت لو اخذه یمکنه ذبحه فلم یاخذ حتی مات لم یؤکل لان الذبح صار مقدوراً علیه فخرج الجرح من ان یکون ذکاة۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۵۱ کتاب الصید)

؎ عن ابراهیم بن عدی بن حاتمؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا رمیت فسمیت فخزقت فکل وان لم تخزق فلا تأکل ولا تأکل من المعراض الا ما ذکیت ولا تأکل من البندقة الا ما ذکیت۔ (رواه احمد) (نیل الاوطار ج۸ ص۱۴۳ کتاب الصید، باب النهی عن الرمی بالبندق وما فی معناه)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار علی الدر المختار ج۶ ص۴۷۱ کتاب الصید۔

؎ قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ولا بد من ذبح صید مستأنس لان ذکاة الاضطرار انما یصار الیها عند العجز عن ذکاة الاختیار (وکفی جرح نعم) کبقر وغنم (توحش) فیجرح کصید (او تعذر ذبحه) کان تردی فی بئر او ند او صال حتی لو قتله المصول علیه مریداً ذکاته حل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۰۳ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۷۱ کتاب الذبائح۔

شکار کا کٹا ہوا عضو کھانا جائز نہیں

سوال :- اگر شکار کرنے وقت تیر یا کسی اور تیز دھار آلہ سے زندہ جانور سے کوئی عضو الگ ہوجائے اور بعد میں وہ جانور ذبح کرلیا جائے تو اس کٹے ہوئے عضو کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- جب کسی زندہ جانور سے اس کا کوئی عضو آلۂ شکار سے کٹ کر الگ ہو جائے تو اُس جانور کے ذبح کرنے سے وہ عضو حلال نہیں ہوتا اس لیے اس الگ شدہ عضو کو کھانا شرعاً درست نہیں ۔

لما قال العلامة ابو بکر بن علی الحدادالیمنیؒ: (قوله واذا رمی صیداً فقطع عضواً منه أكل الصيد لما بيناه ولا يؤكل العضو) لقوله عليه السلام ما ابين من الحي فهو ميت والعضو بهذه الصفة لان المبان منه حي حقيقة لقيام الحيات فيه ـ (الجوهرة النيرة ج۲ ص۲۷۴ کتاب الصيد) [1]

دریاؤں میں موجود مچھلیوں کو بیچنا جائز نہیں

سوال :- بعض دریاؤں میں مچھلیوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے حکومت ان دریاؤں کو بطور ذریعہ آمدنی استعمال کرتی ہے اور ایسی جگہوں پر اُن لوگوں کو مچھلی کا شکار کرنے کی اجازت دیتی ہے جو حکومت کو ایک خاص رقم ادا کرتے ہیں ، عرف میں اس اجازت کو ٹھیکہ کہا جاتا ہے ، کیا شرعاً اس طرح معاملہ طے کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- ملکیت کے لیے جہاں فروخت (بیع) بطور سبب استعمال ہوتا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ جو چیز فروخت کرنی مقصود ہو اس کی تسلیم بائع (فروخت کرنے والے) کے دائرہ اختیار میں ہو اور جہاں کہیں فروخت کی ہوئی چیز سے بائع ـ

---

[1] قال العلامة اكمل الدين محمد بن محمود البابرتیؒ: قال (وان رمی صیداً) اذا قطع بالرمی عضواً من الصید لما بیناه ان الرمی مع الجرح مبیح وقد وجد ولا یؤکل العضو ان امکن حیاته بعد الابانة وان لم یمکن أکلا ـ (العناية شرح الهداية على هامش فتح القدیر ج۹ ص۱۶۱ کتاب الصید)

وَمِثْلُهُ فی الدرالمختار مع ردالمحتار ج۶ ص۴۷۳ کتاب الصید ـ

مشتری کے حوالے کرنے سے قاصر ہو تو وہاں پر بائع کا یہ معاملہ ناجائز ہو کر اس کے لیے یہ رقم لینا ناجائز ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں حکومت کا یہ ٹھیکیداری معاملہ ایک بے بنیاد معاملہ ہے، تاہم اگر ٹھیکیدار محنت کرے اور مچھلی کا شکار کر کے فروخت کرے تو شکار کرنے سے اس کی ملکیت ثابت ہو کر اس کی آمدنی اس کے لیے حلال ہو گی۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ولا يجوز بيع السمك قبل ان يصطاد لانه باع ما لا يملكه ولا في حظيرة اذا كان لا يؤخذ الا بصيد لانه غير مقدور التسليم۔ (الهداية ج ۳ ص۵۵ كتاب الصيد) له

شکاری کُتے کے شکار کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں لوگ شکار کے لیے کُتے پالتے ہیں اور ان کو شکار کی تعلیم دیتے ہیں اور پھر ان سے شکار کھیلتے ہیں۔ تو اگر وہ کُتا شکار کو پکڑے اور خود نہ کھائے بلکہ مالک کے پاس لے آئے لیکن وہ شکار راستے ہی میں اُس کے مُنہ میں مرجائے تو کیا اس شکار کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے شکار کی غرض سے کُتا پالنے اور اس کے ذریعے شکار کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ اُس کو شکار کرنے کی تعلیم دی گئی ہو اور وہ شکار پکڑ کر مالک کے پاس لے آئے لیکن خود اس سے نہ کھائے تو ایسے کتے کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے اگرچہ وہ جانور کُتے کے منہ میں ہی ختم ہو جائے لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مالک نے شکار پکڑنے کے لئے کُتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا ہو، بدون اس کے شکار حلال نہیں۔

لقوله تعالیٰ: يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (سورة المائدة آيت ۴)

له قال العلامة ابن نجيم رحمه الله: (قوله والسمك قبل الصيد) اى لم يجز بيعه لكونه باع ما لا يملكه فيكون باطلاً اطلقه فشمل ما اذا كان فی حظيرة اذا كان لا يؤخذ الا بصيد لكونه غير مقدور التسليم۔ (البحر الرائق ج۶ ص۷۳ كتاب الصيد)
ومثله فی فتح القدير ج۶ ص۴۹ كتاب الصيد۔

چیتے اور شیر کے ذریعے شکار کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا چیتے اور شیر کے ذریعے شکار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس کا جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ دونوں جانور اپنی درندگی اور خونخواری کی وجہ سے تعلیم کے قابل نہیں ہوتے اس لیے فقہاء نے ان کے ذریعے شکار کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ تاہم اگر یہ دونوں جانور تعلیم یافتہ ہو کر شکار کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ علت کی بناء پر ان کے شکار کو ناجائز قرار دیا گیا تھا وہ مفقود ہو چکا ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: فلا يجوز الصيد بذئب واسد لعدم قابليتهما للتعليم فانهما لا يعملان للغير الاسد لعلو همته والذئب لخساسته۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۶۳ كتاب الصيد)

قال العلامة ابن عابدينؒ: وحاصله البحث في استثناء الخنزير والاسد والذئب وفي التعليل لان الشرط في ظاهر الرواية قبول التعليم فيحل بكل معلم ولو خنزير۔ (رد المحتار ج ۶ ص۴۶۴ كتاب الصيد) [1]

شوقیا طور پر شکار کھیلنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں میں کچھ لوگ بعض موذی جانوروں مثلاً گیدڑ وغیرہ کا شکار شوقیا طور پر کرتے ہیں، اس سے ان لوگوں کا مقصود صرف کھیل تماشا ہوتا ہے، کیا شرعاً ایسا شکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی جانور کا شکار اس غرض سے کرنا چاہیئے کہ اس سے کچھ نفع حاصل ہو، صرف کھیل تماشا کے طور پر شکار کرنا جائز نہیں خصوصاً حرام جانور کا شکار جس سے کوئی ظاہراً فائدہ نہ پہنچتا ہو مگر وہ جانور کھیت وغیرہ کو نقصان پہنچاتا ہو تو پھر اُسے مارنا جائز اور رخصت ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: ويكره الصيد لهواً لانه عبث لقوله عليه السلام

---

[1] قال العلامة وهبة الزحيلي: واستثنى ابو يوسفؒ من ذلك الاسد والذئب لانهما لا يعملان لغيرهما الاسد لعلو همته والذئب لخساسته والحق بعضهم الحدأة لخساستها والخنزير مستثنیٰ۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج ۳ ص۷۰۴ الفصل الثاني في الصيد)

لاتتخذوا شيئًا فيه الروح غرضًا ای هدفًا من قتل عصفورًا عبثًا عج الی الله یوم القیامة یقول یا رب ان فلانًا قتلنی عبثًا ولم یقتلنی منفعة ۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج ۳ ص ۶۹۱ الفصل الثانی فی الصید) لہ

تجارت کی غرض سے شکار کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب دارالعلوم حقانیہ! ہم چند ساتھی اجتماعی طور پر دریائے سندھ میں مچھلی کا شکار کرتے ہیں اور پھر اُسے فروخت کر دیتے ہیں، ایک صاحب کا کہنا ہے کہ شکار صرف کھانے کی حد تک جائز ہے تجارت کے لیے شکار جائز نہیں۔ آنجناب سے گذارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ تجارت کی غرض سے شکار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

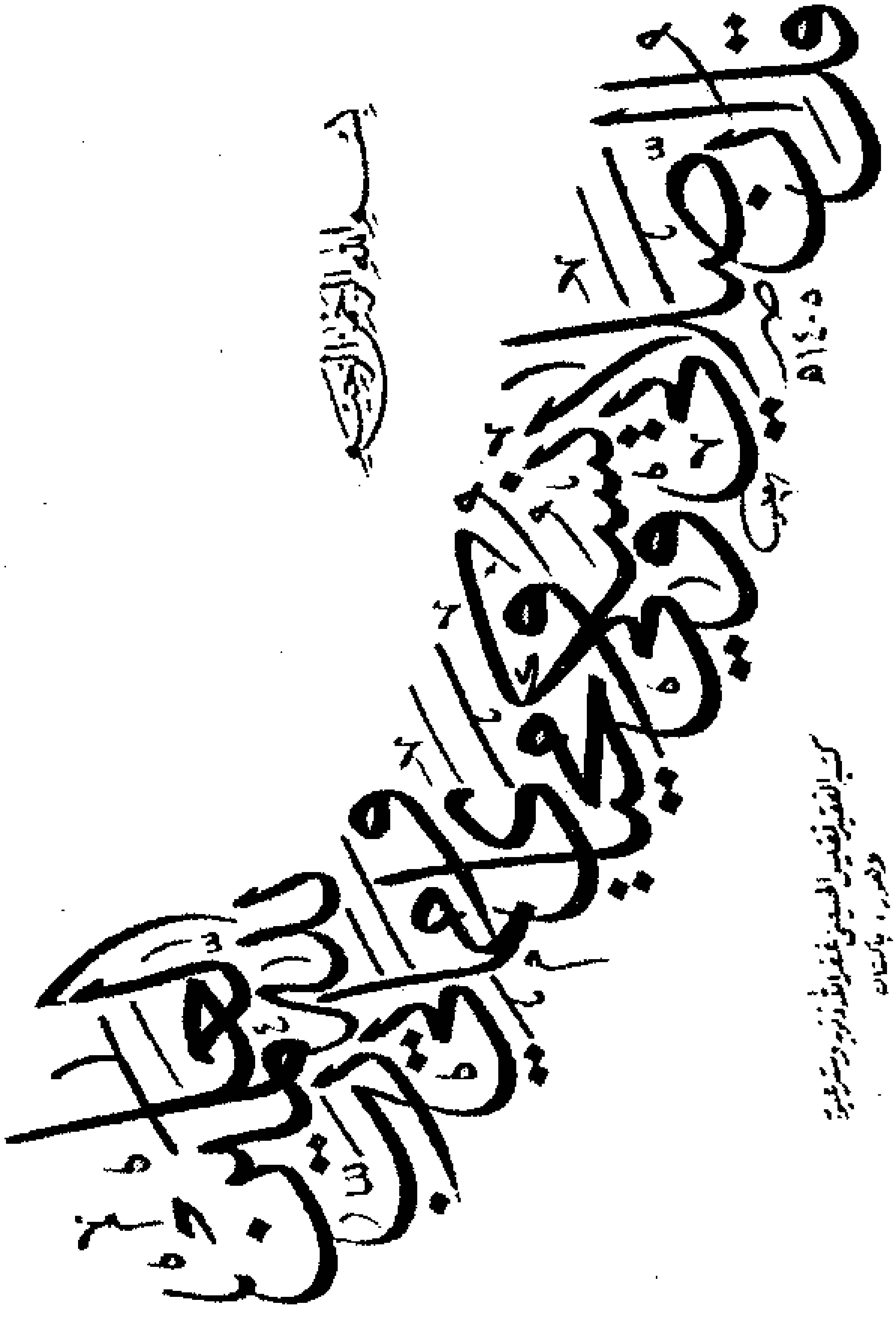
الجواب:۔ اگرچہ بعض علماء کے ہاں شکار کو بطور پیشہ اختیار کرنا مکروہ ہے مگر راجح قول یہ ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق تجارت کے لیے شکار کرنا مباح ہے اس میں حرمت کا کوئی شائبہ نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: هو مباح الا لمحرم فی غیر الحرم اوللتلهی کما هو ظاهر او حرفة علی ما فی الاشباه قال المصنفؒ وانما زدته تبعًا له والا فالتحقیق عندی اباحة اتخاذه حرفة لانه نوع من الاکتساب وکل انواع الکسب فی الاباحة سواء علی المذهب الصحیح۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۶۶۲ کتاب الصید) ۲ہ

لہ لما قال العلامة الحصکفیؒ: هو مباح بخمسة عشر شرطًا ...... الا المحرم فی غیر الحرم اوللتلهی کما هو ظاهر۔ قال العلامة ابن عابدینؒ فی مجمع الفتاوی: ویکره للتلهی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۶۶۱، ۶۶۲ کتاب الصید)

۲ہ قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی التاتارخانیة قال ابو یوسفؒ اذا طلب الصید لهوًا ولعبًا فلا خیر فیه واکرهه وان طلب منه ما یحتاج الیه من بیع او ادام او حاجة اخری فلا بأس۔
رد المحتار ج ۶ ص ۶۶۲ کتاب الصید)

كتاب
الاضحية



کتاب الاضحیۃ

(قربانی کے احکام ومسائل)

نصابِ قربانی کا معیار

سوال: قربانی کے وجوب کے لیے شریعتِ مطہرہ میں نصاب کے معیار کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اگر کوئی شخص اپنے حوائجِ اصلیہ اور قرض کے علاوہ ۷/۲، تولے سونا یا ۵۲/۲، تولے چاندی یا اس مقدار سے زائد نقد مالیت کا مالک ہو تو ایسے شخص پر شرعاً قربانی کرنا لازم ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: قال ابوحنیفة الموسر الذی له مائتا درهم اویساوی مائتی درهم سوی المسکن والخادم والثیاب التی یلبس ومتاع البیت الذی یحتاج الیه وهٰذا اذا بقی له الیٰ ان یذبح الاضحیة۔

(خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۳۰۹ کتاب الاضحیة) [1]

قربانی کے ایام کا حکم

سوال: قربانی کتنے دنوں تک کرنا جائز ہے؟ نیز اس میں جلدی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: قرآن وسنت کی روشنی میں ایام النحر (قربانی کے دن) تین ہیں، یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ متعین دن ہیں، تاہم پہلے دن (۱۰ ذی الحجہ) قربانی کرنا افضل ہے۔

لما ذکر العلامة محمود آلوسیؒ فی تفسیره: وعن تها ثلاثة ایام یوم العید ویومان

---

[1] لما ذکر فی الهندیة: (اما شرائط الوجوب) منها الیسار وهو ما یتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما یتعلق به وجوب الزکوٰة ..... والموسر فی ظاهر الروایة من له مائتا درهم او عشرون دینارًا او شیٔ یبلغ ذٰلك سوی سکنه ومتاع سکنه ومرکوبه وخادمه فی حاجته التی لا یستغنی عنها۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاضحیة۔ الباب الاول فی تفسیرها)

ومِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۶ ص۳۱۲ کتاب الاضحیة۔

وبعده..... لماروی عن عمرو علی وابن عمر وابن عباسٍ و انسٍ و ابی هریرة رضی الله عنهم أنهم قالوا ایام النحر ثلاثة افضلها اولها وقد قالوا سماعاً لأن الرأی لایهتدی الی المقادیر۔ (روح المعانی ج۷ ص۱۴۵) لہ

اُضحیۃ (قربانی کے جانور) کی عمر

سوال:۔ شریعتِ مقدسہ میں قربانی کے لیے جانور کی عمر کی کوئی حد مقرر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے لیے مختلف اجناس کے حیوانات میں مختلف عمروں کا اعتبار کیا ہے۔ اونٹ میں پانچ سال، گائے بھینس میں دو سال، دنبہ اور بکری میں ایک سال کا تعین کیا ہے تاہم اگر دنبہ موٹا تازہ ہو اور ایک سال کا دکھائی دیتا ہو تو پھر اس میں چھ ماہ کی عمر کے دنبے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ویجزئ من ذلک کله الثنی فصاعداً الا الضان فان الجذع منه یجزی..... اذا کانت عظیمة لو خلط بالثنیان یشتبه علی الناظر من بعیدٍ والجذع من الضأن ما تمت له ستة اشهر فی مذهب الفقهاء..... والثنی منها ومن المعز ابن سنة ومن البقر ابن سنتین ومن الابل ابن خمس سنین ویدخل فی البقر الجاموس لانه من جنسه۔ (الهدایة ج۴ ص۴۴۷ کتاب الاضحیة) ؎۲

لہ قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ، وهی جائزة فی ثلاثة ایام یوم النحر ویومان بعده لما روی عن عمرو علی وابن عباس رضی الله عنهم انهم قالوا ایام النحر ثلاثة افضلها اولها۔ (الهدایة ج۴ ص۴۴۴ کتاب الاضحیة) ــــ قال الحافظ قاسم بن قطلوبغا: قوله روی عن عمرو علی وابن عباس۔ قلتُ روی الطحاوی فی الاحکام اثر علی وابن عباسٍ۔ (منیة الالمعی فیما فات من تخریج احادیث الهدایة للزیلعی ص۵۶ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۱۹ کتاب الاضحیة۔

؎۲ قال الشیخ ابوبکر بن علی الحدادالیمنیؒ: (قوله یجزی فی ذلک الثنی فصاعداً الا الضان فان الجذع منه یجزی) یعنی اذا کان عظیماً بحیث اذا خلط بالثنایا یشتبه علی الناظر من بعید فالجذع من الضان ماتم له ستة اشهر وقیل سبعة والثنی منها ومن المعز ماله سنة وطعن فی الثانیة ومن البقر ماله سنتان وطعن فی الثالثة ومن الابل ماله خمس سنین وطعن فی السادسة ویدخل فی البقر الجوامیس لانها من جنسها۔ (الجوهرة النیرة ج۲ ص۲۸۵ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۷ کتاب الاضحیة۔

شرکاءِ قربانی کی تعداد | **سوال**:۔ گائے بھینس وغیرہ کی قربانی میں کتنے اشخاص شریک ہوسکتے ہیں؟

الجواب:۔ گائے بھینس کی قربانی میں شرعاً سات حصوں کی حد مقرر ہے اس سے زائد حصوں کی گنجائش نہیں تاہم سات سے کم حصوں میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤالدین ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولا یجوز بعیر واحد ولا بقرة واحدة عن اکثر من سبعة ویجوز ذٰلک عن سبعة او اقل من ذٰلک۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۷۰ کتاب الاضحیة)[۱]

شرکاءِ قربانی کی نیت کا حکم | **سوال**:۔ اگر قربانی کے شرکاء کی نیت قربت کی حیثیت مختلف ہو، مثلاً بعض نے وجوب اور بعض نے نفل کی نیت کی ہو تو کیا اس سے قربانی متاثر ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور (گائے بھینس وغیرہ) میں شراکت کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ سب کی نیت حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہو، اگرچہ مختلف انواع کی قربات ہوں، لہٰذا متنفلین و واجبین کی قربانی صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو ارادوا القربة الاضحیة او غیرها من اجزاءهم سواء کانت القربة واجبة او تطوعاً او وجبت علی البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة او اختلفت (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۷۱ کتاب الاضحیة)[۲]

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: والتقدیر بالسبع یمنع الزیادة کما لا یمنع النقصان حتی لو کانت الشرکاء فی البدنة او البقرة ثمانیة لم یجزهم ولو کانوا اقل من ثمانیة الا ان نصیب واحد منهم اقل من السبع لا یجوز ایضاً۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۳۱۵ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا۔

[۲] قال العلامة محمد الشهیر بالطوریؒ: تجوز عن سبعة بشرط قصد الکل القربة واختلاف الجهات فیما لا یضر کالقران والمتعة والاضحیة لاتحاد المقصود وهو القربة۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۷ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا۔

شرکتِ اضطراری میں قربانی کا وجوب

سوال:۔ اگر والد کی وفات کے بعد چند بیٹے اس کے وارث ہوں، جائداد متروکہ کو بحالِ خود رکھ کر جملہ برادران اس سے استفادہ کرتے رہیں لیکن تقسیم کرنے کی نوبت نہ آئی ہو، ہر بھائی کا حصہ نصاب کی مقدار سے زائد ہو، کیا اس صورت میں جملہ برادران ایک قربانی کریں گے یا ہر ایک پر قربانی مستقل طور پر واجب ہوگی؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں جبکہ ہر ایک بھائی کا حصہ نصاب کو پہنچتا ہو تو سبب کے متحقق ہونے پر ہر ایک کی ملکیت کا استقلالاً اعتبار ہوگا، ملکیت متحقق ہونے پر شرکت مانع نہیں، اس لیے ہر ایک پر الگ الگ قربانی واجب ہوگی، مشترکہ طور پر ایک قربانی کرنے سے کسی ایک کا بھی ذمہ فارغ نہیں ہوگا

لما قال الامام ابوالحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: الاضحیۃ واجبۃ علی کل حر مسلم موسر فی یوم الاضحیٰ یذبح عن نفسہ۔ انتہی

(مختصر القدوری ص۲۷۸ کتاب الاضحیۃ)[1]

قربانی کا جانور خریدنے کے بعد کسی کو شریک کرنا

سوال:۔ قربانی کے لیے جانور خریدنے کے بعد کسی کو اس میں شریک کیا جائے تو کیا اس طرح کرنے سے قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قربانی کا جانور خریدنے سے قبل سات افراد تک کی شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ ایک دفعہ چند افراد مل کر قربانی کا جانور خریدیں اور ان میں سے کسی ایک شخص کی قربانی نفلی ہو تو ایسی حالت میں کسی کو بعد ازاں شریک کرنا جائز نہیں البتہ اگر تمام حصہ داروں کی قربانی واجب ہو تو پھر کسی کو شریک کرنے میں کوئی حرج نہیں تاہم بہتر یہ ہے کہ قربانی میں شرکت کا دائرہ قربانی کا جانور خریدنے سے قبل تک محدود رکھا گیا ہو۔

---

[1] قال العلامۃ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفیؒ: تجب علی حر مسلم مقیم موسر عن نفسہ۔ انتہی (کنز الدقائق ص۴۲۰ کتاب الاضحیۃ)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۴۱ کتاب الاضحیۃ۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ: ولو اشترى بقرة يريد ان يضحي بها عن نفسه ثم اشرك فيها ستة معه جاز استحساناً.... والاحسن ان يفعل ذلك قبل الشراء ليكون ابعد عن الخلاف۔ (الهداية ج۴ ص۴۴۳ كتاب الاضحية) [1]

نابالغ کی قربانی کا حکم

سوال:۔ کیا صاحبِ نصاب نابالغ پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟ اور وجوب کی ادائیگی باپ یا ولی اپنے مال سے کرے گا یا نابالغ کے مال سے کی جائے گی؟

الجواب:۔ صاحبِ نصاب نابالغ پر شرعاً قربانی واجب ہے اور ادائیگی وجوب اس کے مال سے کی جائے گی۔ [عہ]

لما قال العلامة ابو بكر الكاساني ؒ: واما البلوغ والعقل فليسا من شرائط الوجوب في قول ابي حنيفة ؒ وابي يوسف ؒ..... حتى تجب الاضحية في مال الصبي والمجنون اذا كانا موسرين۔ (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ج۵ ص۶۴ كتاب الاضحية) [2]

میت کے لیے قربانی کا حکم

سوال:۔ کیا میت کی حصہ داری سے دیگر شرکاء کی قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قربانی میں میت کی یا حصہ داری کے بعد مرنے والے کی شراکت شرعاً نقصان دہ نہیں جملہ شرکاء کی قربانی درست اور صحیح ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي ؒ: (وان مات احد السبعة) المشتركين في البدنة

---

[1] قال العلامة الحصكفي ؒ: (وصح اشتراك ستة في بدنة شريت لاضحية) اى ان نوى وقت الشراء الاشتراك صح استحساناً والا لا (استحساناً وكذا) اى الاشتراك (قبل الشراء احب۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۳۱۷ كتاب الاضحية)

ومثله في الهندية ج۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فيما يتعلق به الشركة في الضحايا۔

[2] قال العلامة ابن عابدين ؒ: (وقوله يضحي عن ولده الصغير من ماله) اى مال الصغير ومثله المجنون۔ قال في البدائع ما البلوغ والعقل فليسا من شرائط الوجوب في قولهما۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۱۶ كتاب الاضحية)

عہ البتہ اکثر علماء نے نابالغ اور مجنون کے مال پر قربانی کے عدم وجوب کو راجح قرار دیا ہے (مرتب)

(وقال الورثة اذبحوا عنه وعنكم صح) عن الكل استحسانًا لقصد القربة من الكل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۶ کتاب الاضحیۃ) ۱؎

بلا عذر شرعی قربانی چھوڑ دینا

سوال:۔ قربانی واجب ہونے کے باوجود بلا عذر شرعی چھوڑ دی جائے اور قربانی کے ایام گذر جائیں تو پشیمانی کے احساس کے طور پر کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ قربانی واجب شرعی ہے بلا عذر ترک کرنا موجب گناہ ہے، تاہم قربانی کے دن گذرنے کے بعد اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے ممکن ہے اللہ تعالیٰ اسکی طرف سے قبول کرلے، اور اگر کوئی قربانی کو اپنے اوپر خود واجب کرلے یا فقیر قربانی کے لیے جانور خرید لے تو اس صورت میں زندہ جانور کو صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ: ولو لم يضح حتى مضت ايام النحر ان كان واجب على نفسه اوكان فقيراً وقد اشترى الاضحية تصدق بها حية و ان كان غنياً تصدق بقيمته شاة اشترى اولم يشترى لانها واجبة على الغني وتجب على الفقير بالشراء بقيمة۔ (الهداية ج ۴ ص۴۴۴ كتاب الاضحية) ۲؎

قربانی کے جانور کو تبدیل کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے قربانی کے لیے جانور خریدا، بعد ازاں محض اس لالچ کی وجہ سے فروخت کرنا کہ دوسرا کم قیمت والا جانور مل جائے تو کچھ رقم کا فائدہ ہوگا، تو کیا اس صورت میں اُس

۱؎ قال العلامة علاؤ الدين الكاساني ؒ: إذا اشترك سبعة في بدنة فمات احدهم قبل الذبح فرضى ورثته ان يذبح عن الميت جاز استحساناً۔
(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ج۵ ص۷۲ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُهُ في خلاصة الفتاوى ج ۴ ص۳۱۵ كتاب الاضحية۔

۲؎ قال العلامة عبد الله بن مودود الموصلي: فان مضت ولم يذبح فان كان فقيراً وقد اشترى تصدق بها حية وان كان غنياً تصدق بثمنها اشتراها اولا۔
(الاختيار لتعليل المختار ج ۵ ص۱۹ كتاب الاضحية)
وَمِثْلُهُ في الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۰ كتاب الاضحية۔

خریدے ہوئے جانور کو فروخت کرکے دوسرا جانور خریدنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر قربانی کرنے والا غنی ہو اور اس پر قربانی واجب ہو تو ایسی حالت میں خریدنے سے جانور متعین نہیں ہوتا اس لیے اس حال میں تبدیلی مرخص ہے لیکن اگر قربانی نفلی ہو جو کہ خریدنے سے واجب ہو جاتی ہے پھر اس میں تبدیلی مرخص نہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں ایسی صورت میں زائد رقم بچے تو اس کا تصدق کیا جائے گا، بلکہ فقہاء نے صورتِ اولیٰ میں بھی زائد رقم کے تصدق کو اولیٰ قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ : وفي الاصل اشترى اضحية ثم باعها جاز في ظاهر الرواية ولو اشترى مثلها وضحى بها ان كانت الثاني مثل الاولى او خيراً منها جاز لا يلزمه شيء آخر، وان كان دون الاولى تصدق بفضل القيمتين۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۱۹ كتاب الاضحية) [۱]

قربانی کے جانور سے انتفاع کا حکم

سوال :- کیا قربانی کے جانور سے دودھ لینا یا سواری کیلئے استعمال کرکے انتفاع لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- قربانی کے جانور سے انتفاع لینا شرعاً درست نہیں بلکہ اس کے دودھ کو ٹھنڈے پانی سے خشک کیا جائے گا، تاہم اگر دودھ یا بال وغیرہ اجزاء سے انتفاع لیا جائے تو بعینہٖ اس اجزاء کو یا اس کی قیمت کو فقراء میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ : (قوله يكره الانتفاع بلبنها) فان كانت التضحية قريبة ينضح ضرعها بالماء البارد الاحليه وتصدق به۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۹ كتاب الاضحية) [۲]

---

[۱] وذكر في الهندية : رجل اشترى شاة للاضحية واوجبها بلسانه ثم اشترى اخرى جاز له بيع الاولى في قول ابي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى وان كانت الثانية شراً من الاولى وذبح الثانية فانه يتصدق بفضل ما بين القيمتين۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۹۴ الباب الثاني في وجوب الاضحية بالنذر)

[۲] قال العلامة ابن البزاز الكردريؒ : ويكره حلبها وجز صوفها قبل الذبح وينتفع به فان فعله تصدق به ...... وان في ضرعها لبن يخاف عليه تنضح ضرعها بالماء البارد او فرجها بالماء البارد اذ قربت ايام النحر وان بعدت يحلبها ويتصدق باللبن وما اصاب من اللبن تصدق بمثله اوقيمته وكذا الصوف۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۲۹۴ كتاب الاضحية السادس في الانتفاع)

وَمِثْلُهٗ في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۲۱ كتاب الاضحية۔

قربانی کے گوشت کی تقسیم کا طریقہ

سوال:۔ شریعتِ مقدسہ میں قربانی کے گوشت کو حصہ داروں اور فقراء میں تقسیم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور میں حصہ داروں کو جائز رکھا ہے لہٰذا گوشت کو شرکاء آپس میں ایسے طریقے سے تقسیم کریں جس میں کسی کی حق تلفی کا امکان نہ ہو، تاہم فقراء پر صدقہ کے لیے وزن کرنا ضروری نہیں۔

لما قال العلامه فخر الدین حسن بن الفرغانیؒ: سبعة ضحوا ببقرة واقتسموا لحمها وزنًا جاز لان بیع اللحم باللحم وزنًا بمثل مثلاً جائز فکذٰلک القسمة فان اقتسموا جزافًا لا یجوز اعتبارًا بالبیع۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۵۱ فصل فیما یجوز فی الضحایا ... الخ)[1]

قربانی کے گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کرنا

سوال:۔ کیا قربانی کا سارا گوشت خود رکھا جا سکتا ہے یا تین حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے؟ اس کی تقسیم کے صحیح طریقہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرنا مندوب ہے۔ ایک حصہ فقراء پر تقسیم کیا جائے، دوسرا حصہ عزیز و اقارب کو کھلایا جائے اور تیسرا حصہ اپنے لیے رکھ لیا جائے، تاہم اگر سارا گوشت صدقہ کر دیا جائے یا اپنے لیے ذخیرہ کر لیا جائے تو بھی مرخص ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: والافضل ان یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لاقاربه واصدقائه ویدخر الثلث ... ولو تصدق بالکل جاز ولو حبس الکل لنفسه جاز۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۸۱)[2]

---

[1] قال العلامة شمس الدین محمد بن عبدالله التمرتاشیؒ: ویقسم اللحم وزنًا لا جزافًا۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۱۷ کتاب الاضحیة)
ومثله فی الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۲۹۰ الباب الرابع فیما یجوز من الاضحیة۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: والافضل ان یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لاقاربه واصدقائه ویدخر الثلث ویستحب ان یأکل منها ولو حبس الکل لنفسه جاز لان القربة فی الاراقة والتصدق باللحم تطوع۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیة)
ومثله فی الهندیة ج۵ ص۳۰۰ الباب السادس فیما یستحب من الاضحیة۔

میت کی طرف سے کی گئی قربانی کے گوشت کا حکم

سوال:۔ کیا میت کی طرف سے کی گئی قربانی کا گوشت خود کھایا جاسکتا ہے یا صدقہ کرنا لازمی ہے ؟

الجواب:۔ اموات کی طرف سے ذبح شدہ قربانی کے جانور کا گوشت خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا جائز ہے بشرطیکہ قربانی میت کی وصیت سے نہ کی گئی ہو ورنہ وصیت کی صورت میں صدقہ کرنا لازمی ہے ۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ : ولو ضحی عن میت من مال نفسہ بغیر امر المیت جاز وله ان يتناول منه ولا يلزمه ان يتصدق به لانها لم تصر ملكاً للميت..... وان ضحى عن ميت من مال الميت بامر الميت يلزمه التصدق بلحمه ولا يتناول منه لان الاضحية عن الميت ۔ (الفتاوىٰ قاضيخان على هامش الهندية ج۳ ص۳۵۲ فصل فيما يجوز فى الاضحية مالا يجوز) [1]

نذر کی ہوئی قربانی کے گوشت کا حکم

سوال:۔ نذر کی ہوئی قربانی کے گوشت کا کیا حکم ہے ؟ کیا قربانی کرنے والا اس میں سے خود کھا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ نذر کی ہوئی قربانی بھی قربت الی اللہ کا ذریعہ ہے لیکن ناذر اپنی قربانی کا گوشت نذر کی وجہ سے خود نہیں کھا سکتا بلکہ تمام گوشت فقراء میں تقسیم کرنا لازمی ہوگا ۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ : ولو فقيراً ولو ذبحها تصدق بلحمها ولو نقصها تصدق بقيمة النقصان ايضاً ولا يأكل الناذر منها فان اكل تصدق بقيمة ما اكل ۔ وفى حاشية رد المحتار : اوفقيراً شراها وان ذبح لا يأكل منها ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۱ كتاب الاضحية) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ : من ضحى عن الميت يصنع كما يصنع فى اضحية نفسه من التصدق والاكل والاجر للميت والملك للذابح ۔ قال الصدر والمختار انه ان كان بامر الميت لا يأكل منها والا يأكل ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۶ كتاب الاضحية) ـــــ ومثله فى خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۳۲۲ كتاب الاضحية ۔

[2] قال العلامة فخر الدين الزيلعیؒ : ان وجبت بالنذر فليس لصاحبها ان يأكل منها شيئاً ولا ان يطعم غيره من الاغنياء سواء كان الناذر غنياً او فقيراً لان سبيلها التصدق وليس للمتصدق ان يأكل صدقته ولا ان يطعم الاغنياء ۔ (تبيين الحقائق ج۶ ص۸ كتاب الاضحية) ومثله فى الهندية ج۵ ص۳۰۰ الباب الخامس فى محل اقامة الواجب ۔

چرمِ قربانی کا رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرنا

سوال :- چرم قربانی یا اسکی قیمت مسجد، مدرسہ یا رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- چرم قربانی از قبیل تطوعات ہے، اس لیے بعینہٖ کھال کو مسجد، مدرسہ یا رفاہ عامہ کے کاموں یا اغنیاء کو تملیکاً دینا اور استعمال کرنا شرعاً مباح ہے، البتہ کھال کی قیمت کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں، اس کے علاوہ دیگر امور میں استعمال کرنا ناجائز عمل ہے، تاہم اگر بعینہٖ کھال کسی غنی کو تملیکاً بغیر توکیل وحیلہ کے حوالے کی جائے تو غنی کا اپنی طرف سے کھال کی قیمت مسجد یا مدرسہ اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کرنے سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ : ويتصدق بجلدها او يعمل منه نحو غربال وجراد وقربة وسفرة ودلو او يبدله بما ينتفع به باقياً) كما مر (لا بمستهلك كخل ولحم غيره كدراهم (فان بيع اللحم والجلد به) بمستهلك او بدراهم يتصدق بثمنه) ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۸ كتاب الاضحية)[1]

صاحب نصاب کو چرم قربانی دینا جائز ہے

سوال : کیا صاحب نصاب امام مسجد یا دیگر اشخاص کو چرم قربانی دینا یا خود استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- راجح اور مفتیٰ بہ قول کی رُو سے چرمِ قربانی صدقاتِ نافلہ کے زمرے میں ہے، اس لیے بعینہٖ چرمِ قربانی کو خود استعمال کرنا اور اپنی اولاد یا دیگر

---

[1] لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ : ويجوز الانتفاع بجلد الاضحية والهدي والمتعة والتطوع بان يتخذه فروا او بساطاً او جراباً او غربالاً وله ان يشتري بمتاع البيت كالغربال والجراب والخف ولا يشتري به الخل والمري واللحم ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدقها وليس له ان يبيعه بالدراهم لينفقها على نفسه ولو فعل ذلك يتصدق بثمنه ۔ (خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۳۲۱، ص ۳۲۲ كتاب الاضحية)
ومثله في الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۴ ص ۲۹۴ - السادس في الانتفاع كتاب الاضحية۔

اغنیاء کو دینا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ویتصدق بجلدها او یعمل منه نحو غربال وجراب) وقربة سفرة ودلو (او یبدل بما ینتفع به باقیاً۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیة) لہ

قربانی کا گوشت اُجرت میں دینا جائز نہیں

سوال:۔ اگر قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت اور رصاف کرتے وقت کسی شخص سے مدد لی جائے اور پھر اس کو گوشت یا جزء اضحیہ حق الخدمت کے طور پر دیا جائے تو اس سے قربانی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

الجواب:۔ قربانی کی حقیقت محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے (اراقۃ الدم) خون بہانے تک محدود ہے، تاہم ایسے مقدس فعل میں کسی قول یا خودغرضی کا شائبہ ہونا اس کے فلسفہ سے متصادم ہے، اس لیے قربانی کے کسی جزء کو ذاتی مقاصد کے لیے فروخت کرنا یا کسی کو حق الخدمت میں دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامة شمس الدین محمد بن عبداللہ التمرتاشیؒ: (ولا یعطی اجر الجزار منها) لانه کبیع۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیة) لہ

داغدار جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ داغدار جانور کی قربانی کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ داغ، دھبہ ایسے عیوب نہیں جو قربانی کرنے سے مانع ہوں، لہٰذا داغدار

لہ لما قال الامام شیخ الاسلام ابوبکر الحدادالیمنیؒ: (قوله ویتصدق بجلدها) لانها جزء منها (قوله او یعمل منه آلة تستعمل فی البیت) کالنطع والجراب والغربال ولا بأس ان یتخذ فروًا لنفسه۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص۲۸۵ کتاب الاضحیة)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۸ کتاب الاضحیة۔

لہ قال العلامة علاؤ الدین ابوبکر الکاسانیؒ: ولا ان یعطی اجر الجزار والذابح منها۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۸۱ کتاب الاضحیة)
وَمِثْلُهٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج ۵ ص۱۹ کتاب الاضحیة۔

جانور کی قربانی صحیح اور درست ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: والتی بها كیٌّ والتی لا ینزل لها لبن من غير علة والتی لها ولد یجوز۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۲۱ کتاب الاضحیة)[1]

نکیل والے جانور کی قربانی کا حکم

سوال: کسی جانور کی ناک میں نکیل ڈالنے سے قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قربانی کے جانور میں کسی عضو کا ثلث سے زیادہ عیب دار ہونا قربانی پر اثر انداز ہوتا ہے، ثلث یا ثلث سے کم قربانی سے مانع نہیں، چونکہ نکیل ڈالنے سے جانور کی ناک میں معمولی سا سوراخ ہو جاتا ہے جس کا قربانی پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

لما قال الامام المجتهد ابو عبد الله محمد بن الحسن الشيبانيؒ: وان قطع من الذنب او الاذن والالية الثلث او اقل اجزاه وان كان اكثر لم يجز۔ (الجامع الصغير ص۳۸۷ کتاب الاضحیة)[2]

سینگ کا ٹوٹ جانا مانع قربانی نہیں

سوال: اگر کسی جانور کے سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ جائیں تو اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور میں اس عیب کو معیوب قرار دیا ہے جو جانور کے منافع اور خوبصورتی میں رکاوٹ بنتا ہو، چنانچہ سینگ جانور کا ایسا جز نہیں جس کے نہ ہونے کی وجہ سے جانور کے منافع یا خوبصورتی میں فرق آتا ہو، لہٰذا اس قسم کے جانور کی قربانی میں شرعاً کوئی حرج نہیں بشرطیکہ سینگ دماغ کی ہڈی

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: تجوز الضحية بالمجبوب..... والتی لها كیٌّ والتی لا لسان لها فی الغنم۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۵ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۵ ص۲۹۷ الباب الخامس فی محل اقامة الواجب۔

[2] قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: وان قطع من الذنب او الاذن او العين او الالية الثلث او اقل اجزاه وان كان اكثر لم يجز لان الثلث تنفذ فيه الوصية من غير رضاء الورثة فاعتبر قليلاً۔ (الهداية ج۴ ص۴۴۵ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۶ ص۳۲۴ کتاب الاضحیة۔

تک نہ ٹوٹا ہو۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله ویضحی بالجماء) هی التی لا قرن لها خلقة وکذا العظماء التی ذهب قرنها بالکسر الی المخ لم یجز۔

(رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۳ کتاب الاضحیة) ۱؎

حاملہ جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ اگر قربانی کے لیے خریدا گیا جانور (گائے، بکری وغیرہ) حاملہ نکل آئے تو کیا اس کی قربانی جائز ہے یا اس کو تبدیل کیا جائے گا؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ میں عیب دار جانور کی قربانی صحیح نہیں لیکن حمل کوئی ایسا عیب نہیں جو قربانی سے مانع بنے، تاہم چونکہ اس میں بلا ضرورت ایک دوسری جان کا ضیاع ہے اس لیے حاملہ کی قربانی کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة جلال الدین الخوارزمیؒ: رجل له شاة حامل فاراد ذبحها تقارب الولادة یکره ذبحها لان فیه تضییعاً لما فی بطنها من غیر فائدة۔

(الکفایة شرح الهدایة فی ذیل فتح القدیر ج ۸ ص ۴۱ کتاب الاضحیة) ۲؎

خنثیٰ مشکل جانور کی قربانی کا مسئلہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! خنثیٰ مشکل جانور کی قربانی شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس جانور کے نر یا مادہ ہونے کی تمیز مشکل ہو اور دونوں کی علامات موجود ہوں تو چونکہ ایسے جانور کے گوشت کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اس لیے

۱؎ قال العلامة ابو بکر الکاسانی رحمہ اللہ:۔ وتجزی الجماء وهی التی لا قرن لها خلقة وکذا المکسورة القرن ...... فان بلغ الکسر المشاش لا تجزیه المشاش رؤس العظام۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص ۷۶ کتاب الاضحیة)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۴ ص ۴۴۶ کتاب الاضحیة۔

۲؎ قال العلامة المحقق محمد الشهیر بالطوریؒ: ویکره ذبح الشاة اذا تقارب ولادتها لانه یضیع ما فی بطنها۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۱۷۱ کتاب الاضحیة)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج ۶ ص ۳۰۴ کتاب الذبائح۔

ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : ولا بالخنثیٰ لان لحمها لا ینضج۔
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۵ کتاب الاضحیۃ) [1]

خصّی جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ شریعت مقدسہ میں خصّی جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جانور کے اخصاء سے اس کے گوشت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس لیے خصّی جانور کی قربانی نہ صرف جائز ہے بلکہ فقہاء نے مستحب کہا ہے ۔

لما قال العلامة ابوبکر بن علی الحدّاد الیمنیؒ : قوله یجوز ان یضحی..... والخصی لانه اطیب لحمًا من غیر الخصی ۔قال ابو حنیفةؒ ما زاد فی لحمه انفع مما ذهب من خصیتیه ۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص۲۸۵ کتاب الاُضحیة) [2]

قربانی کیلئے جانور خرید کر موٹا کرنا

سوال :۔اگر کوئی شخص دس ذی الحجہ سے دو تین ماہ قبل قربانی کے لیے جانور خریدے اور پھر اس کو خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کرے تو کیا اس شخص کو اس عمل کا ثواب ملے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ قربانی کے لیے پہلے سے جانور خریدنا اور پھر اس کو خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کرنا مستحب اور باعثِ اجر و ثواب عمل ہے ۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) قربانی کا جانور پہلے سے خریدنا اور اس کو موٹا تازہ کرنا مستحب ہے۔ الخ (امداد الاحکام جلد۴ ص۱۹۰، کتاب الصید والذبائح والاضحیة)

---

[1] لما ذکر فی الهندیة : لا تجوز التضحیة بالشاة الخنثیٰ لان لحمها لا ینضج۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۲۹۹ الباب الخامس فی محل اقامة الواجب)

[2] لما ورد فی الحدیث : عن جابر بن عبد الله قال ذبح النبی صلی الله علیه وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۳۸۲ کتاب الاضحیة)
ومثلهٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۸۰ کتاب الاضحیة ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قربانی کرنا سوال:۔ اگر کوئی شخص پیارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کرے تو یہ قربانی ہو جائے گی یا نہیں اور اس میں ثواب ہوتاہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ درست ہے اور اس میں ثواب بھی ہوتاہے اور اس کے گوشت کا حکم اپنی قربانی کے گوشت جیسا ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص۵۸۹ کتاب قربانی اور عقیقہ کے مسائل)

قربانی کے جانور کے دانت دیکھنا سوال:۔ ہمارے علاقے کے اکثر لوگ قربانی کا جانور خریدتے وقت اس کے دانت ضرور دیکھتے ہیں اگر کسی جانور کے سامنے والے دو دانت نہ نکلے ہوں تو اس کو قربانی کے لیے نہیں خریدتے چاہے اس جانور کی عمر پوری ہی کیوں نہ ہو۔ تو کیا قربانی کرنے کے لیے جانور کے سامنے کے دو دانتوں کا نکل آنا ضروری ہے یا نہیں ؟ وضاحت سے اس مسئلے کو بیان فرمایا جائے۔

الجواب :۔ علماء احناف کے نزدیک قربانی کے لیے جو جانور متعین کیا جائے اس کی عمر کا خیال رکھنا ضروری ہے دانتوں کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے اگر کسی جانور کی عمر پوری ہو تو اس کی قربانی بلا شک وشبہ جائز ہے چاہے اس کے دانت نکلے ہوں یا نہ نکلے ہوں، چونکہ اس عمر میں عموماً جانوروں کے دانت نکل آتے ہیں اس لیے بطور علامت دیکھے جاتے ہیں۔ ویسے آجکل دھوکہ دہی کا عام رواج ہے، لوگ چند پیسوں کی خاطر کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے کم عمر جانور کی عمر پوری بتاتے ہیں اس لیے دانتوں کا دیکھنا مناسب ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وصح الجذع ذو ستة اشهر من الضأن ان كان بحيث لو خلط بالثنايا لا يمكن التميز من بعيد وصح الثني فصاعداً من الثلاثة والثني هو ابن خمس من الابل وحولين من البقر والجاموس وحول من الشاة ـ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۱، ۳۲۲ كتاب الاضحية) [1]

---

[1] لما قال الشيخ المفتي عبد الرحيم رحمه الله: عمر پوری ہونی ضروری ہے، دانت کی علامت ہو یا نہ ہو۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد ۳ ص۱۸۷ کتاب الاضحیہ)

عورت کے حقِ مہر پر قربانی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو حق مہر میں ۱۰ تولہ سونا بشکل زیورات دیا ہے، اس کے علاوہ عورت کے پاس کوئی نقدی وغیرہ نہیں، تو کیا یہ عورت قربانی کرے گی یا نہیں؟ جبکہ اس کا شوہر اب اتنا مالدار نہیں رہا کہ وہ خود قربانی کر سکے؟

الجواب:۔ جب کسی کے پاس ۷½ تولہ سونا موجود ہو چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو یا اینٹ کی شکل میں اور اس پر کوئی قرضہ وغیرہ نہ ہو تو یہ شخص صاحبِ نصاب ہے اس کے ذمے قربانی کرنا لازم ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عورت کے ذمے قربانی کرنا واجب ہے وہ ہر صورت میں قربانی کرے گی، موصوفہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر لاگو نہ ہوگی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وشرائطها: الاسلام والاقامة واليسار الذي يتعلق به وجوب صدقة الفطر کما مر۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۱۲ کتاب الاضحیۃ) ؎۱

گذشتہ سالوں کی قربانی کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے گذشتہ کئی سالوں کی قربانی رہ گئی ہو اور وہ اس کی قضاء کرنا چاہے تو شرعاً اس کا کیا طریقہ ہوگا کہ اس کا ذمہ فارغ ہو جائے؟

الجواب:۔ گذشتہ سالوں کی رہ جانے والی قربانی کی قضاء کا طریقہ یہ ہے کہ جتنے سالوں کی قربانی رہ گئی ہو تو ہر سال کی قربانی کے بدلے اس کی قیمت فقراء ومساکین میں صدقہ کر دے اور اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی مغفرت بھی مانگے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وتصدق بقيمتها غني شراها اولا لتعلقها بذمته بشرائها اولاً فالمراد بالقيمة قيمة شاة تجزي فيها۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۱ کتاب الاضحیۃ) ؎۲

؎۱ لما قال العلامة مفتی عبدالرحیمؒ: جب عورتیں صاحبِ نصاب ہیں تو اُن پر قربانی کرنا واجب ہے کہ اپنے پیسے سے قربانی کریں خود کے پاس رقم نہ ہو تو شوہر کے پاس سے لے کر قربانی کریں، یا شوہر عورتوں سے اجازت لیکر ان کی طرف سے قربانی کریں تو واجب قربانی ادا ہو جائے گی۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج ۳ ص ۱۸۰ کتاب الاضحیہ)

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: ولو تركت التضحية حتى مضى وقتها...... واما الغني اذا لم يشتر الاضحية فيتصدق بقيمة شاة على الصحيح۔ (الفقه الاسلامی وادلته، ج ۳ ص ۶۱۰ كتاب الاضحية۔ المبحث الثالث، وقت التضحية)

قربانی کی بجائے قیمت

ہمارے ملک اور بعض اسلامی ممالک میں دین کی روح سے نابلد ایسے روشن خیال اور تجدد زدہ افراد کی کمی نہیں جو آئے دن اپنی تحقیق مد اجتہاد کی چھری اسلامی شعائر اور قطعی و متواتر احکام وعبادات پر چلانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر ایسے شوشے شوشے چھوڑ دیتے جاتے ہیں کہ قربانی کرنا جانوروں کی ضیاع ہے۔ اس سے قومی سرمایہ ضائع ہوتا ہے۔ اور بجائے قربانی کے اس کی قیمت کو رفاہی کاموں میں لگانا چاہیئے علماء اسلام نے تفصیل سے ایسے شبہات اور وسوسہ اندازیوں کے معقول جوابات دیئے ہیں۔ اس دفعہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس ۱۳۹۶ھ کے نوٹس میں الجزائری اخبار الشعب مجریہ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ میں شائع شدہ ایک الجزائری فتویٰ لایا گیا ہے، جس میں حج کے موقعہ پر قربانی کی بجائے اس کی نقد قیمت تقسیم کرنے کا کہا گیا تھا۔ رابطہ کی مجلس تاسیسی نے تفصیلی دلائل کے ساتھ ایک فتویٰ میں اس نظریہ کو غیر اسلامی قرار دیا کہ قرآن وسنت کے واضح نصوص نبی کریم علیہ السلام کے عمل، قولی و فعلی ہدایات اور عہدِ نبوت سے لے کر اب تک صحابہ کرامؓ اور امتِ مسلمہ کے تعامل سے ثابت شدہ مسائل و عبادات میں کسی رائے زنی کی گنجائش نہیں، تقرب الی اللہ خود ساختہ طریقوں سے لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کرنے سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنے میں ہے کسی کام کے اقتصادی اور معاشی مصالح کے پہلو تب تلاش کئے جا سکتے ہیں جہاں امت کے اجماعی فیصلوں اور نصوص قطعی پر زد نہ پڑے اس لئے استبدال ذبائح بالثمن جیسے لایعنی مباحث کا دروازہ کھولنا ابتداع اور مداخلت فی الدین کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مذکورہ بہر سہ قرار دادوں میں اسلامی اتحاد اور جمہور اہلسنت کے عقائد کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے اس لئے ایسی قرار دادیں عالم اسلام کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے اطمینانِ قلب و زیادتِ ایمان کا باعث ہیں۔ دوسری طرف مغرب سے متاثر خام اذہان کو بھی تنبیہ ہو جاتی ہے۔ کہ ایسے مسائل میں عالم اسلام کی اکثریت کسی بھی ملحدانہ خیالات کی روادار نہیں۔

عقیقہ کی مشروعیت کا فلسفہ

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! عقیقہ کی مشروعیت کا کیا فلسفہ ہے، اسلام نے اس کا کیوں حکم دیا ہے؟ تفصیلاً وضاحت فرماکر مشکور فرمائیں؟

الجواب :۔ احکام شرعیہ کی مشروعیت میں بعض حکمتیں پنہاں ہوتی ہیں، عقیقہ کی مشروعیت اور ساتویں دن کی رعایت کی بعض حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں، نفس مشروعیت کی حکمتوں اور فلسفوں کی طرف فیلسوفِ اسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اشارہ کرکے فرماتے ہیں کہ :۔

وکان فیھا مصالح کثیرۃ راجعۃ الی المصلحۃ الملیۃ والمدنیۃ والنفسیۃ فابقاھا النبیؐ وعمل بھا ورغب الناس فیھا۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج۲ ص۲۱۲)

(ترجمہ) "عقیقہ میں بہت سی مصلحتیں تھیں جن کا تعلق مصالح نفسیہ مدنیہ اور ملیہ سے تھا، ان مصالح کی وجہ سے رسول اللہؐ نے اس کو باقی رکھا، خود بھی اس پر عمل کیا اور لوگوں کو بھی اس کی رغبت دلائی۔"

عقیقہ کے فوائد سے متعلق حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں :۔

(۱)۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ معاشرہ میں بچے کا اپنے سے نسب کا متعارف کرانا ایک ضروری امر ہے تاکہ معاشرہ والوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہ بچہ فلاں شخص کا بیٹا ہے اور کوئی شخص اسکے متعلق ناپسندیدہ بات نہ کہہ سکے۔ اس کے تعارف کے لیے ایک صورت یہ بھی تھی کہ یہ شخص خود گلی کوچوں میں پکارتا پھرے کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات ناگوار تھی، اس لیے جب لوگوں کو عقیقہ پر بلایا جائے یا ان کے پاس گوشت بھیجا جائے تو اس کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ اس شخص کے ہاں بچہ یا بچی پیدا ہوئی ہے۔

(۲)۔ عقیقہ کے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان میں سخاوت کا مادہ پیدا ہوتا ہے، بخل اور کنجوسی جیسی مذموم صفت سے بچنے کی ایک تدبیر ہے جو انسان کی خوبی شمار ہوتی ہے۔

عقیقہ کے مذہبی اور ملی فائدہ

عقیقہ کے مذہبی اور ملی فوائد میں سے ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس میں ملتِ ابراہیمی سے تعلق کا مظاہرہ ہوتا ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں بچہ پیدا ہونے پر زرد رنگ کے پانی میں اس کو رنگ دیا جاتا ہے جس کو یہ لوگ "معمودیہ /بپتسمہ" کہتے ہیں اور اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۳۸)

(ترجمہ) "ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا ہے اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہوسکتا ہے اور ہم تو اسی اللہ کے پرستار ہیں۔"

اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی نسبت ملتِ ابراہیمی سے واضح کریں، مسلمانوں کے عام معاشرتی افعال میں ایسے طریقے ہونے چاہئیں جس سے ملتِ ابراہیمیؑ کا تعلق معلوم ہوتا ہو، ملتِ ابراہیمی میں یہ متعارف تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کی جگہ ایک دُنبہ ذبح کیا تھا۔

علاوہ ازیں مشہور افعال میں سے حج بھی ہے جس میں ذبح کرنا اور بال منڈوانا بھی ہے۔ تو عقیقہ کرنے سے ملتِ ابراہیمی کے ان متعارف افعال اور امور سے نسبت پیدا ہوتی ہے اس لیے مذہبی تعلق کے مظاہرہ کے لیے ایک عظیم صورت ہے۔ ایک اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اس میں تابعداری اور انقیاد کا ایک نمونہ ہے، کیونکہ بچے کی پیدائش پر اس عقیقہ سے ایسا ہی ہوا جیسا کہ اس نے اپنا یہ بیٹا ہی اس کے دربار میں پیش کیا جو اتباع اور فرمانبرداری کی معراج ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۴۲/۱۴۳م)

عقیقہ کرنے میں ایک نکتہ اور راز یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنا بچہ بڑا پیارا ہوتا ہے، بچے کی پیدائش پر والدین کو بہت ہی خوشی ہوتی ہے اور مستقبل کی امیدوں کی سوچ و فکر سے گھر کا ہر فرد خوشی کی وجہ سے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا، ہر ایک کا دل فرحت و سرور سے لبریز ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ بطور تشکر کچھ تصدق ہو اور تصدق کی بہترین صورت یہ قربانی یعنی عقیقہ ہے۔

(الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۲۸۳ المبحث الثالث حکمۃ اللحوم۔ الخ)

عقیقہ کے فوائد میں سے اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ عقیقہ کا گوشت فقراء اور مساکین، دوستوں اور رشتہ داروں کو پیٹ بھر کر کھلانے سے طبعی طور پر ان کے دلوں سے دعائیں نکلیں گی جس سے بچہ کا مستقبل روشن ہوگا، عقیقہ فقراء اور مساکین، دوست واحباب کی دعاؤں کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

تسبیع کی رعایت کا فلسفہ یہ بات ثابت ہے کہ عقیقہ میں بہتر یہ ہے کہ یہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں: "اگر بچہ کی پیدائش کے وقت یہ ضروری قرار دیا جائے تو ممکن ہے کہ اس سے بچے کے والدین کو تکلیف ہو، کیونکہ اس وقت ایک تو گھر کے لوگ بچہ اور اس کی ماں کی خبر گیری میں مصروف اور مشغول ہوتے ہیں، ایسے وقت میں ان کو عقیقہ کا حکم کرنا ان کے لیے کہیں تکلیف کا باعث نہ بنے، علاوہ ازیں ایسے اوقات میں کبھی کبھار جانور ملنے میں بھی دشواری ہوتی ہے، فوراً لزوم کی صورت میں پورا گھرانہ ان تمام مشکلات سے دوچار ہوگا، اس لیے مسنون یہ رہا کہ عقیقہ ساتویں دن ہو جس کے لیے ایک ہفتہ قابلِ اعتماد مدت ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۴۴)

عقیقہ کے لیے جانور متعین کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص عقیقہ کے لیے کوئی جانور متعین کر دے مگر زیادہ پیسے ملنے کے لالچ یا کسی اور فائدہ کی غرض سے وہ شخص اسے فروخت کر کے کوئی دوسرا جانور ذبح کر دے تو کیا اس سے عقیقہ کی سنت ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ عقیقہ چونکہ شرعاً واجب نہیں اس لیے اگر کسی شخص نے عقیقہ کیلئے کوئی جانور متعین کیا لیکن بعد میں اس نے کسی وجہ سے دوسرا جانور ذبح کیا تو اس سے عقیقہ کی سنت ادا ہو گئی، متعین کردہ جانور ذبح کرنا ضروری نہیں۔

مُردہ بچے کے عقیقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد فوت ہو جائے تو کیا اس بچے کا عقیقہ کرنا مستحب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا مستحب ہے لیکن یہ استحباب صرف زندہ بچے تک محدود ہے مُردہ بچے کے عقیقہ کا استحباب ثابت نہیں۔

لما قال الشیخ المفتی عبد الرحیمؒ: مرحوم بچہ کے عقیقہ کا مستحب ہونا ثابت نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد ۲ صـ۹۴ کتاب الاضحیہ)

بچے کا عقیقہ کس پر ہے

سوال:۔ بچے کا عقیقہ کرنا والدین میں سے کس کے ذمے لازم ہے؟

الجواب:۔ بچے کا نان ونفقہ والدین میں سے جس کے ذمے واجب ہو تو استطاعت ہونے کی صورت میں بچے کا عقیقہ کرنا بھی اُسی پر لازم ہے، استطاعت نہ ہونے کی صورت میں کسی کے ذمے لازم نہیں۔

لما قال الشیخ المفتی عبد الرحیم: جس کے ذمے بچہ کا نفقہ واجب ہے اسی کے ذمہ عقیقہ بھی ہے، باپ کی حیثیت نہ ہو تو ماں عقیقہ کرے۔

(فتاویٰ رحیمیہ جلد ۲ صـ۹۴ کتاب الاضحیہ)

قربانی اور مسائل عید قربان

دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء سے ماہنامہ الحق میں افادہ عام کے لیے "قربانی اور مسائل عید قربان" کے عنوان سے یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ فتاویٰ اور مسائل کی مناسبت سے یہاں درج کیا جاتا ہے ——— مرتب ———

قربانی اور قرآن

قربانی اسلام کی اہم باستان عبادت ہے اس کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی مرتبہ (آٹھ سورتوں میں) خداوند کریم نے قربانی اور متعلقات قربانی، اس کی اہمیت اور حکمت و فلسفہ، مختلف امتوں میں اس کی شکل و صورت پر روشنی ڈالی ہے، اور امت مسلمہ ملت ابراہیمی کے لیے اسے دینی شعار اور امتیازی نشان قرار دیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (سورۃ الحج ۳۴)

(ترجمہ) "اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی تاکہ وہ اللہ کے دیئے گئے مویشیوں پر اس کا نام بلند کریں"

جیسا کہ خود آیت کریمہ سے واضح ہے، یہاں منسک سے مراد ذبح کرنا (قربانی دینا) ہے محققین اور تمام اکابر مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔ (قرطبی سراج للنووی فتح القدیر للشوکانی وغیرہ)

قربانی کی حکمت اور فوائد کے بارہ میں ارشاد ربانی ہے:۔

لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ (سورۃ الحج آیت ۳۷)

(ترجمہ) "اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانی کا گوشت پوست اور خون نہیں پہنچتا مگر اس کے ہاں تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

سورۃ الکوثر میں واضح اور قطعی حکم ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ (سورۃ الکوثر ۲)۔ (ترجمہ) "پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو"

قربانی اور حدیث

(۱) عن ابن عمرؓ قال اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ عشر سنین یضحی۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص ۱۸۲ ابواب الاضاحی)

(ترجمہ) "حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس برس تک مدینہ منورہ میں رہے اور برابر قربانی کرتے رہے"

(۲) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ عید قربان کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں اونٹ یا کسی دوسرے جانور کی قربانی کرتے۔ (مسند احمد و نسائی) لے

(۳) حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں گندم گوں رنگ کے دو مینڈھے قربان کیے۔ (بخاری نیز کتاب اختلاف الحدیث للشافعی علی الام ص۲۸ ج۷) ٢ے

(۴) بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہراتؓ کی طرف سے گائے کی قربانی کی۔ ۳ے

(۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر صاحب وسعت پر سال بھر میں ایک قربانی واجب ہے۔ (ابن ماجہ ص۲۳۳) ۴ے

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے استطاعت کے باوجود قربانی نہ دی وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے ۵ے

(۷) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یہ قربانیاں کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت ہے۔ (مشکوٰۃ) ٦ے

(۸) اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ عید قربان کے دن ابن آدم کا کوئی عمل قربانی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں، قیامت کے دن قربانی کے جانور کے سینگ، بال، سُم تک اعمالِ حسنہ کو بھاری کر دیں گے، اس کے خون کے قطرے زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو جاتے ہیں۔ تو طیبِ نفس (دل کی خوشی) سے قربانی کرتے رہو۔ (ترمذی، ابن ماجہ) ٧ے

(۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے ہر بال کے بدلے تمہارے لیے نیکی ہے۔ (سنن ابن ماجہ) ۸ے

سبحان اللہ! کیا ٹھکانہ ہے رحمتِ خداوندی کا کہ اتنی بڑی دولت میسر ہو اور پھر بھی مسلمان کوتاہی کرے، مومن کی شان تو یہ ہے کہ قربانی اگر اس پر واجب نہ بھی ہو تب بھی ثواب اور نیکیوں کا یہ خزانہ ہاتھ سے نہ جانے دے۔

شرائط وجوب قربانی | قربانی واجب ہونے کی شرائط یہ ہیں:۔

(۱) اسلام (غیر مسلم پر واجب نہیں) (۲) اقامت (مسافر پر واجب نہیں) (۳) حریت یعنی آزاد ہونا۔ (غلام پر واجب نہیں) اس کے لیے مرد ہونا شرط نہیں عورتوں پر بھی واجب ہے، نابالغ پر نہ خود واجب ہے نہ اس کی طرف سے اس کے ولی پر واجب ہے۔ کما فی ظاھر

الروایۃ وبہ الفتویٰ۔[9] (۴) تونگری یعنی جو مسلمان اتنا مالدار ہو کر اس پر زکوٰۃ واجب ہو اس پر عید کے دن صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہے چاہے وہ مالِ تجارت ہو یا نہ ہو اور چاہے اس پر پورا سال گذر چکا ہو یا نہ گذرا ہو۔ (بہشتی زیور)[10]

قربانی کے جانور

اونٹ، گائے، بکری کی تمام انواع (نر، مادہ، خصی، غیر خصی) کی قربانی ہو سکتی ہے بھینس گائے میں شمار ہے اور بھیڑ یا دنبہ بکری ہیں۔ گائے، بھینس، اونٹ ان سب میں سات آدمی بھی شریک کر سکتے ہیں جبکہ کسی کا ساتویں حصے سے کم نہ ہو۔ اگر کسی گائے یا اونٹ میں سات یا اس سے کم آدمی شریک ہوئے تو سب کی قربانی درست ہے اور اگر آٹھ یا زیادہ ہوئے تو سب کی قربانی نہ ہوگی[11]

جانور کی عمر

اونٹ پانچ سال کا، گائے بھینس دو سال کی، بکری ایک سال کی، اس سے کم عمر کی قربانی جائز نہیں، ہاں اگر دنبہ یا بھیڑ اتنا موٹا تازہ ہو کر سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو چھ مہینے کی عمر والے کی بھی قربانی درست ہے[12]

کانے اور اندھے جانور کی قربانی جائز نہیں۔ اگر ایک کان تہائی یا تہائی سے زیادہ کٹ گیا یا دُم تہائی یا اس سے زیادہ کٹ گئی (یہ پیدائشی نہ ہوں) تو قربانی درست نہیں۔ اتنا لاغر جس کی ہڈیوں میں مغز نہ ہو یا ایسا لنگڑا جو تین پاؤں سے چل سکتا ہے، چوتھا پاؤں رکھ نہیں سکتا یا اس سے چل نہیں سکتا اس کی قربانی درست نہیں۔ جس کے سارے یا آدھے سے زیادہ دانت نہ ہوں اس کی قربانی بھی جائز نہیں۔ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں مگر جڑیں سالم نہ ہوں یا خصی ہو اس کی قربانی درست ہے[13]

خنثیٰ جانور جس میں نر و مادہ دونوں کی علامتیں ہوں اور جلّالہ جو صرف غلیظ چیزیں کھاتا ہو یا جس کی ٹانگ کٹی ہو اس کی قربانی جائز نہیں۔ اور اگر جانور خریدنے کے بعد ایسا کوئی عیب پیدا ہو تو اس کے بدلے میں دوسرا جانور خریدے۔ ہاں اگر غریب آدمی ہو جس پر قربانی واجب نہ ہو تو اس کے واسطے درست ہے کہ وہی قربانی کر دے[14]

قربانی کے اوقات

(۱) قربانی کا وقت بقر عید یعنی دس ذی الحجہ کی طلوعِ صبح صادق سے بارہویں کے غروبِ آفتاب تک ہے۔ پہلا دن دس ذی الحجہ سب سے افضل ہے، پھر گیارہ ذی الحجہ پھر بارہ ذی الحجہ کا درجہ ہے[15]

(۲) بقر عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا درست نہیں، ہاں دیہات یا قصبوں والے جہاں

نمازِ عید نہ ہوتی ہو نمازِ فجر کے بعد قربانی کرسکتے ہیں [16]

(۳) رات کو ذبح کرنا بہتر نہیں، شاید اندھیرے میں کوئی رگ نہ کٹے اور قربانی درست نہ ہو [17]

(۴) اگر بارہویں کے غروبِ آفتاب سے پہلے مقیم ہوگیا تو تونگر ہوا تو قربانی کرنا واجب ہے [18]

(۵) قربانی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا اولیٰ ہے ورنہ کسی اور سے بھی کرانا جائز ہے [19]

(۶) قربانی کے جانور کو قبلہ رخ لٹاکر پہلے یہ دعا پڑھے: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا [illegible] اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ۔ پھر بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ کہہ کر ذبح کرے اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے: اللّٰهم تقبله منّی کما تقبلت من حبیبك محمد و خلیلك ابراهیم علیهم السلام [20]

(۷) زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں، دل کا ارادہ بھی کافی ہے [21]

(۸) اگر قربانی واجب ہو اور قربانی کے دن بغیر قربانی کیے گذر جائیں تو بعد میں بھیڑ یا بکری کی قیمت دیدی جائے اور اگر جانور خرید لیا گیا ہو تو بعینہٖ وہی خیرات کر دیا جائے [22]

گوشت اور کھال کا حکم

(۱) قربانی دینے والا قربانی کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے خویش و اقارب، غنی و فقراء سب کو دے سکتا ہے، بہتر یہ ہے کہ کم از کم تہائی حصہ خیرات کر دے، اس سے کمی نہ کرے [23]

(۲) اگر سات آدمی قربانی میں شریک ہوں تو گوشت اندازے سے نہ بانٹیں بلکہ صحیح تول کر تقسیم کریں ورنہ گناہ ہوگا [24]

(۳) قربانی کی کھال یا اس کی قیمت خیرات کر دیں اور ان لوگوں کو دیں جو زکوٰۃ و صدقہ فطر کے مستحق ہیں۔ قیمت میں جو پیسے ملیں وہی خیرات کر دیں، اگر تبدیل کر کے دیئے تو بُری بات ہے مگر ادا ہو جائیں گے [25]

(۴) کھال کو اپنے کام میں [illegible] اس سے رسی بنوائی یا چھلنی یا ڈول یا جائے نماز بنوائی۔ (بہشتی زیور)

(۵) گوشت یا چربی یا چمڑا قصائی یا کسی اور کو تنخواہ یا مزدوری میں دینے کا حکم نہیں [27]

(۶) قربانی کی رسّی جھول وغیرہ بھی خیرات کر دینی چاہیئے [28]

(۷) اگر اپنی خوشی سے کسی مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے قربانی کی جائے تو اس قربانی کے گوشت

میں سے کھانا یا کھلانا اور بانٹنا سب درست ہے جس طرح اپنی قربانی کا حکم ہے۔ (بہشتی زیور)[۲۹]

تکبیراتِ تشریق نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک شہری مقیم کو ہر نمازِ پنجگانہ کے بعد جو جماعتِ مستحبہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو ایک بار بلند آواز سے تکبیر کہنا واجب ہے اگر زیادہ بار کہے تو افضل ہے اسے تکبیرِ تشریق کہتے ہیں جو یہ ہے : اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ[۳۰]

عید کی سنتیں حجامت بنوانا، غسل کرنا، اچھے سے اچھا لباس پہننا (جو میسر ہو) سرمہ لگانا، میسر ہو تو خوشبو لگانا۔ اس عید میں نمازِ عید سے پہلے کچھ نہ کھانا چاہیئے بلکہ افضل یہ ہے کہ واپس آکر قربانی کرے اور اس کا گوشت کھائے، اس عید میں عیدگاہ جاتے ہوئے بلند آواز سے یہ تکبیر پڑھے : اللہ اکبر اللہ اکبر لاالٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔ عیدگاہ میں وقت سے پہلے جانا اور شروع صفوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنا، واپسی پر عیدگاہ سے جس راستے سے گیا تھا اس کی بجائے دوسرے راستے سے آنا بھی سنت ہے۔

نمازِ عید کی نیت دو رکعت نمازِ عید الاضحیٰ مع چھ تکبیرات واجب کے، بندگی اللہ تعالیٰ کی، منہ طرف قبلہ شریف کے، پیچھے اس امام کے،

پہلی رکعت میں ثناء کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھنے سے پہلے امام صاحب تین بار اللہ اکبر کہیں گے، مقتدی بھی اللہ اکبر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھائیں، پہلی دو بار تکبیر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں اور حسبِ معمول امام صاحب کے ساتھ رکعت پوری کریں۔ دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور قرأت کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے تین بار تکبیرات کہیں گے، مقتدی حسبِ سابق اللہ اکبر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور چھوڑ دیں، چوتھی بار اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جائیں۔

خطبہ نمازِ عید کے بعد خطبہ ہوتا ہے جس کا سننا واجب ہے، کچھ لوگ خطبہ ختم ہونے سے پہلے عیدگاہ سے چلے جاتے ہیں خواہ خطیب کی آواز سنائی دے یا نہ دے خطبہ ختم ہونے تک اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔

---

[۱] عن عبد اللہ بن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یذبح او ینحر بالمصلّی۔ (سنن النسائی ج ۲ ص۲۰۲ باب ذبح الامام اضحیتہ بالمصلّی)

[۲] عن انسؓ قال ضحّی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکبشین املحین اقرنین ذبحھما

بیدہ ویسمّی وکبر ووضع رجلہ علیٰ صفاحہما۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص۸۳۵، باب التکبیرات عند الذبح — سنن النسائی ج۲ ص۲۰۳ باب الکبش کتاب الاضحیۃ)

۳ عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل علیہا وحاضت بسرق قبل ان تدخل مکۃ وھی تبکی فقال مالکِ اَنُفستِ قالت نعم قال ان ھٰذا امر کتبہ اللہ علیٰ بنات ادم فاقضی مایقضی الحاج غیر ان لا تطوفی بالبیت فلما کنا بمنیً اتیت بلحم بقر فقلت ما ھٰذا قالوا ضحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ازواجہ بالبقر۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص۸۳۲ باب الاضحیۃ للمسافر والنساء)

۴ عن مخنف بن سلیم قال کنا وقوفا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعرفۃ فقال یآ یُّھا الناس ان علیٰ اھل بیت فی کل عام اضحیۃ وعتیرۃ أتدرون ماالعتیرۃ ھی التی یسمیھا الناس الرجبیۃ۔

(ابن ماجہ ص۲۲۶ باب الاضاحی واجبۃ اُم لا)

۵ عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان لہٗ سعۃ ولم یضح فلایقربن مصلانا۔ (ابن ماجۃ ص۲۲۶ باب الاضاحی واجبۃ اُم لا)

۶ عن زید بن ارقمؓ قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یارسولؐ اللہ ماھٰذہ الاضاحی قال سُنۃ ابیکم ابراھیم علیہ السلام۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص۱۲۹ باب فی الاضحیۃ۔ الفصل الثالث)

۷ عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ماعمل ابن ادم یوم النحر عملاً احب الی اللہ عزّوجل من ھراقۃ دم وانہٗ لیاتی یوم القیٰمۃ بقرونھا واظلافھا واشعارھا وان الدم لیقع من اللہ عزّوجل بمکان قبل ان یقع الارض فطیبوابھا نفسا۔ (ابن ماجۃ ص۲۲۶ باب ثواب الاضحیۃ)

۸ عن زید بن ارقمؓ قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یارسول اللہ ماھٰذہ الاضاحی قال سُنۃ ابیکم ابراھیم قالوا فمالنا فیھا یارسول اللہ قال بکل شعرۃ حسنۃ قالوا فالصوف یارسول اللہ قال بکل شعرۃ من الصوف حسنۃ۔

(ابن ماجہ ص۲۲۶)

۹ قال العلامۃ الکاسانیؒ: بشروط وجوب قربانی، الاسلام، الاقامۃ، حریۃ

ولا تجب (علی الصبی) فی ظاہر الروایة ولکن الافضل ان یفعل ذٰلک۔
(بدائع الصنائع ج ۵ ص۶۲ کتاب الاضحیة)

خلہ بہشتی زیور ص۲۵ حصہ تیسرا۔

لہ قال العلامة الزیلعیؒ: (والاضحیة من الابل والبقر والغنم) لان جواز التضحیة بہٰذہ الاشیاء عرف شرعًا بالنص علی خلاف القیاس فیقتصر علیہا۔
(تبیین الحقائق ج ۶ ص۷ کتاب الاضحیة)

قال العلامة الکاسانیؒ: ویدخل فی کل جنس نوعہ والذکر والانثیٰ منہ الیٰ قولہ والمعز نوع من الغنم والجاموس نوع من البقر بدلیل انہ یضم ذٰلک الی الغنم والبقر فی باب الزکوٰة۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۶۹ کتاب الاضحیة)

قال العلامة الکاسانیؒ: ولا یجوز بعیر واحد ولا بقرة واحدة عن اکثر من سبعة ویجوز ذٰلک عن سبعة۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۷ کتاب الاضحیة)

۱۲لہ لما فی الہندیة: فلا یجوز شیئ مما ذکرنا من الابل والبقر والغنم عن الاضحیة الا الثنی من کل جنس والا الجذع من الضأن خاصة اذا کان عظیما الیٰ قولہ قالوا الجذع من الغنم ابن ستة اشہر والثنی ابن سنة والجذع من البقر ابن سنة والثنی منہ ابن سنتین والجذع من الابل ابن اربع سنین والثنی ابن خمس۔ (الفتاوٰی الہندیة ج ۵ ص۲۹۷ الباب الخامس)

۱۳لہ لما فی الہندیة: ولا تجوز العمیاء والعوراء البین عورہا الیٰ قولہ ولو ذہب بعض ہٰذہ الاعضاء دون بعض من الاذن والالیة والذنب والعین۔
(الفتاوٰی الہندیة ج ۵ ص۲۹۸ الباب الخامس)

وفی جامع انہ اذا کان ذہب الثلث او اقل جاز وان کان اکثر من الثلث لا یجوز۔ وروی ابو یوسف رحمہ اللہ انہ ان کان ذہب الثلث لا یجوز وان کان اقل من ذٰلک جاز۔ وقال ابو یوسف رحمہ اللہ ذکرت لابی حنیفة رحمہ اللہ فقال قولی مثل ذٰلک۔ (الفتاوٰی الہندیة ج ۵ ص۲۹۸ الباب الخامس کتاب الاضحیة)

قال العلامة التمرتاشیؒ: فلو مہزولة لم یجز الیٰ قولہ المہزولة التی لا مخ فی عظامہا۔ (شرح تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص۲۲۷ کتاب الاضحیة)

۱۳؎ قال العلامة التمرتاشیؒ: ولا بالخنثیٰ لان لحمها لا ینضج۔ (شرح تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۲۸ کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والعرجاء التی تمشی بثلاثۃ قوائم وتجافی الرابع عن الارض لا تجوز الاضحیۃ بھا (البحر الرائق ج ۸ ص ۱۷۶ کتاب الاضحیۃ)

قال المرغینانیؒ: واما الھتماء وھی التی لا اسنان لھا فعن ابی یوسفؒ انہٗ یعتبر فی الاسنان الکثرۃ والقلۃ وعنہ ان بقی ما یمکن الاعتلاف بہ اجزأ۔

ویجوز ان یضحی بالجماء وھی التی لا قرن لھا لان القرن لا یتعلق بہ مقصود وکذا مکسورۃ القرن لما قلنا والخصی لان لحمھا اطیب۔ (الھدایۃ ج ۴ ص ۴۴۸ کتاب الاضحیۃ)

قال الحصکفیؒ: واشتراھا سلیمۃ یعتب بعیب مانع من التضحیۃ کان علیہ ان یقیم غیرھا مقامھا ان کان غنیاً وان کان فقیراً یجزئہ ذلک لان الوجوب علی الغنی بالشرع ابتداءً لا بالشراء۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۲۹ کتاب الاضحیۃ)

۱۵؎ قال العلامۃ الکاسانیؒ: فلا یجوز لاحد ان یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الاول من ایام النحر۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۷۳ کتاب الاضحیۃ)

۱۶؎ وایام النحر ثلاثۃ یوم الاضحی وھو یوم العاشر من ذی الحجۃ الخ۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص ۶۵ کتاب الاضحیۃ)

۱۷؎ والمستحب ذبحھا بالنھار دون اللیل لانہ أمکن لاستفاد العروق کذا فی الجوھرۃ النیرۃ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۲۹۶ کتاب الاضحیۃ)

۱۸؎ لما فی الھندیۃ: لو کان مسافراً فی اول الوقت ثم اقام فی آخرہ تجب علیہ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۲۹۲ کتاب الاضحیۃ۔ باب شرائط الوجوب)

قال العلامۃ طاہر عبد الرشید البخاریؒ: ولو جاء یوم الاضحی ولا مال لہ ثم استفاد مائتی درھم ولا دین علیہ وجبت الاضحیۃ۔

(خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۳۰۹ کتاب الاضحیۃ)

لما فی الھندیۃ: وھکذا لو کان فقیراً فی اول الوقت ثم ایسر فی آخرہ تجب علیہ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۲۹۲ کتاب الاضحیۃ باب حکم الوجوب)

۱۹ـــہ لما فی الهندیۃ : والافضل ان یذبح اضحیته بیدہ ان کان یحسن الذبح لان الاولیٰ فی القربات ان یتولّی بنفسه وان کان لا یحسن الذبح فالافضل ان یستعین بغیرہ ولکن ینبغی ان یشهدها بنفسه ۔

(الفتاوی الهندیۃ ج۵ ص۳۰۰ کتاب الاضحیۃ الباب الخامس)

۲۰ـــہ عن جابرؓ قال ذبح النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین فلما وجههما قال انی وجهت وجهی الخ (مشکوٰۃ ص۱۲۸ کتاب الضحیۃ الفصل الثانی)

۲۱ـــہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولا یشترط ان یقول بلسانه ما نوی بقلبه کما فی الصلوٰۃ ۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۱۹ کتاب الاضحیۃ)

۲۲ـــہ اذا اوجب شاۃ بعینها او اشتراها لیضحی بها فمضت ایام النحر قبل ان یذبحها تصدق بها حیۃ ولا یاکل من لحمها لانه انتقل الواجب من اراقۃ الدم الی التصدق وان لم یوجب ولم یشتر وهو موسر وقد مضت ایامها تصدق بقیمۃ شاۃ تجزی للاضحیۃ ۔

(رد المحتار ج۵ ص۲۲۶ کتاب الاضحیۃ)

۲۳ـــہ قال العلامۃ الحصکفیؒ : ویاکل من لحم الاضحیۃ ویوکل غنیاً ویدخر وندب ان لا ینقص التصدق عن الثلث ۔ (الدر المختار علی رد المحتار ج۵ ص۲۳۴ کتاب الاضحیۃ)

۲۴ـــہ قال العلامۃ طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ : سبعۃ ضحوا واردوا ان یقسموا اللحم بینهم فاقتسموها وزنا جاز وان اقتسموها جزافا لا ان جعلوا مع اللحم شیئا من السقط کالرأس والاکارع یجوز وان لم یجعلوا لا یجوز ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۱۵ کتاب الاضحیۃ)

۲۵ـــہ ولا بأس بالدراهم لیتصدقها ولیس له ان یبیعه بالدراهم لینفقها علی نفسه ولو فعل ذلک یتصدق بثمنه ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۲۲ کتاب الاضحیۃ)

۲۶ـــہ ویجوز الانتفاع بجلد الاضحیۃ والهدی والمتعۃ والتطوع بان یتخذه فروًا او بساطاً او جراباً او غربالا الخ

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۲۱ کتاب الاضحیۃ) ۔

۲۷ـــہ لما فی الهندیۃ : ولا یحل بیع شحمها واطرافها ورأسها وصوفها

وو برها وشعرها ولبنها الذی یحلبه منها بعد ذبحها بشیٔ لا یمکن الانتفاع به الا باستهلاک عینه من الدراهم والدنانیر والماکولات والمشروبات ولا ان یعطی أجر الجزار والذابح منها۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۵ ص۳۰۱ کتاب الاضحیة)

۲۸ــہ لما فی الهندیة: واذ ذبحها تصدق بجلالها وقلائدها کذا فی السراجیة۔
(الفتاوٰی الهندیة ج ۵ ص۳۰۱ کتاب الاضحیة۔ الباب السادس)

۲۹ــہ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: سئل نصیرؒ عن رجل ضحی عن المیت قال الاجر له والملک لهذا وفی الفتاوٰی ان کان بامر المیت المختار انه لا یتناول۔ وقال فی باب البناء ان ضحی بغیر امره المختار انه یتناول۔
(خلاصة الفتاوٰی ج ۴ ص۳۲۲ کتاب الاضحیة)

۳۰ــہ لما فی الهندیة: اما صفته فانه واجب واما عدده وماهیته فهو ان یقول مرة واحدة الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد۔
واما شروطه فاقامة ومصر ومکتوبة وجماعة مستحبة واما وقته فاوله عقیب صلوٰة الفجر من یوم عرفة وآخره فی قول ابی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ عقیب صلوٰة العصر من آخر ایام التشریق والفتوٰی علی قولهما۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۱۵۲ الباب السابع)

ویستحب یوم الفطر للرجل الاغتسال والسواک ولبس احسن ثیابه ویستحب التختم والتطیب واستحب فی عید الفطر ان یأکل قبل الخروج الی المصلی الاکل قبل صلوٰة یوم الاضحی لا یکره لکن یستحب له ان لا یفعل ویستحب ان یکون أول تناولهم من لحوم الأضاحی ویکبر فی الطریق فی الأضحی جهراً ا۔
وکیفیة صلوٰتها: ان ینوی صلوٰة العید بقلبه ویقول بلسانه اُصلی صلوٰة العید لله تعالیٰ الخ (الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۱۴۹ باب صلوٰة العیدین)

ثم یکبر للتحریمة ..... ثم یکبر الامام والقوم تکبیرات الزوائد ثلاثاً یرفع یدیه للامام والقوم فی کل منها ثم یکبر الامام والقوم تکبیرات الزوائد ثلاثاً ویرفع یدیه فیها کما فی الرکعة الاولیٰ۔ (طحطاوی ص۲۹۱ باب العیدین)

كتاب الوصية

ان الله تعالى تصدق عليكم

بثلث اموالكم زيادة في

اعمالكم فضعوها حيث شئتم

کتاب الوصیۃ

(وصیت کے احکام و مسائل)

وارث کے لیے وصیت کرنا باطل ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنے کل مال کی وصیت پوتے کے لیے کر دی جبکہ اس کی پوتیاں اور بہنیں بھی موجود ہیں، تو کیا یہ وصیت شرعاً درست اور نافذ ہوگی یا نہیں؟ تفصیلاً جواب مطلوب ہے؟

الجواب:- ورثاء کے حقوق قانونِ وراثت کے مطابق متعین ہیں، اور مورث ورثاء کو وصیت کرکے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی کا حق نہیں رکھتا، جس وارث کے لیے وصیت کی جائے اس کی تنفیذ دوسرے ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگی اور اگر دیگر ورثاء اجازت نہ دیں تو وصیت کالعدم رہے گی تاہم بصورتِ اجازت وصیت پر عمل کرنے اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة المرغینانیؒ: ولا تجوز لوارثه لقوله علیه الصلوٰة والسلام: ان الله تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقه الا لا وصیة لوارث ولانه یتأذی البعض بایثار البعض ففی تجویزه قطیعة الرحم ولانه حیف بالحدیث الذی رویناه۔

(الھدایة ج۴ ص۶۲۵ کتاب الوصایا) [1]

نابالغ اولاد کی شادیاں کرانے کیلئے وصیت کا حکم

سوال:- زید نے اپنی بالغ اولاد کی شادیاں کر دی ہیں، کیا وہ اپنی نابالغ اولاد کی شادی کے لیے اپنی جائیداد میں سے شرعاً کسی حصہ کی وصیت

---

[1] عن عمرو بن خارجة خطب رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال ان الله قد اعطی کل ذی حق حقه الا لا وصیة لوارث۔
(سنن النسائی ج۲ ص۱۳۱ کتاب الوصایا، باب ابطال الوصیة للوارث)

کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اولاد کی شادیاں کرانا والد کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ احسان کا معاملہ ہے زندگی میں تو باپ کو اپنی جائیداد میں تصرّف کا مکمل اختیار حاصل ہے، لیکن مرنے کے بعد اولاد کے لیے ایسے اضافی اخراجات کی وصیت کالعدم رہے گی۔

کما قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: اِنَّ اللّٰہَ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ اَلَا لَاوَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ۔

(سنن النسائی ج۲ ص۱۳۱ کتاب الوصایا۔ باب ابطال الوصیۃ للوارث) [1]

وصیّت مملوکہ جائیداد میں نافذ ہے

سوال:۔ زید نے بکر کے لیے اپنی جائیداد میں پانچویں حصے کی وصیت کی، پھر اپنے بیٹے خالد کو بعض جائیداد متفرق جگہوں میں دے دی، تاہم وفات کے وقت اس کی ملکیت میں کچھ جائیداد ضرور تھی، کیا ایسی حالت میں وصیت تمام جائیداد میں نافذ ہو گی جس میں بیٹے کو دی ہوئی جائیداد بھی شامل ہے یا صرف موت کے وقت مملوکہ جائیداد میں وصیت نافذ ہو گی؟

الجواب:۔ وصیت درحقیقت مرتے وقت نافذ ہوتی ہے، اس لیے موت کے وقت جو جائیداد باقی ہو اس میں وصیت معتبر ہو گی، چونکہ موت سے قبل وصیت کرنے والا اپنی جملہ جائیداد میں مالکانہ تصرّفات کا حق محفوظ رکھتا ہے اس لیے اُسے وصیت سے قولاً یا عملاً رجوع کا حق بھی حاصل ہے، لہٰذا بیٹے کو جو جائیداد زندگی میں دی ہو وہ اسی کی ملکیت ہو گی البتہ باقیماندہ جائیداد سے پانچواں حصہ موصٰی لہٗ کو دیا جائے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدّین۔

(مقدمۃ السراجی ص۳) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ:۔ ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ السّلام: ان اللہ اعطی کل ذی حق حقہ الا لا وصیۃ لوارث۔

(الھدایۃ ج۴ ص۶۲۵ کتاب الوصایا)

[2] وفی الھندیۃ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما یبقی بعد الکفن والدّین۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض) ومثلہ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۴۵۵ کتاب الفرائض۔

کل مال کے ثُلث سے زائد میں وصیت معتبر نہیں | **سوال**:۔ ایک عورت نے زندگی میں اپنی کل جائیداد غیر منقولہ رائج الوقت ملکی قانون کے تحت بذریعہ رجسٹری محلہ کی مسجد کے لیے اس شرط کے ساتھ وقف کی کہ میری وفات تک یہ جائیداد میری رہے گی، میرے مرنے کے بعد کل اثاثہ یعنی سوئی سلائی تک مسجد کی ملکیت ہو گی، اور اس بات کے گواہ بھی موجود ہیں۔ جبکہ مرحومہ کے ورثاء میں ماموں زاد بھائی کی بیٹی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے جس کے بارے میں مرحومہ نے بتایا تھا کہ میں نے اس لڑکی کو جو کچھ دینا تھا وہ اپنے ہاتھوں سے دے دیا ہے اب اسے اور کچھ نہ دوں گی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مرحومہ کی موت کے بعد اس کے رشتہ داروں کو کچھ ملے گا یا نہیں؟ یا اس کا جملہ اثاثہ مسجد کے لیے ہی وقف ہو گا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا یہ وقف وصیت سے متعلق ہے اور وصیت کل مال کے ثلث سے زائد میں معتبر نہیں یعنی کل جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کا صرف ۱/۳ حصہ مسجد کے لیے وقف ہو گا اور ۲/۳ حصہ میں ارث جاری ہو گی، کیونکہ وصیت کے ذریعے کوئی اپنے ورثاء کو میراث سے محروم نہیں کر سکتا۔

قال العلامة محمد علاؤ الدین افندیؒ: الارث جبری لا یسقط بالاسقاط۔
(تکملۃ ردالمحتار ج ۱ ص ۳۵۹ مطلب واقعۃ الفتوٰی۔ کتاب الدعوٰی)

قال العلامۃ السجاوندیؒ: وتنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین۔
(مقدمۃ السراجی ص ۳)[1]

میّت کی زبانی وصیّت سے مسجد پر خرچ کرنا | **سوال**:۔ زید نے وفات سے دو ماہ قبل مسجد کے لیے دس ہزار روپے دینے کا کہا تھا جن میں سے اس نے دو سو پچاس روپے مسجد پر خرچ بھی کر دیئے لیکن بقیہ رقم وفات تک وہ کسی وجہ سے خرچ نہ کر سکا، تو کیا مرحوم کے ترکہ سے یہ رقم مسجد پر خرچ

---

[1] وفی الهندیۃ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الکفن والدّین ......
ثم یقسم الباقی بین الورثۃ علی سهام المیراث۔
(الفتاوٰی الهندیۃ ج ۶ ص ۴۴۷ کتاب الفرائض)

کی جائے گی یا نہیں، جبکہ مرحوم کی وصیت پر گواہ بھی موجود ہیں؟

الجواب: اگر مرحوم کی وصیت کے بارے میں اس کے ورثا اقرار کرتے ہوں یا اس پر گواہ موجود ہوں اور جائیداد متروکہ کے ثلث سے اس کی ادائیگی ممکن ہو تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

قال العلامة السجاوندی رحمہ اللہ: وتنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین۔ (مقدمة السراجی ص۳) [1]

وصیت کی وجہ سے وارث حقِ میراث سے محروم نہیں ہوتا

سوال: ایک عورت جو کہ لاولد ہے، نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری زرعی جائیداد اور مکان میرے دونوں دیوروں کو برابر برابر دیدی جائے کیونکہ ان دونوں نے میری بیماری پر کافی مال خرچ کیا ہے اور آئندہ بھی میری تجہیز و تکفین پر خرچ کریں گے، اس لیے میرے کسی دوسرے اقارب کو میری جائیداد میں کوئی حق حاصل نہیں، جبکہ اس کی وفات کے بعد اس کے دو چچازاد بھائی زندہ ہیں، تو کیا شرعاً ان دونوں کو مرحومہ کی میراث میں سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب: شریعت کے مطابق کفن و دفن پر جو خرچ ہو گا وہ ترکہ سے لیا جائے گا اور باقی جائیداد کے ثلث سے وصیت پوری کی جائے گی اس لیے کہ ثلث سے زیادہ وصیت کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں اور بقیہ مال ورثاء پر تقسیم ہو گا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کے دونوں دیوروں کو ثلث مال ملنے کے بعد باقی مال اس کے دونوں چچازاد بھائیوں کا ہو گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: تتعلق بترکة المیت حقوق اربعة مرتبة الاول یبدأ بتکفینه وتجهیزه من غیر تبذیر ولا تقطیر…… ثم تنفذ وصایاه من ثلث ما بقی بعد الدین ثم یقسم الباقی بین ورثته بالکتاب والسنة والاجماع الامة۔ (مقدمة السراجی ص۳) [2]

---

[1] قال العلامة ابن البزازؒ: وتبرعات المریض کالهبة والصدقة…… من الثلث۔ (البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۴۳۲ کتاب الوصایا)

[2] قال العلامة المرغینانیؒ: قال ولا تجوز بما زاد علی الثلث لقول النبی علیه السلام فی حدیث سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ الثلث والثلث کثیر۔ (الهدایة ص۶۵۳ کتاب الوصایا۔ باب صفة الوصیة)

وصیت صرف ثلث مال میں نافذ ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص زندگی میں ہی اپنے مال کی وصیت کرے تو اس کی وصیت کتنے مال میں نافذ ہوگی یا کہ اس کا جملہ مال وصیت کے مطابق خرچ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ وصیت میت کے کل مال کے صرف ثلث میں جاری ہوگی یعنی میت کی وصیت کو اس کے ثلث مال سے پورا کیا جائے گا اور باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبدالرشیدؒ: ثم تقضیٰ دیونهٗ من جمیع مابقی من ماله ثم تنفذ وصایاه من ثلث مابقی بعد الدین الخ

(السراجی ص۳) [1]

وصیت سے رجوع صحیح ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے لیے اپنے مال میں مخصوص حصہ کی وصیت کرے اور اسے اسٹامپ پر تحریر بھی کر دے لیکن چند دن بعد وصیت کرنے والا کچھ ذاتی ناراضگی کی وجہ سے وصیت سے رجوع کر لیتا ہے، تو کیا اس شخص کا وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب وصیت کنندہ نے اپنے وصیت نامہ سے رجوع کر لیا تو بعد الموت وصی کو کچھ نہیں ملے گا۔

قال العلامة المرغینانیؒ: ویجوز للموصی الرجوع عن الوصیّة واذا صرح بالرجوع او فعل مایدل علی الرجوع کان رجوعًا۔ (الهدایة ج۴ ص۶۶۴ کتاب الوصایا، باب فی صفة الوصیة مایجوز من ذٰلك الخ) [2]

---

[1] وفی الهندیة، ثم تنفذ وصایاه من ثلث مایبقی بعد الکفن والدّین الّا ان تجیز الورثة اکثر من الثلث الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض الباب الاول فی تعریفها وفیما یتعلق بالترکة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۶۵۹ کتاب الوصایا، باب فی صفة الوصیة مایجوز من ذٰلك الخ۔

[2] وفی الهندیة: ویصح للموصی الرجوع عن الوصیة ثم الرجوع قد یثبت صریحاً وقد یثبت دلالة الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۹۳ کتاب الوصایا، الباب الاول فی تفسیرها وشرط جوازها وحکمها الخ)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی قاضیخان ج۴ ص۴۳۲ کتاب الوصایا۔ فصل فیما یکون رجوعاً عن الوصیة الخ

غیر مسلم کو وصیّت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک مسلمان کا اپنے مال میں کسی غیر مسلم کے لئے وصیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو یہ وصیت کتنے مال میں جاری ہوگی؟

الجواب:۔ اسلام میں وصیت کا دائرہ وسیع ہے مسلمان کے علاوہ غیر مسلم کے لئے بھی وصیت کرنا درست ہے اور اس کا اجراء صرف ثلث مال میں ہوگا۔

قال العلامة الکاسانیؒ: اما کونه مسلماً فلیس بشرط حتٰی لوکان ذمیًا فاوصی له مسلم اوذمی جاز۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳۴۱ کتاب الوصایا)[1]

اثباتِ وصیت کے لیے شہادت ضروری ہے

سوال:۔ ایک آدمی نے یہ دعوٰی کیا کہ فلاں شخص نے میرے لیے اتنے مال کی وصیت کی ہے جبکہ مرحوم کے ورثاء اس وصیت کے منکر ہیں مگر مدعی کے پاس گواہ موجود ہیں، تو کیا شرعاً ورثاء کا انکار مرحوم کی وصیت کو ختم کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح دیگر معاملات اور عقود کے اثبات کیلئے گواہوں کی گواہی موجبِ اثبات ہے بالکل اسی طرح وصیّت بھی گواہوں کی گواہی سے ثابت ہوجائے گی اور اس سے ورثاء کے انکار کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔

لما قال العلامة الدکتور وهبة الزحیلی: وتثبت الوصیّة بطرق الاثبات الشرعیّة کالشهادة والکتابة۔

{الفقه الاسلامی وادلته ج۸ ص۱۲۶
الجث السابع اثبات الوصیّة}

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: ویجوزان یوصی المسلم للکافر والکافر للمسلم فالاوّل لقوله تعالٰی: لاینهاکم الله عن الّذین لم یقاتلوکم فی الدین۔
(الهدایة ج۴ ص۶۴۱ کتاب الوصایا)

موصی لہ کا موصی سے پہلے وفات پاجانے پر وصیت کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہی اپنے ایک دوست کے لیے ایک قطعہ اراضی کا وصیت نامہ لکھا تھا کہ میرے مرنے کے بعد یہ زمین تمہاری ہے، لیکن والد صاحب کا یہ دوست ان کی زندگی میں ہی انتقال کر گیا، اب میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے دوست کے بیٹے اس قطعہ اراضی کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا شرعاً ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وصیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ موصی لہ وصیت کرنے والے کی وفات تک زندہ ہو تب وہ وصیت کا اہل ہوگا ورنہ بصورتِ دیگر اگر موصی لہ وصیت کرنے والے کی زندگی میں ہی فوت ہوجائے تو وصیت باطل ہوجائے گی، اس لیے صورتِ مسئولہ میں وصیت کا مال وصیت کرنے والے کا حق ہے موصی لہ کی اولاد کا دعویٰ استحقاق درست نہیں۔

قال العلامة الکاسانی رحمه الله: وتبطل بموت الموصی له قبل موت الموصی لان العقد وقع له لا لغیرہ فلا یمکن ابقاء علیٰ غیرہ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳۹۴ کتاب الوصایا، فصل تبطل الوصیة)[1]

وصی کو معزول کرنا جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کو وصی مقرر کرے اور پھر چند دنوں کے بعد اس کو معزول کر کے کسی اور کو وصی مقرر کرے تو کیا شرعاً اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ایک دفعہ کسی کو وصی مقرر کرنے کے بعد پھر اس کو معزول کر سکے؟

الجواب:۔ موصی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کو وصی مقرر کرنے کے بعد

---

[1] قال العلامة وهبه الزحیلی: موت الموصی له المعین قبل موت الموصی تبطل به الوصیة باتفاق المذاهب الاربعة لان الوصیة عطیة وقد صادقت المعطی میتاً فلا تصح کالهبة للمیّت۔ (الفقه الاسلامی وادلّتهٗ ج ۸ ص ۱۱۶ المبحث الرابع مبطلات الوصیة)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۴۵۳ کتاب الوصایا۔

پھر اس کو معزول کردے لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وصی کو اس کی معزولی کی اطلاع ہو جائے۔

قال العلامة الكاسانیؒ: فالوصية تبطل بالنص على الابطال.... اما النص فنحو ان يقول ابطلتُ الوصية التي اوصيتها لفلان او فسختها او نقضتها الخ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۹۴ كتاب الوصايا، فصل بيان ما تبطل به الوصيّة)[1]

وصیت کی ملکیت کے لیے قبول کرنا ضروری ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے لیے اپنے مرنے کے بعد ایک مخصوص مال کی وصیت کرجائے تو کیا اس شخص کی صرف وصیت سے موصی لہٗ اس مخصوص مال کا مالک بن جائے گا یا اس کا قبول کرنا اس کے لیے ضروری ہے؟

الجواب:۔ وصیت ایک عقد ہے اور حنفیہ کا اصول ہے کہ ہر عقد کی تکمیل کے لیے قبول کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی موصی لہٗ کا وصیت کو قبول کرنا لازمی امر ہے بدون اِس کے وہ اُس چیز کا مالک نہیں بن سکتا، لیکن قبول کرنے میں واضح الفاظ کا کہنا ضروری نہیں نفس قبضہ میں لینا بھی کافی ہے۔

قال العلامة وهبة الزحيلی: حكم الوصية بمعنى الاثر المترتب على الشئ هو انتقال ملكية الموصى به الى الموصى له ملكاً جديداً بقبول الموصى له بعد وفاة الموصى وبه تلزم الوصية بالاتفاق۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج ۸ ص۲۲ كتاب الوصايا، وقت ثبوت ملكية الموصى به)[2]

---

[1] قال العلامة وهبة الزحيلی، والرجوع اما ان يكون صريحاً او دلالة فالرجوع الصريح: ما كان بلفظ هو نص فی الرجوع مثل قول الموصى رجعت عن وصيتی لفلان او تركتها او ابطلتها او نقضتها او ما اوصيت به لفلان هو لورثتی ونحوه۔

(الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج ۸ ص۱۱۴ المبحث الرابع، مبطلات الوصية)

[2] قال العلامة الكاسانیؒ: وملك بدون القبول او بدون عدم الرد ووقوع اليأس عنه ولم يوجد القبول منه ولا وقع اليأس عن الرد ما دام حياً فلا يعتق۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۳۲ كتاب الوصايا، فصل ركن الوصيّة)

ومِثلُهٗ فی الهندية ج ۶ ص۹۰ كتاب الوصايا، الباب الاول۔

مبہم وصیّت کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص ان الفاظ سے وصیت کرے کہ میرے مال سے کچھ حصہ فلاں شخص کو دیدیا جائے مگر اس نے اس مال کی تعین نہ کی ہو تو کیا وصیت کرنے والے کی وفات کے بعد موصیٰ لہٗ کو وہ مبہم مال دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً تو ایسی وصیت صحیح ہے البتہ ابہام کی وجہ سے وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد اس کا تعین ورثاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ موصی لہٗ کو جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، تاہم اگر وصیت کرنے والے نے اپنی زندگی میں ہی اس مال کو متعین کر دیا ہو تو بعد الموت وہی مال دینا پڑے گا بشرطیکہ وہ مال میت کے کل ترکہ کے ثلث سے زیادہ نہ ہو۔

قال العلامة الکاسانی رحمه الله ؛ منها ما اذا أوصى لرجل بجزء ماله او بنصيب من ماله او بطائفة من ماله او ببعض او بشقص من ماله فان بين فى حياته شيئًا والا اعطاه الورثة بعد موته ماشاء والان هٰذه الالفاظ تحتمل القليل والكثير فيصح البيان فيه ما دام حيا ومن ورثته اذا مات لانهم قائمون مقامه۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۳۵۶ کتاب الوصایا، فصل شرائط الوصية)

مجنون (پاگل) اور نابالغ کی وصیّت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی مجنون یا نابالغ کسی کے لیے وصیت کر جائے تو کیا اس کے مرنے کے بعد موصی لہٗ اس مال کا مالک متصوّر ہو گا یا نہیں؟

الجواب:۔ نابالغ اور مجنون چونکہ تصرفات کا حق نہیں رکھتے اس لیے شرعاً ان کی وصیت کا بھی کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا مجنون کی وصیت سے موصی لہٗ اس مال کا مالک متصور نہ ہوگا۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ ؛ ومنها ان يكون من اهل التبرع فى الوصية بالمال وما يتعلق به لان الوصية بذٰلك تبرع بايجابه بعد موته فلا بد من اهلية التبرع فلا تصح من الصبى والمجنون لانهما ليسا من

اھل التبرع لکونه من التصرفات

(البدائع والصنائع جلد۷ ص۳۳۴ کتاب الوصایا، فصل فی الشرائط) [1]

پوتے کے لیے وصیت کا حکم

سوال:۔ اگر دادا پوتے کے لیے اپنے بیٹوں کے برابر حصہ میراث کی وصیت کرے تو کیا اس کی وصیت پوتے کو چچوں کے برابر حصہ میراث ملے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کے لیے وصیت کرنا اگرچہ صحیح ہے مگر یہ وصیت میت کے ثلث مال میں جاری ہوگی ثلث مال سے زیادہ پوتے کو نہیں ملے گا۔ تاہم اگر ثلث مال اتنا ہو کہ بیٹوں کے حصص کے برابر بنتا ہو تو وصیت کے مطابق برابر حصہ ملے گا، مثلاً مرحوم کے دو بیٹے اور ایک پوتا ہو تو مال کے تین حصے کر کے ایک ایک حصہ ہر ایک کو ملے گا۔

کما فی الھندیة: یعتبر کونه وارثا او غیر وارث وقت الموت لا وقت الوصیّة حتی لو اوصی لاخیه وھو وارث ثم ولد له ابن صحت الوصیة للاخ ولو اوصی لاخیه وله ابن ثم مات الابن قبل موت الموصی بطلت الوصیّة للاخ۔ (الفتاوی الھندیة ج۶ ص۹۰ کتاب الوصایا۔ الباب الاول)۔

وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنے کسی دوست کے لیے کچھ مال کی وصیت کرے لیکن مرنے سے پہلے اس کو منسوخ کر دے، تو کیا اس شخص کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وصیت چونکہ امر استحبابی ہے اس لیے اگر موصی وصیت کرنے کے بعد اس سے رجوع کرلے اور اپنی ماقبل وصیت کو باطل کر دے تو یہ اس کا شرعاً حق بنتا ہے اور اس رجوع سے وہ وصیت باطل ہو جائے گی، چاہے رجوع

---

[1] وفی الھندیة: ولا تصح الوصیة الا ممن یصح تبرعه فلا تصح من المجنون والمکاتب والماذون الخ۔ (الفتاوی الھندیة ج۶ ص۹۲ کتاب الوصایا، الباب الاول)

قولاً ہو یا عملاً یا تحریراً۔

قال العلامۃ الکاسانی ؒ: الموصی حتی یملک الرجوع عندنا مادام حیا لان الموجود قبل موتہ مجرد ایجاب وانہ یحتمل الرجوع فی عقد المعاوضۃ فھی بالتبرع اولیٰ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳۷۸ کتاب الوصایا، فصل صفۃ ھذا العقد)[1]

موصی بہ پر صرف قبضہ کرنا بھی کافی ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! وصیت کو قبول کرنے کے لیے "قبول کرتا ہوں" کے الفاظ کہنا ضروری ہے یا کہ صرف موصی بہ قبضہ کر لینے سے موصی لہٗ کی قبولیت پوری ہو جائے گی؟

الجواب: "قبول کرتا ہوں" کے الفاظ کہنے سے جس طرح قبول کرنا پورا ہوتا ہے تو اسی طرح دلالۃ وفعلاً جو قبول کرنے کو واضح کرتے ہوں سے بھی پورا ہوتا ہے الفاظ سے قبول کرنا ضروری نہیں۔

قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ۔ وفی البدائع رکنھا الایجاب والقبول وقال زفر الایجاب فقط قلت والمراد بالایجاب مایعم الصریح والدلالۃ بأن یموت الموصی لہ بعد موت الموصی بلا قبول۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۶۵۰ کتاب الوصایا)[2]

وصی کا موصی کے انتقال کے بعد وصیت کو رد کرنا

سوال: ایک صاحب نے کسی کو اپنا وصی بنایا اور اُس نے

---

[1] قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: تبطل الوصیۃ باسباب اما من الموصی کرجوعہ عن الوصیۃ او زوال اھلیتہ او ردتہ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۸ ص۱۱۲ المبحث الرابع، مبطلات الوصیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۶ ص۹۳ کتاب الوصایا، الباب الاول۔

[2] وفی الھندیۃ: ویشترط فی الوصیۃ القبول صریحاً او دلالۃ وذلک بان یموت الموصی لہ قبل الرد والقبول فیکون موتہ قبولاً فترثھا ورثتہ۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج۶ ص۹ کتاب الوصایا، الباب الاول فی تفسیرہا)

قبول بھی کر لیا اور اس بات پر وصیت کرنے والے کی وفات تک قائم رہا، اب وہ موصی کی وفات کے بعد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے، تو کیا وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک آدمی کسی شخص کو وصی مقرر کرے اور وہ وصیت کو قبول کر کے اس پر وصیت کرنے والے کی وفات تک قائم رہے تو وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد وصی ہونے کی ذمہ داری کو پورا کرنا اس پر لازم ہوگا اور وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

قال العلامۃ محمد الطوری رحمہ اللہ: واذا اوصی الیہ فقبل قبل موتہ اوبعدہ ثم رد لم یخرج لان الموصی ما اوصی الا الی من یعتمد علیہ من الاصدقاء والامناء الخ۔ (البحر الرائق ج۸ ص۴۵۷ کتاب الوصایا) لہ

بیٹے کی موجودگی میں بھائی کے لیے وصیت کرنا

سوال:۔ ایک بھائی غریب اور نادار ہے جبکہ دوسرا بھائی امیر و مالدار ہے، دونوں بھائیوں کی اولاد بھی موجود ہے۔ اب اگر مالدار بھائی اپنے غریب بھائی کے لیے اپنے مال میں سے کچھ مخصوص رقم کی وصیت کرے تو کیا اپنی اولاد کی موجودگی میں بھائی کے حق میں وصیت صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائی اگرچہ وارث ہے مگر اپنی اولاد یعنی بیٹوں کی موجودگی میں وہ بمنزلہ اجنبی کے ہے جبکہ شریعتِ مطہرہ میں اجنبی کے لیے ایک تہائی مال تک کی وصیت جائز ہے، لہٰذا بیٹوں کی موجودگی میں غریب بھائی کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے، البتہ اگر مخصوص مال کل مال کے ایک تہائی سے متجاوز ہو تو وہ ورثاء کے اختیار میں ہوگا۔

وفی الھندیۃ: یعتبر کونہ وارثا اوغیر وارث وقت الموت لا وقت الوصیۃ حتی لو اوصی لاخیہ وھو وارث ثم ولد لہ ابن صحت الوصیۃ للاخ ولو اوصی لاخیہ ولہ ابن ثم مات الابن قبل موت الموصی بطلت الوصیۃ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۶ ص۹۱ کتاب الوصایا۔ الباب الاول)

شیخ احمد کی طرف منسوب وصیّت نامہ کی شرعی حیثیت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ گذشتہ کافی عرصہ سے پاک وہند میں بار بار ایک وصیت نامہ شائع ہورہا ہے جس کی نسبت شیخ احمد خادم روضۂ رسول مقبول علیہ السلام کے نام سے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ یہ وصیت نامہ بصورتِ اشتہار مختلف عنوانات سے بار بار مختلف مضامین کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور سادہ لوح مسلمانوں کو ترغیب وترہیب دے دے کر اس کی تشہیر واشاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ کیا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اسکی نسبت صحیح ہے؟ اور کیا ایک ایسے غیر یقینی طریقے سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اس کا منسوب کرنا جائز ہے؟ اس اشتہار (وصیت نامہ) کی شرعی حیثیت اور شرعاً اس کی اشاعت پر روشنی ڈالیں؟

الجواب:۔ مذکورہ وصیت نامہ بشکل اعلان واشتہار نصف صدی سے مختلف امصار وبلاد میں بار بار چھپ رہا ہے اور اس کے مندرجات کے غیر شرعی ہونے کی وجہ سے علماء کرام نے بار بار اس کی تردید کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس قسم کے وصیت نامے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، کیونکہ اس کے مندرجات بالکل بیہودہ، غلط اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ چنانچہ آج سے کافی عرصہ قبل حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ نے اس من گھڑت کہانی کی سختی سے تردید کی۔ چنانچہ اس بارہ میں ان کا مفصل فتویٰ امداد الفتاوی جلد ۴ ص ۵۰۶،۵۰۷ پر موجود ہے۔ مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی اور جہالت کا نتیجہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے یقینی ثابت شدہ اور قطعی ارشادات وتعلیمات (جو کہ بشکل قرآن وسنت مدون ومنضبط موجود ہیں) کی ترویج واشاعت کی طرف تو توجہ نہیں مگر دوسری طرف علماء کرام کے بار بار اعلانات اور وضاحتوں کے باوجود ایک بے سروپا اور بے ثبوت افسانے کی ترویج واشاعت میں ایک دوسرے سے سبقت لے کر دانستہ ونادانستہ وعیداتِ نبوی کے مصداق بن رہے ہیں ارشادِ نبوی ہے:۔

من كذب علی متعمدًا فليتبوأ مقعده من النار۔ (الحدیث)

(ترجمہ) "جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ باندھا پس وہ اپنے لیے جہنم میں ٹھکانا بنائے"۔

یہ اور اس کے علاوہ بیشمار نصوص و احادیث ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسولِ کریمؐ اور مذہب کے نام منسوب رطب و یابس پر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے عمل نہیں کرنا چاہیئے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات و ارشادات کو دروغگوئی اور جعلسازوں کی دیسسہ کاریوں اور من گھڑت باتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مسلمانوں کے اسلاف نے فنِ حدیث، فنِ اصولِ حدیث، فنِ اسماء الرجال کے ناموں سے عظیم الشان علوم و فنون مدوّن کئے اور محدثین نے ایک ایک روایت کو شریعت و عقل، فہم و درایت، ادراک و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح و ضعیف کو ایک دوسرے سے جدا کر کے رکھ دیا اور معمولی قرائن کی وجہ سے بھی جو روایت کے خلافِ شرع ہونے پر دال تھے احادیث کو موضوع کہہ دیا۔ ایک طرف اتنی حزم و احتیاط، اتنا تقوٰی اور دینی بصیرت کی یہ کیفیت ہے اور دوسری طرف یہ ہمارے سادہ لوح مسلمان بھائی اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے ایک موضوع، بے اصل اور من گھڑت وصیت نامہ کی اشاعت میں دن رات مصروف ہیں، حالانکہ معمولی توجہ اور عقل و دانش سے کام لیا جائے تو اس کا خلافِ اصل اور بے سند و دلیل ہونا واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کی نہ کوئی سند ہے نہ دلیل ہے محض ایک فرضی نام سے منسوب کردہ ایسے مضامین کی کیا حیثیت ہے جو از روئے شرع قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ مثلاً ان مختلف النوع وصیت ناموں سے بعض منتخب باتیں یہاں بیان کی جاتی ہیں:۔

(ا) اس وصیت نامہ کی نسبت شیخ احمد خادم روضۂ نبوی کی طرف کی جاتی ہے اور یہ ہمیشہ اسی نام اور لقب سے شائع ہوتا ہے، حالانکہ آج تک شیخ احمد کے نام سے روضۂ اقدس کا کوئی خادم نہیں گذرا۔ (ب) اور پھر تعجب ہے کہ یہ ایک ہی شخص اتنی بڑی عمر پاوے (ج) پھر یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ ایک شخص کے علاوہ کسی اور خادمِ روضۂ نبوی یا عالمِ اسلام کے دیگر اکابر اولیاء، بزرگانِ دین اور عباد مقربین کو خواب میں اس قسم کی وعیدات و تہدیدات اور وصیت کیوں نہیں کی گئی؟ (د) اور اگر بالفرض یہ قصہ صحیح بھی ہوتا تو خود حرمین الشریفین (مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ) میں اس کی شہرت زیادہ ہونی چاہیئے تھی؟ حالانکہ پوری دنیا سے مسلمانوں کی آمد و رفت اور رسل و رسائل کے باوجود وہاں اس وصیت نامے کا نام و نشان بھی نہیں، اور اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنہیں خواب دیکھنے والے نے یہ قصہ سنایا اور پھر کن راویوں نے کن وسائط سے یہ واقعہ

ہندوستان تک پہنچا اور یہاں کس ثقہ اور معتمد شخص نے اسے سُنا اور پھر کس نے اس کے اردو تراجم کر کے لوگوں میں اس کی اشاعت کی؟ ظاہر ہے کہ ایک ایسی روایت جس کا نہ راوی معلوم ہے نہ سند اور نہ درمیانی وسائط، اور نہ اس کی کوئی تاریخی حیثیت ہے محض ایک من گھڑت اور تراشیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جعلی یا موضوع ہدایت کی اشاعت و روایت نصاً اور اجماعاً حرام ہے بلکہ بعض محدثین کے نزدیک تو کفر ہے۔

(۲) اس میں لکھا ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ساٹھ ہزار آدمی مرے جن میں سے کوئی بھی ایماندار نہ تھا۔ اور بعض وصیت ناموں کے مطابق ستر لاکھ مسلمان کلمہ گو مرے اور ان میں صرف ستر آدمی صحیح مسلمان تھے۔

یہ مضمون بھی اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی ارشادات کے خلاف ہے ارشادِ خداوندی ہے:-

وسعت رحمتی علیٰ غضبی۔ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

نیز ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی اکثر مسلمان توبہ کر کے اور کلمہ پڑھتے ہوئے مرتے ہیں جو خاتمہ بالخیر ہونے کی علامت ہے۔

(۳) اسی طرح اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ "تارک الصلوٰۃ کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں"۔ یہ حکم صاف طور پر حدیث کے خلاف ہے، ارشادِ نبوی ہے: صلّوا علیٰ کلّ برّ و فاجر۔ یعنی ہر نیک اور بدکار مسلمان پر نمازِ جنازہ پڑھو۔

(۴) اس میں علاماتِ قیامت اور قربِ قیامت کے ضمن میں بعض ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا روایات و احادیث میں کہیں بھی ذکر نہیں ملتا، مثلاً:-

(الف) ایک ستارہ آسمان پر طلوع ہوگا (ب) قرآن مجید کے حروف اڑ جائیں گے۔

(۵) اس میں بعض ایسی چیزوں کی ترغیب و تعلیم ہے جن کا حرام اور بدعت قطعی ہونا بدلائلِ شرعیہ ثابت ہو چکا ہے، مثلاً:- ،

(الف) تخصیص شربت کی شہداءِ کربلا کے واسطے (ب) اور کھیر حضرت خاتونِ جنتؓ کے واسطے (ج) اور پلاؤ حضرت غوث الاعظمؒ کے واسطے۔

(۶) اسی طرح آجکل کے مروجہ مولود شریف اور قوالیاں جو کہ تمام شرع و عقل کے خلاف ہیں جیسا کہ اس وصیت نامہ کے بارے میں حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے امداد الفتاویٰ ج۴ ص۵۰

میں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

(۷) اس میں بعض ایسی چیزیں ذکر ہیں جن سے (العیاذ باللہ) خاکم بدہن حضور فخر کائنات سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین وتحقیر کا پہلو نکلتا ہے اور حضورؐ کی شان شفاعتِ کبریٰ ورحمۃ للعالمینی اور محبوبیت ومقبولیت بارگاہِ خداوندی پر زد پڑتی ہے، مثلاً:-

"جس نے اس وصیت نامہ کی تشہیر کی اس کی اور اس کے پورے خاندان کی شفاعت کی جائے گی اور انہیں جنت میں جگہ دلوائی جائے گی اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا" گویا محض ایک فرضی خواب کی وجہ سے مسلمانوں کی نجات وشفاعت کے لیے ایک ایسی شرط لازمی کر دی گئی ہے جس کا نہ قرآن میں ذکر ہے نہ احادیث میں۔

اگر واقعی ایمان کی مقبولیت اور انسان کی مغفرت وشفاعت کے لیے اس وصیت نامہ کی تشہیر ضروری قرار دی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ کروڑوں مسلمان، علماء وصلحاء، اہل اللہ اور بزرگانِ دین سب کے سب محروم الشفاعت اور مستحق جہنم ٹھہریں گے جنہوں نے اس وصیت نامہ کی تشہیر نہیں کی اور نہ اب کر رہے ہیں، اس من گھڑت اور بے سروپا داستان کی زد کہاں پہنچ رہی ہے۔

ایک اور وصیت نامہ جو کہ ملتان سے مشتہر کیا گیا ہے اس میں حسب ذیل عبارتیں موجود ہیں:-

(الف) اے شیخ احمد میں خدائے عزوجل سے بہت شرمندہ ہوں۔

(ب) اس وجہ سے میں خداوند کریم اور فرشتوں کو منہ نہیں دکھا سکتا۔

(ج) اے شیخ احمد میری امت کو کہہ دے کہ تمہاری بدولت خداوند کریم سے بہت شرمندہ ہوں۔

(د) میں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اپنے خدا سے معافی چاہتا ہوں، اے شیخ احمد تو بھی یہ وصیت نامہ لوگوں تک پہنچا دے تاکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔ (ملاحظہ ہو مختلف طبقوں کے علماء کا فتویٰ مطبوعہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور ص۱۲، ۲۵ جنوری ۱۹۶۲ء)

اس قسم کے جملوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اقدس، شانِ شفاعت اور وجاہت وعظمت کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلام دشمن آریوں اور عیسائیوں کی سازش معلوم ہوتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فریضۂ رسالت اور تبلیغ کی ذمہ داریوں کو باکمل واحسن اور انتہائی تمام وکمال سے ادا کر کے سبکدوش ہو گئے اور بارگاہِ خداوندی سے رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً اور فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔ نیز وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ اور دیگر بے شمار بشارات وانعامات پا کر شفیع المذنبین اور

رحمۃ للعالمین کے مقام پر فائز ہوئے۔ اب امت کی بدکرداری اور گنہگار ہونے کا کوئی عذر اور بوجھ اور بازپرس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نہیں اور نہ ہماری بداعمالیوں کا وبال آپ پر ہے جس کی وجہ سے معاذ اللہ آپ کو شرمندہ ہونا پڑے، وہ اپنے فریضہ سے بھی ہزار ہا درجہ زیادہ پیغام رشد وہدایت خداوندی انسانیت تک پہنچا کر اپنے فریضۂ تبلیغ سے باحسن وجوہ سرخرو ہو چکے ہیں۔

اس وصیت نامہ کی اشاعت کی طرف توجہ دیتے ہوئے لوگوں کو لاکھوں کروڑوں روپے کے لالچ اور خوف وعذاب، تباہی وبربادی سے ڈرایا دھمکایا جارہا ہے۔ اور پھر "سُنا ہے" کہہ کر کامیابی اور بربادی کے بعض فرضی افسانے لکھے ہوئے ہیں، جبکہ نہ تو سنانے والا معلوم اور نہ ہی سننے والا معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہرگز اس کے تمام مندرجات اور مضامین کو صحیح نہ سمجھنا چاہیئے، البتہ جو باتیں قرآن وحدیث اور دین کی کتابوں میں لکھی ہیں ان کے موافق نیک راہ پر چلنے اور نبی کریمؐ کی سُنت کو مضبوطی سے تھام کر بُری راہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے، جھوٹی اور بے اصل باتوں کی نسبت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا بہت بڑا بھاری گناہ ہے۔ اسلئے ازروئے شرع ایسے مضمون کی اشاعت کرنے والا سخت گنہگار ہوگا۔ اگر کسی کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات، مبشرات ومنذرات کے پڑھنے، سیکھنے اور انہیں شائع کرنے کا شوق ہو تو یہ تمام تعلیمات احادیث شریف کی مستند کتابوں میں موجود ہیں، ان کے پڑھنے، سیکھنے، عمل کرنے اور شائع کرنے سے ایمانی جذبہ اور عشقِ نبوی کا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

وصیّت نامہ کی تحریر وارث کے حق میں نافذ نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! گذارش ہے کہ میرے والد صاحب کا حال ہی میں انتقال ہُوا ہے، وفات سے تقریباً آٹھ سال قبل یعنی ۹۱/۱/۲۴ کو ایک اقرارنامہ تحریر کیا جس میں انہوں نے اپنا ملکیتی دس مرلہ زمین کا پلاٹ اپنی بیٹی (میری سگی بہن) "سماشاہجہان" کے نام کیا تھا، بعد میں ۹۲/۷/۴ کو انہوں نے ایک دوسرا اقرارنامہ تحریر کیا جس میں مذکورہ بالا دس مرلہ کا پلاٹ اپنی دوسری بیوی (میری سوتیلی والدہ) اور اس کے بیٹے (میرے سوتیلے بھائی) کے نام کیا۔ بعدازاں ۹۶/۸/۲۱ کو میرے والد صاحب نے ایک وصیّت نامہ تحریر کیا جس میں بھی مذکورہ زمین اپنی دوسری بیوی کے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں (میرے سوتیلے

بھائی بہنیں) کے نام کر دی، بعد ازاں اپنی وفات سے چند روز قبل یعنی ۲۴/۱/۹۹ کو ایک اور وصیت نامہ تحریر کیا جس میں مجھے مذکورہ بالا زمین کا مختارِ خاص بنا کر ہدایت کی گئی ہے کہ اس زمین کو بیچ کر میری دوسری بیوی کے بچوں (میرے سوتیلے بھائی بہنیں) کی پرورش اور تربیت پر صرف کرنا۔

جنابِ عالیٰ! مندرجہ بالا صورتحال کے پیشِ نظر آپ سے التماس ہے کہ قرآن وسُنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں کہ مذکورہ بالا چار دستاویزات میں سے کس پر عمل کیا جائے؟ عین نوازش ہوگی۔

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ دو مسئلوں پر محیط ہے:۔

(۱) **ھبہ:** جو کہ موصوف نے اپنی دس۱۰ مرلہ زمین کو ہبہ کیا ہے اور شریعتِ اسلامی میں ہبہ نافذ العمل ہے مگر اس کی تکمیل قبض پر موقوف ہے۔ اگر موہوبہ چیز پر قبضہ نہ کیا جائے تو صرف زبان سے کہنے یا تحریری اقرارنامہ سے ہبہ تامہ نہیں ہوتا، اور جب کسی رشتہ دار کو کوئی چیز ہبہ کر دی جائے اور وہ اس کے قبضہ میں دے دی جائے تو پھر اس سے رجوع کرنا شرعاً صحیح نہیں اور نہ واہب کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا اگر موصوف نے مذکورہ زمین اپنی دختر مسماۃ شاہجہان کے قبضہ میں دے دی تھی تو اب موصوفہ کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں، والد کا ہبہ سے رجوع یا تنسیخی کا اسٹامپ کارآمد نہیں، اور اگر قبضہ میں نہیں دیا ہو تو والد کا کسی وقت بھی اپنے ہبہ سے رجوع کرنا صحیح ہے اور ہبہ کا اقرارنامہ بحق مسماۃ شاہجہان بی بی ناکارہ اور منسوخ متصور ہوگا۔

لما قال المرغیناني: الهبة عقد مشروع تصح بالايجاب والقبول والقبض، اما الايجاب والقبول فلانه عقد والعقد ينعقد بالايجاب والقبول والقبض لابد منه لثبوت الملك اھ (الهداية ج۳ ص۲۸۱ كتاب الهبة)

لما قال المرغیناني: وان وهب هبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها لقوله عليه السلام اذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها لان المقصود صلة الرحم وقد حصل۔ (الهداية ج۳ ص۲۸۷ كتاب الهبة باب ما يصح رجوعه)

(۲) **وصیت:** باقی اسٹامپ کا تعلق وصیت کے ساتھ ہے، شرعاً وصیت کے نفاذ کیلئے چند شرائط ہیں:۔

(۱) وصیت کا نفاذ مال کے صرف ایک تہائی یعنی ۱/۳ میں ہوتا ہے ۔

(۲) دوسرے یہ کہ موصی لہ یعنی جس شخص کے لیے وصیت کی گئی ہو وہ اس کے مال کا وارث نہ ہو، اس لیے کہ وارث کے لیے وصیت کرنا شرعاً جائز نہیں ۔

لہٰذا اسی بناء پر باقی تین اسٹامپ اپنے ورثاء یعنی اولاد کے لیے وصیت کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے نافذ العمل نہیں بلکہ اس میں جملہ ورثاء کا حق وراثت ہے، شرعاً ان (تین) اقرارناموں پر عمل کرنا جائز نہیں ۔ تاہم وصیت کے مطابق مسمی مظفر داد اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کا ان کے حصہ شرعی میں کفیل ہوگا، اقرارنامہ کی کفالت مال متعین کی ہے جو ناکارہ اور غیر صحیح ہے ۔

لما فی الهداية: ولا تجوز بما زاد على الثلث لقوله عليه السلام وحديث سعد بن ابى وقاص الثلث والثلث كثير ۔ اھ ايضاً ولا تجوز لوارثه لقوله عليه السلام ان الله تعالىٰ اعطى كل ذى حق حقه لا وصية للوارث الخ ۔

(الهداية ج ۴ ص ۶۵۱، ۶۵۲ كتاب الوصايا)

(واللہ اعلم وعلمہ تام)

كتاب الفرائض

تعلموا الفرائض وعلموها الناس

کتاب الفرائض

(میراث کے احکام ومسائل)

قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا

سوال:- ایک شخص نے اپنے بھائی کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے قتل کر دیا اور مرحوم کے عصبہ میں سے اس قاتل بھائی کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں، تو کیا قاتل کو مقتول بھائی کی میراث میں حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- قصداً عمداً یا خطاءً ہر حالت میں قتل سبب حرمانِ ارث ہے، اس لیے صورتِ مذکورہ میں مقتول کی جائیداد اس کے دوسرے ورثاء کو دی جائے گی قاتل بھائی کے وجود کا اعتبار نہیں بلکہ بوجہ مانع یہ کالعدم رہے گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: المانع من الارث اربعة...... والقتل الذی يتعلق به وجوب القصاص او الكفارة۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع)[لہ]

دادا کی موجودگی میں چچا کی میراث سے محرومی کا حکم

سوال:- ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں دادا اور چچا کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں، تو مرنے والے کی میراث شرعاً کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:- بشرطِ صدق وثبوت اگر ورثاء کی تعداد درست ہو تو بعد از ادائے حقوقِ متقدمہ علی الارث تمام جائیداد دادا کو بطورِ عصوبت دی جائے گی، اور چچا چونکہ عصبہ بعیدہ ہے اسلئے وہ دادا کی موجودگی میں میراث سے محروم رہے گا۔ نقشہ ملاحظہ ہو:-

مسئلہ ١

دادا	چچا
١/١ (کل ترکہ کا حقدار)	محجوب

لہ وفی الهندية: القاتل بغير حق لا يرث من المقتول شيئاً عندنا سواء قتله عمداً او خطأً وكذلك كل قاتل هو فی معنی الخاطئ..... وقتل الصبی والمجنون والمعتوه والمبرسم والموسوس يوجب حرمان الميراث لان الحرمان يثبت جزاء قتل محظور الخ

(الفتاوى الهندية ج ٦ ص ٤٥٤ الباب الخامس فی الموانع)

قال العلامة السجاوندیؒ :۔ امّا الاب فلہٗ احوالٌ ثلث والتعصیب المحض وذٰلک عند عدم الولد وولد الابن وان سفل .... والجد الصحیح کالاب عند عدم الاب۔

(السراجی ص۷ باب معرفۃ الفروض) ؎۱

اختلافِ دین مانع ارث ہے

سوال :۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی عورت سے نکاح کرے تو موت کی صورت میں میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ عیسائی عورت سے اگرچہ نکاح جائز ہے لیکن یہ میاں بیوی عقائد میں اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کی میراث سے محروم رہیں گے کیونکہ اختلافِ دین مانع ارث ہے۔

قال العلامة السجاوندیؒ : المانع من الارث اربعۃ...... واختلاف الدینین ای اسلامًا وکفرًا۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع) ؎۲

خاوند اور بہن میں جائیداد کی تقسیم کا حکم

سوال :۔ ایک عورت نے مرنے کے بعد خاوند اور ایک بہن وارث چھوڑے ہیں جبکہ عصبات کوئی نہیں، مہربانی کرکے شریعت کی روشنی میں دونوں کا حصہ متعین فرمادیں ؟

الجواب :۔ اگر مرحومہ کے ورثاء میں خاوند اور ایک اعیانی بہن کے علاوہ اور کوئی زندہ نہ ہو تو کل جائیداد کا نصف خاوند کو اور باقی نصف بہن کو دیا جائے گا، نقشہ ملاحظہ ہو :۔

مسئلہ ۲   احمرہ

زوج (خاوند)   بہن
(۱)   (۱)

قال العلامة السجاوندی رحمہ اللہ : واما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد

؎۱ وفی الھندیۃ : فالاقرب العصبات ...... ثم الاب ثم الجد اب الاب وھم ای العصبۃ کل من لیس لہٗ سھم مقدر .... واذا انفرد اخذ جمیع المال۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۱ الباب الثالث فی العصبات)

؎۲ وفی الھندیۃ :واختلاف الدین ایضًا یمنع الارث والمراد بہ الاختلاف بین الاسلام والکفر۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۴ باب الموانع)

وولد الابن وان سفل ۔ (السراجی ص۷ باب معرفۃ الفروض ومستحقیھا)

وقال ایضاً : واما للاخوات لاب وام فاحوال خمس النصف للواحدۃ ۔

(السراجی ص۱۰ فصلٌ فی النساء) ؎۱

بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی میراث سے محرومی

سوال: ۔ ایک شخص کی وفات کے بعد اس کا ایک بیٹا زندہ ہے لیکن دوسرا بیٹا جو کہ اس کی زندگی میں ہی فوت ہوگیا تھا اب اس کے بیٹے زندہ ہیں، تو کیا دادا کی میراث میں سے مرحوم کے ایک بیٹے کی موجودگی میں فوت شدہ بیٹے کی اولاد کا کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ چونکہ بیٹا قریبی عصبہ ہے اور پوتا اس سے بعید ہے، قریبی وارث کی موجودگی میں بعید کے ورثاء حقِ وراثت سے محروم رہتے ہیں، اس لیے تمام جائیداد بیٹے کا حق ہے پوتے کو کچھ نہیں ملے گا، تاہم اگر بیٹا دل کی خوشی سے اسے کچھ دے دے تو کوئی حرج نہیں ۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ : اولٰھم بالمیراث جزء المیّت ای البنون ثم بنوھم ۔

(السراجی ص۱۴ باب العصبات) ؎۲

حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی میراث سے محروم رہے گا

سوال: ۔ ایک شخص کی وفات کے بعد اس کے ورثاء میں دو حقیقی بھائی، ایک بہن اور ایک علاتی بھائی رہ گئے ہیں، شریعتِ مطہرہ کی

؎۱ قال اللہ تبارک وتعالیٰ : (۱) وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۔ (سورۃ النساء:۱۲) ۔ (۲) إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۔ (سورۃ النساء:۱۷۶)

؎۲ قال العلامۃ السرخسیؒ : واولاد الابن یقومون مقام اولاد الصلب عند عدم اولاد الصلب فی جمیع ما ذکرنا لقولہ تعالیٰ : يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۔ واسم الاولاد یتناول اولاد الابن مجازاً...... فان اجتمع اولاد الصلب واولاد الابن فان کان فی اولاد الصلب ذکر فلا شیئ لاولاد الابن ذکوراً او اناثاً او مختلطین لان المذکر اولاد الصلب مستحق لجمیع المال باعتبار حقیقۃ الاسم ۔ (المبسوط للسرخسی ج۲۹ ص۱۴۱ کتاب الفرائض)

روشنی میں مرحوم کی جائیداد ان ورثاء میں کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال اگر مرحوم کے ورثاء میں دو حقیقی بھائی، ایک بہن اور ایک علاتی بھائی ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا قریبی عصبہ یا ذوی الفروض نہ ہو تو بعداز ادائے حقوق متقدمہ علی الارث مرحوم کی تمام جائیداد کے پانچ حصے کرکے ہر ایک حقیقی بھائی کو دو دو حصے (۲/۵، ۲/۵) اور ایک حصہ (۱/۵) حقیقی بہن کو دیا جائے گا اور اعیانی بھائیوں کی موجودگی میں علاتی بھائی حقِ وراثت سے محروم رہیں گے۔

قال العلامة السجاوندیؒ: واما للاخوات لاب وام ..... ومع الاخ لاب وام للذکر مثل حظ الانثیین یصرن به عصبة لاستوائهم فی القرابة الی المیت۔
(السراجی ص۱۰ فصل فی النساء)

وایضاً: لقوله علیه السلام ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات کالاخ لاب وام فانه مقدم علی الاخ لاب اجماعاً۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات) [1]

بیٹے، بیٹی میں میراث کی تقسیم اور نواسی کا اس سے محروم ہونا

سوال:۔ ایک عورت نے مرنے کے بعد ایک بیٹا، ایک بیٹی اور ایک نواسی وارث چھوڑے ہیں شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ان ورثاء میں مرحومہ کی میراث کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ حسبِ بیانِ سائل صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا ترکہ بعداز ادائے حقوق متقدمہ علی الارث تین حصے کرکے ایک حصہ بیٹی کو اور دو حصے بیٹے کو ملیں گے، اور نواسی چونکہ ذوی الارحام میں سے ہے لہٰذا عصبات کی موجودگی میں یہ میراث سے محروم رہے گی، نقشہ ملاحظہ ہو:۔

مرحومہ

بیٹا	بیٹی	نواسی
۲	۱	محروم

---

[1] وفی الهندیة: اختان لابوین واخت لاب فالمال للاختین فرضاً ورداً ولاشئ للاخت لاب فان کان منهما اخوها عصبها فلهما الباقی وهو الثلث للذکر مثل حظ الانثیین۔
(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۵۲ الباب الرابع فی الحجب)

قال العلامة السجاوندیؒ: اما البنات الصلب فاحوال ثلث ...... ومع الابن للذکر مثل حظ الانثیین وھو یعصبھن۔ (السراجی ص۸ فصل فی النساء) [1]

صرف والد ہی کا بیٹے کی تمام جائیداد کا وارث ہونا

سوال:۔ اگر ایک آدمی کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں صرف اس کا والد باقی ہو تو از روئے شریعتِ مقدسہ مرحوم کا ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟

الجواب:۔ بشرط صحتِ سوال مرحوم کا تمام ترکہ بعد از ادائے ما وجب تقدیمہ علی الارث اس کے والد کو بطور عصوبت ملے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما الاب فلہ احوال ثلث ...... والتعصیب المحض وذٰلک عند عدم الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۶ باب معرفۃ الفروض)

وایضاً: والعصبۃ کل من یأخذ ما ابقتہ اصحاب الفرائض وعند الانفراد یحرز جمیع المال۔ (مقدمۃ السراجی ص۴) [2]

اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بہن کی میراث سے محرومی

سوال:۔ ایک عورت نے مرنے کے بعد ایک اعیانی بھائی اور ایک علاتی بہن وارث چھوڑے جبکہ ان کے علاوہ ذوی الفروض اور عصبہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے، تو مرحومہ کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر واقعی مرحومہ کے ورثاء میں ایک اعیانی بھائی اور ایک علاتی بہن کے علاوہ کوئی دوسرا قریبی عصبہ یا ذوی الفروض زندہ نہ ہو تو بعد از اداءِ حقوقِ مقدمہ علی الارث مرحوم کی تمام جائیداد کا مستحق اس کا اعیانی بھائی

---

[1] قال اللہ تبارک وتعالیٰ: یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۱)

[2] وفی الھندیۃ: فاقرب العصبات ...... ثم الاب، وھم ای العصبۃ کل من لیس لہ سہام مقدرۃ ویأخذ ما بقی من سہام ذوی الفروض واذا انفرد اخذ جمیع المال۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۱ الباب الثالث العصبات)

ہے اور اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاقی بہن کو کچھ نہیں ملتا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: ثم جزء ابیہ ای الاخوۃ۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات)

وایضاً: ویسقط بنو العلات ایضا بالاخ لاب وام۔ (السراجی ص۱۱ باب معرفۃ الفروض)[1]

نافرمان بیٹے کا باپ کی میراث میں استحقاق

سوال:۔ ایک شخص اپنے باپ کا نافرمان ہونے کے ساتھ اُسے گالی گلوچ بھی دیتا ہے تو کیا یہ شخص باپ کے مرنے کے بعد میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، لیکن یہ میراث سے محرومی کا سبب نہیں بن سکتا، کیونکہ ارث اضطراراً ورثاء کی طرف منتقل ہوتی ہے، اس لیے نافرمان بیٹا فرمانبردار بیٹے کی طرح میراث لے سکتا ہے۔

قال العلامۃ محمد علاؤ الدین افندیؒ: الارث جبریٌ لا یسقط بالاسقاط۔
(تکملۃ رد المحتار ج۱ ص۳۵۹ مطلب واقعۃ الفتوی۔ کتاب الدعوی)

وراثت کے لیے محض رشتہ دار ہونا کافی نہیں

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک عورت فوت ہوگئی ہے جس کے ورثاء میں کوئی بھی عصبہ، ذوی الفروض یا ذوی الارحام موجود نہیں صرف خاوند کے بھتیجے ہیں، تو کیا مرحومہ کی میراث میں سے اس کے خاوند کے بھتیجوں کو حصہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی عورت کے خاوند کے بھتیجے خاوند کے تو عصبہ ہیں لیکن اس کی بیوی سے اس کا کوئی خاص رشتہ نہیں جو سببِ ارث بن جائے صرف خاوند کی قرابت کی وجہ سے بیوی کی میراث میں ان کو حق نہیں دیا جاسکتا اور نہ یہ کسی حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں بلکہ ایسی حالت میں تو ان کے درمیان اجنبیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کا آپس میں نکاح بھی جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس عورت کے شرعی ورثاء

---

[1] قال اللہ تعالیٰ: وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۔ (سورۃ النساء ۱۷۶)

لما فی الحدیث: ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات۔
(السراجی ص۱۴ باب العصبات)

نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ترکہ بیت المال میں جائے گا۔

قال العلامة السید شریف الجرجانی ؒ ثم بیت المال ای اذا لم یوجد احد من المذکورین توضع الترکة فی بیت المال۔ (الشریفیة ص۱۱) لہ

نکاحِ فاسد سے پیدا ہونے والی اولاد کا وراثت سے محروم ہونا

سوال:۔ایک شخص نے زوجۂ غیر سے نکاح کیا اور اس نکاح سے اس کی اولاد بھی پیدا ہوئی، تو کیا یہ اولاد ماں کے اس دوسرے خاوند سے میراث لے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زوجۂ غیر کے ساتھ نکاح کرنا نکاح فاسد ہے اور نکاح فاسد کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہو وہ اگرچہ ثابت النسب ہوگی لیکن باپ کی میراث میں حقدار نہ ہوگی۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: ویثبت النسب واما الارث فلا یثبت۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۳۸۲ باب ثبوت النسب) ۲ہ

رواجی قبضہ کا اعتبار نہیں

سوال:۔ایک شخص کے مرنے کے بعد جائز ورثاء میں دو بیوگان کے علاوہ اس کے بہن بھائی تھے لیکن انگریزی قانون (رواج) کے مطابق مرحوم کی دونوں بیویاں اس کی جائیداد پر قابض تھیں، اب اس کی ایک بیوی فوت ہو چکی ہے تو یہ ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب:۔شریعتِ مقدسہ میں صرف رواجی قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے دونوں بیوں سے مرحوم کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں وہ کل جائیداد کے صرف ۴/۱ حصہ کی حقدار ہوں گی جبکہ بقیہ جائیداد مرحوم کے ان ورثاء میں تقسیم ہوگی جو اسکی

لہ لما فی الهندیة: فیبدأ بذوی الفروض النسبیة بقدر حقوقهم ثم ذوی الارحام ثم مولی الموالاة ...... ثم الموصی لہ بجمیع المال ثم بیت المال۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاول)

۲ہ قال العلامة الرافعی رحمہ اللہ: وعبارة ابی سعود ولا توارث بین الزوجین فی الفاسد۔ (تقریرات ج۱ ص۱۹۷ باب ثبوت النسب)

موت کے وقت زندہ تھے۔

قال العلامة السجاوندیؒ: اما للزوجات فحالتان الربع للواحدة فصاعدة عند عدم الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۱۰ فصل فی اصحاب الفروض)[1]

مجرم کا پھانسی گھاٹ میں ہونا مرض الموت کے حکم میں نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص قتل کے الزام میں قید خانہ میں محبوس ہو تو کیا اس کا اقرار اور جائیداد وغیرہ میں تصرفات مرض الموت کے حکم میں شمار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس شخص کو قتل کے الزام میں عدالت کی طرف سے سزائے موت (پھانسی) کا حکم ہو چکا ہو یا قتل کے جرم میں حوالات یا قید خانہ میں محبوس ہو، اس کی یہ حالت مرض الموت کے مانند نہیں سمجھی جائے گی، اس کے تمام معاملات مثل صحت کے جاری و نافذ ہوں گے البتہ جس وقت قید سے نکال کر مقتل (پھانسی دیئے جانے کی جگہ) کی طرف روانہ کر دیا جائے تو قید خانہ سے نکالنے کے بعد پھانسی ہونے تک جتنی دیر لگے گی وہ مرض الموت کے مانند ہوگی، اس حالت میں اگر اس نے کوئی تصرف مثلاً اقرار وغیرہ کیا ہو تو وہ مرض الموت کے تصرفات کی طرح ناقابل قبول ہے۔ اور اگر اس روز پھانسی کی سزا کسی وجہ سے ملتوی ہو جائے یا اس کا حکم بالکل منسوخ ہو جائے تو قید خانہ سے نکل کر پھانسی گھاٹ تک آنے کی حالت مرض الموت کے مانند نہ رہے گی یعنی مثل صحت کے سمجھی جائے گی اور اس حالت میں جو تصرفات کئے تھے وہ جاری اور درست سمجھے جائیں گے۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولو کان محصورا او محبوسا فی حد او قصاص او واقفا فی صف القتال فهو فی حکم الصحیح ـ وقد ذکر محمد فی الاصل مسائل تدل علی ان الشرط خوف الهلاک علی طریق الغلبة لا کونه صاحب فراش فانه قال: اذا اخرج الرجل للقصاص او الرجم فهو فی حکم المریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۳ ص۵۸۰ کتاب الطلاق، باب طلاق المریض)[2]

---

[1] لقوله تعالیٰ: وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ـ (سورة النساء:۱۲)

[2] وفی الهندیة: ولو عاین المخرج للقتل الی الحبس او رجع المبارز بعد المبارزة الی الصف صار فی حکم الصحیح کالمریض اذا برا من مرضه۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۶۳ الباب الخامس فی طلاق المریض)

طویل بیماری مرض الموت شمار ہوگی

سوال:۔ از روئے شرع مرض الموت کے تصرفات محدود ہیں جس میں بسا اوقات میت کے تصرفات موقوف سمجھے جاتے ہیں لیکن بعض بیماریاں سالوں تک ممتد رہتی ہیں کیا ایسی ممتد بیماری کو مرض الموت کہا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ مرض الموت میں یہ ضروری نہیں کہ یہ چند دنوں تک محدود ہو بلکہ کبھی مرض الموت کی مدت طویل بھی ہو سکتی ہے، تاہم جو بیماری عمومی حیثیت اختیار کر جائے جیسا کہ آجکل ثوران الدم (بلڈ پریشر) ذیابیطس (شوگر) یا امراض قلب میں مبتلا ہونے مرض الموت میں شمار کرنا مشکل ہے، کیونکہ یہ بیماریاں اگرچہ فوری طور پر موت کا سبب بن سکتی ہیں لیکن مدتوں تک محیط ہونے سے بھی خالی نہیں۔

قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: ولو طال المرض وصد بحال لا يخاف عليه الموت كالفالج او صار مدنفاً او يابس الشق لا يكون حكم المرض الا اذا تغير حاله من ذلك ومات من ذلك التغير فما فعل فى حال التغير فمن الثلث۔

(الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۴۳۲ كتاب الوصايا)[1]

شرعی بیت المال نہ ہونے کی صورت میں میراث کا حکم

سوال:۔ اگر کسی میت کے اقسام ثلاثہ (ذوی الفروض، عصبات، ذوی الارحام) ورثاء میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو اور شرعی بیت المال بھی نہ ہو تو اس کے ترکہ کا کیا کیا جائے گا، شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب مطلوب ہے؟

الجواب:۔ جب شرعی بیت المال موجود نہ ہو تو مسئولہ صورت کے مطابق میراث

---

[1] قال العلامة ابن نجيم: والمقعد والمفلوج والاشل والمسلول ان تطاول ذلك ولم يخف منه الموت فهبته من كل المال لانه اذا تقادم العهد صار من طبعه كالعمى والعرج وهذا لان المانع من التصرف فى مرض الموت ومرض الموت لا يكون سبباً للموت غالباً وانما يكون سبباً للموت اذا كان بحيث يزداد حالاً فحالاً الى ان يكون آخره الموت۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۲۸۴ قبيل باب العتق فى المرض والوصية بالعتق)

کو ایک امین (امانت دار شخص) کے ہاتھ میں دے دیا جائے تاکہ وہ ایسے فقراء جن کا کوئی سرپرست وغیرہ نہ ہو پر اس طرح خرچ کرے کہ ان فقراء کا نفقہ، تداوی، کفن دفن وغیرہ اس ترکہ سے پورا کرے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: واما الرابع (ای الضوائع مثل مالا یکون لہ اناثا وارثونا) فمصرفہ المشھور ھو اللقیط الفقیر والفقراء الذین لا اولیاء لھم فیعطی منہ نفقتھم وادویتھم وکفنھم وعقل جنایتھم۔ (ردالمحتار ج۲ ص۵۸ مطلب فی بیان بیوت المال ومصارفہا، قبل باب المصرف)

حین حیات میں جائیداد کی تقسیم کا شرعی طریقہ

سوال:۔ ایک شخص کی ایک بیوی، دو بیٹے، تین بیٹیاں، ایک پوتی اور دو پوتے ہیں جن کا والد فوت ہو چکا ہے، اب یہ شخص زندگی میں ہی اپنی جائیداد ان میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس کی صورت کس طرح ہونی چاہیئے؟ کیا پوتوں اور پوتیوں کو بیٹوں اور بیٹیوں کے برابر حصہ دیا جائے گا؟ اور اگر کوئی ان کو محروم رکھے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد کی تقسیم درحقیقت ہبہ ہے جس میں مالک کو کلی اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح چاہے تقسیم کرے اور اولاد کا اس پر باقاعدہ قبضہ کر لینے کے بعد وہی تقسیم نافذ رہے گی تاہم کسی وارث کو بلا وجہ میراث سے محروم کرنا سراسر زیادتی ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ زندگی میں ہی اولاد میں جائیداد تقسیم کرنے والے کو ایسا طریقہ اپنانا چاہیئے کہ اگر اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد ورثاء میں تقسیم کرنے کی نوبت آئے تو اسی طرح تقسیم ہوتی۔ لہٰذا مسئولہ صورت میں بھی اس شخص کو چاہیئے کہ وہ کل جائیداد کے ۵۶ حصے کر کے ثمن کل جائیداد کا (۷/۵۶) بیوی کو اور ہر ایک بیٹے کو ۱۴/۵۶، ۱۴/۵۶ حصہ اور بیٹی کو ۷/۵۶ حصے کے حساب سے تقسیم کرے، اور جہاں تک پوتوں اور پوتیوں کا تعلق ہے تو بہتر یہ ہے کہ دادا اپنی زندگی میں ہی ان کو کچھ دے دے تاکہ اس کے مرنے کے بعد قانونی تنازعات پیدا نہ ہو جائیں لیکن اگر دادا پوتوں اور پوتیوں کو کچھ نہ دینا چاہے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: الا فضل فی هبة الابن والبنت التثلیث کالمیراث۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص۲۳۷ کتاب الهبة۔ الجنس الثالث)

نقشہ ملاحظہ ہو:۔

مسئلہ ۵۶

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی
۷	۱۴	۱۴	۷	۷	۷

بذریعہ اعلانِ عاق نامہ بیٹے کو میراث سے محروم کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنے بیٹے سے ناراض ہو اور اسی ناراضگی کی وجہ سے اخبار وغیرہ میں بذریعہ اشتہار اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے اُسے عاق کرنے کا اعلان کردے، تو کیا باپ کی وفات کے بعد عاق شدہ بیٹا میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وراثت ایک اضطراری حق ہے کوئی شخص اپنی طرف سے اس حق کو زائل یا ختم نہیں کرسکتا، اس لیے باپ کے مرنے کے بعد عاق شدہ بیٹا بھی میراث کا حقدار ہے، تاہم اگر یہ شخص اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد اور منقولہ سرمایہ اپنے ورثاء میں تقسیم کردے اور ان کو باضابطہ مالک بنا دے تو اس صورت میں باپ کے مرنے کے بعد عاق شدہ بیٹا حقِ ارث کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

قال العلامة محمد علاؤالدین آفندیؒ: الارث جبریٌ لایسقط بالاسقاط۔ (تکملة ردالمحتار ج ۱ ص۳۵۹ مطلب واقعة الفتوی۔ کتاب الدعوی) [۱]

---

[۱] وذکر الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن ابراهیم عن الاسود عن عائشةؓ قالت اشتریت بریرة فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اشتریها فان الولاء لمن اعتق۔ (الجامع الصحیح البخاری ج ۲ ص۹۹۹ کتاب الفرائض باب الولاء لمن اعتق الخ)

ومثله فی امداد الفتاوی ج ۴ ص۳۶۴ کتاب الفرائض۔

کفار کے ہاں قید شخص کی میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا ایک بھائی کشمیر میں جہاد کے دوران انڈین فوج کے ہاتھوں قید ہوگیا ہے، اب دوسرے بھائی والد صاحب کے ترکہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کیا قیدی بھائی کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ اس کی رہائی کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔

الجواب:۔ جب کوئی مسلمان کفار کے ہاتھوں قید ہوجائے تو وہ تا وقت موت یا ارتداد عام مسلمانوں کی طرح میراث کا حقدار ہے، لہٰذا آپ کا وہ بھائی جو دشمن کی قید میں ہے باپ کی میراث میں برابر کا حقدار ہے اس کی رہائی یا موت کی مصدقہ اطلاع تک اس کا حصہ محفوظ رکھا جائے۔

قال السید شریف الجرجانیؒ: حکم الاسیر کحکم سائر المسلمین فی المیراث مالم یفارق دینہ فیرث ویورث منہ لان المسلم من اھل دار الاسلام اینما کان۔ (الشریفیۃ ص۱۴۲ فصل فی الاسیر) ؎۱

شیعہ سنی کے مابین میراث کا حکم

سوال:۔ کیا کوئی شیعہ کسی سنی کے مال میں شرعاً میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیعہ (روافض) کے مختلف گروہ ہیں جو شیعہ کفریہ عقائد مثلاً الوہیتِ حضرت علیؓ اور قذفِ سیدہ حضرت عائشہؓ وغیرہ کے قائل ہوں تو اختلافِ دین کی وجہ سے شیعہ سنی کا وارث نہیں ہوسکتا البتہ جو شیعہ غالی نہ ہوں تو صرف بدعت مانع ارث نہیں۔

قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ: والمانع من الارث اربعۃ.....

؎۱ وفی الھندیۃ: وحکم الاسیر کحکم سائر المسلمین فی المیراث مالم یفارق دینہ فان فارق دینہ فحکمہ حکم المرتد فان لم یعلم ردتہ ولا حیاتہ ولا موتہ فحکمہ حکم المفقود۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۷ الباب الثامن فی المفقود والاسیر الخ)

ومثلہٗ فی السراجی ص۷۵ فصل فی الاسیر۔

والقتل الذی یتعلق بہ وجوب القصاص اوالکفارۃ..... واختلاف الدینین ای اسلاماً وکفراً۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع) ؎۱

مُرتد کسی مسلمان کی میراث کا حقدار نہیں

سوال:۔ میرا بھائی امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا وہاں وہ عیسائی بن گیا، تو کیا والد صاحب کی وفات کے بعد اس کو میراث میں حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟ جبکہ وہ اپنے حصۂ میراث کا مطالبہ کرتا ہے۔

الجواب:۔ ارتداد مانع ارث ہے۔ اسی بناء پر مُرتد ہونے کی وجہ سے آپ کا بھائی بھی باپ کے مالِ وراثت کا حقدار نہیں رہا۔

قال العلامة سید شریف جرجانیؒ: واما المرتد فلا یرث من احد لامن مسلم ولامن مرتد مثلہ لانہٗ جانٍ بارتدادہ فلایستحق الصلة الشرعیة التی ھی الارث بل یحرم عقوبة ما لقاتل بغیرحق۔ (الشریفیة ص۱۳۱ فصل فی المرتد) ؎۲

مُرتدہ عورت کے ترکہ کا حکم

سوال:۔ ایک مسلمان عورت روس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئی تو وہاں وہ اسلام کو چھوڑ کر مُرتد ہوگئی، اور اب اس کا انتقال ہوگیا ہے تو شرعاً کون اس کے ترکہ کا حقدار ہے؟

الجواب:۔ ارتداد اگرچہ مانع ارث ہے مگر عورت اس سے مُستثنیٰ ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس مرتدہ عورت کی موت کے بعد اس کا ترکہ اُس کے ورثاء میں

؎۱ قال العلامة الحصکفیؒ: اختلاف الملتین اسلاماً وکفراً۔ قال السید احمد الطحطاویؒ ای من جھة الاسلام والکفر اما اختلافھما من جھة الیھودیة والنصرانیة فلا یکون مانعاً وھذا التقیید لا بد منہ ......واماعدم توریث الکافر من المسلم فبالاجماع۔
(طحطاوی حاشیة الدرالمختار ج۴ ص۳۷۸ کتاب الفرائض)
وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاوی ج۴ ص۳۵۵ کتاب الفرائض۔

؎۲ وفی الھندیة: المرتد لا یرث من مسلم ولامن مرتد مثلہ۔
(الفتاوی الھندیة ج۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اھل الکفر)
وَمِثْلُہٗ فی السراجی ص۲۷ فصل فی المرتد۔

بطریقۂ شرعی تقسیم ہوگا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانیؒ: وکسب المرتدۃ جمیعًا ای سواء اکتسبتہ فی اسلامھا او فی ردتھا قبل اللحوق بدار الحرب لورثتھا المسلمین بلا خلاف بین اصحابنا۔ (الشریفیۃ ص۱۲۰ فصل فی المرتد) ؎۱

ہیجڑے کی میراث کی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک ہیجڑا جس کی داڑھی بھی ہے اگر اُس کا باپ، ماں یا کوئی اور رشتہ دار مرجائے تو میراث میں اس کا کتنا حصہ ہوگا؟

الجواب:۔ اگر ہیجڑے پر مردوں کے آثار موجود ہوں تو اُسے مردوں جتنا حصہ ملے گا اور اگر عورتوں کے آثار زیادہ ہوں تو عورتوں جتنے حصے کا حقدار ہوگا، چونکہ صورتِ مسئولہ میں اس ہیجڑے کی داڑھی آچکی ہے جو کہ مردوں کی علامت ہے اس لیے اس کا حصۂ میراث مردوں جتنا ہوگا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانیؒ: فلا بد أن یزول الاشکال بظھور العلامۃ لانہ ان جامع بذکرہ او نبتت لہ لحیتہ او احتلم کاحتلام الرجل فھو رجل۔
(الشریفیۃ ص۱۲۵ فصل فی الخنثیٰ) ؎۲

مرنے والے کا قرضہ نکل آنے پر تقسیمِ ترکہ کالعدم ہوجاتی ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا بیٹا طاہر جمال تقریباً ۱۳ سال ملائشیا میں رہا، جب وہ گاؤں واپس آیا

؎۱ وفی الھندیۃ: والمرتدۃ اذا ماتت قسم مالھا بین ورثتھا علیٰ فرائض اللہ تعالیٰ سواء کان کسب الاسلام او کسب الردۃ کلا الکسبین یصیر میراثًا عنھا۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اھل الکفر)
وَمِثْلُہٗ فی السراجی ص۷۵ فصل فی المرتد۔

؎۲ وفی الھندیۃ: فاذا بلغ الخنثیٰ وخرجت لحیتہ او وصل الی النساء فھو رجل۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۶ ص۴۵۷ الباب التاسع فی میراث الخنثیٰ)
وَمِثْلُہٗ فی السراجی ص۶۵ فصل فی الخنثیٰ۔

تو یہاں ہم نے قرضہ لے کر اس کی شادی کی، کچھ عرصہ بعد وہ سخت بیمار ہوگیا تو اس کا علاج بھی قرضہ لے کر کرایا اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہوگیا، بعداز وفات بینک میں اس کے ۴ لاکھ روپے موجود تھے جو کہ بذریعہ عدالت ورثاء میں تقسیم کئے گئے، اس کے بعد اس کے ذمے کافی قرضہ نکل آیا۔ تو کیا اس قرضہ کی ادائیگی کے لیے ورثاء سے رجوع کیا جاسکتا ہے یا نہیں یا اس قرضہ کو ادا کرنے کا میں ہی ذمہ دار ہوں؟

الجواب: کسی کی وفات کے بعد اس کے جملہ مال سے اولاً چار حقوق منہا کئے جائیں گے۔ اور پھر بقیہ مال ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

وفی الهندیة: الترکة تتعلق بها حقوق اربعة جهاز المیت ودفنه والدین والوصیة والمیراث فیبدأ اولاً بجهازه وکفنه ومایحتاج الیه فی دفنه بالمعروف۔ (الفتاوى الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض)

قال الشیخ السید شریف الجرجانیؒ: ثم تقضی دیونه من جمیع ما بقی من ماله ای یبدأ بقضاء دینه من جمیع ماله الباقی بعد التجهیز والتکفین وهذا هو الثانی فی الاربعة۔ (الشریفیة ص۵ کتاب الفرائض)

اور اگر لاعلمی یا دھوکہ دہی کی وجہ سے مرنے والے کا جملہ ترکہ اس کے ورثاء میں تقسیم ہو جائے تو یہ تقسیم صحیح نہیں بلکہ از سرِ نو قرضہ وغیرہ منہا کر کے بقیہ میراث کو ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

کما فی مجلة الاحکام: اذا ظهر دین علی المیت بعد قسمة الترکة تنسخ القسمة.

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: تحت مادة سواء کان الدین محیطاً بالترکة اولا اما الاول فظاهر لانه یمنع الملک فیمنع التصرف واما الثانی فتعلق حق الغرباء بالترکة شائعاً ولان القسمة مؤخرة عن قضاء الدین لحق المیت۔

(شرح المجلة ص۶۴۱ الفصل السابع فی فسخ القسمة واقالتها)

لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال صورتِ مسئولہ میں بھی مرحوم بیٹے کے ذمہ قرض کی ادائیگی اس کے باپ کے ذمے نہیں بلکہ تقسیم وراثت کالعدم متصور ہو کر جملہ ترکہ سے قرضہ منہا کیا جائے گا اور بقیہ مال ورثاء میں تقسیم ہوگا، اس لیے مرحوم کے باپ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ دیگر ورثاء دین (قرض) کی ادائیگی کرے چاہے ورثاء میں اس کی بیوہ ہو یا ماں باپ ہوں۔

رضاعت موجب میراث رشتہ نہیں

سوال:۔ کیا رضاعی بیٹے کو باپ کی میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ مرحوم کے اس رضاعی بیٹے کے علاوہ چچازاد بھائی بھی ہیں؟

الجواب:۔ وراثت کے حقدار صرف نسبی بھائی ہیں لہٰذا مرحوم کی جملہ جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے چچازاد بھائیوں کو ملے گی، رضاعی بیٹے کا اس کی میراث سے کوئی واسطہ نہیں۔

قال العلامۃ سراج الدین السجاوندیؒ: ثم یقسم الباقی بین ورثتہ بالکتاب والسنۃ واجماع الامۃ فیبدأ باصحاب الفرائض هم الذین لهم سهام مقدرۃ فی کتاب اللہ تعالیٰ ثم بالعصبات من جهة النسب الخ۔ (السراجی ص۴ کتاب الفرائض) [1]

متبنیٰ کو میراث دینے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، محلے کے ایک دوست نے اُسے اپنا بیٹا دیدیا، اس شخص نے بحیثیت باپ اس بچے کی پرورش کی، تو کیا اس شخص کی وفات کے بعد یہ لڑکا اس کی میراث کا مالک متصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ لڑکا مرحوم کا حقیقی نہیں بلکہ منہ بولا بیٹا ہے اور کسی کو متبنیٰ بنانا کوئی سببِ میراث رشتہ نہیں جس کی وجہ سے کوئی کسی کا وارث بن جائے، اس لیے مرحوم کا مال اس کے دیگر رشتہ داروں میں تقسیم ہوگا اور لڑکے کو بطورِ حقِ وراثت کچھ نہیں ملے گا البتہ اگر مرحوم نے اپنی زندگی میں تملیکاً اس کو کچھ دیا ہو تو وہ اس کا مالک ہے اور مرحوم کا کوئی رشتہ دار اس میں وراثت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

قال العلامۃ سراج الدین السجاوندیؒ: العصبات النسبیۃ .... وهم اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (السراجی ص۱۸، ۱۹ باب العصبات) [2]

---

[1] قال العلامۃ عبداللہ بن المودود الموصلیؒ: ویستحق الارث برحمٍ ونکاحٍ وولاءٍ۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
وَمِثْلُہٗ فی الهندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔ الباب الاول۔

[2] قال العلامۃ الموصلیؒ: ویستحق الارث برحمٍ ونکاحٍ وولاءٍ۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
وَمِثْلُہٗ فی الهندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔ الباب الاول۔

سوتیلا باپ میراث سے محروم ہے

سوال:۔ ایک آدمی کا انتقال ہوگیا ہے اس کے ورثاء میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور ایک سوتیلا باپ موجود ہیں، مرحوم کی میراث ان میں کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب: حقوقِ متقدمہ کی ادائیگی کے بعد باقیماندہ مال مرحوم کی بیوہ اور دو بیٹوں میں تقسیم ہوگا جبکہ سوتیلا باپ حقِ میراث سے محروم ہوگا اس لیے کہ دونوں کے درمیان موجبِ ارث کوئی رشتہ داری نہیں۔

۱۶ = ۲ × ۸

بیوہ	بیٹا	بیٹا
۲/۱۶	۷/۱۶	۷/۱۶

قال العلامة السجاوندیؒ: العصبات النسبية...... وهم اربعة اصناف جزء الميت واصله وجزء ابيه وجزء جده۔ (السراجی ص۱۹ باب العصبات)[1]

سوتیلے بیٹے کی میراث کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی بیوہ عورت سے شادی کی جبکہ بوقتِ نکاح اس عورت کا مرحوم شوہر سے ایک بیٹا بھی تھا جس نے اس آدمی کے گھر میں پرورش پائی اور وہ بھی اس کو اپنا بیٹا سمجھتا رہا، اب یہ آدمی فوت ہوگیا ہے تو کیا یہ لڑکا اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ میراث میں شریک ہوگا یا نہیں، یاد رہے کہ اس لڑکے کے یہ بھائی اس کی ماں (یعنی اس عورت کے دوسرے شوہر) سے ہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مرحوم اور اس کے سوتیلے بیٹے کے درمیان کوئی موجبِ میراث رشتہ نہیں اسلئے مرحوم کا ترکہ اس کے حقیقی بیٹوں کا ہے اور یہ لڑکا میراث سے محروم رہے گا۔

قال العلامة الموصلیؒ: ويستحق الارث برحم ونكاح وولاء۔
(الاختيار لتعليل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)[2]

---

[1] قال العلامة الموصلیؒ: ويستحق الارث برحم ونكاح وولاء...... ثم اصله وهو الاب والجد ثم جزء ابيه ثم بنوهم الخ۔ (الاختيار لتعليل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاول۔

[2] وفی الهندية: ويستحق الارث باحدى خصال ثلاث بالنسب وهو القرابة والسبب وهو الزوجية والولاء۔ (الفتاوى الهندية ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاول)

دو بیویوں کی اولاد میں میراث کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے میرے علاوہ میری دو بہنیں بھی ہیں، اور دوسری بیوی سے تین بیٹے ہیں جبکہ میری والدہ کا والد صاحب سے پہلے انتقال ہو گیا ہے، تو کیا والد صاحب کا ترکہ ان کی سب اولاد میں برابر تقسیم ہو گا یا ہم حقیقی بہن بھائی کو کم اور دوسروں کو زیادہ ملے گا؟

الجواب:۔ میراث کی تقسیم میت کے ساتھ رشتے کی بناء پر ہوتی ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحوم کے ساتھ اس کی دونوں بیویوں کی اولاد کا حق برابر ہے اس لیے آپ سب میں حصۂ شرعی کے مطابق میراث تقسیم ہو گی، یعنی ماں کے حصے کے علاوہ مال کے دو حصے ایک بھائی اور دو بہنوں کو ملیں گے اور تین حصے دوسرے تین بھائیوں کو ملیں گے۔

۸۰ = ۱۰ × ۸

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی
۸۰/۱۰	۸۰/۱۴	۸۰/۱۴	۸۰/۱۴	۸۰/۱۴	۸۰/۷	۸۰/۷

قال العلامة السجاوندیؒ: العصبات النسبیة وهم اربعة اصناف جزء المیت واصله وجزء ابیه وجد ه الاقرب فالاقرب یرجحون بقرب الدرجة اولهم بالمیراث جزء المیت ای البنون۔ (السراجی ص ۱۹ باب العصبات) [1]

مہر میں شوہر کا حصۂ ارث

سوال:۔ ایک عورت کو شادی کے بعد کسی وجہ سے اس کے انتقال تک اس کا حق مہر نہیں ملا جبکہ اس عورت کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے صرف ایک باپ، دو بھائی اور شوہر زندہ ہیں، تو اب مہر کس کا حق ہے؟

الجواب:۔ حقِ مہر بھی مرحومہ کے ترکہ میں شامل ہے اس لیے مرحومہ کے دیگر اموال

---

[1] قال العلامة الموصلی رحمه الله: غصبة بنفسه وهو کل ذکر لا یدخل فی نسبته الی المیت انثیٰ واقربهم جزء المیت وهو بنوه۔

(الاختیار لتعلیل المختار ج ۵ ص ۹۲ فصل فی العصبات)

ومثلهٗ فی الهندیة ج ۶ ص ۴۵۱ الباب الثالث فی العصبات۔

کی طرح اس کے مہر کی رقم بھی شوہر اور باپ کے درمیان تقسیم ہوگی یعنی آدھا مہر شوہر کو اور آدھا باپ کو ملے گا بھائی محروم ہوں گے۔

قال العلامة السجاوندیؒ: اما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والربع مع الولد الخ۔ (السراجی ص۹ باب معرفة الفروض الخ)[1]

کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنا

سوال: کیا کسی وارث کو حقِ وراثت سے محروم کرنا جائز ہے، اگر نہیں تو محروم کرنے والے کا فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب: کسی وارث کو حقِ وراثت سے محروم کرنا جائز نہیں، ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا تاہم جو فیصلہ وہ کرچکا ہے (یعنی اپنی زندگی میں اپنے جملہ اموالِ منقولہ وغیر منقولہ کو دیگر ورثاء میں تقسیم کردے) نافذ ہوگا اور اس کی موت کے بعد محروم ہونے والا وارث حقِ میراث کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

قال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ: ولو وهب جمیع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو آثم نص عن محمد هکذا فی العیون۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۰۰ کتاب الهبة قبل الفصل الثانی)[2]

بیٹیوں کو میراث سے محروم کرنا گناہ ہے

سوال: بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ باپ کے ترکہ میں بیٹیوں کو حصہ نہیں دیا جاتا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

---

[1] قال العلامة الموصلیؒ: ثم تقضی دیونه ----- والربع فی فرضها وفرض الزوج والنصف فی فرض الزوج۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۹۲،۸۵ کتاب الفرائض)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاول۔

[2] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ فصل فی الهبة الولد لولده)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۹۱ الباب السادس فی الهبة للصغیر۔

الجواب:۔ باپ کے مرنے کے بعد جس طرح بیٹے اس کی میراث میں ارث کے حقدار ہیں اسی طرح بیٹیاں بھی ترکہ میں شرعاً حقدار ہیں اور یہ حق ان کو اسلام نے دیا ہے اس لیے انہیں اس شرعی حق سے محروم کرنا ناجائز و حرام ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: ولو وهب جميع ماله لابنه جاز في القضاء وهو اثم نص عن محمد هكذا في العيون۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۴۰۰ كتاب الهبة قبل الفصل الاول) ؎۱

ولد الزنا اور ولد الملاعنة کی میراث کا حکم

سوال:۔ جس بچے کے نسب کی باپ لعان کے ذریعے نفی کر دے اور پھر میاں بیوی کے مابین رشتہ ازدواج بھی ختم ہو جائے، اب سوال یہ ہے کہ جب یہ بچہ مر جائے تو اس کی میراث باپ کو ملے گی یا ماں اور اس کے رشتہ داروں میں تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ جس بچے کا نسب بذریعہ لعان باپ سے منقطع ہو جائے تو وہ ولد الزنا کی طرح ہے، اب چونکہ اس کا رشتہ نسب صرف ماں سے ثابت ہے اس لیے اس کی میراث بھی ماں اور اس کے رشتہ دار لیں گے اور باپ حق میراث سے محروم رہے گا۔

قال العلامة الموصليؒ: وعصبة ولد الزنا وولد الملاعنة مولى امه لانه لااب له والنبی صلی اللہ علیہ وسلم الحق ولد الملاعنة بامه فصار کشخص لا قرابة له من جهة الاب فيرثه قرابة امه ويرثهم۔ (الاختيار لتعليل المختار ج۵ ص۹۴ فصل في العصبات) ؎۲

؎۱ قال العلامة قاضی خان رحمه الله: رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء ويكون آثما فيما صنع۔ (فتاوىٰ قاضيخان على هامش الهندية ج۳ ص۲۷۹ فصل في هبة الوالد لولده)

ومثله في الهندية ج۵ ص۳۹۱ الباب السادس في الهبة الصغير۔

؎۲ قال العلامة الحصكفيؒ: وعصبة ولد الزنا وولد الملاعنة مولى الام.... وهي ان ولد الزنا يرث من امه ميراث اخ لام.... وولد الملاعنة يرث من توأمه ميراث اخ لابوين۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۵ ص۴۹۵ كتاب الفرائض)

ومثله في امداد الفتاوىٰ ج۴ ص۳۴۱ كتاب الفرائض۔

دو رشتہ والے کی میراث کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی فوت ہو گیا ہے اور اس کے ورثاء میں ایک بیوہ مسماۃ گل میننہ، دوسرا وارث مسمی جمعہ گل جو کہ باپ کے رشتے سے چچازاد بھائی اور ماں کے رشتہ سے سوتیلا بھائی ہے دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسمی جمعہ گل کو مرحوم کی میراث میں کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب:۔ مرحوم کے ترکہ میں مسمی جمعہ گل کو دو حصے ملیں گے، ایک اخیافی بھائی ہونے کے ناطے سے اور دوسرا عصوبت کی وجہ سے، اس لیے تقسیم میراث میں مرحوم کی بیوہ کو ۱/۴ حصہ ملے گا اور باقی مال جمعہ گل کا ہوگا بشرطیکہ کوئی اور وارث نہ ہو۔

۴

جمعہ گل	بیوہ
۳/۴	۱/۴

پنشن کی رقم میں میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! یہاں ایک آدمی کا انتقال ہو گیا ہے جو کہ فوج میں ملازم تھا اس نے اپنی پنشن بیوی کے نام پر اس عنوان سے کی تھی کہ میری وفات کے بعد میری پنشن میری بیوہ کو دی جائے، اب اس کی وفات کے بعد اس کے دوسرے ورثاء پنشن میں وراثت کا دعویٰ کرتے ہیں، تو کیا مرحوم کی بیوہ کے علاوہ دیگر ورثاء کا بھی پنشن میں حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پنشن کا وظیفہ مال مملوکہ نہیں بلکہ سرکار کی طرف سے ایک عطیہ ہوتا ہے بناء بریں وجہ یہ وظیفہ تقسیمِ میراث سے مستثنیٰ ہوگا، سرکار جس کو چاہے اور جتنا چاہے دے سکتی ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحوم کے کاغذات اس کی بیوہ کے نام ہیں اور سرکار بھی اس پر راضی ہے اس لیے یہ پنشن صرف بیوہ کا حق ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: چونکہ میراث مملوکہ اموال میں جاری ہوتی ہے اور یہ وظیفہ محض تبرع و احسان سرکار کا ہے بدون قبضہ کے مملوک نہیں ہوتا لہٰذا آئندہ جو وظیفہ ملے گا اس میں میراث جاری نہیں ہوگی، سرکار کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تقسیم کر دے۔ الخ (امداد الفتاویٰ جلد۴ صـ۳۴۲ کتاب الفرائض)

میت کی جملہ مملوکہ اشیاء میں ارث جاری ہونے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا میراث صرف میت کی جائیداد میں جاری ہوگی یا گھر اور اس کے سازوسامان اور نقدی میں بھی جاری ہوگی؟

الجواب:۔ کسی کی ملکیت میں جو کچھ بھی ہو اس کے مرنے کے بعد وہ سب ترکہ شمار ہوگا، چاہے مرحوم کی جائیداد ہو یا نقدی، گھر ہو یا اس کا سازوسامان، ان سب اشیاء میں ارث جاری ہوگی اور ورثاء میں تقسیم ہوگی۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ: قال علماؤنا رحمہم اللہ تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ۔

قال المحشی تحت لفظ الترکۃ: والمراد من الترکۃ ما ترکہ المیت خالیاً عن تعلق حق الغیر بعینہ وان کان حق الغیر متعلقا بعینہ کالرھن والعبد الجانی والمشتری قبل القبض قال صاحبہ یقدم علی التجہیز کما فی حال حیاتہ الخ۔

(الشریفیۃ شرح السراجی ص۳ کتاب الفرائض)[1]

مفقود الخبر کے ترکہ کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کئی سالوں سے لاپتہ ہو اور ہر ممکن ذریعہ سے تلاش کے باوجود اس کا اتہ پتہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی جائیداد کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ اس کے ورثاء میں تقسیم کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں مفقود الخبر ۹۰ سال تک زندہ اور اپنی جائیداد کا مالک ہوتا ہے، اس لیے جب تک مفقود الخبر کی عمر ۹۰ سال نہ ہو جائے اور مسلمان حاکم اس کی موت کا فیصلہ نہ کر دے اُس وقت تک اس کی جائیداد کو تقسیم نہیں کیا جائے گا، جب مسلمان حاکم یا قاضی کی طرف سے اس کی موت کی تصدیق و فیصلہ ہو جائے تو اُس وقت موجود ورثاء میں اس کی جملہ جائیداد بطورِ میراث تقسیم ہوگی اور فوت شدہ ورثاء

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ: والمراد من الترکۃ ما ترکہ المیت خالیا عن تعلق حق الغیر بعینہ الخ۔ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۲۲۹ کتاب الفرائض)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔

محروم ہوں گے۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ: المفقود حیٌّ فی ماله حتّی لا یرث منه احدٌ ومیتٌ فی مال غیرہ حتّی لا ترث من احد و یوقف ماله حتّی یصح موته او تمضی علیه مدۃ۔ واختلف الروایات فی تلک المدۃ وبعد اسطر قال بعضھم تسعون سنۃ وعلیه الفتوی الخ۔ (السراجی ص۵۶، ۵۷ فصل فی المفقود) [۱]

عصبہ کی موجودگی میں ترکہ میں نواسیوں کے حصہ کا حکم

سوال:۔ ایک عورت فوت ہوگئی ہے اس کے ورثاء میں دو نواسیاں (بیٹی کی بیٹیاں)، دو بھائی اور شوہر زندہ ہیں، اب نواسیوں کو نانی کی میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ ان کی والدہ نانی سے قبل ہی فوت ہوگئی ہے؟

الجواب:۔ نواسیوں کا شمار ذوالارحام میں ہوتا ہے، عصبہ کی عدم موجودگی میں ان کو نانا یا نانی کی میراث میں حصہ ملے گا، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحومہ کے دو بھائی ہیں جو اس کے عصبہ میں سے ہیں اس لیے اس کا جملہ ترکہ اس کے شوہر اور بھائیوں میں بقدرِ حصۂ شرعی تقسیم ہوگا اور نواسیاں محروم ہوں گی۔

وفی الھندیۃ: وانما یرث ذوی الارحام اذا لم یکن احد من اصحاب الفرائض ممن یرد علیه ولم یکن عصبۃ الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ص۴۵۹ ج۶ الباب العاشر فی ذوی الارحام) [۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ: قال مشائخنا مدار مسئلۃ المفقود علی حرف واحد ان المفقود یعتبر حیًا فی ماله ومیتًا فی مال غیرہ حتّی ینقضی من یعلم انه لا یعیش الی مثل تلک المدۃ لا تموت اقرانه وبعد ذلک یعتبر میتًا فی ماله۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۶ الباب الثامن فی المفقود والاسیر)

[۲] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولا شئ لذوی الارحام مع العصبۃ او مع صاحب الفرائض الخ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۲۱۹ جنس آخر فی ذوی الارحام واما الصنف الرابع الخ)

ومثلهٗ فی السراجی باب ذوی الارحام ص۳۵

اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی کا میراث سے محروم ہونا

سوال :۔ یہاں ہمارے علاقہ میں ایک شخص فوت ہوگیا ہے جس کے ورثاء میں تین بیٹیاں، ایک اعیانی بہن اور بھائی، ایک علاتی بھائی زندہ ہیں، تو کیا اعیانی بہن بھائی کی موجودگی میں سوتیلے یعنی باپ شریک بھائی کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب :۔ اعیانی بہن بھائی کی موجودگی میں علاتی اور اخیافی بہن بھائی میراث سے محروم ہوں گے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحوم کا ترکہ اس کی تین بیٹیوں اور اعیانی بہن بھائی میں تقسیم ہوگا اور سوتیلا بھائی محروم ہوگا، نقشہ درج ذیل ہے :۔

مسئلہ ۳×۳ = ۹

بنت	بنت	بنت	اخ للاب وام	اخ للاب	اخت لاب وام
۲/۹	۲/۹	۲/۹	۲/۹	محروم	۱/۹

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ : ان ذی القرابتین اولیٰ من ذی قرابة واحدة ذکرا کان او انثیٰ لقوله علیه السلام ان اعیان بنی الأم یتوارثون بنی العلات کالاخ لاب وام اذا صارت عصبة مع البنت اولیٰ من الاخ لاب الخ۔

(السراجی ص۱۴ باب العصبات)

میراث میں مطلقہ کے حصے کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی عدت گذر جانے کے بعد اس شخص کا انتقال ہوگیا اب اس کی مطلقہ بیوی حقِ میراث کا دعویٰ کرتی ہے، تو کیا اس کو سابقہ خاوند کے ترکہ سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب :۔ مطلقہ عورت عدت گذر جانے کے بعد خاوند کے لیے اجنبی بن جاتی ہے، اس لیے مطلقہ کو عدت گذر جانے کے بعد میراث میں حصہ نہیں ملے گا کیونکہ میت کے ورثاء کا حق ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مطلقہ کا دعویٰ ارث صحیح نہیں ہے۔

وفی الهندیة : ولو طلقها طلاقا بائنًا او ثلاثا ثم مات وهی فی العدة فکذلک عندنا ترث ولو انقضت عدتها ثم مات

لم ترث الخ۔ (الفتاوٰی الہندیة ج ۱ ص۴۶۲ الباب الخامس فی طلاق المریض) لے

بیوی کا کفن شوہر کے ذمہ ہے

سوال:۔ اگر کوئی عورت فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء میں شوہر، بھائی اور باپ زندہ ہے، تو کیا اُس عورت کا کفن اس کے مہر سے بنایا جائے گا یا اس کا جملہ خرچہ شوہر برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ چونکہ کفن عورت کا لباس ہے اور لباس شرعاً شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے، لہٰذا جب عورت فوت ہو جائے تو اس کے کفن کا خرچہ شوہر برداشت کرے گا اس کے حق مہر سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: واختلف فی الزوج والفتوٰی علیٰ وجوب کفنها علیه عند الثانی وان ترکت مالاً خانیة ورجحه فی البحر بانه الظاهر لانه ککسوتها۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۸۱۰ باب صلوٰة الجنائز) لے

اپنا حصہ میراث کسی دوسرے حصہ دار پر فروخت کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحبؒ چند ماہ قبل انتقال ہو گیا ہے اور انہوں نے کافی جائیداد ترکہ میں چھوڑی ہے، میں ایک غریب آدمی ہوں کیا میں اپنا حصہ میراث اپنے بھائیوں میں سے کسی ایک بھائی پر فروخت کر سکتا ہوں یا نہیں؟ جبکہ میرے علاوہ دوسرے ورثاء ابھی جائیداد کو تقسیم نہیں کرنا چاہتے؟

الجواب:۔ آپ چونکہ اپنے والد صاحب کے فوت ہو جانے کے بعد ان کے ترکہ میں

لے قال العلامة قاضی خان رحمه الله: وان ابانها بغیر سوالها ثم مات وهی فی العدة ورثته عندنا وان مات بعد انقضاء العدة لم ترث الخ۔
(فتاوٰی قاضیخان ج ۲ ص۲۷۳ کتاب الطلاق فصل فی المعتدة التی ترث)
وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج ۲ ص۱۰۹ کتاب الطلاق، باب طلاق المریض۔

لے وفی الهندیة: ومن لم یکن له مال فالکفن علیٰ من تجب علیه النفقة الا الزوج فی قول محمدؒ وعلیٰ ابی یوسفؒ یجب الکفن علی الزوج وان ترکت مالا وعلیه الفتوٰی هٰکذا فی قاضی خان۔
(الفتاوٰی الہندیة ج ۱ ص۱۶۱ الفصل الثالث فی التکفین)۔ وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضیخان علیٰ ہامش الہندیة ج ۱ ص۱۸۹ فصل فی غسل المیت الخ

حصۂ شرعی کے حقدار ہیں اور وہ حصّہ آپ کی ملکیت ہے اس لیے آپ کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنے حصّہ کی جائیداد تقسیم سے قبل یا بعد اپنے بھائیوں میں سے کسی ایک پر فروخت کر دیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ : ویجوز بیع احدھما نصیبہ من شریکہ وجمیع الصور ومن غیر شریکہ بغیر اذنہ۔

(الھدایۃ ج ۲ ص۵۸۸ کتاب الشرکۃ) [1]

چار بیویوں کا خاوند کے ترکہ میں حصّۂ شرعی

سوال:۔ ایک شخص کی چار بیویاں ہیں اور اس کی وفات کے بعد چاروں زندہ ہیں، تو کیا ہر ایک کو خاوند کے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا یا سب کا حصّۂ شرعی آٹھواں ہے جو ان میں برابر تقسیم کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اسلام نے اولاد کی موجودگی میں بیوی کے لیے آٹھواں حصہ مقرر کیا ہے، چاہے کسی کی ایک بیوی ہو یا زیادہ، اور اگر اولاد نہ ہو تو ۱/۴ حصہ اس کیلئے مقرر ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں مرحوم کی کل جائیداد کا ۱/۸ حصّہ اس کی چاروں بیواؤں میں برابر تقسیم کیا جائے گا اور باقی ترکہ مرحوم کی اولاد اور دوسرے ورثاء کو دیا جائے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ : اما للزوجات فحالتان الربع للواحدۃ فصاعدۃ عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والثمن مع الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۷/۸ باب معرفۃ الفروض) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن الھمام رحمہ اللہ : ان الشرکۃ اذا کانت بینھما من الابتداء بان اشتریا حنطۃ او ورثاھا کانت کل حبۃ مشترکۃ بینھما فلیبع کل منھما نصیبہ شائعًا جائز من الشریک والاجنبی۔

(فتح القدیر ج۶ ص۱۵۴ کتاب الشرکۃ)

[2] وفی الھندیۃ : وللزوجۃ الربع عند عدمھما والثمن مع احدھما والزوجات والواحدۃ یشترکن فی الربع والثمن وعلیہ الاجماع۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۰ الباب الثانی فی ذوی الفروض)

[3] ومثلہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض۔

پہلے شوہر کا میراث میں حصہ نہیں ہے

سوال:- کسی مطلقہ عورت نے ایک دوسرے مرد سے نکاح کر لیا اور چند سال اس کے ساتھ زندگی گذارنے کے بعد فوت ہو گئی اب اس کے ترکہ میں دونوں خاوندوں کا مال ہے، پہلا شوہر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میرے والے مہر میں مجھے ۴/۱ حصہ مال ملنا چاہیے جبکہ اس عورت کے شوہر ثانی سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں بھی ہیں، کیا شرعاً پہلے خاوند کو عورت کے ترکہ میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب:- طلاق دے کر عدت گذر جانے کے بعد میاں بیوی کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا اور دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں جبکہ میراث کے لیے رشتہ ارث ضروری ہے۔ صورت مسئولہ میں جہاں تک عورت کے پہلے شوہر کے حق مہر کا تعلق ہے تو وہ عورت کی ملکیت ہے اس میں سابقہ شوہر کا کوئی تعلق نہیں اسلئے عورت کا جملہ ترکہ اس کے شوہر ثانی، تین بیٹوں اور دو بیٹیوں میں تقسیم ہو گا۔

مرحومہ ۴ × ۸ = ۳۲

شوہر اول	شوہر ثانی	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی
محروم	۸/۳۲	۶/۳۲	۶/۳۲	۶/۳۲	۳/۳۲	۳/۳۲

وفی الهندية: لو طلقها طلاقاً بائناً او ثلاثاً ثم مات وهی فی العدة فكذلك عندنا ترث ولو انقضت عدتها ثم مات لم ترث وهذا اذا طلقها من غير سؤالها فاما اذا طلقها بسؤالها فلا ميراث لها۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۴۶۲ الباب الخامس فی طلاق المريض)

بھتیجوں کی موجودگی میں بھتیجیاں میراث سے محروم ہوں گی

سوال:- ایک شخص کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے ورثاء میں صرف چھ بھتیجے اور چار بھتیجیاں زندہ ہیں، اب بھتیجیاں چچا کے ترکہ میں میراث کا مطالبہ کرتی ہیں، تو کیا ان کو شرعاً چچا کے ترکہ میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں مرحوم کے جملہ ترکہ میں صرف اس کے بھتیجے حقدار ہیں اور بھتیجیوں کو چچا کے ترکہ سے کچھ بھی نہیں ملے گا وہ شرعاً محروم ہوں گی، مرحوم کا جملہ ترکہ چھ بھتیجوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ : العصبات النسبیۃ.... ثم جزء ابیہ ای الاخوۃ ثم بنوھم وان سفلوا ثم جزء جدہ۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات) ؎۱

نکاح ثانی کرنے سے عورت کا حصہ میراث ختم نہیں ہوتا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب ۱۹۸۶ء میں فوت ہوگئے ہیں اور انہوں نے نقد رقم کے علاوہ کچھ جائیداد بھی ترکہ میں چھوڑی ہے، والد صاحب کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی والدہ نے دوسرا نکاح کرلیا، اب وہ والد صاحب کے جملہ ترکہ میں اپنے حصّہ کا مطالبہ کررہی ہیں، تو کیا شرعاً والدہ کا اس ترکہ میں حصہ بنتا ہے یا نہیں جبکہ انہوں نے نکاح ثانی بھی کرلیا ہے؟

الجواب :۔ میاں بیوی کا رشتہ موجب ارث رشتہ ہے، خاوند کی وفات کے بعد وہ ترکہ میں حصہ شرعی کی حقدار ہے، عدت گذارنے کے بعد دوسرا نکاح کرنے سے میراث میں حصہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے آپ کی والدہ کا اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ میں حصّہ شرعی کا دعویٰ صحیح ہے جو کہ اس کو دینا چاہیئے۔

لقولہ تعالیٰ : وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ (سورۃ النساء آیت ۱۲) ؎۲

؎۱ وفی الھندیۃ : وباقی العصبات ینفرد بالمیراث ذکورھم دون اخواتھم وھم اربعۃ ایضاً العم وابن العم وابن الاخ وابن المعتق الخ
الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۱
الباب الثالث فی العصبات

؎۲ قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ : اما للزوجات فحالتان الربع للواحدۃ فصاعدۃ عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والثمن مع الولد وولد الابن وان سفل۔
(السراجی ص۸،۹ باب معرفۃ الفروض ومستحقیھا)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۰ الباب الثانی فی ذوی الفروض۔

اولاد کی موجودگی میں والدین کا حصۂ شرعی متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ کیا اولاد کی موجودگی میں والدین کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ والدین کا معقول ذریعہ آمدنی بھی ہے اور اولاد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں؟

الجواب:۔ ولدیت کا رشتہ موجبِ اِرث ہے اولاد کا وجود اس کے لیے مانع نہیں اور نہ والدین کے ذرائع آمدنی سے ان کا حصۂ میراث متاثر ہوتا ہے، اس لیے اولاد کی موجودگی میں بھی والدین کو ۶/۱ حصہ میراث ملے گا۔

لقولہ تعالیٰ: وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۱) [۱]

حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم میں میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا شوہر سیلاب میں ڈوب کر فوت ہو گیا ہے، حکومت نے سیلاب میں مرنے والوں کی بیواؤں کو ۵۰/۵۰ ہزار روپے امداد کے طور پر دیئے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں اور میرے چار معصوم بچے ہیں اور اس امدادی رقم کے علاوہ میری گزران کا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں، اب میرا سسر اس ۵۰ ہزار روپے میں سے اپنے حصّے کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً حکومت کی طرف سے ملنے والی اس امدادی رقم میں میرے سسر کا کوئی حصہ ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جو مال حکومت نے مرحوم کی بیوہ کو دیا ہے وہ حکومتی امداد ہے جو مرحوم کی بیوہ کے ساتھ مخصوص ہے اس میں میراث کے احکام جاری نہیں ہوں گے اس لیے کہ یہ مال مرحوم کا ترکہ نہیں ہے جبکہ میراث

---

[۱] قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما الاب..... وھو السدس وذلک مع الابن او ابن الابن وان سفل..... اما للام فاحوال ثلث السدس مع الولد او ولد الابن وان اسفل (السراجی ص ۱۱،۶ باب معرفۃ الفروض ومستحقیھا)

ومثلہ فی الھندیۃ ج ۶ ص ۴۴۸ کتاب الفرائض، الباب الثانی فی ذوی الفروض۔

ترکہ میں جاری ہوتی ہے۔

قال العلامة محمد الطوریؒ: تحت قوله (یبدأ من ترکة المیّت) المراد من الترکة ما ترکه المیت خالیا عن تعلق حق الغیر بعینه۔
(البحر الرائق ج ۸ ص۴۸۹ کتاب الفرائض)[1]

باپ کی زندگی میں میراث کا دعوی کرنا

سوال:۔ ایک شخص اپنی زندگی میں اپنی جملہ جائیداد کو فروخت کرنا چاہتا ہے مگر اس کا ایک بیٹا اُسے جائیداد فروخت کرنے سے روک رہا ہے اور اپنے حصہ کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا بیٹا باپ کی زندگی میں اس سے اپنے حصۂ میراث کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باپ اپنی مملوکہ جائیداد میں خود مختار ہے وہ اس میں جس طرح چاہے تصرّف کر سکتا ہے، کوئی بیٹا اس کو شرعاً منع نہیں کر سکتا، اور نہ ہی باپ کی زندگی میں اس کی جائیداد میں اپنے حصہ کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: ولو وهب جمیع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو آثم نص عن محمدؒ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۰۰ کتاب الهبة، قبیل الفصل الثانی)[2]

---

[1] قال العلامة الدکتور وهبة الزحیلی: المورو ث هو الترکة ویسمی ایضاً میراثا وارثا وهو ما یترکه المورث من المال او الحقوق التی یمکن ارثها عنه کحق القصاص وحبس المبیع لاستیفاء الثمن وحبس المرهون لاستیفاء الدین۔ (الفقه الاسلامی وادلته جلد ۸ ص۲۴۹ الباب السادس المیراث)

[2] قال العلامة قاضی خانؒ: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ فصل فی الهبة الولد لولده)
ومثلهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۹۱ الباب السادس فی الهبة الصغیر۔

منافع بھی ترکہ میں شامل ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب کسی کے ساتھ کاروبار میں شریک تھے جس میں والد صاحب کے چار لاکھ روپے تھے، مشترکہ کاروبار بڑے اچھے طریقے سے چل رہا تھا کہ اچانک والد صاحب کا انتقال ہوگیا، اب دس سال بعد ہم اس سرمایہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں جبکہ اس چار لاکھ روپے کے ساتھ ۲ لاکھ منافع بھی ہو چکا ہے، تو کیا اب ہم تقسیم چار لاکھ کی کریں گے یا منافع کی رقم بھی شامل کرنی ہوگی؟

الجواب:۔ منافع چونکہ شرعاً اصل زر کا تابع ہوتا ہے، اس لیے منافع اور اصل رقم کو ملا کر تقسیم کیا جائے گا، یعنی آپ لوگ کل ۶ لاکھ روپے آپس تقسیم کریں گے۔

قال العلامة محمد الطوریؒ: تحت قوله (یبدأ من ترکة المیت الخ) المراد من الترکة ما ترکه المیت خالیاً من تعلق حق الغیر بعینه الخ

(البحرالرائق ج ۸ ص۴۸۹ کتاب الفرائض) لہ

قبر کے لیے جگہ کی قیمت میّت کے ترکہ سے دی جائے گی

سوال:۔ اکثر شہری علاقوں میں قبر کے لیے جگہ قیمتاً ملتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ قبر کی قیمت کس مال سے ادا کی جائے گی یعنی میت کے ترکہ سے واجب الاداء ہوگی یا ورثاء اپنے مال سے دیں گے؟

الجواب:۔ میّت کے کفن دفن یعنی تجہیز و تکفین پر آنے والے اخراجات میت کے جملہ ترکہ سے ادا کیے جائیں گے۔ لہٰذا جہاں کہیں قبر کی جگہ قیمتاً ملتی ہو تو اس کی قیمت میت کے ترکہ سے ادا کی جائے گی۔

وفی الھندیة: الترکة تتعلق بہا حقوق اربعة جھاز المیت ودفنه والدّین والوصیّة والمیراث فیبدأ اولاً بجھازہ وکفنه وما

لہ قال العلامة وھبة الزحیلی: الموروث ھو الترکة ویسمی ایضاً میراثاً وھو ما یترکه المورث من المال او الحقوق التی یمکن ارثھا عنه کحق القصاص وحبس المبیع لاستیفاء الثمن وحبس المرھون لاستیفاء الرھن۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۸ ص۲۴۹ الباب السادس المیراث)

یحتاج الیہ فی دفنہ بالمعروف۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۶ ص۴۴۷ الباب الاول، کتاب الفرائض) [۱]

قبر کھودنے والوں کی مزدوری کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں قبر کھودنے کی مزدوری لی جاتی ہے، تو کیا قبر کھودنے والوں کی مزدوری میت کے ترکہ سے ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میت کی تجہیز و تکفین پر جتنا بھی خرچہ آئے وہ اس کے ترکہ سے ہی ادا کیا جائے گا، تاہم اگر ورثاء اپنی طرف سے دینا چاہیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة السجاوندیؒ: قال علماءنا رحمهم الله تعالیٰ تتعلق بترکة المیت حقوق اربعة مرتبة الاول یبدأ بتکفینه وتجهیزه من غیر تبذیر ولا تقتیر الخ (السراجی ص۳،۲ کتاب الفرائض) [۲]

شوہر بیوی کے مال میں حصۂ میراث سے محروم نہیں ہوتا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہماری بہن کو اسکے شوہر نے شادی کے ایک سال بعد اپنے گھر سے نکال دیا لیکن طلاق نہیں دی، چار پانچ سال کے بعد وہ ہمارے ہاں ہی فوت ہوگئی، اب اس کا شوہر ہماری بہن کے مال میں حصۂ میراث کا مطالبہ کر رہا ہے، تو کیا شرعاً مرحومہ کے مال میں اس کا

---

[۱] قال العلامة السجاوندیؒ: قال علماءنا رحمهم الله تعالیٰ تتعلق بترکة المیت حقوق اربعة مرتبة الاولیٰ یبدأ بتکفینه وتجهیزه من غیر تبذیر ولا تقتیر ثم تقضی دیونه من جمیع مابقی من ماله الخ۔ (السراجی ص۳،۲)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض الاول فی اصحاب الفرائض۔

[۲] وفی الهندیة: الترکة تتعلق بها حقوق اربعة جهاز المیت ودفنه والدّین والوصیة والمیراث فیبدأ اولاً بجهازه وکفنه ومایحتاج الیه فی دفنه بالمعروف۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاوّل)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج ۸ ص۴۸۹ کتاب الفرائض۔

حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میراث کے حصص اضطراری ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں اور بدون موانع شرعی کے ساقط نہیں ہوتے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق جب شوہر نے بیوی کو طلاق نہیں دی ہے تو شوہر ہونے کے ناطے سے وہ بیوی کے ترکہ میں نصف یا ربع کا شرعاً حقدار ہے۔

لقولہٖ تعالیٰ: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۲) [۱]

بہن کے مال میں بہن اور بھائیوں کا حصہ

سوال:۔ محترم جناب مفتی صاحب! ہماری بہن کا انتقال ہو گیا ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں صرف شوہر، ماں، ہم چھ بھائی اور ایک بہن زندہ ہیں، کیا مرحومہ کے ترکہ میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کوئی عورت فوت ہو جائے اور اس کی نہ کوئی اولاد ہو اور نہ باپ، تو اس کے مال میں بہن و بھائی سب حصۂ شرعی کے حقدار ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا ترکہ اس کی ماں، شوہر، بہن اور بھائیوں میں مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

مرحومہ ۶ × ۱۳ = ۷۸

ماں	شوہر	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بہن
۱۳/۷۸	۳۹/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۲/۷۸

وفی الهندية: فالنسبية ثلاثة انواع عصبة بنفسه وهو كل ذكر لا يدخل

---

[۱] قال العلامة السجاوندی رحمه الله: اما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والربع مع الولد وولد الابن وان سفل۔
(السراجی ص۷ باب معرفة الفروض ومستحقيها)
ومثله فی البزازية علی هامش الهندية ج۶ ص۴۵۳ كتاب الفرائض، الاول فی اصحاب الفرائض۔

فی نسبتہ الی المیت انثیٰ وھم اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص ۴۵۱ کتاب الفرائض الباب الثالث فی العصبات) [1]

ظالم باپ کا بیٹے کے ترکہ میں حصۂ میراث کا حکم

سوال:- ایک شخص بہت بڑا ظالم ہے اور اس نے اپنے بیٹے پر بہت ظلم کئے ہیں، اب اس کا بیٹا فوت ہوگیا ہے، تو کیا ایسے ظالم باپ کو بھی بیٹے کی میراث میں حصّہ ملے گا؟

الجواب:- میراث کے حصص شرعاً مقرر شدہ ہیں ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنا جائز نہیں اور نہ بدون موانع شرعی کے یہ حصص ساقط ہوسکتے ہیں، اس لئے صورتِ مسئولہ کے مطابق باپ اپنے بیٹے کے مال میں حصۂ شرعی کا حقدار ہے، ظلم کی وجہ سے اس کا حق ساقط نہیں ہوسکتا۔

لقولہ تعالیٰ: وَلِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ۔

(سورۃ النساء پ۴ آیت ۱۱) [2]

---

[1] قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما العصبۃ بنفسہ فکل ذکر لا تدخل فی نسبتہ الی المیت انثیٰ وھو اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (السراجی ص ۱۴ باب العصبات)

[2] لما فی الھندیۃ: اما الرجال فالاول الاب فلہ ثلاثۃ احوال الفرض المحض وھو السدس مع الابن وابن الابن وان سفل والتعصیب المحض وذٰلک لا یخلف غیرہ فلہ جمیع المال بالعصوبۃ وکذا اذا اجتمع مع ذی فرض لیس بولد ولا ولد الابن کزوج وامّ وجدۃ فیاخذ والفرض فرضہ فالباقی للاب بالعصوبۃ الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص ۴۴۸ کتاب الفرائض، الباب الاوّل)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۶ ص ۴۵۴ کتاب الفرائض، الاوّل فی اصحاب الفرائض۔

نافرمان بیوی کا شوہر کی میراث میں حصہ کا حکم

سوال :۔ ایک شخص کی بیوی نافرمان ہے اور بلاوجہ ہر وقت شوہر سے جھگڑتی رہتی ہے، اور اگر اسی حالت میں اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو کیا اس عورت کو شوہر کی میراث سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب :۔ میراث میں حصص کا تعین منجانب اللہ مقرر ہے جو کہ بدون موانع شرعی کے کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتا، چاہے وارث فرمانبردار ہو یا نافرمان، اس لیے مذکورہ صورت میں بھی نافرمان بیوی کو شوہر کے مال میں چوتھا یا آٹھواں حصہ ملے گا۔

لقولہ تعالیٰ : وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۲) [1]

حربی ذمی کا وارث نہیں ہو سکتا

سوال :۔ اگر کوئی غیر مسلم پاکستان میں وفات پا جائے اور وہ یہاں کا شہری ہو اور اس کا باپ ہندوستان میں رہتا ہو تو کیا یہ باپ اپنے بیٹے کی میراث میں حصہ شرعی کا حقدار ہو گا یا نہیں؟

الجواب :۔ اختلافِ دارین (دار الحرب اور دار الاسلام) بھی مانع ارث ہے، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق باپ اپنے بیٹے کی میراث میں حصے کا حقدار نہیں ہوگا اور مرنے والے کا مجملہ مال دار الاسلام (پاکستان) میں رہنے والے اس کے ورثاء میں تقسیم ہو گا۔

قال العلامۃ محمد الطوریؒ : لاخلاف بین اصحابنا ان الکافر الحربی لا یرث الذمی سواء کان الحربی مستامنا فی دارنا او فی الحرب اھل الذمۃ یرث بعضھم بعضاً۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۵۰۱ کتاب الفرائض)

---

[1] لما قال العلامۃ ابن البزاز الکردری رحمہ اللہ : وتصیب الزوجۃ الربع مع کل الورثۃ الا مع الولد او ولد الابن فلھا معھم الثمن بکل حال واحدۃ او اکثر یشترکن فی ذٰلک۔ (البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض، الاول فی اصحاب الفرائض)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۶ ص۴۵ کتاب الفرائض، الباب الاول۔

بہن کا اپنے بھائی کے ترکہ میں میراث کا حکم

سوال :- کیا بہن اپنے بھائی کے ترکہ میں سے میراث کی حقدار ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کن حالات میں؟ اور کیا اپنے باپ کے ترکہ میں میراث کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب :- عورت اپنے باپ کے ترکہ میں میراث کی حقدار ہوتی ہے مگر اپنے بھائی کے ذاتی مال وجائیداد میں حقدار نہیں ہوتی خصوصاً جب بھائی زندہ ہو اور وفات کی صورت میں شرعی ضابطہ کے مطابق کبھی حقدار ہوگی اور کبھی نہیں۔

وفی الهندية : الخامسة الاخوات لاب وام للواحدة النصف وللثنتين فصاعداً الثلثان ومع الاخ لاب وام للذكر مثل حظ الانثيين ولهن الباقي مع البنات او بنات الابن - السادسة الاخوات لاب وهن كالاخوات لابوين عند عدمهن ـــ ولهن السدس مع الاخت لاب وام تكملة الثلثين ولا يرثن مع الاختين لاب وام الا ان يكون معهن اخ فيعصبهن ـــ السابعة للاخوات لام للواحدة السدس وللثنتين فصاعداً الثلث ـــ ويسقط الاخوة والاخوات بالابن وابن الابن وان سفل وبالاب بالاتفاق وبالجد عند ابي حنيفة رحمه الله -

(الفتاوى الهندية ج۶ ص۴۵۰ كتاب الفرائض الباب الثاني في ذوي الفروض)[۱]

---

[۱] قال العلامة علاء الدين الحصكفي رحمه الله : فيبدأ بذوي الفروض وهم اثنا عشر من النسب ثلاثة من الرجال (هم الاب والجد والاخ لام) وسبعة من النساء (هن البنت وبنت الابن والاخت الشقيقة والاخت لاب والاخت لام والجدة واثنان من النسب وهما الزوجان الخ

{الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص۵۳۸ كتاب الفرائض}

ومثله في البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۴۵۳ كتاب الفرائض الفصل الاول في اصحاب الفرائض -

مطبوعات مؤتمر المصنّفین (۱۶)

قادیانیّت
اور
ملّتِ اسلامیّہ کا موقف

۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران قومی اسمبلی پاکستان میں
ملّتِ اسلامیہ کا وہ بیان استغاثہ جس پر قومی اسمبلی نے
بالاتفاق دستور میں قادیانیوں کو غیر مُسلم قرار دیا

پیشکش
مُؤتمر المُصنّفِین
دار العلوم حقّانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

مطبوعات مؤتمر المصنفین (۴)

الحاوی

علی

مشکل الطحاوی

رشحات فکر

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی

شیخ الحدیث مولانا عبد الرحمٰن کاملپوری

مولانا عبد اللطیف، مولانا مفتی سعید احمد، مولانا اسعد اللہ

ترتیب و تالیف

قاری سعید الرحمٰن

مہتمم جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر

مؤتمر المصنفین

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

پاکستان

سلسلۂ مطبوعات مؤتمر المصنفین (۳۸)

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

ترتیب

مولانا عبدالقیوم حقانی

رفیق "مؤتمر المصنفین" و استاذ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

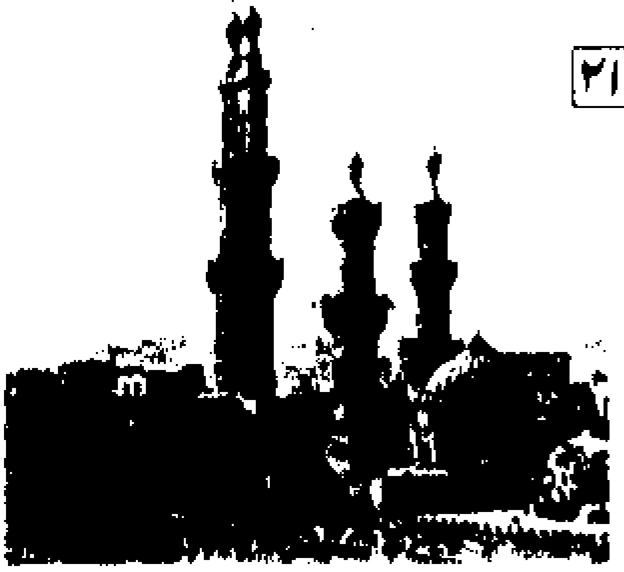
جناب مدیر الحق" مولانا سمیع الحق کے سوالنامہ کے جواب میں
مشائخ، مشاہیر علماء، ممتاز سکالرز، دانشوروں اور قومی و ملی زعماء کے
علمی و مطالعاتی تاثرات اور مشاہدات پر مبنی وقیع مضامین کا مجموعہ،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق
مولانا سید محمد یوسف بنوری
مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم
مولانا شمس الحق افغانی
شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فرید
مولانا ظفر احمد عثمانی
مولانا اطہر علی بنگلادیشی
قاضی زین العابدین میرٹھی
مولانا محمد ابراہیم جان مجددی
مولانا سمیع الحق مدظلہ
مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی
مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی
پروفیسر محمد اشرف پشاور
مولانا لطافت الرحمن
مولانا محمد اسحاق سندیلوی
مولانا عبدالقدوس ہاشمی
علامہ مولانا مارتونگ
ڈاکٹر محمد صغیر حسن
ڈاکٹر حمید اللہ پیرس
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

مؤتمر المصنفین

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، نوشہرہ، سرحد (پاکستان)

مطبوعات مؤتمر المصنفین [۲۱]





دارالعلوم حقانیہ سے جامعۃ الازہر تک

پیش لفظ ــــ حضرۃ مولانا سمیع الحق مدیر الحق

تالیف ــــ مولانا مفتی غلام الرحمٰن

- مصر "جامعۃ ازہر" اور حرمین شریفین کا تازہ اور دلچسپ سفرنامہ، مصر کی قدیم وجدید تاریخ، ثقافت ومعاشرت، مادیت ومغربی تہذیب کی یلغار، اور نقد وتبصرہ۔
- جامعۃ ازہر کی اہمیت، تعلیمی ادوار، عروج وارتقاء، مشائخ ازہر اور اکابر علماء کے حالات۔
- اہم تاریخی اور مذہبی یادگاروں کا تذکرہ، سبق آموز واقعات اور دیار حبیب میں عاشقانہ حاضری کی محبت بھری روئیداد، سہل وسلیس اور دلچسپ انداز بیان۔

مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

پشاور ۔ پاکستان